لبنان

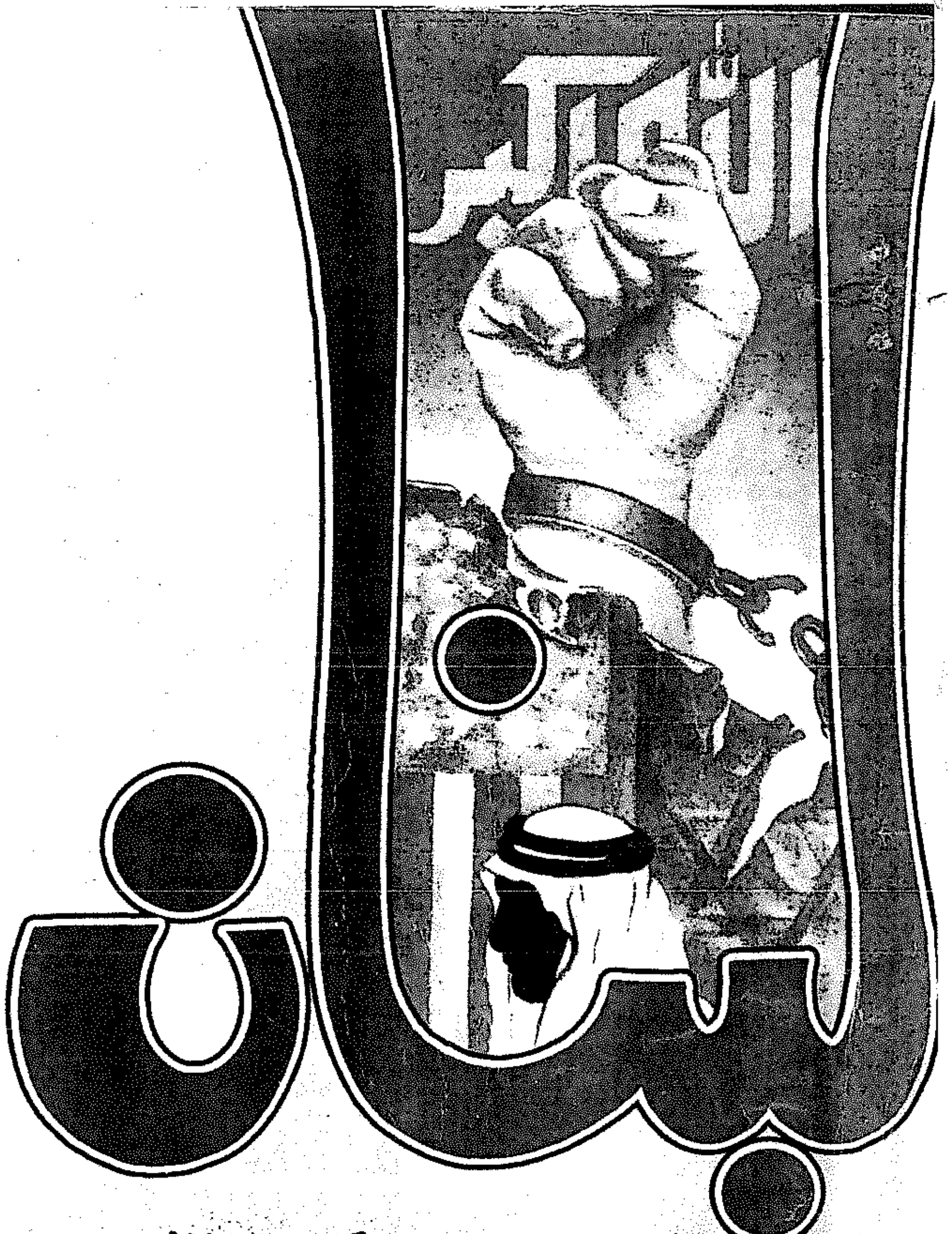

تصنیف : ڈاکٹر مصطفیٰ چمران

ترجمہ : سید سجاد رضوی

معاونت : ڈاکٹر ہاشم رضا

Presented by Ziaraat.Com

لُبنَان

تصنیف

ڈاکٹر مُصطفٰی چمران

ترجمہ : سیّد سجّاد رضوی

بمعاونت : ڈاکٹر ھاشم رضا

ناشر

اِمامیہ پبلی کیشنز، پاکستان

35 - حیدر روڈ ○ اسلام

Presented by Ziaraat.Com

فہرست

مضمون	صفحہ
عرض ناشر	۹
مقدمہ مترجم	۱۱
پیام آیت اللہ امام خمینی	۱۵
اس کتاب میں	۱۷
پیش لفظ	(۲۵)
باب اوّل	۳۴
جنوبی لبنان	۳۵
تشیع کا مرکز	۳۵
لبنان ایک زندہ تجربہ	۳۶
لبنان کا محلِ وقوع اور جبل عامل	۳۸
جبل عامل کے شیعوں پر ظلم	۴۰
جاگیردارانہ نظام کا قیام	۴۲
یورپی استعمار کی آمد	۴۴
باب دوم	۴۶
لبنان کی آزادی اور فرقہ وارانہ قانون	۴۶

مضمون	صفحہ
فرقہ وارانہ نظام	۴۶
احساس ذلّت و کمتری	۴۹
باب سوم	۵۲
اسرائیلی جرائم	۵۲
شہروں اور دیہات کی بربادی	۵۵
باب چہارم	۵۷
لبنان میں بائیں بازو کی جماعتوں کی سرگرمیاں	۵۷
شیعوں کی زندگی کی ایک جھلک	۵۷
بائیں بازو کی جماعتوں سے شیعوں کا تعلق	۵۸
سیاسی پارٹیوں کا طرز عمل	۶۰
کردستان کے مشابہ نظام	۶۱
بڑی طاقتوں کی آماجگاہ	۶۱
باب پنجم	۶۵
لبنان میں آقائی سید صدر کی آمد اور ان کی جدوجہد کا آغاز	۶۵

Presented by Ziaraat.Com

نام کتاب ــــــ لبنان

مصنف ــــــ ڈاکٹر مصطفےٰ چمران

مترجم ــــــ سید سجاد رضوی

کتابت ــــــ دار الکتابت حضرت کیلیانوالہ

مطبع ــــــ معراج دین پرنٹرز

ناشر ــــــ امامیہ پبلیکیشنز

35۔حیدر روڈ، اسلام پورہ، لاہور

فون نمبر:7119027

ملنے کا پتہ

العصر اسلامک بک سنٹر

35۔حیدر روڈ۔ اسلام پورہ لاہور

فون نمبر:7119027

مضمون	صفحہ
انقلابی حکومت اور فوجی حکومت میں تضاد	۲۲۴
فلسطینی مزاحمت اور سوریا کے مابین جنگ کی روک تھام میں سید موسیٰ الصدر کا حصہ	۲۲۸
ہنگامے پر ہنگامہ	۲۳۰
سوریا کی فوج لبنان میں	۲۳۲
فلسطینی مزاحمت - ایک مقدس شعلہ	۲۳۵
پوچ نعرے اور داخلی تخریب	۲۳۸
جنوبی لبنان کے لوگوں کے لیے اسرائیلی ترغیبات	۲۴۷
بائیں بازو کی طاقتوں کا تسلط	۲۴۹
بائیں بازو کی جماعتیں کیا چاہتی ہیں؟	۲۵۲
لبنان کی تقسیم	۲۵۵
باب سیزدہم	۲۵۹
رأس النبعہ کا سقوط	۲۵۹
رأس النبعہ میں میری آمد	۲۶۲
"نبعہ" کے محاصرے	۲۶۵
"نبعہ" میں ہسپتال کی بنیاد	۲۶۶
ہسپتال سے ڈاکٹروں کو دیس نکالا	۲۷۰
"نبعہ" کے سانحے کی تفصیل	۲۷۱
"نبعہ" کا سقوط اور بائیں بازو کی جماعتوں کی غداری	۲۷۵
کتائب کے جرائم	۲۷۷

مضمون	صفحہ
تہمت تراشی اور دروغ بافی	۲۷۸
"نبعہ" کی بربادی کے بعد	۲۸۰
شیعیان علیؑ و حسینؑ	۲۸۵
"نبعہ" شہید کی زیارت	۲۸۸
باب چہاردہم	۲۹۱
تل زعتر کا سقوط	۲۹۱
تل زعتر کی حیثیت	۲۹۱
تل زعتر کا سقوط کیونکر ہوا؟	۲۹۳
سقوط کی داستان	۲۹۵
باب پانزدہم	۲۹۷
خانہ جنگی کے دوران میں شیعوں کا موقف	۲۹۷
بائیں بازو والوں سے تصادم	۲۹۸
انصار کے قصبے پر حملہ	۳۰۱
قبر یخا کا حادثہ	۳۰۵
سید موسیٰ الصدر کے قتل کی سازش	۳۰۶
باب ششم دہم	۳۱۱
خانہ جنگی کا تیسرا دور	۳۱۱
سوریا کے ساتھ نئی صلح	۳۱۲
اظہار معذرت کیوں نہیں کرتے	۳۱۳

مضمون	صفحہ
باب ہفدہم	۳۱۵
اسرائیل و کتائب کے مقابل دادِ شجاعت کے چند نمونے۔	۳۱۵
جنوبی لبنان میں گڑبڑ کی سازش	۳۱۵
بنت جبیل کی داستان شجاعت	۳۱۶
الشیاح اور کتائب کے ایک اڈے کی تسخیر	۳۲۴
الشیاح میں بنکر کی تکمیل!	۳۲۶
حی لیلکی اور المدرسۃ الانجیلیۃ کی تسخیر	۳۲۷
زحلہ کے مرتفعات پر حملہ	۳۲۹
حی مسلم سے کتائب کا فرار!	۳۳۰
الشیاح میں پیئر جمیل بلڈنگ کی بربادی	۳۳۲
عین الرمانہ پر حملہ	۳۳۳
سعدیات اور دامور	۳۳۶
الشیاح اور حسین حسینی کا ایثار	۳۳۸
الشیاح اور ایثار کا آتش فشاں!	۳۴۰
باب ہیجدہم	۳۴۳
لبنان کی خانہ جنگی میں "امل" اور فتح	۳۴۴
شیعیان لبنان کی تحریک!	۳۴۴
"فتح" اور "امل" کا باہمی ارتباط!	۳۴۷
سازش کا خلاصہ	۳۵۶

مضمون	صفحہ
ہمارے عقائد کا اثر	۳۶۳
سید موسیٰ الصدر کے خلاف سازش	۳۷۴
باب نوزدہم	۳۷۷
انقلاب اسلامی ایران کی کامیابی اور سید موسیٰ الصدر کا اغواء	۳۷۷
انقلاب اسلامی ایران کامیابی کی طرف گامزن	۳۷۷
اسلامی آئیڈیالوجی کی برتری	۳۷۸
دنیا کے شیعوں کی بیداری	۳۷۹
فاسد نظام ہائے حکومت کے لیے خطرہ	۳۸۰
لبنان اور سید موسیٰ الصدر	۳۸۰
ہمسایوں پر انقلاب ایران کا اثر	۳۸۵
دنیا کے شیعوں میں بیداری کی حرکت	۳۸۵
عرب حکومتوں کو سقوط کا خط	۳۸۵
سید موسیٰ الصدر کا اغواء	۳۸۷
مذہبی اختلافات	۳۸۷
اغواء کی تفصیل	۳۸۹
عوام کا ردِ عمل	۳۹۰
بیرونی ردِ عمل	۳۹۲
آقائے خمینی سے وساطت	۳۹۳
باب بیستم	۳۹۸
شیعیان لبنان پر انقلاب اسلامی ایران کا اثر	۳۹۸

Presented by Ziaraat.Com

مضمون	صفحہ	مضمون	صفحہ
اسلامی انقلاب ایران کی کامیابی اور قوتوں کے		ضمیمہ الف	۴۳۶
توازن کی تبدیلی	۴۰۱		
انقلاب اسلامی ایران کی کامیابی کے بعد		ڈاکٹر مصطفیٰ چمران شہید۔	۴۳۶
تصادم اور شہادتیں	۴۰۳	ولادت	۴۳۶
محمد فتوتی اور علی تقی کی شہادت	۴۰۳	تعلیم	۴۳۷
آیت اللہ سید باقر الصدر کے سوگ پر بائیں		اجتماعی سرگرمیاں	۴۳۷
بازو کے کاسہ لیسوں کی حرکات بد	۴۰۸	لبنان میں	۴۳۸
ایران کے سفارت خانے پر حملہ	۴۱۰	ایران کے اسلامی انقلاب کی کامیابی کے بعد	۴۴۰
الزہرا ہسپتال پر حملہ	۴۱۱	کردستان میں	۴۴۰
تنظیم امل کے خلاف بائیں بازو کی جماعتوں کا حملہ	۴۱۲	ڈاکٹر چمران وزارت دفاع میں	۴۴۱
علی موسوی کی شہادت	۴۱۴	ایرانی مجلس کے رکن کی حیثیت سے	۴۴۲
موت سے کھیلنے والا بہادر	۴۱۵	خوزستان کے محاذ پر۔	۴۴۳
لبنان اور فلسطین کی کامیابی اور انقلاب		چھاپہ مار دستوں کی تنظیم	۴۴۴
اسلامی ایران	۴۱۶	سوسنگرد کی فتح	۴۴۴
شیعیان لبنان سے بے مہری اور بے توجہی	۴۱۷	امام خمینی سے ملاقات	۴۴۶
ایک بندوق اور چھے افراد	۴۲۰	قربان گاہ کی جانب	۴۴۸
باب بلیست وکیم	۴۲۲	السید موسیٰ الصدر	۴۴۹
آخر کلام	۴۲۲	سید موسیٰ الصدر کی گم شدگی	۴۵۴

عرضِ ناشر

اس وقت لبنان پر نہ صرف مستضعفین جہان ہی کی نظریں ہیں بلکہ دُنیا بھر کی نام نہاد سپر طاقتیں بھی حیران و ششدر ہیں اور وہاں کے حالات کا تجزیہ کر رہی ہیں کہ کس طرح ان مٹھی بھر جیالے سرفروشوں نے استعماری اور صیہونی قوتوں کو لبنان سے دُم دبا کر بھاگنے پر مجبور کیا کئی ایک علاقوں کو امریکہ کی ناجائز اولاد اسرائیل کے ناپاک وجود سے آزاد کروایا۔

ڈاکٹر مصطفیٰ چمران شہید نے لبنان کی مکمل روئیداد لکھ کر دنیا کی آزادی پسند اقوام کے لیے راہ متعین کر دی ہے۔ محترم پروفیسر سیّد سجّاد رضوی نے اس عظیم کتاب کو اُردو کے قالب میں ڈھال کر مسلمانان پاکستان کو بھی موقع دیا کہ وہ لبنان کے اس زندہ معجزہ پر غور کرنے کی طائر عقل کو دعوت دیں اور سوچیں کہ مجاہدین لبنان نے جاء الحق وزہق الباطل کی تفسیر کر کے دکھائی اور ثابت کر دیا کہ آج بھی مومنین کفار پر حاوی ہیں۔

ادارہ محترم سجاد رضوی صاحب کا تہہ دل سے مشکور ہے اور دُعاگو ہے کہ خداوند تعالےٰ ان کی توفیقات میں اضافہ فرمائے۔

ہماری شروع ہی سے کوشش رہی ہے کہ ہم قارئین کرام کو عالم اسلام کے تازہ حالات سے باخبر رکھیں اور دشمنانِ اسلام کی سازشوں سے آگاہ کرتے رہیں۔ خداوند تعالیٰ ہمیں توفیق دے کہ ہم اپنی سعی کو جاری رکھ سکیں۔

آپ کی آراء کا منتظر

ادارہ

Presented by Ziaraat.Com

مقدمہ مترجم

ڈاکٹر مصطفیٰ چمران شہید کی اس کتاب کا ترجمہ بہت پہلے ہو جانا چاہیئے تھا تاکہ وطن عزیز کا پڑھا لکھا طبقہ کچھ تو لبنان کے صحیح حالات سے واقفیت حاصل کرتا۔ لبنان کی موجودہ خانہ جنگی سے قبل ہمارے ملک کا پڑھا لکھا طبقہ لبنان کے نام سے آشنا تو تھا لیکن اس کے بارے میں تصوّرات بے حد غلط اور گمراہ کن تھے۔ اس میں قصور ان لوگوں کا تھا جو یورپ جاتے ہوئے یا یورپ سے واپسی پر دو ایک دن بیروت میں رک جاتے، از یتونہ کے علاقے کی نائٹ کلبوں اور معاملتین کے کازینو کا چکر لگا کر اپنے سامعین کے سامنے اپنی رومانوی فتوحات کا تذکرہ کچھ اس انداز سے کرتے کہ سننے والوں کے رال ٹپکنا شروع ہو جاتی لبنان کی خانہ جنگی کا ایک اچھا نتیجہ ہمارے اہل وطن کے لیے یہ نکلا ہے کہ انہیں لبنان کے صحیح حالات سے کچھ کچھ آگاہی حاصل ہونا شروع ہو گئی ہے۔ موجودہ خانہ جنگی اور فلسطینی جدوجہد کے آغاز میں ہمارے اخباروں نے لبنان کے ذکر سے اپنے کالموں کو پُر کیا اور لوگوں کی توجہ اس منطقے کی جانب مبذول ہوئی لیکن مغربی ذرائع ابلاغ کے وسیلے سے حاصل ہونے والی ان خبروں نے لبنان کی خانہ جنگی کا اصلی سبب اخبار بین طبقے کی نگاہوں سے اوجھل ہی رکھا مغرب سے نازل ہونے والی ان خبروں پر یہودی اور صیہونی اثرات کی چھاپ کوئی راز کی بات نہیں۔ یہ ذرائع ابلاغ تو صرف وہ خبریں اور اس رنگ کی خبریں ہمارے اخبارات تک پہنچنے دیتے جن میں ان کی اپنی مصلحت ہوتی اور ہمارے اخبارات کی "معصومیت" کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ اگر رائٹر کی خبر میں شام کے ہوائی جہازوں کو اسرائیلی بیان میں دشمن کے ہوائی جہاز لکھا گیا تھا تو ہمارے ہاں بھی انہیں دشمن کے ہوائی جہاز ہی لکھا گیا۔ ۱۹۸۵ء کے آغاز میں اخباروں میں خبریں چھپنا شروع ہوئیں کہ لبنان میں "شیعہ دہشت گردوں" نے "بیچارے نہتے امریکیوں" پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑ رکھے ہیں۔ اس ملک میں شیعہ بہت پہلے

Presented by Ziaraat.Com

سے موجود تھے اور ابتدائے ایام ہی سے مختلف طبقوں اور طاقتوں کی ستم رانیوں کا نشانہ بنتے رہے ہیں۔ ان خبروں کا واضح مقصد شیعوں کے خلاف نفرت کی فضا ہموار کرنا اور غیر شیعہ مسلمانوں میں ان کے بارے میں غلط جذبات پیدا کرنا ہے۔

بدقسمتی سے ہمارے کسی اخبار یا رسالے کا نمائندہ مشرق اوسط کے ممالک میں اور بالخصوص لبنان میں موجود نہیں تاکہ وہ اپنی آنکھوں دیکھی اور کانوں سنی باتیں پاکستان کے اخبار بین عوام تک پہنچا سکے بعض اوقات کسی اخبار کا کوئی نمائندہ عارضی طور پر اس علاقے میں چلا بھی جائے تو وہ عربی سے ناواقفیت کی بنا پر صرف ان لوگوں سے ملتا ہے جو انگریزی بول سکتے ہوں اور یوں وہ اصل حقائق تک نہیں پہنچ سکتا۔ بلکہ اُسے یہ بھی معلوم نہیں ہوتا کہ وُہ جس شخص سے بات کر رہا ہے، وہ مسلمان ہے یا عیسائی اور عیسائی ہے تو کس قسم کا عیسائی۔ وہ لبنانی ہے یا اس نے لبنانی شہریت اختیار کر رکھی ہے نتیجہ یہ ہے کہ یہ عارضی طور پر لبنان میں جانے والے صحافی ہمارے عوام تک وہاں کی صحیح خبریں پہنچانے سے قاصر رہتے ہیں۔

موجودہ کتاب ایک ایسے شخص کی کاوش زبان و بیان کا نتیجہ ہے جس نے امریکہ میں تعلیم حاصل کی، مصر کے فلسطینی کیمپوں میں گوریلا جنگ کا تجربہ حاصل کیا، الفتح کے پروگراموں میں شرکت اور پھر لبنان میں تقریباً آٹھ نو سال درس و تدریس کے علاوہ وہاں کے مظلوم عوام کی ابھرتی ہوئی تحریک میں حصّہ لیا اور اُس کی تشکیل و تربیت کی ذمہ داری قبول کی جو لبنان میں حرکۃ المحرومین کا عسکری پہلو ہے۔ اس کتاب میں جو باتیں ہیں وہ صرف کانوں سنی اور آنکھوں دیکھی ہی نہیں بلکہ تن بیتی بھی ہیں۔ یہ ایک ایسے باشعور مجاہد کے تاثرات و افکار کا مجموعہ ہے جس نے لبنان کے مسئلے کا نہ صرف گہرا مطالعہ کیا ہے۔ بلکہ لبنان میں برپا طوفان میں دل و جان سے کود کر وہاں کے عوام کی مدد بھی کی ہے۔

یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ اس کتاب کے پڑھنے سے لبنان کے حالات، ان کے پس منظر اور اُن کے اسباب کا سو فی صد سراغ لگ پائے گا۔ البتہ یہ بات ضرور ہے کہ اس کے مطالعے سے لبنانی صورت حالات کے بعض اہم اور پوشیدہ پہلو ضرور سامنے آجائیں گے جو اب تک نگاہوں سے اوجھل تھے اور شاید ان غلط فہمیوں کا یوں ازالہ ہو سکے جو ہمارے ہاں اکثر اوقات

موجود ہیں۔ مثال کے طور پر فلسطینی تحریک کے بارے میں ہمارا رویہ رومانیت پسند ہے۔ اور ہم اس بات سے آشنا نہیں کہ اس تحریک میں مخلص اور غیر مخلص عناصر موجود ہیں اور غیر مخلص عناصر غیر ملکی حکومتوں سے رقمیں وصول کر کے فلسطینی تحریک کو زک پہنچانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اُن کے مختلف اقدامات کا ہدف ہی یہ ہوتا ہے کہ عوام کی توجہ اپنی طرف مبذول کرائیں اور ان سے داد حاصل کریں، چاہے فلسطینی تحریک کو نقصان ہی پہنچ جائے۔ ہم لوگ پاکستان میں بیٹھ کر اس بات پر بہت خوش ہوتے ہیں کہ کسی نے فلاں ملک کا طیارہ اغوا کر لیا اور اسے بم سے اڑا دیا لیکن اس بات سے آگاہ نہیں ہوتے کہ اس کے نتائج کیا نکلیں گے۔ یاسر عرفات نے پوری کوشش کی تھی کہ فلسطینی گوریلوں کو لبنان کی خانہ جنگی میں الجھنے سے بچایا جائے تاکہ ان کی قوت اسرائیل کے خلاف صرف ہو لیکن یاسر عرفات کے مخالف عناصر نے اپنے آقایانِ ولی نعمت کے اشاروں پر ان گوریلوں کو لبنانی خانہ جنگی میں الجھانے میں کامیابی حاصل کر لی۔ اور اس کا نتیجہ جیسا کہ سب لوگ جانتے ہیں، یہ نکلا کہ لبنان میں فلسطینی مجاہدین کے بڑے بڑے کیمپ ختم ہو گئے، وہاں سے فلسطینی تحریک کا مرکز تیونس میں منتقل ہو گیا اور اسرائیل کی حکومت چین کی بنسری بجانے لگی، اس کتاب میں ان حالات کی تفصیل آپ کو ملے گی ان سے نتائج اخذ کرنا پڑھنے والوں کا کام ہے کیونکہ پڑھے لکھے ہونے کا ایک ہی فائدہ ہوتا ہے کہ انسان اپنی عقل سے کام لے کر نتائج اخذ کرتا ہے۔

مترجم نے اس کتاب کا ترجمہ کرتے ہوئے مختلف مقامات پر حاشیے تحریر کیے ہیں جو اُس کے اپنے دس سالہ قیام لبنان کے تأثرات پر مشتمل ہیں۔ کتاب کے آخر میں چند ضمیمے بھی شامل کر دیے گئے ہیں تاکہ قارئین کو اس کتاب کے دو مشہور کرداروں یعنی اس کے مصنف ڈاکٹر مصطفیٰ چمران شہید اور لبنان میں مسلمان تحریک کے عظیم رہنما سید موسیٰ الصدر کے بارے میں مزید معلومات حاصل ہو پائیں۔

امید ہے کہ قارئین اس کتاب کو ٹھنڈے دل و دماغ سے پڑھیں گے اور ان سے وہ نتائج اخذ کر پائیں گے جو مصنفِ کتاب حاصل کرنا چاہتے تھے۔

Presented by Ziaraat.Com

پیام آیت اللہ العظمیٰ سید روح اللہ الموسوی الخمینی

بمناسبت شہادت ڈاکٹر مصطفیٰ چمران

سردارِ پرافتخارِ اسلام، مجاہد بیدار اور متعہد راہ خدا ڈاکٹر مصطفیٰ چمران کی انسان ساز شہادت اور ان کے حضرت ولی العصر ارواحنا فداہ کے حضور حاضر ہونے کے موقع پر میں تعزیت بھی پیش کرتا ہوں اور ہدیۂ تبریک بھی۔ تعزیت اس لیے کہ ہماری شہید پرور قوم ایک ایسے سپاہی سے جدا ہو گئی ہے جس نے باطل کے خلاف نبرد آزمائی کر کے، چاہے وہ لبنان میں ہو یا ایران میں، شجاعت آفریں داستانیں تخلیق کی ہیں، ان کے مکاسب کے سرفہرست اسلام اور حقانیت کی باطل پر کامیابی تھی۔ وہ ایسے متقی، جنگجو اور متعہد معلم تھے کہ ہمارے ملک کو ان جیسے لوگوں کی بڑی شدید ضرورت تھی۔ مبارک باد اس لیے پیش کرتا ہوں کہ اسلام اپنے ایسے سربرآوردہ فرزندوں کو مستضعف اقوام اور عوام کی خدمت میں پیش کرتا ہے اور ایسی عظیم ہستیوں کو اپنے دامنِ تربیت کے سائے میں پروان چڑھاتا ہے اور یوں ثابت کرتا ہے کہ اس کی راہ میں زندہ رہنا عقیدہ اور جہاد سے عبارت ہے۔

چمرانِ عزیز نے اپنے پاک و خالص عقیدے کے ساتھ سیاسی گروہوں اور پارٹیوں سے وابستگی کے بغیر اپنے الٰہی مقصد پر عقیدے کے ساتھ زندگی کے آغاز میں اس کے لیے جہاد شروع کیا اور اسی پر زندگی کو ختم کر دیا۔ انہوں نے اپنی زندگی میں نورِ معرفت اور خدا سے پیوستگی کے ساتھ قدم اٹھائے، اسی کی راہ میں وہ جہاد کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے اور اپنی جان کو قربان کر دیا۔ وہ سربلند رہ کر زندہ رہے اور سرفراز رہ کر شہید ہوئے اور حق سے جا ملے۔

ہنر یہ ہے کہ انسان بغیر سیاسی شور و غوغا کے اور شیطانی خود نمائی کے صرف خدا کے لیے جہاد پر کھڑا ہو اور اپنی زندگی کو اپنے مقصد پر قربان کر دے نہ کہ اپنی خواہشات پر،

Presented by Ziaraat.Com

اور یہ ہنر مردانِ خدا کا خاصہ ہے۔

وہ اپنے خدائے بزرگ کے حضور میں باآبرو گئے۔ ان کی روح خوش رہے اور ان کی یاد سلامت رہے البتہ کیا ہم اس قابل ہو سکتے ہیں کہ ایسا ہنر ہمیں بھی حاصل ہو جائے یہ خدا ہی کی مرضی ہے کہ ہمارے ہاتھ پکڑے اور ہمیں جہالت و نفسانیت کی تاریکیوں سے نجات دے۔

میں ملتِ ایران کو، لبنان کو، بلکہ تمام مسلمان اقوام کو، حق کی راہ میں لڑنے والے نبرد آزماؤں کو مسلح افواج کو اور اپنے اس عزیز مجاہد اور محترم بھائی کے خاندان کو تعزیت پیش کرتا ہوں اور خداوند تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ انہیں اپنی رحمت سے نوازے اور ان کے قابلِ احترام پسماندگان کو صبر و اجر دے۔

روح اللہ الموسوی الخمینی

۲۲/ جون ۱۹۸۱ء

اس کتاب میں

ان دنوں لبنان میں جو کچھ ہو رہا ہے۔ اور ماضی میں جو کچھ ہو چکا ہے وہ بلاشک دنیائے اسلام کے لیے خاص اہمیت کا مالک ہے۔ اس اہمیت کے مختلف پہلو اس قابل ہیں کہ ان پر توجہ دی جائے اور ان کا جائزہ لیا جائے۔

لبنان اسرائیل کے تسلط میں آنے والی سرزمین کے ساتھ واقع ہے اور سوریا اور بحیرہ روم کی ہمسائگی میں ہے۔ اس وقت اس کی آبادی تقریباً تیس لاکھ ہے اور رقبہ تقریباً دس ہزار چار سو باون کلومیٹر مربع ہے۔ اپنے محل وقوع کے لحاظ سے یہ علاقہ خاصی سٹریٹیجک اہمیت کا حامل ہے۔ لبنان کا علاقہ بہت سرسبز، زرخیز اور خوبصورت ہے اور اقتصادی مصادر کے اعتبار سے بھی اہمیت کا مالک ہے۔

یہ ایک ایسا ملک ہے جس میں تقریباً سترہ مختلف فرقے مختلف ادیان و مذاہب سے متعلق یہاں رہتے ہیں۔ اس لحاظ سے یہ ملک مختلف افکار و خیالات کا نقطۂ اجتماع ہے اور اس کے ساتھ تمام دنیا کی خبروں کی نشر و اشاعت کا مرکز بھی۔ اسے دنیا کا دروازہ کہا جا سکتا ہے۔ ہر قسم کے افکار اور ہر قسم کی آئیڈیالوجی کو لبنان کے ذریعے سے تمام دنیا میں پھیلایا جا سکتا ہے۔

اردن میں ستمبر سیاہ ۱۹۶۷ء کے حوادث اور اردن کے بادشاہ حسین کے ہاتھوں فلسطینیوں کے کشت و خون کے بعد لبنان فلسطینی مزاحمت کا سب سے بڑا مرکز بن گیا اور چند سال میں لبنان کے بہت سے مناطق میں، خصوصاً جنوبی لبنان میں فلسطینی مزاحمت کی سیاسی، عسکری اور اقتصادی طاقت، لبنان کی حکومت یا لبنان کی دوسری طاقتوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ تھی۔ فلسطینی مزاحمت اور لبنانی شہریوں میں آپس میں اس قدر میل جول بڑھا ہے کہ بہت سی ایسی پارٹیاں وجود میں آ گئی ہیں۔ جن میں لبنانی اور فلسطینی برابر شریک ہیں۔ فلسطینی تنظیموں کی اکثریت میں بہت سے لبنانی ارکان بھی شامل ہیں۔

Presented by Ziaraat.Com

جنوبی لبنان کی سرزمین جس کو تاریخ میں جبل عامل کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، اسلام کے ابتدائی دور سے دنیا کے شیعوں کا مرکز اور بڑے شیعہ علماء کا وطن رہی ہے۔ اور اسی بناء پر اپنی پوری تاریخ میں یہ منطقہ خلفائے بنوامیہ و بنوعباس و خلفائے عثمانی اور دیگر حاکموں کے ظلم وستم کا شکار رہا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس علاقے کے شیعہ ہمیشہ ان حکومتوں سے ٹکر لیتے رہے ہیں اور یوں حاکموں کے ظلم وستم، بغض وعناد اور حسد وکدورت کا شکار رہے۔ اپنے علمی کارناموں اور لیے عظیم علماء کے باوجود یہاں کے لوگ فقر وفاقہ، بدنصیبی اور بے علمی کا شکار رہے ہیں جو اس ظلم وستم کا نتیجہ تھا جو حاکموں نے یہاں کے عوام پر روا رکھا۔

یہ ستم رسیدہ اور مستضعف شیعہ آخر کار اپنے پاؤں پر کھڑے ہوگئے اور انہوں نے لبنان میں ایک طوفان وہیجان پیدا کردیا جس نے اس ملک کی طاقتوں کے توازن کو بگاڑ دیا جس کے نتیجے میں اس انقلاب کو ختم کرنے کے لیے پے در پے سازشیں وجود میں آئیں اور آخر کار لبنان کے اندر دائیں اور بائیں بازو کی جماعتیں اور لبنان سے باہر اس مظلوم ومستضعف عوام کے دشمنوں یعنی اسرائیل اور امریکہ، کے مابین اتحاد ظہور پذیر ہوا اور انہوں نے مل کر اس ناتوان قوم کے نومولود انقلاب پر حملے کرنے شروع کیے اور اب ان کے وطن کو بھی ان سازشیوں نے اسرائیل کے تسلط میں دے دیا ہے۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ دنیا کی تاریخ کا یہ شرمناک باب نہ صرف امریکہ اور اسرائیل اور لبنان کی دائیں بازو کی جماعتوں (کتائب، وغیرہ) کے ہاتھوں ضبطِ تحریر میں آیا ہے بلکہ رجعت پسند عرب حکمرانوں نے بھی مسلمان ہونے اور فلسطینیوں کے دوست ہونے کے باوجود سازش وظلم وستم کے اس باب کو مکمل کرنے میں حصّہ لیا ہے اور تاریخ انسانیت میں اپنے لیے ننگِ ابدی حاصل کی ہے۔

لبنان کے حادثات کے جائزے، خصوصاً وہاں کے شیعوں کی جو بغیر کسی شک وشبہ کے ایرانی انقلاب کے عملی طور پر حامی ہیں موجودہ افسوسناک حالت کی تحریر اس وقت تک ممکن نہیں جب تک اس علاقے کی گذشتہ تاریخ، دورِ جدید میں یہاں کے باشندوں کی جدوجہد اور ان لوگوں کی اسلامی تحریک اور انقلابی سرگرمیوں کا مطالعہ نہ کیا جائے۔

مغرب کی استعماری طاقتوں بالخصوص امریکہ کو شیعیانِ لبنان کی اس تحریک سے، جس کا مقصد

اسلامی انقلاب کی راہ اختیار کرنا ہے جو اسلامی معیاروں کے مطابق حضرت علی علیہ السلام کے طریقہ کار کی پیروی میں اور شہادتِ حسین علیہ السلام کی راہِ سرخ پر چلنے کی اساس پر برپا ہے بے حد خوف وہراس ہو رہا ہے۔

موجودہ لبنان کا مسلمان معاشرہ بے حد مشکلات کا سامنا کر رہا ہے خصوصاً لبنانی شیعوں کا معاشرہ جو فکری، اقتصادی، سیاسی اور عقائدی بے سروسامانی کے وارث ہیں، کچھ زیادہ ہی مشکلات میں مبتلا ہیں جس کی بے سروسامانی صدیوں کے ظلم وستم کا نتیجہ ہے۔

ان مشکلات کا تجزیہ، ان کی اصل کا سراغ اور ان کی جزئیات کی تحقیق اور اس کے ساتھ ہی شیعیان لبنان کی گذشتہ تاریخ کا تجزیہ ایک ایسا موضوع ہے جس پر شاید بہت کم توجہ دی گئی ہو۔ یہ بات یقینی ہے کہ اب تک جو کچھ ہوچکا ہے وہ صرف واقعہ نگاری کی حد تک محدود ہے۔ اور یہ بات جس میں تاریخی تجزیہ نہ ہو، اسباب وعلل کی تلاش نہ ہو اور گہرا تحقیقی مطالعہ نہ ہو۔ اس واقعہ نگاری کو صرف داستان بنا کر پیش کرتی ہے۔

لبنان کے گذشتہ واقعات کا مطالعہ بھی ایک بے حد اہم کام ہے لیکن اس کے ساتھ مشکل بھی، اور ہر شخص کے بس کا روگ نہیں۔ اس سے وہی شخص عہدہ برآ ہو سکتا ہے جس نے ان واقعات کے ظاہر پر نظر ڈالنے کے ساتھ ساتھ ان کے اسباب وعلل کی طرف بھی توجہ کی ہو۔ یہ بات اس لحاظ سے خاص طور پر اہم ہے کہ کہیں پروپیگنڈے کے زیر اثر واقعات کی ظاہری شکل فریب نہ دے جائے اور انسان دنیا کی خبر رساں ایجنسیوں کی چڑیلوں کے دام میں گرفتار نہ ہو جائے جو حقائق کو برعکس پیش کرتی ہیں، رات کو دن بنا ڈالتی ہے اور سیاہی کو سفیدی کے روپ میں پیش کرتی ہیں۔ اس کے علاوہ یہ بھی ضروری ہے کہ ایسے شخص کو لبنان کے داخلی اور خارجی واقعات پر پوری اطلاع حاصل ہو اور وہ واقعات کو الگ الگ کر کے نہ دیکھے بلکہ ان کے تاریخی تسلسل کی کلیت اور اس کے تمام پہلوؤں کا جائزہ لے اور یوں اس فریضے کو ادا کرے جس کو اس نے اپنے ذمے لیا ہے۔

یہ کتاب ڈاکٹر مصطفیٰ چمران شہید کا ترکہ ہے اور ان اصولوں کے مطابق تدوین دی گئی ہے جن کا سطور بالا میں ذکر ہوا ہے۔ مزید برآں اس میں خلوص، صداقت اور غیر جانبداری کی آمیزش

Presented by Ziaraat.Com

بھی ہے ۔

ڈاکٹر چمران شہید لبنان میں اور ایران میں اس موضوع کے بارے میں بڑی کدوکاوش سے کام لیتے رہے کیونکہ اس کی حقیقت سب پر عیاں نہیں ۔ وہ کوشش کرتے رہے کہ لبنان کے حالات کو صراحت سے بیان کریں اور اس سلسلے میں انہوں نے اپنی بہت سی یادداشتیں اور تقریریں اپنی یادگار کے طور پر چھوڑیں ۔ یہ تقریریں اور یادداشتیں بلاشک بڑے اہم ، دقیق اور بے نظیر مطالب پر حاوی ہیں ۔ وہ ان حقائق پر سے پردہ اٹھاتے ہیں جو کسی تاریخ میں یا کسی کتاب میں پڑھنے کو نہیں ملتے ۔ وہ ان حوادث و واقعات کا اس انداز میں تجزیہ کرتے ہیں کہ استعماری طاقتوں کی خباثت اور مجرمانہ ذہنیت اور خود فروش سیاست پیشہ لوگوں اور بے ضمیر چھوؤں کے چہروں سے ان حوادث کے بیان میں نقاب اٹھ جاتی ہے ۔ یوں ڈاکٹر چمران نے اپنے تاریخی فریضے کو بڑی شائستگی سے ادا کیا ہے ۔ وہ شیعیان لبنان کی گذشتہ تاریخ کو بڑی گہری نظر سے دیکھتے ہیں ۔ ان کی موجودہ بدنصیبی کے اسباب و علل کا جائزہ لیتے ہیں اور بڑی وضاحت و صراحت کے ساتھ سب کے سامنے پیش کر دیتے ہیں ۔

ڈاکٹر چمران شہید خود بھی شیعیانِ لبنان کی موجودہ تاریخ کے بہت مؤثر اور تحریک آفریں عامل ہیں ۔ ہم یہ بلا مبالغہ کہہ سکتے ہیں کہ ہم ان جیسے کسی شخص کو حاصل نہیں کر سکتے ۔ جو ان کی طرح لبنان کے گذشتہ دس سالوں کے ان واقعات و حوادث کے زیر و بم سے پوری طرح آگاہ ہو ، جس نے وہاں کی اس انسان ساز تحریک میں حصہ لیا ہو اور جو اس قابل ہو کہ لبنان کے قضیئے کی جڑ تک پہنچ سکے ۔ اس لحاظ سے وہ بہترین شخص تھے جو لبنان کے ان حوادث میں خود موجود تھے اور جنہوں نے ان جرائم اور ظلم و ستم کو نزدیک سے دیکھا اور محسوس کیا جن سے وہاں کے شیعوں کو سابقہ پڑا تھا ۔

اس لحاظ سے ان کی تقریریں اور ان کی تحریریں ، دونوں بہترین تاریخی سند ہیں ۔ اس بناء پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ لبنان کے واقعات کی تہہ تک پہنچنا عام تاریخ نویسوں اور مختلف دھڑوں سے وابستہ اور سازشی سیاستدانوں کا کام نہیں بلکہ ڈاکٹر چمران کی تقریریں اور تحریریں جو صرف واقعات کے ظاہر کو نہیں دیکھتیں بلکہ ان کی جڑ تک پہنچنے کی کوشش کرتی ہیں ، ہر شخص کے لیے بہترین رہنما ہیں ۔ کیونکہ ڈاکٹر چمران سے زیادہ کوئی اور شخص ایسا نہیں جس نے ان واقعات کو یوں قریب سے دیکھا ہو اور

ان کے اسباب و علل پر غور کیا ہو ۔

ڈاکٹر مصطفیٰ چمران شہید دراصل اس لیے لبنان تشریف لے گئے تھے کہ وہاں اسلامی انقلابی تحریک کا آغاز فرمائیں اور یوں وہاں پر ایک ایسا مرکز قائم ہو جو استبداد و طاغوت ، سابق شاہ ایران اور اسرائیل کے خلاف جو ایک ہی سرچشمے سے طاقت حاصل کرتے ہیں ، کام کر سکیں ۔ اس بناء پر لبنان میں ان کی ساری سرگرمیاں تحریک کو چلانے اور مسلح جدوجہد کے سلسلے میں رہیں اور یہ سب تاریخ کا جزو ہیں ۔ یہ تحریک دوسری تحریکوں کے برخلاف تھی جس کی بناء پر وہ واقعات رونما ہوئے جو لبنان کی تاریخ اور اس کی سرنوشت پر بہت اثر ڈالنے کا باعث ہیں ۔

موجودہ کتاب براہ راست ان یادداشتوں پر جو چمران شہید نے لکھیں اور ان کی تقریروں پر مشتمل ہے جو انہوں نے لبنان کے بارے میں لبنان ، یورپ اور ایران میں کیں ان کو تاریخی لحاظ سے یکجا کیا گیا ہے ۔ ظاہر ہے کہ ایک یادداشت سے یا ایک تقریر سے یہ تمام مطالب واضح نہیں ہو سکتے لیکن ان تمام یادداشتوں اور تقریروں کو جن کی فہرست کتاب کے آخر میں موجود ہے دیکھ کر لبنان کے واقعات کا تجزیہ کر کے اسے ایک مربوط شکل دی جا سکتی ہے ۔

اس بناء پر اگر اس کتاب میں مطالب کے باہمی ربط میں کچھ گڑبڑ نظر آئے تو اس کا باعث چمران شہید نہیں بلکہ اس کام کی نوعیت کا مشکل ہونا اور کتاب کے مرتب کی کمزوری ہے ۔ ڈاکٹر چمران شہید نے تو ہر موضوع کو لے کر نہایت عمدہ طریق سے اس کا تجزیہ کیا ہے اور حقائق کو آشکار کیا ہے ۔ افسوس یہ ہے کہ یہ کتاب ڈاکٹر چمران شہید کی زندگی میں مرتب نہ کی جا سکی ورنہ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کی قدر و قیمت میں کہیں زیادہ اضافہ ہو چکا ہوتا ۔

جیسا کہ کہا جا چکا ہے ۔ یہ ساری یادداشتیں اور تقریریں یکے بعد دیگرے نہیں ہوئیں بلکہ ان کی تمام تحریروں کو اور تقریروں کو سامنے رکھ کر ان سے استفادہ کیا گیا ہے ۔ اسی لیے بعض مطالب یا بعض واقعات کے بارے میں نوٹ دے دیا گیا ہے کہ اس کی اصل تاریخ کیا تھی اور اسی لیے بعض اوقات کتاب کے متن میں بریکٹ کے اندر کوئی تحریر موجود ہے جس کا مقصد وضاحت کرنا ہے ۔

اس کتاب کے ان حصوں میں جہاں جہاں ڈاکٹر چمران شہید کی تقریروں سے استفادہ کیا گیا ہے ۔ وہاں تقریر کا اسلوب ظاہر ہوتا ہے کیونکہ ان حصوں کو ٹیپ سے بعینہٖ لکھا گیا ۔ اس لیے ان

Presented by Ziaraat.Com

کا انداز تحریری انداز سے مختلف ہے۔

ڈاکٹر مصطفیٰ چمران شہید کی خصوصیات میں سے سب سے اہم خصوصیت ان کی بے حد تواضع اور انکساری ہے اور ان کے قول و فعل کا خلوص ہے۔ اسی بنا پر اس امر کے باوصف وہ ان تمام حادثات میں شریک تھے تاہم انہوں نے اپنے اثر اور کام کا ذکر نہیں کیا جن سے لبنان اور تاریخ لبنان متاثر ہوئے ہیں۔ اس لیے اولاً تو یہ ممکن ہے کہ عام لوگ اس کتاب میں ڈاکٹر چمران شہید کے کارناموں کا صحیح اندازہ نہ کر پائیں اور ثانیاً چونکہ ڈاکٹر چمران شہید نے ہر جگہ اپنا ذکر بے حد کم کیا اور صرف وہیں کیا ہے جہاں اس سے گریز ممکن نہ تھا۔ وہ ہمیشہ اس بات کے قائل تھے کہ ان کے تمام اعمال اور ان کی تمام کارگذاریاں اللہ کی دین ہیں، اسی لیے اس بات کے باوصف کہ وہ ان تمام واقعات، اس ساری تاریخ مزاحمت اور ان تمام نبرد آزمائیوں کے ہیرو تھے تاہم انہوں نے اس کا اظہار نہیں کیا۔ لیکن اگر ہم چاہیں کہ ہم صداقتِ تاریخی کو ملحوظ رکھیں تو بلاشک ڈاکٹر چمران شہید کا اثر شیعیانِ لبنان کی فکری اور عملی رہنمائی میں بے حد اہم اور اساسی حیثیت رکھتا ہے اور ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ سید موسیٰ الصدر کی سیاسی اور عسکری رہنمائی، ان کی سوجھ بوجھ اور ان کے خلوص کے ساتھ ساتھ ان تمام تحریکوں اور سرگرمیوں، خصوصاً مزاحمت کے ولولہ آفریں واقعات میں ڈاکٹر چمران شہید ہی کا اثر نمایاں ہے۔ وہ اس قابل ہوئے ہیں کہ ایسے نمونے پیش کریں جن کی نظیر کم ملتی ہے اور جن کو پیش کرنا فقط ان لوگوں کے حصے میں ہے جو رسول اعظم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم امیرالمومنین علیہ السلام اور سید الشہداء امام حسین علیہ السلام کے نقشِ قدم پر چلتے ہیں۔ شہادت حسینی شیعوں کی رگوں میں خون کو گرماتی رہتی ہے اور جب کبھی سینوں میں اٹھنے والے اس طوفان کو منظم کر دیا گیا تو ان مظلوموں نے بڑی بڑی عسکری طاقتوں اور کرایے کے لڑنے والے بڑے بڑے گروہوں کا مقابلہ کیا ہے اور اسی صورت میں کیا ہے۔ جیسے کہ آج بے شمار شیعوں نے راہ شہادت حسینی اور خطِ عقیدۂ اسلامی کو استمرار بخش کر اپنی مظلومی کی لڑائی لڑ کر ظاہر کیا ہے۔

لبنان کے مظلوم شیعوں کے رہبر اور ان کے معنوی باپ سید موسیٰ الصدر مفقود الخبر ہیں اور یہ لوگ ڈاکٹر چمران کے قول کے مطابق یتیم ہو چکے ہیں۔ اب انہوں نے ڈاکٹر چمران شہید کو بھی ہاتھ سے کھو دیا ہے جو ان کی تحریک، جدوجہد اور بغاوت کا سرچشمہ اور اس کی روح رواں تھے لبنان کے

شدید مصیبت کرائے کے لوگوں کے ساتھ جو عراق کے پٹھو تھے اور دوسرے خود فروش گروہوں کے ساتھ مسلسل چپقلش میں رہے ہیں اور ایران کے اسلامی انقلاب کی کامیابی کے بعد اب تک سینکڑوں شہید پیش کر چکے ہیں۔ اسرائیل کے ایجنٹ سعد حداد، کتائب اور دائیں بازو کی جماعتوں نے ان کو اپنی خباثتوں کا نشانہ بنایا ہے اور ان کے خلاف بے شمار جرائم کا ارتکاب کیا ہے اور آخر اسرائیل کی طاقتور صیہونی حکومت نے ان لوگوں کو اپنی گولہ باری اور بمباری کا نشانہ بنایا اور اب نہ صرف جبل عامل کی مقدس سرزمین کو اپنے تسلط میں لے لیا ہے بلکہ بیروت تک کے تمام علاقے پر غاصبانہ قبضہ کیے ہوئے ہے۔ ان مظلوم و مقہور لوگوں کے گھر برباد کر دیئے گئے ہیں۔ انہیں قتل عام کا نشانہ بنایا گیا ہے اور اپنی طرف سے پوری کوشش کی ہے۔ کہ اس منطقے میں کوئی لبنانی باقی نہ رہے لیکن اس کے باوصف تاریخ کے یہ مظلوم لوگ خدائے بزرگ و برتر پر بھروسہ کر کے اس سے امید وابستہ کیے ہوئے ہیں اور اکیلے ہی جنگ آزما ہیں اور اس کے ساتھ انقلاب اسلامی ایران کی حتمی کامیابی اور امام امت خمینی بت شکن کی سلامتی اور طول عمر کے لیے دعاگو ہیں۔ فطری امر ہے کہ خداوندِ عالم کے بعد اگر انہیں امید کی کرن نظر آتی ہے تو صرف ایران میں جو واحد اسلامی انقلابی مملکت ہے۔ ہم امید کرتے ہیں کہ اس نازک مرحلے پر خداوندِ عالم ہمیں زیادہ توفیق دے کہ ہم تمام جدوجہد کرنے والے مستضعفوں اور خصوصاً شیعیانِ لبنان کی مدد کر سکیں جو انقلاب برپا کرنے کی سمت میں رواں ہیں۔

اس لحاظ سے ڈاکٹر چمران شہید کی کوششیں جو انہوں نے انقلابی تحریکوں کو چلاتے میں صرف کیں اور لبنان کے شیعوں اور محروم مسلمانوں کو اپنے پاؤں پر کھڑا کرنے کے لیے جو اقدام کیے وہ ناقابل فراموش ہیں۔ لیکن اس کے باوجود جب کوئی بات خود ان سے متعلق ہوتی ہے۔ تو وہ خاموشی اختیار کر لیتے ہیں اور اسی بنا پر بہت سے واقعات کو انہوں نے بیان ہی نہیں کیا اور ان کی تفصیل شاید ہمیں کوئی اور سنا سکے، یا پھر یہ بھی ممکن ہے کہ کسی اور شخص نے وہ واقعات دیکھے ہی نہ ہوں۔

اس کتاب کے متن میں ہمارے سنی بھائیوں کے بارے میں اور دیگر ادیان کے پیروؤں مثلاً عیسائیوں اور ارمنیوں کے بارے میں خاصی گفتگو موجود ہے۔ اس سلسلے میں یہ بات قابل توجہ ہے

Presented by Ziaraat.Com

کہ لبنان کے مختلف مذہبوں پر بات کرتے ہوئے یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ لبنان کے سنی مسلمان اور عیسائی بھی ایران میں ان کے ہم عقیدہ لوگوں کے ساتھ کوئی رابطہ نہیں رکھتے۔ خصوصاً لبنان کے سنی مسلمانوں کو ایران میں بسنے والے سنی مسلمانوں سے کسی قسم کا کوئی تعلق نہیں جو ایران کے دوسرے لوگوں کی طرح انقلاب کی تحریک کے ہر مرحلے پر شریک رہے ہیں۔ اسی طرح لبنان میں مذہبی فرقوں اور ان سے پیدا ہونے والے مسائل کو ایران کے پس منظر میں دیکھنا ممکن نہیں کیونکہ یہ وہ مسائل ہیں جو لبنان کے مخصوص حالات سے تعلق رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر چمران شہید نے خود بار بار اپنی تقریروں میں اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے تاکہ کسی قسم کی غلط فہمی نہ رہے اور تفرقے کو ہوا نہ ملے۔

دوسری اہم بات جو توجہ کے قابل ہے وہ ان یادداشتوں اور تقریروں کا وقت اور مقام ہے۔ بہت سی باتیں سیاسی تغیرات کے زیر اثر اس وقت بدل چکی ہوں گی اور بہت سے افراد، تنظیمیں اور جماعتیں شاید موجود ہی نہ ہوں، مثلاً افراد دہشت گردی کا شکار ہو چکے ہوں، یا افراد اور جماعتیں اپنا سیاسی موقف بدل چکی ہوں۔ یا اپنے بنیادی موقف سے ہٹ چکی ہوں۔ وہ سیاسی تغیرات وہ سیاسی رہنما جنہوں نے تحریک آزادیٔ فلسطین میں مقام حاصل کیا اور وہ جماعتیں یا تحریکیں جو لبنان میں ظاہر ہوئیں لیکن اس وقت جب ڈاکٹر چمران شہید ہو چکے تھے، ظاہر ہے کہ ان سے نہ اس کتاب میں کوئی بحث ہو سکتی ہے اور نہ اس بحث کا اس کتاب سے کوئی تعلق ہے۔ یہ اور بات ہے کہ تیز بین نگاہیں ڈاکٹر چمران کے پیش کردہ تجزیے اور واقعات سے فائدہ اٹھا کر اس علاقے کی سیاسی روش کے بارے میں کوئی پیش بینی کر سکیں یا اندازہ لگا سکیں۔

موجودہ کتاب ڈاکٹر چمران شہید کے اس تاریخی تجزیے پر مشتمل ہے جو انہوں نے لبنان کے ایک محروم گروہ کی شناخت اور ان کے علیؑ و حسینؑ کی راہ اختیار کر کے ایثار و شہادت کے نمونے پیش کرنے کے بارے میں پیش کیا ہے۔ اس بنا پر یہ کتاب اس قابل بن سکتی ہے کہ لبنان کے بارے میں ہمارے انداز فکر اور ہمارے اقدام کی بنیاد بن سکے۔ لیکن سب چیزوں سے بڑھ کر یہ کتاب اس علاقے میں اسلامی انقلابی تحریک کے خلاف بڑی بڑی سازشوں کو بے نقاب کرتی ہے۔

خداوندا! ہماری اس معمولی سی خدمت کو قبول فرما اور ہمیں بیشتر توفیق دے کہ ان افکار اور ان واقعات کو زیادہ سے زیادہ پھیلا سکیں جو ابھی تک مخفی ہیں۔ خداوندا! صحیح اسلام کی راہ میں شہید ہونے والے اور ایران پر ٹھونسی ہوئی جنگ میں جام شہادت پینے والے لوگوں کی روحوں کو شاد و خرم رکھ کر، بالخصوص ڈاکٹر مصطفیٰ چمران شہید کی روح پُرفتوح کو۔ خداوندا! ہمیں اپنی رحمت بے پایاں سے محروم نہ رکھ کر ہمیں توفیق عطا فرما کہ ہم بھی شہداء اور صدیقین کے زمرے میں شریک ہو سکیں۔

والسلام علیٰ من اتبع الہدیٰ

Presented by Ziaraat.Com

پیش لفظ

میں جبل عامل سے آیا ہوں۔ اس سرزمین سے آیا ہوں جہاں رسول اللہ کے دوست حضرت ابوذر غفاری رضوان اللہ علیہ نے پہلی بار اس علاقے کے لوگوں کو اسلام صحیح سے آشنا کیا اور ایک مسجد تعمیر کی جو اب بھی میس الجبل تک کے قصبے میں مسجد ابوذر کے نام سے مشہور ہے۔ جبل عامل تشیع کی سرزمین ہے، ولایت علی علیہ السّلام کی سرزمین ہے۔ شہید اول اور شہید ثانی اعلی اللہ مقامہما کی سرزمین ہے جو تاریخ تشیع کے درخشندہ باب ہیں۔ یہ سرزمین شیخ بہاالدین عاملی اور بزرگ ترین مفکرین اور دانشمندوں کی سرزمین ہے۔ جنہوں نے دنیا کو نور علم سے منور کیا۔

میں جبل عامل سے آیا ہوں جو اسلام کی گذشتہ چودہ سو سال کی تاریخ میں ہمیشہ مظلوم رہا جو ہمیشہ اموی، عباسی ترکی، مغربی استعمار اور آخرکار اسرائیل کے بغض وعناد اور غیض وغضب کا شکار رہا ہے۔ یہ سرزمین ہمیشہ سے ظلم وجور کے تازیانے سہتی رہی ہے اور ستم وتشدد کا نشانہ بنتی رہی ہے۔ ظالم وجابر اور ستمگر حکام کے ہاتھوں یہاں قتل عام ہوتے رہے ہیں اور استعمار پرستوں کے ذریعے سے اسے غلامی کا جوا اٹھانا لازم رہا ہے

میں شیعوں کی مقدس سرزمین جبل عامل سے آیا ہوں۔ میں جنوبی لبنان کے محروم ومستضعف لوگوں کا نمائندہ ہوں جو ہر روز اسرائیلی توپخانے اور ہوائی جہازوں کی چیرہ دستیوں کا شکار ہوتے ہیں۔ میں اس علاقے سے آیا ہوں جس کا نصف سے زائد حصہ بالکل تباہ ہو چکا ہے۔ یہاں ایسے قصبے ہیں جن کی ایک دیوار تک بھی سلامت نہیں، ایسے گاؤں ہیں جو رہنے والوں سے خالی ہیں۔ یہ وہ علاقے ہیں جو اسرائیل کے اور اس کے ایجنٹ سعد حداد کے سیاہ تسلط میں چلے گئے ہیں یہ ایک ایسا منطقہ ہے جس کے تین لاکھ سے زائد افراد بے گھر ہو چکے ہیں اور اس وقت اپنے برباد گھروں سے کہیں دور، بہت دور مدرسوں میں، مسجدوں کے آس پاس، گلی کوچوں میں زندگی کی ذلت کا بوجھ اٹھائے ہوئے ہیں۔

Presented by Ziaraat.Com

میں اس لیے آیا ہوں کہ شیعیان لبنان کی جنون بھری صدا کو ایران کی سرزمین میں سناؤں اور اس کی گونج پیدا کروں۔ میں اس لیے آیا ہوں کہ پابند وضع اور ذمہ دار افراد کے سوئے ہوئے شعور کو بیدار کروں۔ میں اس لیے آیا ہوں کہ درد و الم، ظلم و ستم، محرومی و بے چارگی، نالہ ہائے نیم شبی، آہ ہائے سحرگاہی، اشک یتیمانِ بے سرو سامان، بے آسرا و درماندوں کی فریاد، بیواؤں کے نالہ ہائے سرد، اور دل سوختہ لوگوں کے سینے میں دبی ہوئی آگ کی داستان بیان کروں۔ میں اس لیے آیا ہوں کہ سیاہ رات کے اس پردے کو جو گھنے بادلوں کی طرح ہماری قوم کے افکار پر چھایا ہوا ہے، چاک چاک کردوں اور شیعیان لبنان کے بارے میں تلخ حقائق اور دردناک واقعات بیان کروں۔ میں اس لیے آیا ہوں کہ ایک لاکھ مرنے والوں اور چار لاکھ زخمیوں کے بارے میں اطلاع دوں جن کی اکثریت شیعہ ہے۔ میں اس لیے آیا ہوں کہ جنوبی لبنان کے تین لاکھ خانماں برباد اور دربدر شیعوں کی داستان غم سناؤں جو دور دراز کے غاروں، برباد شدہ مکانوں کے کونوں کھدروں، سڑکوں کے کناروں، مدرسوں کے کونوں اور مسجدوں کی دیواروں تلے ایک کمبل میں گذر کر رہے ہیں۔ میں اس لیے آیا ہوں کہ اس دردناک داستان کو اس انداز میں آپ کے گوش گذار کروں جس میں کسی نے بیان نہ کیا ہو میں شکوہ و شکایت کرنے کے لیے نہیں آیا۔ وہ لوگ جو گذشتہ چودہ سو سال سے رنج و غم کے بوجھ کو برداشت کیے ہوئے ہیں وہ آج بھی تمام مشکلات کے باوصف اسے برداشت کر رہے ہیں

میں تو اس لیے آیا ہوں کہ دعا کروں کہ خداوند بزرگ و برتر انقلاب اسلامی ایران کو فتحیاب کرے میں اس لیے آیا ہوں کہ یہ آرزو کروں کہ حکومتِ اسلامی کی پشت پناہی میں عدل و عدالت کا دامن پھیلے۔ میں تو یہ امید کرنا چاہتا ہوں کہ اسرائیل اور دوسرے استعمار پرستوں کے ظلم و ستم کا تسلط ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نیست و نابود ہو جائے۔ میں اس لیے آیا ہوں کہ اپنی جان قربان کروں تاکہ اسلام کے مقدس پیغام کو کامیابی نصیب ہو اور کفر و جہالت و فساد کی بیخ کنی ہو سکے

میں اس لیے نہیں آیا کہ کوئی چیز مانگوں کیوں کہ جس شخص نے اپنا پورا وجود، اپنی پوری زندگی

اپنے مشن کی نذر کر دی ہو، وہ بے نیاز ہوتا ہے۔ میں اس لیے آیا ہوں کہ اپنے آپ کو اسلام کے مقدس مشن کی راہ میں قربان کر دوں تاکہ یہ مشن مکمل ہو سکے اور دنیا سے کفر، ظلم اور جہالت کی تاریکیاں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے دور ہو جائیں۔

میں اس لیے نہیں آیا کہ میں ان تہمتوں، افتراء پردازیوں، اذیتوں، تکلیفوں اور ظلم و ستم کا شکوہ کروں جو میرے ہم کیش لوگوں نے مجھ پر روا رکھے ہیں کیونکہ میں اپنی چودہ سو سالہ تاریخ کے دوران میں اس قسم کے ظلم و ستم کا عادی ہو چکا ہوں۔ میں نے اسی قسم کی بے انصافیوں کو برداشت کرنے کی خو ڈال رکھی ہے

میں ان مظلوموں، تشدد کا شکار لوگوں اور اسیروں کی چیخ ہوں جو تاریخ کے مختلف ادوار میں استعمار پرستوں، مصلحت بینوں اور منفعت خواہوں کے تشدد کا شکار ہو کر نیست و نابود ہو گئے ہیں۔

میں ان دل شکستہ یتیموں کی دلخراش فریاد ہوں جو رات کے اندھیروں میں بھوک کے مارے سو نہیں سکتے اور کسی ایسے دست شفقت کو نہیں پاتے جو انہیں تسلی دینے کے لیے ان کے سروں پر پھیرے۔ یہ یتیم تنہائی اور تاریکی سے ڈرتے ہیں لیکن کوئی محبت بھری گود نہیں جو انہیں پناہ دے سکے۔

میں وہ آہ سحرگاہی ہوں جو بیوہ عورتوں کے سینۂ پُرسوز سے نکلتی ہے اور نسیم سحری کی ہمراہی میں بیدار دلوں اور باشعور جذبوں کی تلاش میں ہر سو پھرتی ہے یہاں تک کہ تھک جاتی ہے اور اس کے قدم نہیں اُٹھتے۔ پھر وہ ناامیدی اور مایوسی کے ساتھ ایک آنسو میں تبدیل ہو جاتی ہے اور شبنم کی شکل میں کسی پتے کے دامن میں پناہ لے لیتی ہے۔

میں زندہ دلوں کی آرزو ہوں جنہیں عدل و انصاف کی تلاش ہے۔ میں اس دنیائے پُرستم سے گریزاں ہوں اور اس دن کی امید لگائے بیٹھا ہوں جس دن ظہور حضرت مہدی عجل اللہ فرجہ کے ساتھ عدل و انصاف اس منطقۂ وجود کو اپنے دامن میں لے لے اور ظلم و ستم اس جہان سے رخصت ہو جائیں۔ میں عاشقوں کے دلوں کی تمنا ہوں جو یہ چاہتے ہیں کہ تمام دنیا پر عشق و محبت کا راج ہو اور اس زمین سے بغض و کینہ و تعصب ناپید ہو جائیں۔ میں ان یتیموں کا آنسو ہوں جو ٹوٹے ہوئے دلوں کو تھامے چاروں طرف ماں باپ کی تلاش میں پھرتے ہیں لیکن جس قدر زیادہ

Presented by Ziaraat.Com

پھرتے ہیں اسی قدر کامیابی ان سے دور بھاگتی ہے۔ وائے وہ وقت جب کوئی یتیم روئے اور آسمان لرزہ براندام ہو جائے۔

میں شہیدوں کا خون ہوں جو دور دراز کے پہاڑوں، گہری کھڈوں اور دشت و صحرا کے دامنوں میں جاری ہے۔ میں نے اس دلِ پرسوز سے سبق حاصل کیے ہیں جو حق و صداقت کے لیے تڑپتا ہے اور عدل وانصاف کو برقرار رکھنے کے لیے جنگ آزما ہوتا ہے۔

میں آزاد مردوں کی جانبازیوں اور فداکاریوں کا گواہ ہوں۔ میں ان شہیدوں کا زندہ گواہ ہوں جنہوں نے اپنی پوری ہستی عاشقانہ انداز میں خدا کے سپرد کر دی ہے اور ابدیت کے ساتھ متصل ہو گئے ہیں۔ میں دنیا کے نوجوانوں کے ذہنوں کی آبیاری کرتا رہوں گا تاکہ وہ ظلم و ستم کے مقابل کھڑے ہو جائیں اور اس زمین میں وجودِ خدا پہ دلیل بنیں اور شہداء کے کاروان کو افتخار کو استمرار بخشیں۔

میں ہر روز اپنے بھائیوں میں سے ایک شہید کو اپنے کاندھے پر اٹھاتا ہوں اور قبرستان لے جاتا ہوں۔ ہر روز اسرائیل کی بمباری کی بناء پر گھر برباد ہوتے ہیں اور ان کا ساز و سامان آگ کی نذر ہوتا ہے۔ اسرائیل کے بمبار طیارے قتلِ عام کرتے ہیں اور جنوب کے شیعوں کو اس زندگی سے محروم کر دیتے ہیں۔"

لبنان کے شیعہ موت کے گھاٹ اتر جاتے ہیں لیکن کوئی شخص انہیں شہید شمار نہیں کرتا وہ فریاد کرتے ہیں لیکن انہیں کوئی فریاد رس نہیں ملتا وہ ظلم و ستم کے بوجھ تلے کچلے جاتے ہیں لیکن کسی کے شعور میں یہ بات نہیں آتی کہ ان پر ظلم کے پہاڑ ٹوٹ رہے ہیں۔

دوسری طرف سے ایک دنیا بھر کی دشمنی، کردار کشی، بغض و کینہ، تہمت تراشی، افترا پردازی اور افواہ سازی کا ایک طوفان ہے جو ہر جانب سے شیعوں پر وارد ہو رہا ہے۔ یہاں تک کہ انقلابی ایران میں بھی کچھ خفیہ ہاتھ شیعوں کے خلاف، ان کی واحد تنظیم امل کے خلاف کارگزاریوں میں مصروف ہیں۔ حقائق کو ایران کے لوگوں سے پوشیدہ رکھا جاتا ہے۔ شیعوں کو افواہوں، تہمتوں اور دروغ بافیوں کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ اور ان پر کیچڑ اچھالی جاتی ہے۔ کس قدر ظلم کی بات ہے!

بہت سے لوگ مجھ پر تہمت لگاتے ہیں کہ میرے خیالات بیرونی ممالک پر مرکوز ہیں اور

میں ایران کے مفادات اور مصلحتوں کو نظر انداز کر رہا ہوں۔ وہ یہ کہتے ہیں کہ مجھے اپنی تمام تر توجہ ایران پر مرکوز کرنا چاہیے اور لبنان اور دوسرے ملکوں کی باتیں کم کرنا چاہییں (اس کے جواب میں میں یہ کہتا ہوں) اولاً میری توجہ اور فکر ایران سے مربوط ہے، دوسرے ملکوں سے نہیں۔ میں اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہوں کہ ہمارے انقلاب کو بہت سے خطرے لاحق ہیں۔ اس لیے میں یہ باتیں جو بیان کرتا ہوں وہ ایران کی حمایت و پاسداری کے لیے ہیں۔

دوسرے یہ کہ میں نے آٹھ سال لبنان میں گذارے ہیں۔ یہ مدت بڑی خطرناک اور زندگی اور موت کی جنگ تھی۔ مجھے اس بات پر فخر ہے کہ میں نے لبنان میں سب سے بڑی عقائدی اور مکتبی تحریک کو منظم کیا ہے "حرکت محرومین" اور "تنظیم امل" جن کی بنیاد سید موسیٰ صدر نے رکھی تھی ان کی تنظیمی کاروائی میں سر فہرست تھی۔ میں لبنان اور مشرق اوسط کے ممالک کی انقلابی اور سیاسی کاروائیوں میں شریک رہا۔ میں کسی بھی شخص سے زیادہ اس منطقے کے حالات سے مطلع ہوں اور کسی بھی شخص سے زیادہ شیعوں کے مستقبل کی تعمیر میں مجھے دخل رہا ہے اور محروم شیعہ عوام پر جو ظلم ڈھائے گئے ہیں اور جس قسم کے جرائم ان کے خلاف عمل میں آئے ہیں، ان سے واقف ہوں اور اس بناء پر میرا دل شدید زخمی ہے۔"

اگر کوئی شخص یہ چاہے کہ لبنان، شیعیانِ لبنان اور سید موسیٰ صدر کے بارے میں کوئی چیز جانے تو میں ایسے لوگوں کیلئے بہترین ماخذ ہوں۔ مجھے تعجب ہوتا ہے جب میں یہ دیکھتا ہوں کہ بہت سے لوگ دائیں اور بائیں بازو سے مربوط اور غیر ملکی حکومتوں کے اجیر لوگوں کی تحریروں کے پیچھے بھاگتے ہیں تاکہ معلومات حاصل کریں اور مشکوک نیز بے عقیدہ لوگوں کو مستند سمجھتے ہیں، حالانکہ میں ان تمام واقعات کے درمیان سے گذرا ہوں اور ہر شخص سے زیادہ مجھے ان سے آگاہی حاصل ہے، مجھ سے کوئی بات نہیں کرتا۔

جب میں یہ دیکھتا ہوں کہ سازشیں برپا ہیں اور بہت سے مشکوک لوگ یہ چاہتے ہیں کہ شیعوں کے حقوق پامال ہوں، حق کو پوشیدہ رکھتے ہیں اور باطل کی طرفداری کرتے ہیں، تو اس وقت مجھے احساس ہوتا ہے۔ کہ خاموش رہنا جائز نہیں مجھ پر لازم ہے کہ میں حقیقت کو بیان کر دوں بالخصوص اس وقت جب آپ یہ دیکھیں کہ اسلام اور تشیع کے دشمن کتابوں پر کتابیں

Presented by Ziaraat.Com

لکھ رہے ہیں، افواہات پھیلاتے ہیں، تہمتیں تراشتے ہیں، تو پھر میرا مجبور ہونا لازم ہے کہ جواب میں کچھ کہوں۔

جو کچھ میں کہتا ہوں وہ مخالفین کی سرگرمیوں اور ان کی زبان درازیوں کا ایک سواں حصہ بھی نہیں۔ مجھے افسوس ہے کہ میرے پاس نہ وقت ہے کہ نہ فرصت کہ بیرونی حالات کے بارے میں اس سے زیادہ کچھ حقائق بیان کرسکوں۔

تیسری بات یہ ہے کہ بہت سے لوگ جان بوجھ کر یا نا سمجھی میں اس بات کے درپے ہیں کہ دوسرے ملکوں کے طرز روش یا دوسری تنظیموں کے اسلوب یا طریقۂ کار کو ہمارے سامنے ماڈل کے طور پر پیش کریں۔ وہ ان کو ترقی پسند، حمایتی اسلامی اور انقلابی حکومت کے نمونے اور انقلابِ ایران کے پشت پناہ کی حیثیت سے پیش کرتے ہیں۔ یہ بات دیکھنے میں آتی ہے کہ کچھ لوگ کچھ ضرورت سے زیادہ تیزی دکھاتے ہیں، ہمارے انقلاب میں غلطیاں نکالتے ہیں اور بیرونی ممالک کے نمونوں کو ہمارے انقلاب سے بہتر گردانتے ہیں۔ یہ بہت بڑا جرم ہے۔"

ایران کا مقدس اسلامی انقلاب اس قدر پاک وصاف اور خالص ہے کہ دوسرے لوگ اس کی تقلید کریں۔ نہ یہ دکھاوے کی انقلابی روشوں کو اور جھوٹ، مکر و فریب اور سیاست بازی کے

(بقیہ حاشیہ: سلے ڈاکٹر چمران کی یہ بات بے حد اہم ہے اور اس کا منبع امیرالمومنین علیہ السلام کا یہ قول ہے کہ "من رضی بفعل قوم فهو كالداخل فيه معهم وله اثمان اثم الفعل به واثم رضی به" یعنی جو شخص کسی قوم کے کسی فعل پر رضامندی کا اظہار کرتا ہے وہ گویا ان میں شامل ہے اور اس کے دو گناہ ہیں، ایک گناہ اس فعل بد کے ارتکاب کا، دوسرا گناہ اس پر رضامندی کے اظہار کا۔ دنیا کا طریقہ یہی ہے کہ اپنی مصلحتوں اور مفادات کے پیش نظر فعل بد کے ارتکاب پر خاموش رہتی ہے تاوقتیکہ اس کا اثر ان پر نہ پڑے۔ لیکن مردِ مومن کے لیے اظہارِ حق فریضہ بن جاتا ہے اس کی سیدھی سی مثال یہ ہے کہ جب عراق نے ایران پر حملہ کیا اور وحشیانہ طریقے سے خرم شہر، آبادان اور ہویزہ وغیرہ کو برباد کر دیا، اس وقت غیر مسلم ممالک کا تو ذکر ہی کیا، کسی مسلمان ملک نے الا ماشاءاللہ ایران کی حمایت میں ہمدردی کا اظہار بھی نہ کیا اور خاموش تماشائی بنے رہے اور اب تو اکثر یہی بات زیر بحث آتی ہے کہ جارح کون ہے؟! پاکستان کے ایک بہت بڑے عمامہ پوش عالم نے تو یہ بھی کہہ دیا ہے کہ انہیں یہ خبر ہی نہیں کہ حملہ آور عراق تھا یا نہیں لیکن یہ روش طریق علوی نہیں چاہے دعویٰ کرنے والے اس کا دعویٰ کریں)

طریقے ہم پر ٹھونسے۔ ایسی روشوں کی نشاندہی، ان کے طریقۂ کار اور ان کے حقائق سے پردہ اٹھانا میرا فرض ہے۔ میں نے سالہا سال ان پیشہ ور سیاستدانوں کے ساتھ وقت گذارا ہے۔ اور ان کی سازشوں کے خلاف اُٹھ کھڑا ہوا ہوں اور اب خدا سے میری یہی درخواست ہے کہ وہ اسلام کی عقائدی روش پر چلنے میں ہمیں کامیاب کرے۔

Presented by Ziaraat.Com

باب اوّل

بِسمِ اللہِ الرَّحمٰنِ الرَّحِیمِ

جنوبی لبنان

تشیع کا مرکز۔ جبلِ عامل

ایک زمانے میں میں اپنے آپ سے پوچھا کرتا تھا کہ یہ بات کیوں کر ممکن ہے کہ حضرت علی علیہ السلام، اسلام، عدالت اور حق کا مظہر ہوں اور ان کی اپنی تابناک شخصیت اور اعلیٰ ترین انسانی صفات اور قابلِ فخر ماضی کے باوجود ان کے مقابلے میں خانوادۂ ابوسفیان کا پروپیگنڈہ زیادہ مؤثر ہو اور لوگ ان کے بارے میں شکوک و شبہات کا شکار ہوں اور سالہا سال تک مسجدوں کے منبروں پر جمعوں کے خطبوں میں ان پر سب و شتم روا رکھا جائے اور سننے والے خاموشی سے وہ سب باتیں سنتے رہیں اور انھیں قبول کر لیں۔ ایسی بات کیوں کر ممکن ہے۔ اس کا جواب تلاش کرنے سے میں عاجز تھا۔ لیکن اب ایک زندہ تجربے کی بھٹی سے میں یوں باہر نکلا ہوں کہ میرے جسم کا رواں رواں اس بات کو محسوس کر رہا ہے کہ ایسا ہونا کیوں کر ممکن ہوا کہ خانوادۂ ابوسفیان طاقت، روپے پیسے، تہمت تراشی، دروغ بافی اور فریب کاری کے ذریعہ سے ایک مدت تک لوگوں کی عقلوں اور ان کے افکار پر مسلّط رہا۔ ان کے سامنے حضرت علی علیہ السلام کو کافر کے طور پر پیش کیا جائے اور امام حسین علیہ السلام کو دین سے خارج گردانا جائے اور ناسمجھ لوگ اس فریب کو قبول کر لیں۔

Presented by Ziaraat.Com

لبنان ایک زندہ تجربہ:

یہ زندہ تجربہ لبنان تھا۔

زمانے نے مجھے بے شمار سبق دیے ہیں۔ میں زندگی کے معرکوں میں شریک رہا۔ ایسے سخت اور خطرناک معرکے جن میں انسان کی عزت و آبرو، ایمان اور ارادہ آزمائش کی کسوٹی پر پرکھا جاتا ہے۔ کیسی کیسی سخت آزمائشیں میرے سامنے آئیں، سچ یہ ہے کہ دُنیا جد و جہد اور امتحان کی ایک سٹیج ہے اور یہ بھی سچ ہے کہ بہت کم لوگ ایسے ہوتے ہیں جو زندگی کی ان آزمائشوں میں سرخرو ہو سکیں اور خدا کا شکر ہے کہ میں نے اپنی زندگی میں کسی آزمائش سے فرار نہیں کیا اور کسی وحشتناک معرکے سے منہ نہیں موڑا۔ غم و الم کو برداشت کرنا، شکستوں کا تحمل کرنا اور مشکلات کا سامنا کرنا آسان کام نہ تھا لیکن خدا کی مرضی یہی تھی کہ وہ زندگی کی اس گزرگاہ میں مجھے پروان چڑھائے اور میری قوتِ برداشت کو معراج پر پہنچا دے۔

خدائے بزرگ و برتر نے مجھے آتشِ عشق و محبت میں جلایا اور میرے دل کو نئی اقدار اور نئے معیاروں سے آشنا کیا۔ عادی اور شخصی خواہشات میری نگاہ میں پست ہوگئیں۔ ایک زمانہ گزرا ہے کہ میں نے دُنیا اور مافیہا کو تین طلاقیں دے دیں اور اپنے آپ کو ہر چیز سے بے نیاز کر کے موت کے استقبال میں کشادہ بازوؤں کے ساتھ چلا گیا۔ ان شدید امتحانات میں میری کامیابی کا سنگِ بنیاد شاید یہی دو چیزیں تھیں عشق اور بے نیازی، عشق خدا کے ساتھ اور بے نیازی ہر چیز سے۔ اس وقت میں ناداری اور ناطاقتی میں گرفتار ہو گیا۔

میں اس حالت میں بھی اپنی بے پناہ استعداد سے استفادہ کرنا چاہتا ہوں جب مجھ پر موت سایہ فگن ہو، جب تمام دشمن میرے قتل کا ارادہ کیے ہوں، جب کفر و جہالت اور ظلمت کی تاریکیاں مجھ پر سایہ فگن ہوں، جب زمین و آسمان میرے خلاف نبرد آزما ہوں اور میرے دوستوں کی اکثریت یا تو مجھے چھوڑ جائے اور یا پھر

خاموش ہو جائے۔ اس حالت میں بھی میری خواہش یہی ہوتی ہے کہ میں اپنی صلاحیت کو کام میں لاؤں۔ لیکن فقر و ناداری کے قید خانے میں محبوس ہوں اور اس وقت میرے لیے یہی طریقہ ہے کہ اپنی نگاہیں پردۂ غیب پر گاڑ دوں، دل کو خدا کے حوالے کروں اور باقی ہر چیز سے اپنے آپ کو الگ کر لوں۔

یہ فقر اور ناچیزی بہترین دولت تھی جو خداوندِ عالم نے مجھے ارزانی فرمائی۔ اس نے میری ہمت اور ارادے کو اس قدر بلند کیا کہ زمین و آسمان میری نگاہ میں حقیر ہو گئے۔ جب کوئی شہید اپنا پاکیزہ خون میرے سپرد کر دیتا ہے اور ناداری مجھے یہ اجازت نہیں دیتی کہ اس کے یتیموں کی پرورش کروں، جب کوئی زخمی اپنی زندگی کے آخری لمحات میں میری طرف دیکھتا ہے اور اس کی نگاہیں مجھ سے امداد طلب کرتی ہیں اور میں دل ہی دل میں کڑھتا ہوں اور پانی پانی ہو جاتا ہوں کہ مجھ میں اس کی مدد کرنے کی قدرت نہیں، جب شدید خون ریز لڑائی میں ایک بہادر جنگ آزما مورچے میں اس حالت میں بیٹھا ہو، کہ بھوک کی وجہ سے اس کا پیٹ کمر سے لگ چکا ہو اور اس قابل نہ ہو کہ پانی کا ایک گھونٹ بھی اپنے گلے سے اُتار سکے، اس وقت میں ان سب چیزوں کو دیکھتا ہوں اور صبر کرتا ہوں۔ اس کے علاوہ ناداری اور فقر سے نہ تو مجھے کوئی ڈر لگتا ہے اور نہ وحشت آتی ہے میں نے اس آہنی قفس کو توڑ دیا ہے۔ مجھ میں احساسِ بے نیازی اس قدر بڑھ گیا ہے کہ شدید ترین مصیبت کے وقت بھی اور کچل دینے والے حملوں کے دوران میں بھی کسی شخص سے نہ مدد مانگتا ہوں نہ فریاد کرتا ہوں، حتیٰ کہ آہ تک بھی نہیں کھینچتا۔ میں دُنیا کے فقر میں اس قدر آگے بڑھ گیا کہ گویا مطلق بے نیازی کی منزل میرے سامنے ہے۔ اب اگر میں ان درد آلود کلمات کو اپنے زخمی دل سے نکال رہا ہوں تو صرف اس لیے کہ خطرات کا زمانہ میرے لیے سپر بن چکا ہے، امتحان اپنے آخری لمحات کو پہنچ چکا ہے، ناداری اور محتاجی کی کمر ٹوٹ چکی ہے اور ہمت و ارادہ کامرانی سے ہم آغوش ہو چکے ہیں۔

خداوندِ بزرگ و برتر نے مجھے غم و الم کے دریا کی شناوری سے بہرہ یاب کیا ہے اور ہر جانب سے آنے والے طوفانِ حوادث میں استقامت بخشی، تنہائی اور محرومی کے صحرا میں

Presented by Ziaraat.Com

میرے وجود کو پاک و صاف کر دیا اور میرے دل کو جلا بخش دی ہے۔ بعض اوقات جب میں ماضی کے بارے میں سوچتا ہوں تو اپنے آپ سے پوچھتا ہوں کہ یہ بات کیوں کر ممکن ہے کہ ان تمام خطرات سے گزرنے کے باوصف ابھی تک زندہ ہوں۔ گولیوں کی بارش میں اور بموں کے دھماکوں میں سے گزروں، ہمیشہ دریائے موت میں غوطے لگاؤں، کمین گاہ میں بیٹھے ہوئے دشمن ہمیشہ مجھے نشانہ بنائیں، اور ان تمام باتوں کے باوجود میں زندہ رہوں۔ یہ کیا راز ہے؟ تقدیر نے میرے ساتھ اس قدر لطف و کرم کیوں روا رکھا ہے؟ اس کے جواب میں میں سوچتا ہوں کہ یہ مشیّتِ ایزدی تھی کہ خداوندِ عالم نے مجھے ان کڑے امتحانوں کے لیے تیار کیا۔ اگر میں پہلے سے تیار نہ ہوتا تو ناممکن تھا کہ اس کڑی آزمائش کو برداشت کر سکتا۔ اب پہلی بار مجھے یہ احساس ہو رہا ہے کہ میری تمام پوشیدہ صلاحیتیں میرے تمام تجربات اور میری تمام ہستی کم از کم بعض مخصوص اوقات میں کام میں آئی ہے اور میں اس قابل ہوا ہوں کہ کلمۂ حق کو بلند کروں اور کردارِ الٰہی کا مظہر بن سکوں۔ ظلم و ستم، تہمت تراشی دروغ بافی، دشمنی و کینہ پروری، حیلہ جوئی اور پستی و رذالت کے بے رحم طوفانوں کا مقابلہ کروں اور ظلم و کفر و جہالت کے مقابلے میں سرِ تسلیم خم نہ کروں۔ زمین و آسمان مجھے اپنی گرفت میں لے لیں اور نجات کی کوئی راہ باقی نہ رہے، اس وقت اپنے آپ کو دامنِ شہادت میں پناہ دوں تاکہ حسینؑ کا عَلَم سربلند رہے۔

یہ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں تاریخ نہیں ہے کیونکہ اس کے لیے میرے پاس فرصت ہی نہیں بلکہ یہ تو لبنان کے دردناک حادثات کا تجزیہ و تحلیل ہے۔ جیسا کہ میں نے سُنا ہے، سفیانی پروپیگنڈے کی مشینری نے افکار کو پریشان کر دیا ہے اور حقائق کو بالکل الٹ کر رکھ دیا ہے اور دوستوں کو بھی شکست و شکوک و شبہات کا نشانہ بنایا ہے۔

لبنان کا محلِّ وقوع اور جبلِ عامل:

لبنان ایک چھوٹا سا ملک ہے جو بحیرۂ روم کے کنارے سوریا (شام) اور مقبوضہ فلسطین کے مابین واقع ہے۔ یہاں مختلف قسم کے گروہ، مختلف مذاہب کے ساتھ

زندگی بسر کرتے ہیں۔ لبنان کے شیعہ زیادہ تر اس منطقے میں آباد ہیں جو جبلِ عامل کہلاتا ہے[1]۔ یہ منطقہ تاریخی طور پر شرقِ اوسط کا مقدس ترین علاقہ ہے۔ جبلِ عامل کی حدود فلسطین سے ملتی ہیں۔ یہاں بے شمار نبیوںؑ نے جنم لیا اور وحی الٰہی نے اس کو اپنا مرکز بنایا۔ اسلام اس علاقے میں جناب سرورِ کائناتؐ صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کے جلیل القدر صحابی حضرت ابوذر غفاریؓ کی کوششوں سے پھیلا۔ انھوں نے ایک مسجد بھی بنوائی جو آج بھی جبلِ عامل کے شہر "میس الجبل" میں مسجدِ ابوذرؓ[2] کے نام سے مشہور ہے۔ میں نے یہاں نماز پڑھنے کا شرف حاصل کیا ہے۔ افسوس ہے کہ آج یہ مسجد مقبوضہ فلسطین کے صہیونی حکمرانوں اور ان کے کاسہ لیس ایجنٹ سعد حدّاد کے تسلّط میں ہے۔ یہ منطقہ شیعہ مناطق میں شمار ہوتا ہے جسے آج غاصبوں نے تسخیر کر لیا ہے۔ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کی وساطت سے پیغامِ مصطفویؐ اور اسلامِ صحیح جنوبی لبنان میں پہنچا اور حضرت ابوذر غفاریؓ کی زبانِ پاک ہی سے اس علاقے کے لوگوں کے دلوں میں محبتِ علی علیہ السلام کی شمع روشن ہوئی۔ اس بنا پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ جبلِ عامل کا علاقہ جنوبی لبنان میں وہ پہلا خطّہ ہے جہاں شیعانِ حیدرِ کرّار نے سکونت اختیار کی اور یہ سب کچھ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ

---

[1] جبلِ عامل کا منطقہ بیروت سے کوئی پچاس کیلومیٹر جنوب کی طرف سے شروع ہوتا ہے اور فلسطین کی سرحدوں تک پھیلا ہوا ہے۔ مشرق میں اس کی حدود سوریا سے جاملتی ہیں۔ یہ علاقہ خالص پہاڑی علاقہ ہے۔ اس کے پہاڑ شمال مشرق لبنان میں وادی بقاع کو اپنی آغوش میں لیے ہوئے ہیں جس کا مشہور شہر بعلبک اپنی تاریخی حیثیت سے معروف ہے۔ پہاڑی علاقہ پھلوں، سبزیوں اور تمباکو کی کاشت کے لیے مشہور ہے۔ لبنان کا سارا تمباکو اسی منطقہ میں پیدا ہوتا ہے۔ اس تمباکو کی خرید و فروخت کا ٹھیکہ ایک فرانسیسی کمپنی نے لے رکھا ہے۔ ان کمپنی کی اجارہ داری نے اس علاقے کے مزارعین کو ایک عرصے سے کچل رکھا ہے۔ بقاع کی وادی پھلوں، سبزیوں، مرغیوں اور مویشیوں کے فارموں کے لیے مشہور ہے۔ لبنان کا مشہور دریا لیطانی اسی منطقہ کو سیراب کرتا ہے جس کی ایک شاخ دریائے اردن میں جاملتی ہے اور ایک شاخ شہر صور (Tyre) سے ۵ کیلومیٹر شمال میں سمندر میں جاگرتی ہے۔ (مترجم)

[2] حضرت ابوذرؓ کی قائم کردہ ایک اور مسجد صیدا اور صور کے شہروں کے مابین بیروت سے کوئی ۵۵ کیلومیٹر جنوب میں سرفند میں بھی واقع ہے۔

Presented by Ziaraat.Com

کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔

جبلِ عامل کے شیعوں پر ظلم :

آپ کو معلوم ہے کہ معاویہ نے ایک طویل مدت تک ملک شام پر حکومت کی اور بنو امیّہ اور بنو عبّاس نے سادات پر اور شیعانِ علیؑ پر ظلم و ستم رَوا رکھے۔ وہ جبلِ عامل کے منطقے میں دوسرے تمام مقامات سے کہیں زیادہ تھے۔ شیعوں کو دیواروں میں چُنوا دیا جاتا تھا اور ستونوں میں دفن کر دیا جاتا تھا۔ بعض اوقات شیعوں کا قتلِ عام بھی شروع ہو جاتا تھا۔ آج بھی اگر ہم جنوبی لبنان میں سفر کریں تو دیکھ سکتے ہیں کہ تمام گاؤں، پہاڑوں کی چوٹیوں پر بنائے گئے ہیں تاکہ اگر دشمن حملہ کرے تو اپنی حفاظت کی جا سکے۔

مسلکِ تشیع میں امامِ زمانہ عجل اللہ فرجہ کے عام نائبین میں دو بزرگ شخصیتیں نظر آتی ہیں یعنی شہیدِ اوّل اور شہیدِ ثانی۔ یہ دونوں بزرگوار جنوبی لبنان کے منطقہ جبلِ عامل سے تعلق رکھتے تھے۔ ان میں سے ایک کو زندہ جلا دیا گیا اور ان کی خاک کو منتشر کر دیا گیا اور دوسرے بزرگوار کو جنوبی لبنان کے ایک شہر جباع میں دفن کیا گیا جہاں ان کا مزار آج مرجعِ خلائق ہے۔

جبلِ عامل کا منطقہ فلسطین اور قدس سے مربوط ہے۔ یہ وہ منطقہ ہے جہاں بہت سے پیمبروںؑ پر وحی نازل ہوئی۔ جبلِ عامل کے گوشے گوشے میں ماضی کے مختلف نبیوں کے مزار ملتے ہیں۔ جس طرح ایران میں امام زادوں کے مزار ہیں اسی طرح اس منطقے میں انبیاءؑ کے مقبرے ہیں۔ صور کے نزدیک ایک غار ہے جس کا نام غارِ مسیح ہے۔ اس غار میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام عیسیٰ تک پوشیدہ رہے تاکہ دشمنوں کے شر سے محفوظ رہیں۔

فلسطین کی طرح جبلِ عامل کا علاقہ بھی ابتدائے ایّام سے مہبطِ وحی رہا ہے۔ ظہورِ اسلام کے بعد یہ تشیع کا مرکز بنا اور بزرگ ترین شیعہ دانشوروں اور رہبروں کا مسکن جبلِ عامل کے انھی علماء میں سے ایک بزرگ ایران تشریف لائے اور وہاں انھوں نے شہرت حاصل کی۔ یہ بزرگ شیخ بہاء الدین عاملی ہیں کہ صفوی دَور میں ایران تشریف لائے اور

وہاں مشہورِ خاص و عام ہوئے۔ اصفہان میں ایک مشہور حمام، ایک مینارِ لرزاں اور بعض دوسری چیزیں آج بھی اُن کی یاد دلاتی ہیں۔ شیعہ اہلِ علم کہ ہمیشہ ظلم و ستم کا نشانہ بنتے رہے یہی کوشش کرتے تھے کہ دشمن سے ٹکّر نہ لیں۔ صفوی دَور میں جب ایران میں مسلکِ تشیع نے رواج حاصل کیا، ان میں کی ایک بڑی تعداد نے ایران کو ہجرت کی۔ انھی میں شیخ بہاء الدین عاملی تھے۔ ان کے ہمراہ بہت سے لوگ ایران آئے اور وہاں شائستہ خدمات انجام دیں۔

یہ ظلم و ستم جو گذشتہ چودہ سو سال کے دوران میں لبنان کے مظلوم و محروم شیعوں پر رَوا رکھا گیا ہے، یہ ظلم و ستم اس دَور میں بھی جاری رہا ہے۔ بنی اُمیّہ اور بنو عبّاس کے برسرِ اقتدار آنے سے ترکانِ عثمانی کے دورِ حکومت کے خاتمے تک یہ ظلم و ستم برابر جاری رہا۔ ایک مشہور ترک گورنر احمد پاشا جزار نے جو لبنان اور فلسطین پر حاکم تھا، جنوبی لبنان کے شیعوں کے قتلِ عام کا حکم صادر کیا۔ ایک ہفتے کے لیے جو شیعہ پایا گیا اسے تہِ تیغ کر دیا گیا۔ اس کے بعد اس کے کارندوں نے شیعہ علماء کی کتابیں جمع کیں اور شہر عکہ میں جو احمد پاشا جزار کا پایہ تخت تھا لے گئے۔ کافی مدّت تک شہر عکہ کے حمام اور تنور ان کتابوں کی آگ سے گرم ہوتے رہے۔ اس بات سے ایک طرف تو منطقہ جبلِ عامل کے شیعوں کے علمی ذوق و شوق کا سراغ ملتا ہے اور دوسری طرف اس ظلم و ستم کا پتہ چلتا ہے جو شیعہ دشمن عناصر نے ان بدنصیب لوگوں پر روا رکھے۔ یہ بات یاد رکھنا چاہیے کہ صلاح الدین ایوبی کے بہترین سپاہیوں میں لبنان کے شیعہ تھے۔ صلاح الدین ایوبی نے صلیبیوں سے جنگیں لڑیں فلسطین کے علاقے کو ان سے پاک کیا اور ہماری تاریخ میں اپنی جلالتِ قدر اور پاکبازی کے لیے نام حاصل کیا۔ لبنان کے شیعوں نے صلیبیوں سے جنگیں لڑیں اور انھیں شکست دی لیکن صلاح الدین ایوبی نے شیعوں کی اس شجاعت سے حسد کا اظہار کیا اور وہ ان سے اس حد تک ڈرا کہ عیسائیوں پر فتح حاصل کرنے کے بعد شیعوں کے قتلِ عام کا حکم دیا۔ جبلِ عامل کے علاقے میں شیعوں کے اس قدر قتلِ عام ہوئے ہیں کہ تاریخ کو ان کے ذکر سے شرم آتی ہے۔

Presented by Ziaraat.Com

بحیثیتِ مجموعی اس علاقے کے شیعہ اپنے زمانے کے حاکموں کے ظلم و ستم کے خلاف ہمیشہ نبرد آزما رہے، انھوں نے ان حکومتوں کے سامنے سرِ تسلیم خم نہ کیا اور یوں ہمیشہ حکام کی نفرت اور ان کے بغض و کینہ کا شکار رہے۔ انھیں کافر و رافضی کہا گیا اور دم دار حیوان ان کا لقب ٹھہرا۔ انھوں نے ہمیشہ بے رحمانہ قتلِ عام اپنے شہروں اور قریوں کی بربادی، اپنے کتاب خانوں اور علمی مراکز کی آتش زدگی کو برداشت کیا۔

جاگیردارانہ نظام کا قیام:

اب جب کہ بات عثمانی ترکوں کی حکومت کی ہو رہی ہے، یہ کہ دینا مناسب ہو گا کہ پہلی جنگِ عظیم میں ترکی کے عثمانی حکمرانوں کو یورپ میں جنگ لڑنے کے لیے سپاہیوں کی ضرورت تھی۔ چونکہ سپاہی میدانِ جنگ میں جانے سے انکار کرتے تھے کہ انھیں معلوم تھا کہ وہ یورپ میں نشانۂ مرگ بن جائیں گے، ترکی کی حکومت نے فرمان جاری کیا، کہ شیعوں کو جبری طور پر فوج میں بھرتی کیا جائے اور انھیں بلقان اور یورپ کے سب محاذوں پر روانہ کیا جائے۔ اس وقت یہ بات روشن ہوئی کہ جو شخص محاذِ جنگ پر جاتا ہے، لوٹ کر نہیں آتا۔ کچھ مدت کے بعد سب لوگوں کو اس بات کا احساس ہوا اس بناء پر شیعوں نے ترکی کے حکمرانوں پر زور ڈالا اور کہا کہ کس بنیاد پر صرف شیعوں کو ہی محاذِ جنگ پر بھیجا جا رہا ہے اور دوسرے فرقے کے لوگوں کو معاف کر دیا جاتا ہے۔ آخر کار ترکی کی حکومت اس بات پر راضی ہو گئی کہ ہر شخص جو محاذِ جنگ پر نہ جانا چاہے ۷۵ دینار جرمانہ ادا کرے اور یوں لڑائی میں شریک ہونے سے معافی حاصل کر لے۔ آپ اس بات سے بخوبی واقف ہیں کہ اس زمانے میں اور پہلی جنگِ عظیم کے دوران میں ۷۵ دینار خاصی رقم ہوتی تھی اور ایک شیعہ کسان کا بیٹا یہ رقم حکومت کو مہیا نہ کر سکتا تھا کہ معافی حاصل کر لے۔ اس بناء پر وہ اپنی زمینیں بیچتے تھے اور مالدار لوگ یہ زمینیں خرید لیتے تھے۔ یوں آہستہ آہستہ ایک جاگیردارانہ نظام پیدا ہوا اور بدنصیب و بے دست و پا لوگوں نے ان جاگیرداروں کی زمینوں پر کام کرنا شروع کر دیا۔ مالدار لوگ ایک جوان کے عوض ۷۵ دینار حکومت کو دے دیتے تھے اور اس رقم کے بدلے میں اس جوان کو پوری زندگی کے لیے اپنا نوکر بنا لیتے تھے۔ یوں یہ انسان مجبور تھا کہ ساری عمر ان جاگیرداروں، سرمایہ داروں یا زمینداروں کے لیے کام کرے اور ان کی زمینوں میں کھیتی باڑی اختیار کرے۔ یہاں تک کہ اگر اپنی زندگی میں وہ ۷۵ دینار ادا نہ کر سکتا تو اس پر لازم تھا کہ وہ اپنی اولاد کو بھی اس زمیندار کی بیگار کے لیے وقف کر دے۔ جنوبی لبنان میں جاگیرداری کا جو انداز تھا اس کو عربی زبان میں اقطاعی نظام کہتے ہیں۔ جنوبی لبنان کے یہ زمیندار اس دَور کے بڑے بڑے سرمایہ دار تھے جنھوں نے پیسے کے زور سے بے شمار جوانوں کو اپنی غلامی کے جوئے تلے رکھا اور تمام عمر ان سے اور ان کی اولاد سے بیگار لیتے رہے۔ ان جاگیرداروں میں سے ایک احمد الاسعد تھا اور جنوبی لبنان کا تقریباً نصف حصّہ اس کے تصرّف میں تھا۔ یہ شخص بے حد خود پرست تھا۔ ۱۹۴۸ء میں جب مقبوضہ فلسطین کے صہیونی دستوں نے فلسطین اور دیگر مسلمان علاقوں پر حملہ کیا، اس بدبخت نے بہت سے شیعہ دیہات صہیونیوں کے ہاتھ بیچ دیے اور یوں شیعوں کے ۱۴ گاؤں یہودیوں کے تسلّط میں آ گئے۔ ان میں سے ایک گاؤں کا نام صالحہ تھا جس کا ذکر ہم آئندہ سطور میں کریں گے۔

ایک اور بڑا جاگیردار ہے جس کا نام کاظم الخلیل ہے جو جنوبی لبنان کے شہر صور (Tyre) کا رہنے والا ہے اور اس زمانے میں بھی وہ صہیونی ایجنٹ کمیل شمعون[1] کا ہم نوالہ و ہم پیالہ ہے۔ کمیل شمعون وہ شخص ہے جس نے ۱۹۵۸ء میں لبنان کے صدر کی حیثیت سے اور امریکہ کی انگیخت پر مسلمانوں کے خلاف مہم شروع کی اور امریکی فوجی اس کی حمایت میں بیروت اور لبنان کے دیگر علاقوں میں وارد ہوئے۔ کاظم الخلیل ان جاگیرداروں میں سے ایک ہے جنھوں نے جنوبی لبنان کے مختلف علاقوں میں بے شمار لوگوں کو اپنا غلام

[1] کمیل شمعون کا ذکر اس کتاب میں بار بار آئے گا۔ یہی وہ امریکی ایجنٹ ہے جس نے ۱۹۵۸ء میں امریکی بیڑا لبنان میں لنگر انداز کروایا کہ اپنی حکومت و اقتدار کی حفاظت کر سکے۔ اس نے اسرائیل سے باقاعدہ روابط قائم کر رکھے تھے۔ تشیع کا مدعی سابق شاہ ایران اس کے گہرے دوستوں میں سے تھا۔ عراقی آمر صدام تکریتی نے اسی شمعون کو باقاعدہ رشوتیں دی ہیں کہ وہ لبنان میں شیعوں کا قلع قمع کرنے میں مدد دے۔

Presented by Ziaraat.Com

بنا رکھا ہے اور آج بھی وہ دشمنوں کی دوستی کا دم بھرتا ہے جو سابق شاہِ ایران کا دوست اور مقبوضہ فلسطین کی صیہونی حکومت کا ایجنٹ ہے۔ جنوبی لبنان کے باقی ماندہ جاگیرداروں میں کامل الاسعد، عادل عسیران اور کاظم الخلیل وغیرہ آج بھی موجود ہیں۔

یورپی استعمار کی آمد

ترکوں کی حکومت کے خاتمے پر یورپی استعمار اس علاقے میں وارد ہوا اور شرقِ اوسط کے ممالک مختلف استعماری طاقتوں کے مابین تقسیم ہوگئے۔ لبنان فرانس کے حصے میں آیا۔ فرانسیسیوں نے بھی شیعوں کے قتل و غارت میں کچھ دریغ نہ کیا[1] لیکن لبنانی شیعوں نے ان کے سامنے سرِ تسلیم خم نہ کیا۔ ابھی تک ہزارہا شیعہ ایسے ہیں جنھوں نے فرانسیسیوں سے شناختی کارڈ حاصل نہ کیے اور اس بات کے باوصف کہ وہ صدیوں سے لبنان میں رہ رہے ہیں انھیں لبنانی شمار نہیں کیا جاتا۔ اس امر کے باوجود یہاں کے شیعوں نے فرانسیسیوں کے خلاف بے شمار محاذ قائم کیے لیکن بالآخر انھیں مغلوب ہونا پڑا اور لبنان کی نئی حکومت نے فرانسیسیوں کی سیاسی اور فوجی حمایت سے لبنان پر سطوت حاصل کرلی اور اقتصادی، سیاسی اور فوجی طاقتیں ساری کی ساری عیسائیوں کے ہاتھ میں آگئیں۔

اس وقت شیعوں کی حالت بے حد قابلِ رحم تھی۔ وہ عیسائیوں اور سنیوں کے بعد تیسرے درجے کے شہری شمار ہوتے تھے۔ تمام حقیر قسم کے کام مثلاً مزدوری اور گلیوں کی صفائی وغیرہ کا کام شیعوں کے پاس تھا۔ ان کے علاقے لبنان کے غریب ترین علاقے تھے۔ ان کی داستانِ حیات الم آفرین داستانوں میں شمار ہوتی تھی۔ شیعوں کے خلاف اموی دور سے جو کینہ پروری اور تعصب کی رَو چلی ہوئی تھی اس کے مطابق انھیں رافضی اور کافر اور حقیر شمار کیا جاتا تھا اور انھیں عام طور پر "متاولہ" کہا جاتا تھا جس کے معنی دم دار جانور کے ہیں۔

[1] انھی فرانسیسی درندوں نے لبنان کے سربرآوردہ مجتہد سید عبدالحسین شرف الدینؒ کی پوری لائبریری جلادی۔ کیونکہ سید موصوف رحمہ اللہ فرانسیسی انتداب اور پھر جبلِ عامل کی سوریا سے علیحدگی کے خلاف جدوجہد کر رہے تھے۔

شیعوں میں بھی احساسِ کمتری در آیا تھا۔ ان میں سے بعض عیسائیوں اور سنیوں سے صرف اس لیے شادی کرلیتے تھے کہ کسی نہ کسی طریقے سے اس احساسِ کمتری کا مداوا کریں۔ ان میں سے ایک بہت بڑی تعداد لبنان سے ہجرت کرکے دوسرے ممالک میں، خصوصاً افریقی ممالک میں کاروبار میں لگ گئی تھی[1]۔

شیعوں کے لیے تعلیم حاصل کرنے کے امکانات بھی صفر کے برابر تھے۔ ایک زمانے میں پورے جنوبی لبنان میں ایک بھی مدرسہ نہیں تھا۔ ایک مرتبہ یہاں کے لوگوں نے لبنانی پارلیمنٹ کے موجودہ سپیکر کامل الاسعد کے والد احمد الاسعد سے تقاضا کیا کہ وہاں مدرسہ قائم ہو تو اس نے جواب دیا کہ "جب کامل سبق پڑھتا ہے تو تم سب کے لیے کافی ہے"۔ پورے جنوبی لبنان میں ہسپتال تو کجا ایک ڈسپنسری تک نہ تھی۔ پکی سڑک تک نہ تھی اور پورا علاقہ بجلی سے محروم تھا۔ جنوبی لبنان کے بعض حصوں میں اور بعلبک کے علاقے میں ایک شیعہ خاندان کی سالانہ اوسط آمدنی ۵۷ لیرہ تھی۔

لبنان کے فاسد ماحول نے انانیت، مادہ پرستی اور خود پروری کی روح کو بھی جنم دیا تھا فقر و جہالت، خوف، بے امنی اور احساسِ کمتری کے درمیان لوگ ارادے سے عاری تھے پسماندہ تھے اور جاگیرداروں نیز سیاسی جماعتوں کے ہاتھ میں بازیچۂ اطفال بنے ہوئے تھے۔ وہ قضا و قدر پر راضی ہو کر ایسی زندگی بسر کر رہے تھے جس میں روح و جسم میں رشتہ باقی رکھنے کے لیے خوراک پر قناعت کی جاتی ہے۔

[1] لبنان کے چارلس مالک نے جو اقوامِ متحدہ کا صدر بھی رہا ہے، شیعوں کی اس غربت سے فائدہ حاصل کیا اور بہت سے ذہین شیعہ لڑکوں کو تعلیم دلانے کے بہانے بالآخر عیسائی بنا دیا۔

Presented by Ziaraat.Com

باب دوم

لبنان کی آزادی اور فرقہ وارانہ قانون

بے حد جد وجہد اور جنگ وجدل کے بعد ۱۹۴۳ء میں لبنان[1] کی آزادی کا خواب شرمندۂ تعبیر ہوا لیکن یہ آزادی فرانس اور مارونی عیسائیوں کے نفوذ و تسلط کے سایے میں تھی۔ اس آزادی میں جو نظام ابھرا اسے نظام طایفی یا فرقہ وارانہ نظام کہا جاتا ہے جس میں ہر قسم کی طاقت چاہے وہ سیاسی ہو یا فوجی یا اقتصادی، عیسائیوں کے ہاتھ میں ہے۔

فرقہ وارانہ نظام:

لبنان میں ۱۵ مختلف فرقے بستے ہیں اور اپنے اپنے دین و مذہب پر کاربند ہیں یہاں ایک ایسا دستور نافذ ہے جسے عربی میں قانونِ طایفی یعنی فرقہ وارانہ قانون کہتے ہیں۔ یہ قانون ۱۹۳۲ء میں فرانسیسی انتداب کے سایے میں لکھا گیا۔ اس قانون کے مطابق ہر فرقے کو کچھ حقوق و تحفظات حاصل ہیں۔ لبنان کے بڑے بڑے فرقے تین ہیں: عیسائی، اہلِ سنت اور اہلِ تشیع۔ جب کبھی لبنان میں حقوق و مراعات کی تقسیم کا موقع آئے تو لازم ہے کہ اسے ان فرقوں کے درمیان ایک مخصوص نسبت کے اعتبار سے تقسیم کیا جائے۔ اس کے مطابق عیسائیوں کو ۵ حصے ملتے ہیں، اہل سنت کو ۳ اور اہلِ تشیع کو ۲۔ لبنان میں شیعوں کی تعداد

[1] یاد رہے کہ انگریزوں نے فرانسیسیوں کے ساتھ مل کر سوریا اور فلسطین کے بعض حصے لے کر لبنان کی حدود معین کیں۔ ۱۹۴۵ء میں لبنان کی آزادی سے قبل پورے منطقے میں تحریک چلی جس کا مقصد یہ تھا کہ وادی بقاع، شمالی لبنان (طرابلس) اور جنوبی لبنان کے مناطق کو دوبارہ سوریا میں شامل کیا جائے۔ اس تحریک میں موجودہ لبنانی وزیرِ اعظم رشید کرامہ کے والد عبدالحمید کرامہ اور صور کے مجتہدِ اعظم سید عبدالحسین شرف الدین پیش پیش تھے۔

۱۲ لاکھ کے قریب ہے۔ اہلِ سنت ۵ لاکھ ۵۰ ہزار کے قریب ہیں اور مارونی جو عیسائیوں کا سب سے بڑا فرقہ اور بے حد سیاسی، فوجی اور اقتصادی نفوذ کا مالک ہے ۴ لاکھ ۵۰ ہزار افراد پر مشتمل ہے۔ اس دستور کے مطابق لازم ہے کہ صدرِ جمہوریت ہمیشہ مارونی ہو، وزیرِ دفاع مارونی ہو، لبنان کے سرکاری اور مرکزی بینک کا سربراہ مارونی ہو۔ اس اعتبار سے حکومت کے تینوں اہم شعبے مارونیوں کے ہاتھ میں ہیں۔ تمام سیاسی امور صدرِ مملکت کے پاس ہیں اور اسی طرح فوجی اور مالی امور بھی مارونی وزراء کے قبضے میں ہیں۔ یہ سب کچھ اس بات کے باوجود ہے کہ مارونیوں کی تعداد صرف ۴ لاکھ ۵۰ ہزار افراد ہے۔ جب حقوق و مراعات کی تقسیم کو مدِنظر رکھیں تو معلوم ہوگا کہ عیسائیوں کو ۵ حصے ملتے ہیں، اہلِ سنت کو ۳ حصے اور شیعوں کو فقط ۲ حصے۔ مثال کے طور پر پارلیمنٹ (مجلس) کے انتخابات کے موقع پر فرض کیجیے کہ وہاں ۱۰۰ ارکان ہیں۔ ان سو میں سے پچاس ارکان عیسائی ہونا چاہییں، تیس سنی اور بیس شیعہ۔ حالانکہ اگر ان کی آبادی کو پیشِ نظر رکھا جائے تو شیعہ ان کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہیں۔ یہ اپنی آبادی کے لحاظ سے اہلِ سنت سے دوگنا ہیں اور مارونیوں سے دوگنا سے بھی زیادہ لیکن آپ دیکھ سکتے ہیں کہ اس کے باوجود اہلِ سنت تو تیس نمائندے چنتے ہیں اور شیعہ فقط بیس۔ اس طرح وزراء کے انتخاب کے موقع پر بھی یہی کیفیت ہوتی ہے۔ فرض کیجیے کہ دس وزیر ہونا چاہیے۔ ان دس وزراء میں سے پانچ لازمی طور پر عیسائی ہوں گے، تین وزیر سنی اور صرف دو وزیر شیعہ۔ یہاں تک کہ جب لبنان کی سرکاری یونیورسٹی طلبہ کو داخل کرتی ہے تو اس وقت بھی طالب علموں کو پانچ، تین اور دو کی نسبت سے چنا جاتا ہے اور یہ بات مدِنظر نہیں رکھی جاتی کہ ان کی تعداد کیا ہے اور استعداد کیا ہے۔ یہ داخلے ایران کے مانند نہیں ہوتے کہ طالب علموں کی استعداد کو مدِنظر رکھیں۔ بلکہ اگر سو طالب علم لینا ہوں تو پچاس لازمی طور پر عیسائی ہونا چاہییں تیس طالب علم سنی اور بیس شیعہ۔ اگر شیعہ امیدواروں کی تعداد عیسائیوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ بھی ہو تو ان کو داخل نہیں کیا جاتا کیونکہ وہ شیعہ ہیں۔ ان کے شناختی کارڈ میں ان کا شیعہ ہونا لکھا جاتا ہے۔

۱۹۷۴ء میں ایک وزیرِ تعلیم نے عہدہ سنبھالا جو ذرا آزاد خیال تھا۔ اس کا نام ابو حیدر[1] تھا۔

[1] یہ ابو حیدر عیسائی تھا اور آرتھوڈکس یونانی کلیسا سے تعلق رکھتا تھا۔ اکثر لوگ اسے شیعہ سمجھتے ہیں۔ ابو حیدر اس

Presented by Ziaraat.Com

اس نے پہلی بار اس بات کا اعلان کیا کہ یونیورسٹی میں داخلے کے امیدواروں کو ان کی تعداد کے اعتبار سے چنا جائے گا اور اس سلسلے میں اس کے مذہب اور فرقے کو مدِ نظر نہیں رکھا جائے گا۔ کیونکہ یہ بات ظلم بھی ہے اور جرم بھی کہ کوئی شخص یونیورسٹی میں آئے اور اس میں حصولِ علم کی استعداد ہی نہ ہو بلکہ اس بنیاد پر اسے قبول کر لیا جائے کہ وہ عیسائی ہے یا سنی۔ پہلی بار جو امتحان نئے انداز میں ہوا وہ اساتذہ کی تربیت کے سلسلہ میں تھا۔ اس کے لیے ۲۷ طالب علم چنے جانا تھے۔ پہلی بار داخلے کا امتحان اس بنیاد پر ہوا کہ سب فرقوں کے لوگ اس میں شامل ہوں اور طالب علموں کی استعداد اور ان کی تعداد کے مطابق انتخاب عمل میں آئے۔ اس امتحان میں سینکڑوں اشخاص شریک ہوئے۔ اس میں پہلی سے اکیسویں پوزیشن حاصل کرنے والے سب کے سب شیعہ طالب علم تھے۔ دیکھی آپ نے قابلیت! شیعہ اپنی محرومی اور کمزوری کے باعث مجبور ہے کہ زیادہ دل لگا کر پڑھے تاکہ وہ کسی نہ کسی طریقے سے یونیورسٹی میں داخل ہو سکے۔ یوں پہلی سے اکیسویں پوزیشن شیعہ امیدواروں نے حاصل کی۔ اس کے بعد دو امیدوار عیسائی تھے اور ایک سنی۔ چوبیسویں اور پچیسویں پوزیشن حاصل کرنے والے امیدوار پھر شیعہ تھے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ یونیورسٹی میں داخلے کے لیے چنے جانے والے ۲۷ امیدواروں میں سے ۲۴ شیعہ تھے۔ اس پر عیسائیوں اور برادرانِ اہلِ سنت کی طرف سے خوب واویلا مچی کہ اس طریقہ پر تو ساری یونیورسٹی شیعوں سے بھر جائے گی اور ایسا نہیں ہونا چاہیے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ آزاد خیال وزیرِ تعلیم کو اپنا فیصلہ بدلنا پڑا اور اس داخلے کے امتحان کو کالعدم قرار دے دیا گیا اور امیدواروں کا چناؤ اسی ۵، ۳ اور ۲ کی نسبت سے ہوا۔ یوں آپ دیکھ سکتے ہیں کہ داخلے کے قابل تمام شیعہ امیدواروں میں سے صرف ۴ یا زیادہ سے زیادہ ۵ افراد چنے جا سکے۔

یہ ہیں وہ ظلم اور جرم جو لبنان کا فرقہ وارانہ نظام شیعوں پر وارد کرتا ہے۔ اب ذرا آگے چلیے اور فوج کی بات کریں۔ آپ جانتے ہیں کہ لبنان کے عیسائی اور سنی دولت مند ہیں۔ جن کے پاس کھانے پینے کو ہوتا ہے وہ فوج میں بھرتی نہیں ہوتے بلکہ تجارت اختیار کرتے ہیں۔ اپنا آزاد کاروبار کرتے ہیں۔ یہ صرف بدنصیب شیعہ ہی ہیں جو اپنی غربت اور

ناداری کی بناء پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ فوج کا رُخ کریں۔ لیکن فوج میں بھی وہی فرقہ وارانہ قانون کام کرتا ہے۔ اگر ایک مسلمان فوج میں شامل ہو تو ضروری ہے کہ اس کے مقابلے میں ایک عیسائی بھی فوج میں آئے تاکہ توازن برقرار رہے۔ اس بناء پر ہزارہا شیعہ فوج میں بھرتی ہونے سے رہ جاتے ہیں چونکہ ان کے مقابلے میں اتنی تعداد میں عیسائی نہیں آتے اس لیے انھیں فوج میں قبول نہیں کیا جاتا۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک شیعہ نوجوان کسی عیسائی کو پیسے دے کر اس بات پر راضی کر لیتا ہے کہ وہ اس کے ہمراہ جا کر فوج میں بھرتی ہو جائے اور یوں فوج ایک شیعہ کو قبول کر لے۔

میں نے اپنے قیامِ لبنان کے دوران میں ایسے جرائم بھی دیکھے ہیں کہ اس تناسب کو بھی درخورِ اعتناء نہیں سمجھا جاتا۔ مجھے یاد ہے کہ ۱۹۷۵ء میں لبنان کی خانہ جنگی کے دوران میں یتیم بچوں کی تعداد بے حد زیادہ ہو گئی تھی اور فلاکت کا کوئی حد و حساب نہ تھا۔ بعض عرب حکومتوں نے مل کر پچاس لاکھ ڈالر اس غرض سے دیے کہ صرف مسلمانوں میں تقسیم کیے جائیں اور عیسائیوں کو اس میں شامل نہ کیا جائے کیونکہ ان کی اکثریت مغربی ممالک اور اسرائیل سے جوڑ توڑ کرتی رہتی ہے۔ اس سلسلے میں مختصراً عرض کروں گا کہ مسلمانوں میں شیعہ اکثریت رکھتے ہیں لیکن اس پچاس لاکھ ڈالر میں سے فقط ۲ لاکھ پچاس ہزار ڈالر شیعوں تک پہنچے۔ یعنی تمام لبنان کے شیعوں کو ۱/۲۰ حصہ ملا۔ اگر درست طریقے پر ۳ اور ۲ کی نسبت سے اس رقم کو تقسیم کرنا چاہتے تو واضح تھا کہ پچاس لاکھ میں سے کم از کم تیس لاکھ ڈالر شیعوں کو ملتا۔ لیکن شیعوں کو صرف دو لاکھ پچاس ہزار ڈالر ملے جو فرقہ وارانہ قانون کی روشنی میں مل سکنے والی رقم کا تقریباً ۱/۱۲ تھا۔ قانون کو آپ کے لیے وضع کیا جاتا ہے اور یہ قانون اس صورت میں ہو کہ ایک قومی اور مرکزی حکومت لوگوں کو ان کے حقوق دلا سکے۔ لیکن وائے ہو اس وقت پر جس میں کوئی قوم کسی رہبر سے محروم ہو اور اسی کا نتیجہ ہے کہ لبنان کے شیعہ اس قسم کے ظلم و ستم کا شکار ہوتے ہیں۔

احساسِ ذلت و کمتری

لبنان کے بدنصیب شیعہ نوجوان کو کہیں بھی جائے پناہ نہیں ملتی۔ حکومت اسے

Presented by Ziaraat.Com

مارتی ہے۔ جاگیرداری اسے کچلتی ہے اور فلسطین کی صیہونی حکومت اسے بے دست و پا کرتی ہے، وہ کام کی تلاش میں نکلے تو کوئی اسے کام نہیں دیتا، یہاں تک کہ فوج بھی اسے قبول نہیں کرتی۔ یہ شیعہ نوجوان اپنی بدنصیبی کا سبب تلاش کرتا ہے کہ آخر کس بنیاد پر یہ بدبختی اس کے حصے میں آئی ہے اور وہ اس سبب کو تلاش کر لیتا ہے۔ اس کی بدنصیبی کی بنیاد اس کے شیعہ ہونے پر ہے۔ وہ اس لیے ظلم و ستم کا شکار ہے کہ اس کے شناختی کارڈ میں اس کا شیعہ ہونا درج ہے۔ اس لیے وہ شعوری یا لاشعوری طور پر تشیع اور شیعوں کے خلاف بغض و کینہ اختیار کر لیتا ہے کہ اسی نام نے اسے مظلوم بنایا ہے اور زندگی کے دروازے اس پر بند کر دیے ہیں۔ اس معاشرے میں جہاں ظلم و ستم راج کر رہے ہوں، کمیونسٹ اور مارکسی گروہ اپنا کام شروع کر دیتے ہیں۔ یہ شیعہ نوجوان اس بات کے لیے تیار ہوتا ہے کہ اپنے دل میں موجزن بغض و کینہ کے احساس کے لیے کوئی فلسفیانہ بنیاد تلاش کرے۔ اسی بناء پر وہ مارکسیت کو قبول کر لیتا ہے۔ وہ کمیونسٹ پارٹی میں شریک ہو جاتا ہے کہ یوں وہ نہ صرف تشیع سے بلکہ خود خدا سے اور دین سے جنگ آزما ہو۔

اسی بناء پر وہ کوشش کرتا ہے کہ وہ شیعہ ہونے اور مسلمان ہونے اور اس کے ساتھ خدا اور پیغمبر اور دین سبھی کو پامال کرے۔ اسی لحاظ سے آپ دیکھ سکتے ہیں کہ وہ لوگ جو لبنان میں دین کے خلاف نبرد آزما ہیں وہ یہی بدنصیب شیعہ نوجوان ہیں کہ ان کی الجھنیں اور احساسِ حقارت نے انہیں مجبور کر دیا ہے کہ وہ کمیونزم کا دامن تھامیں اور اپنی میراث کو، اپنی ثقافت کو اور اپنے دین کو اس جوش و خروش سے زد میں لائیں۔ عیسائیوں نے شیعوں پر جو حملے کیے ہیں وہ ان حملوں سے کہیں کم ہیں جو بائیں بازو کے شیعوں نے دیندار شیعوں پر روا رکھے ہیں۔ کچھ ایسے شیعہ تھے جنھوں نے اس داخلی الجھن اور احساسِ حقارت پر غلبہ حاصل کر لیا اور اپنے آپ کو ان سے آزاد کروا لیا لیکن بہت زیادہ تعداد اُن لوگوں کی ہے جن کے ہاں یہ الجھنیں اور یہ احساس باقی ہے اور انھوں نے ان سے نجات کی راہ اسی میں تلاش کی کہ وہ دینِ اسلام اور جناب سرورِ کائناتؐ اور جناب امیرالمومنینؑ کے خلاف نبرد آزما ہوں۔

ان سب حالات کے درمیان علمائے دین، دین کی روح اور پیغامِ دینی کے سلسلے میں قربانی کا کہیں سراغ نہیں ملتا تھا۔ علماء طاقتوروں کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بنے ہوئے تھے۔ یہ علماء دولت اور اقتدار کے ہاتھوں میں فریب کاری کی ترویج کا ذریعہ بنے ہوئے تھے اور وہ اہلِ زر اور اہلِ اقتدار کی مدد کرتے تھے تاکہ ان بدنصیب لوگوں کا زیادہ سے زیادہ اور بہتر سے بہتر استحصال کیا جا سکے۔ اس بناء پر جنوبی لبنان کے شیعہ نوجوانوں کے پاس اس بات کے سوا کوئی راہِ فرار نہ تھی کہ وہ کمیونسٹ پارٹی یا بائیں بازو کی دوسری انتہاپسند پارٹیوں کے رکن بن جائیں جو ان کے گرد و پیش میں اُبھر آئی تھیں۔

یہ وہ اہم اور گہری بات ہے جو ایران میں نہیں پائی جاتی اور شاید ایرانی دوست اس بات کو نہیں سمجھ سکتے لیکن یہ صورتِ حال عرب ملکوں میں، ترکی اور انڈونیشیا اور ہندوستان و پاکستان میں بڑی اہمیت کی مالک ہے۔

Presented by Ziaraat.Com

باب سوم

اسرائیلی جرائم

۱۹۴۸ء میں امریکہ اور سوویٹ یونین کی مشترکہ مدد سے اسرائیل کی تاسیس ہوئی۔ جیساکہ آپ جانتے ہیں اسرائیل کے قیام کے وقت یہودیوں نے غنڈہ گردی اور قتلِ عام کے ذریعے سے مسلمانوں کو ہجرت کرنے پر مجبور کر دیا۔ وہ فلسطین سے نکلے تو کچھ اردن چلے گئے، کچھ نے سوریا میں پناہ لی اور کچھ جنوبی لبنان میں پناہ گزین ہوے۔ کشت و خون کی بڑی بڑی داستانوں میں سے ایک قصہ دیر یاسین کے قتلِ عام کا ہے۔ یہودی دستوں نے اس گاؤں کو گھیرے میں لے کر اس کے ۲۵۰ افراد کو قتل کر دیا۔ ان میں جوان اور بوڑھے بھی تھے، بچے اور عورتیں بھی تھیں۔ قتل ہونے والوں کی لاشوں کو گڑھے کھود کر زیرِ زمین دبا دیا گیا۔ یہودی حکومت چاہتی یہ تھی کہ اس دہشت گردی کے ذریعے سے فلسطینیوں کو ملک چھوڑنے پر مجبور کر دے، فلسطینی یہودی دستوں کے مقابلے سے گریز کریں اور یوں یہ سرزمین خالی ہو جائے۔ صیہونیوں کا کہنا یہ تھا کہ فلسطین ایک ایسی سرزمین ہے جو انسانوں سے خالی ہے اور یہودی ایک ایسی قوم ہیں جن کے پاس کوئی ملک نہیں۔ اس بناء پر انسانوں سے خالی سرزمین اس قوم کے لیے ہے جو بے وطن ہے۔ یہ وہ رائے ہے جو اسرائیل اپنے لیے اقوامِ متحدہ میں ہموار کر رہا تھا اور اسی شعبدہ بازی کے ذریعہ سے صیہونیوں نے فلسطین کو ہڑپ کر لیا۔

فلسطین میں جو کشت و خون ہوا اس کی مثال جبلِ عامل میں بھی ملتی ہے۔ اس علاقے میں ہونے والے درد انگیز واقعات میں سے ایک واقعہ صالحہ نام کے گاؤں کا ہے اس گاؤں کے تمام باشندے شیعہ تھے اور یہ جبلِ عامل کے بالکل جنوب میں واقع ہے۔ جن

دنوں میں یعنی ۱۹۴۸ء میں صیہونی دستوں نے دیر یاسین میں قتلِ عام کیا انھی دنوں میں یہ لوگ صالحہ میں بھی پہنچے۔ انھوں نے اس گاؤں کے ۸۵ مردوں کو گاؤں کے وسط میں مسجد کے عقب میں جمع کیا۔ جنوبی لبنان کے ان دیہات میں عام طور پر درمیان میں ایک میدان سا ہوتا ہے اور اس کے کنارے پر مسجد واقع تھی۔ ان ۸۵ افراد کو مسجد کی دیوار کے ساتھ کھڑا کر کے گولیوں کا نشانہ بنا دیا اور یہ منظر دیکھنے والے گاؤں کے لوگ تھے جن میں بچے بھی تھے اور عورتیں بھی۔ انھوں نے اس ظلم کو اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ مارنے کے بعد انھوں نے یہ سب لاشیں مسجد میں رکھ کر نذرِ آتش کر دیں اور اس کے بعد اس مسجد کو منہدم کر دیا گیا اور پھر عورتوں اور بچوں کو رہا کر دیا گیا تاکہ وہ دربدر پھریں اور اسرائیل کی اس حرکت کی خبر کو دوسروں تک پہنچائیں اور بتائیں کہ صالحہ میں کیا کچھ ہوا۔ یہ ایک ٹیکنیک تھی جس کے ذریعے اسرائیلی حکومت ان مصیبت زدہ اور سوگوار بچوں اور عورتوں کو استعمال کر کے تمام علاقے میں ہیبت پھیلا دے اور پھر ان لوگوں کو وہاں سے بھاگنے سے مجبور کر دے اس ترکیب سے صیہونیوں نے جنوبی لبنان کے ۱۴ قریوں کو شیعہ آبادی سے خالی کر کے اپنے تسلط میں لے لیا۔ ان دیہات میں صالحہ نام کا گاؤں بھی ہے جسے صیہونی حکومت نے "کریات شمونہ" کا نام دیا۔

اسرائیل نے اس قسم کے ظلم و ستم اور جرائم بے شمار کیے ہیں اور جیساکہ آپ بعد میں دیکھیے گا کہ اسرائیل کی اس وحشیانہ پالیسی کا شکار دیر یاسین ہی نہیں ہوا بلکہ اس جرم پیشگی اور وحشت گردی کا نشانہ جنوبی لبنان کے شیعہ بھی ہوے ہیں۔ جن لوگوں نے اس علاقے کی تاریخ لکھی ہے انھوں نے تمام دلائل کے باوجود اپنی مصلحت اس میں نہ دیکھی کہ اس منطقے میں شیعوں پر ہونے والے ظلم و ستم کا بیان کریں اور ان کی قربانیوں کا ذکر کریں۔ میں ان باتوں کو شیعوں کی زبانی سُن چکا ہوں جو اس زمانے میں بچے تھے اور ان دیہات میں رہتے تھے۔ انھوں نے ان ستم کاریوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے لیکن افسوس ہے کہ نہ کسی کتاب میں ان کا ذکر ہے، نہ کسی اخبار میں ان کا بیان۔ جس سال سے اسرائیل کا نحس وجود دُنیا کے نقشے پر اُبھرا ہے اسی وقت سے جنوبی لبنان کے شیعوں پر اسرائیل

Presented by Ziaraat.Com

کی طرف سے ظلم وستم و جور کی داستان شروع ہوتی ہے۔ انھی دنوں سے اسرائیل کا توپخانہ اور اسرائیلی ہوائی جہاز جنوبی لبنان کو اپنی زد میں لاتے رہتے ہیں۔ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ مرنے والے سارے کے سارے فلسطینی ہیں لیکن میں آپ سے عرض کرتا ہوں کہ یہ ساری خون ریزیاں شیعہ علاقے میں ہوتی ہیں، ان شہروں اور گاؤں میں جن میں شیعہ آباد ہیں۔ اسی بناء پر جب جنوبی لبنان کا علاقہ اسرائیلی توپخانے اور اسرائیلی ہوائی جہازوں کا نشانہ بنتا ہے تو مرنے والے شیعہ ہی ہوتے ہیں۔ فلسطینی گوریلا دستے جب کسی شہر سے گزرتے ہیں یا کسی علاقے کو عبور کرتے ہیں تو کسی صورت بھی موجب خطر نہیں ہوتے۔ یہ دستے تو شہر سے گزر جاتے ہیں، وہاں رہتے نہیں۔ جو وہاں رہتے ہیں اور مر جاتے ہیں وہ بدنصیب عورتیں اور بچے ہیں کہ اپنے اپنے گھروں میں زندگی بسر کر رہے ہوتے ہیں کہ ایک دم اسرائیلی گولہ باری ان کے گھروں کو برباد کر دیتی ہے اور ان گھروں میں رہنے والے موت کے آغوش میں چلے جاتے ہیں۔ آپ کو یاد ہوگا کہ کچھ سال قبل اسرائیل نے جنوبی لبنان پر حملہ کیا اور دریائے لیطانی کو اپنے قبضے میں لے لیا۔ یہ دریا خاصہ بڑا ہے اور جنوبی لبنان سے گزرتا ہوا بحیرۂ روم میں جا گرتا ہے۔ مقبوضہ فلسطین کی صیہونی حکومت کی نظریں اس دریا کے پانی پر تھیں کہ وہ اپنی منفعت کے لیے اس کا رُخ اسرائیل کی طرف موڑ لے۔ اسی بناء پر اس نے اس دریا پر قبضہ کیا۔ یہ جنگ سات دن تک جاری رہی۔ اس میں شہید ہونے والے فلسطینیوں کی تعداد صرف ۱۵ تھی، صرف ۱۵۔ البتہ اس علاقے کے کم از کم دو ہزار شیعہ اس جنگ میں کام آئے اور ان میں سے بیشتر تعداد ان عورتوں، بچوں اور بوڑھوں کی تھی کہ اپنے گھروں کو چھوڑ نہیں سکتے تھے۔ جوان لوگ جن میں طاقت تھی کہ فرار کر سکیں، وہ فرار کر گئے تھے، لیکن وہ بے بس لوگ جو شہروں اور گاؤں میں رہ گئے تھے انھوں نے اسرائیلی توپخانے کی اور اسرائیلی جہازوں کی تباہ کاریوں میں اپنی جان جان آفریں کے سپرد کر دی۔ دنیا نہیں جانتی اور نہیں سمجھتی کہ اس جنگ میں دو ہزار شیعہ مارے گئے۔ کوئی شخص ان کے نام سے آشنا نہیں۔ حتیٰ کہ انھیں شہداء میں بھی شمار نہیں کیا جاتا۔ حالانکہ وہ قرآن و احادیث کی رُو سے شہیدوں میں سے ہیں۔

شہروں اور دیہات کی بربادی

یہ وہ ظلم وستم ہیں اور وہ جرائم ہیں جن کا نشانہ جنوبی لبنان کے شیعہ بنتے رہے ہیں۔ اس سات روزہ جنگ میں ۷۵ فی صد شیعہ دیہات اور قصبے ویران ہو گئے۔ جنوبی لبنان میں ایک قصبہ 'غندوریہ' نام کا ہے۔ اس کا کوئی مکان، حتیٰ کہ کوئی دیوار تک سلامت نہیں۔ اسرائیلی بمباری سے یہ قصبہ یوں برباد ہوا ہے کہ اس کے بچے کھچے لوگ قصبے سے باہر کھلے میدان میں خیمے سے بنا کر زندگی گزار رہے ہیں۔ کوئی شخص قصبے میں نہیں رہ سکتا۔ اب یہ قصبہ نہیں بلکہ ایک ویرانہ ہے۔ اسی طرح اسرائیلی سرحد کے ساتھ 'طیبہ' نام کا ایک اور قصبہ ہے۔ اب اس قصبے میں بھی کوئی نہیں رہتا۔ اس کے رہنے والے یا تو اس دنیا سے سفر کر گئے یا اس قصبے کو چھوڑ کر کہیں اور چلے گئے۔ اس طرح ایک اور قصبہ 'عباسیہ' جو 'صور' کے شہر کے نزدیک ہماری اقامت گاہ سے تقریباً ۲ کلومیٹر کے فاصلے پر تھا، اس قصبے کو بھی اسرائیلی جہازوں نے اپنی وحشیانہ بمباری کا نشانہ بنایا۔ میں اس کا عینی شاہد ہوں۔ یہاں تک کہ میں نے اسرائیلی جہازوں کی تصویریں بھی لی ہیں جن سے پتا چلتا ہے کہ وہ کس طرح اس قصبے کو برباد کرتے رہے۔ حالانکہ اس کے تمام جوان لوگ چلے گئے تھے اور وہاں سوائے بوڑھوں، بچوں اور عورتوں کے کوئی نہ تھا۔ اس بمباری کے نتیجے میں ۲۷ اشخاص ہلاک ہو گئے اور ۷۵ فی صد مکانات زمین بوس ہو گئے۔ اس قصبے کے ۷۵ افراد نے مسجد میں پناہ لی تھی اور اس خیال سے کہ اسرائیلی مسجد کا احترام کر کے اس پر بمباری نہیں کریں گے۔ لیکن اسرائیلی بمباروں نے اس مسجد کو بھی خاک نشین کر دیا اور یہ ۷۵ کے ۷۵ افراد مسجد کے ملبے میں دب کر مر گئے۔ میں خود چند دن کے بعد وہاں گیا لیکن مجھے مسجد کا کوئی نشان نہ ملا۔ مسجد اور اس کے گرد و نواح کے مکان یوں زمین بوس ہو گئے تھے کہ کوئی شخص بھی مسجد کی جگہ کی نشان دہی نہ کر سکتا تھا۔ 'ارنون' نام کا ایک اور قصبہ ہے۔ اس قصبے میں بھی اس وقت ایک شخص بھی نہیں ہے۔ اس کے رہنے والے یا مارے گئے یا قصبہ چھوڑ گئے۔ یہ ظلم وستم مسلسل جاری ہے۔ ہر روز اسرائیلی جہاز اور اسرائیلی توپ خانہ

Presented by Ziaraat.Com

جنوبی لبنان کے قصبوں کو اپنا نشانہ بنائے رکھتے ہیں۔

یہ سب شیعہ مناطق ہیں اور شیعہ دیہات ہیں۔ اسرائیل کے ایک پٹھو سعد حداد نے اسرائیلی سرحد کے قریب جنوبی لبنان کے دس کلومیٹر کے ایک علاقے پر تسلط جما رکھا ہے اور اسرائیل کی مدد سے، اور اسرائیلی فوجوں کی حمایت میں اس منطقہ پر مسلط ہے[1]۔ لبنان کے شیعوں کے رہنما سیّد موسیٰ صدر نے اس علاقے کے لوگوں سے کہا تھا کہ کوئی شخص اپنا گھر بار نہ چھوڑے اور فلسطینیوں کی طرح ہجرت نہ کرے۔ اس بناء پر یہاں کے شیعہ حتی الامکان اپنے اپنے گھروں میں رہ رہے ہیں۔ سعد حداد کے زیرِ تسلط علاقے میں بھی شیعہ دیہات میں زندگی بسر کرتے ہیں۔ دوسرا علاقہ جو فلسطینی مجاہدوں کے قبضے میں ہے یا دوسری جماعتوں کے تسلط میں ہے وہ بھی سارا شیعہ منطقہ ہے۔ یہ دونوں علاقے ایک دوسرے پر گولہ باری کرتے رہتے ہیں۔ اس طرف سے بھی مرتے ہیں تو شیعہ اور اس طرف سے بھی مرتے ہیں تو شیعہ۔ ان لوگوں نے ایک اصول بنا لیا ہے کہ شیعوں کو ناپید کر دیا جائے۔ یہ ظلم وستم اور یہ جرائم کاری جو زمانۂ قدیم سے اس سرزمین پر ہو رہی ہے آج بھی اسی شدّت سے جاری ہے۔

---

[1] سعد حداد کی حمایت صرف اسرائیل ہی نہیں کر رہا تھا بلکہ بعد کے حالات نے ثابت کیا کہ لبنان کے موجودہ صدر امین الجمیّل کی پارٹی ' الکتائب اللبنانیة ' بھی سعد حداد کی پشت پناہی کر رہی تھی اور اب تک کر رہی ہے۔ اب اسرائیل اور کتائب کے درمیان دوستانہ تعلقات کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔

~~~

باب چہارم

لبنان میں بائیں بازو کی جماعتوں کی سرگرمیاں

شیعوں کی زندگی کی ایک جھلک:

یہ لبنان کے شیعوں کی بدنصیب زندگی کی ایک تصویر ہے جو بنی امیہ، بنو عباس، سلاطینِ عثمانی اور فرانسیسی استعمار کے بعد لبنان پر عیسائیوں کے تسلط کے زمانے میں مسلسل ظلم وستم کا شکار رہے ہیں۔ آپ ایک شیعہ نوجوان کا تصوّر کیجیے کہ ہر چیز سے محرومی اس کی قسمت ہے۔ یونیورسٹی میں داخلہ اُسے نہیں ملتا، اعلیٰ تعلیم حاصل نہیں کر سکتا، حتّیٰ کہ انتظامیہ میں شریک نہیں ہو سکتا، فوج میں نہیں جا سکتا، کارخانوں میں فنی یا انتظامی عہدوں کو حاصل نہیں کر سکتا۔ یہ سب کچھ ہے تو وہ بے چارہ کرے کیا اور کہاں پناہ لے۔ اس کے لیے صرف ایک کام موجود ہے اور وہ یہ کہ جنوبی لبنان کی زمینوں میں کھیتی باڑی کرے۔ اس لیے ان کی بیشتر تعداد کھیتی باڑی ہی کرتی ہے[1]۔ لیکن اسرائیل جو ظلم وستم کا بادشاہ

---

[1] مترجم نے اپنے تجربے سے بھی یہ بات دیکھی ہے کہ زراعت کے کام میں شیعوں کو ان کا حق نہیں ملتا۔ جنوبی لبنان پھلوں اور سبزیوں کے علاوہ تمباکو کی کاشت کے لیے بھی مشہور ہے لیکن سارا تمباکو ایک فرانسیسی کمپنی ہی خرید سکتی ہے جس کا نام (Regie de Tombac et Tobac) ہے۔ اس کمپنی کی تمباکو کی خرید و فروخت پر اجارہ داری ہے۔ جب تمباکو کی فصل تیار ہو جاتی ہے تو کمپنی کے کارندے جن کی نوّے فیصد اکثریت مارونی عیسائیوں کی ہے، دورہ کرتے ہیں اور تمباکو کا نرخ مقرر کرتے ہیں جس کے لیے کوئی اصول نہیں بلکہ ان کی من مرضی کا سودا ہے کہ جو بھاؤ چاہیں لگا لیں کسان مجبور ہے کہ اسی قیمت پر وہ تمباکو کمپنی کے حوالے کرے۔ ۱۹۷۰ء میں اس مسئلے پر جب جھگڑا اٹھا تھا۔ کمپنی کے کارندے تمباکو ڈھائی لیرے سے سات لیرے یعنی آٹھ روپے سے تقریباً ۲۲ روپے فی کلو کے حساب سے خریدتے تھے۔ اندازہ کیا گیا تھا کہ ایک کلوگرام تمباکو سے تقریباً ایک ہزار سگریٹ بنتا ہے اور کمپنی آٹھ روپے کلو تمباکو خرید کر اس سے کم از کم دو سو روپیہ فی کلو کماتی تھی۔ اس ظلم کے خلاف آواز بلند ہوئی اور کئی مرتبہ ہوئی، لیکن بے سُود۔

Presented by Ziaraat.Com
~~~

ہے ہر روز جنوبی لبنان کو اپنی گولہ باری اور بمباری کا نشانہ بناتا ہے اور اس کے شہروں اور قصبوں کو برباد کرتا ہے۔ جنوبی لبنان کی چار لاکھ آبادی میں سے اس وقت کم و بیش تین لاکھ افراد بے گھر ہیں۔ انھوں نے اپنے گھر بار کو چھوڑ دیا ہے اور جہاں کہیں انھیں سر چھپانے کی جگہ ملتی ہے وہاں اپنی زندگی کے دن پورے کر رہے ہیں۔ کہیں مسجدوں میں، کہیں کیمپوں میں، کہیں سڑکوں کے کنارے، کہیں غاروں میں زندگی گزار رہے ہیں۔ ان نادار اور غریب لوگوں کی رسائی کہیں تک نہیں۔ ان کے سیاسی رہنما تمام کے تمام جاگیردار ہیں اور انھوں نے اسرائیل کے ساتھ عہد و پیمان کر رکھے ہیں اور افسوس کی بات یہ ہے کہ ان کے مذہبی رہنماؤں میں سے بھی ایسے لوگ موجود تھے اور ہیں جنھوں نے اپنے آپ کو ان جاگیرداروں کے ہاتھ فروخت کر رکھا تھا اور کر رکھا ہے۔ اس بناء پر جب ایک شیعہ نوجوان بدترین ظلم و ستم کی بارش میں پناہ گاہ تلاش کرتا ہے تو اسے جائے پناہ نہیں ملتی۔ اس کے سیاسی لیڈر خود پسند، جاہ طلب اور قوم فروش ہیں، اس کے دینی رہنماؤں کی بھی حالت اکثر اوقات ایسی ہی ہے اور حکومت کے فعال عناصر اسرائیل کے دست نگر ہیں اور وہ خود کمال ناداری اور بدنصیبی کی زندگی بسر کرتا ہے۔ اسرائیل ہر روز ان کی سرزمین کو نشانۂ ظلم بناتا ہے اور ہر روز ان کی ایک بڑی تعداد موت کا شکار ہو جاتی ہے، یہ سب کچھ ہے لیکن اس کا علاج کوئی نہیں ہے۔ اس کے نتیجے میں ہم یہ دیکھتے ہیں کہ یہ محروم شیعہ نوجوان جنھیں کہیں بھی رسائی حاصل نہیں، مارکسی اور بائیں بازو کی دوسری جماعتوں کی آغوش میں پکے پھلوں کی صورت گر پڑتے ہیں، کیونکہ اس کے علاوہ کوئی چارۂ کار نہیں۔

بائیں بازو کی جماعتوں سے شیعوں کا تعلق:

کمیونسٹ پارٹی نے لبنان میں تقریباً پچاس سال سے اپنی سرگرمیاں تیز تر کر دی ہیں۔ ان کی زیادہ تر سرگرمیاں نادار اور محروم شیعہ طبقوں میں ہیں جو ہر قسم کی اجتماعی مراعات سے محروم ہیں اور اپنے عقیدے اور اپنے دین سے بددل ہو چکے ہیں اور راہِ فرار کی تلاش میں ہیں۔ ان کے سامنے بہترین راستہ کمیونسٹ پارٹی اور دیگر بائیں بازو کی جماعتوں میں

شامل ہونا ہے۔ اسی لیے شیعہ نوجوانوں کی بہت بڑی تعداد ان جماعتوں میں شامل ہو جاتی ہے۔

بائیں بازو کی جماعتیں اس لیے مضبوط ہوتی ہیں اور شہرت حاصل کرتی ہیں کہ ناداری اور جہالت کا دور دورہ ہوتا ہے، علمائے دین گم کردہ راہ ہوتے ہیں اور جاگیردار ظالم۔ یہ جماعتیں تعلیم یافتہ نوجوانوں کو اپنے گرد جمع کر لیتی ہیں اور انقلابی اور اشتراکی نعرہ بازی سے ایک خوبصورت اور خیالی دُنیا کا نقشہ ان نوجوانوں کے سامنے پیش کرتی ہیں۔ یہ سب جماعتیں یا ان کی غالب اکثریت یا تو کسی غیر ملکی حکومت سے وابستہ ہوتی ہیں یا غیر ملکی سیاست کا کھلونا۔ وہ لبنان کو عربی اور بین الاقوامی تضادات کا میدان بنا دیتی ہیں۔ شروع ہی سے ان کا طریقۂ کار یہ رہا ہے لیکن لوگ بھی اس سیاسی کھیل سے آگاہ تھے۔ انھیں کسی جماعت پر یا کسی شخص پر یقین نہ تھا۔ وہ تو صرف مال حاصل کرنے کے لیے یا اقتدار حاصل کرنے کے لیے کسی نہ کسی سیاسی جماعت سے متعلق ہو جاتے تھے۔ ان جماعتوں میں ایسے اشخاص نادر تھے اور ہیں جو کسی ایمان و یقین کی بناء پر ان جماعتوں میں شریک ہوں۔ افسوسناک بات یہ ہے کہ ان جماعتوں کے ناپختہ ارکان کی اکثریت جنوبی لبنان کے شیعوں پر مشتمل ہے۔ لبنان کی کمیونسٹ پارٹی کا سربراہ جارج حاوی تھا جو مذہباً عیسائی تھا لیکن اس پارٹی کے ۹۵ فیصد ارکان جنوبی لبنان کے شیعہ تھے۔ الحزب القومی السوری (Syrian National Party)[1] کے سربراہ انعام رعد اور ڈاکٹر جارج سعادہ تھے۔ یہ دونوں عیسائی تھے۔ اس جماعت کی اکثریت بھی شیعوں پر مشتمل تھی۔ فلسطینیوں کی

---

[1] الحزب القومی السوری نے ۱۹۶۱ء میں لبنان میں انقلاب برپا کرنے کی کوشش کی تھی لیکن ناکام رہی۔ یہ جماعت بڑے سوریا کی قائل ہے یعنی وہ سوریا جس میں موجودہ شام، عراق، لبنان، اردن اور فلسطین شامل ہیں۔ ان کا بنیادی نعرہ یہ تھا کہ "مَنْ آمَنَ بِالْمَسِيْحِيَّةِ فَقَدْ كَفَرَ وَمَنْ آمَنَ بِالْإِسْلَامِ فَهُوَ أَكْفَرُ" یعنی جو عیسائیت پر ایمان لایا وہ کافر ہو گیا اور جو اسلام پر ایمان لایا وہ اس سے بڑا کافر ہو گیا۔ شیعوں کی اس جماعت کے ساتھ لگن کا سراغ اس بات سے ملتا ہے کہ فرانسیسی انتداب کے زمانے میں جنوبی لبنان اور بقاع کے شیعوں اور طرابلس کے سُنیوں نے جن کے لیڈر عبدالحمید کرامی تھے، مل کر کوشش کی تھی کہ ان کے علاقوں کو سوریا میں شامل کیا جائے۔

Presented by Ziaraat.Com

انتہا پسند جماعتیں، حتیٰ کہ منظمۂ آزادی فلسطین (الفتح) میں بھی بہت سے شیعہ جمع تھے۔ جمال عبدالناصر کا حامی گروہ ابراہیم قُلیلات کی سرکردگی میں کام کر رہا تھا۔ اس کے پاس ۴۰۰ جنگجو تھے جو ہر قسم کے اسلحہ سے لیس تھے۔ اسے 'فتح' اور 'لیبیا' کی کمک بھی حاصل تھی اور وہ پروپیگنڈے پر بھی بے دریغ پیسہ خرچ کرتے تھے۔ ابراہیم قُلیلات کو بیروت کے اہلِ سنت اپنا پیر و مرشد قرار دیتے تھے۔ اس جماعت میں بھی ۴۰۰ میں سے ۳۵۰ جنگجو جوان جنوبی لبنان کے شیعہ تھے جو واقعی لڑتے تھے اور قربانیاں دیتے تھے۔ قُلیلات ان کے خون کے پیسے کھرے کرتا تھا اور ان جوانوں کو ان پیسوں میں سے کچھ رقم فراہم کر دیا کرتا تھا۔ بنیادی طور پر یہ ساری پارٹیاں اور ان کے کرتا دھرتا سادہ لوح اور جوشیلے جوانوں کو بغیر ضروری تربیت دیے دشمن کا سامنا کرنے کے لیے بھیج دیتی تھیں اور وہ اکثر و بیشتر مارے جاتے تھے اور انھیں موت کے منہ میں بھیجنے والی پارٹی اس بیرونی حکومت سے پیسے وصول کرتی تھی جس کی اساس مرنے والوں کی تعداد ہوتی تھی اور اس کا سبب یہ بیان کیا جاتا تھا کہ ان کی جنگ آزمائیوں اور مرنے والوں کی تعداد میں براہِ راست تعلق ہے۔ اس لیے یہ پارٹیاں اور ان کے کرتا دھرتا اپنے ارکان کو موت کے منہ میں بھیجنے سے کوئی باک نہیں رکھتی تھیں اور بالآخر مرنے والوں میں اکثریت شیعوں کی ہوتی تھی۔

سیاسی پارٹیوں کا طرزِ عمل:

لبنان میں ۲۷ سے زائد بائیں بازو کی جماعتیں کام کر رہی ہیں۔ سوویٹ یونین، چین اور امریکہ سے لے کر مصر اور دوسری عرب حکومتوں کے زیرِ سایہ کام کرنے والی پارٹیاں یہاں کارفرما ہیں۔ یہ پارٹیاں ان شیعہ نوجوانوں کو اپنی طرف کھینچتی ہیں جو بدنصیبی، بھوک اور نفسیاتی الجھنوں کی بنا پر کسی کے لیے قابلِ قبول نہیں ہوتے۔ یہ پارٹیاں ان نوجوانوں سے کہتی ہیں کہ ہماری صفوں میں شامل ہو جاؤ، ہم تمہیں ماہانہ تنخواہ دیں گے، اسلحہ دیں گے اور تم پارٹی کی خدمت کرنے کے لیے میدانِ جنگ میں اُتر جاؤ۔ یہ نوجوان اپنے اندازِ فکر کے مطابق یہ سوچتے ہیں کہ معاملہ مناسب ہے اور یوں یہ اپنی فکری بنیادوں کو ترک کر دیتے ہیں اور

اس کے عوض میں نان و نفقہ اور اسلحہ حاصل کرتے ہیں۔

کردستان کے مشابہ نظام:

اسی قسم کا شر انگیز نظام ضدِ انقلاب قوتوں نے کردستان میں رائج کیا۔ چونکہ میں خود لبنان میں اس کا تجربہ کر چکا تھا اس لیے میں بڑی آسانی سے اس قابل ہو گیا کہ جان سکوں کہ ڈیموکریٹک پارٹی اور دوسری جماعتیں کس طرح کردستان میں اپنے گرد لوگوں کو جمع کر لیتی ہیں اور گڑبڑ پیدا کرتی ہیں۔ وہ افواہیں پھیلاتی ہیں کہ فوج تمہارے گاؤں کو برباد کرنا چاہتی ہے۔ بدنصیب نوجوان کرد اپنے گاؤں سے نکل بھاگتا ہے، بیوی بچوں کو ساتھ لیتا ہے اور پہاڑوں میں پناہ گزین ہو جاتا ہے۔ اب ظاہر ہے یہ بدنصیب لوگ پیسے اور اسلحے کے بغیر پہاڑوں میں کیا کریں اور اپنی زندگی اور اپنے خاندان کی عزت کی حفاظت کیوں کر کریں۔ اس وقت پارٹی آتی ہے اور کہتی ہے کہ ہم حاضر ہیں کہ تمہیں اسلحہ دیں تاکہ اپنی عزت کا دفاع کرو، ہم تمہیں ماہانہ پیسے بھی دیں گے، روٹی، چاول اور گھی بھی فراہم کریں گے تاکہ تم زندہ رہ سکو۔ اب یہ طے شدہ بات ہے کہ یہ بدنصیب نوجوان اپنے آپ کو پارٹی کے ہاتھ میں بیچ دیں گے اور پارٹی اس بات پر قادر ہو گی کہ ان کرد نوجوانوں کو جنوب سے شمال اور شمال سے جنوب تک کھینچتی پھرے اور انھیں فوج، حکومت اور پاسداروں کے خلاف لڑوائے۔ یہ ٹیکنیک بائیں بازو کی جماعتیں دُنیا کے ہر خطے میں برپا کرتی ہیں۔ کردستان میں کوئی نئی چیز نہیں

بڑی طاقتوں کی آماجگاہ:

جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے بائیں بازو کی جماعتیں لبنان میں ایک دو نہیں بلکہ ۲۷ کی تعداد میں موجود ہیں جن کی تفصیل آگے چل کر آئے گی۔ چونکہ لبنان آزادی کی سرزمین ہے اس لیے تمام ممالک اس بات پر قادر ہیں کہ وہاں آزادی سے اپنی سرگرمیاں جاری رکھیں، اپنی پارٹی بنائیں، اپنی جماعت تشکیل کریں، ہتھیار لائیں، اخبار نکالیں، وغیرہ وغیرہ۔ اسی لیے لبنان مختلف بین الاقوامی طاقتوں کی آماجگاہ بنا ہوا ہے۔ مثال کے طور پر عراق اور

Presented by Ziaraat.Com

سوریا ایک دوسرے کے مدِمقابل ہیں، سوریا اور لیبیا میں باہمی خصومت ہے، سعودی عرب اور سوریا میں تعلقات اچھے نہیں۔ ان میں سے ہر ملک لبنان میں ایک پارٹی بنائے ہوئے ہے جسے وہ پیسہ اور اسلحہ فراہم کرتا ہے۔ یہ مختلف پارٹیاں لبنان کے اندر ایک دُوسرے کے ساتھ الجھتی رہتی ہیں تاکہ جس حکومت کا کھاتے ہیں اسی کے گیت گائیں اور اس کے پروگرام کو رائج کریں۔ لیکن بائیں بازو کی یہ سب پارٹیاں جن لوگوں کو اپنا رُکن بناتی ہیں ان کی اکثریت شیعہ ہے یعنی جو لوگ عراق کے زیرِ سایہ پلنے والی جماعت کے رکن ہیں، وہ بھی شیعہ ہیں اور جنھوں نے سوریا کی حامی جماعت کی رکنیت اختیار کی ہے وہ بھی شیعہ۔ اسی طرح کمیونسٹ پارٹی، عوامی محاذِ آزادی فلسطین، جمہوری محاذِ آزادی فلسطین اور دیگر پارٹیوں کے ارکان کی اکثریت شیعہ ہے۔ اس لیے جب عرب حکومتیں یا دوسری بڑی طاقتیں ان پارٹیوں کو آپس میں لڑواتی ہیں تو وہ شیعہ ہی ہوتے ہیں جو ایک دوسرے کو مارتے ہیں۔ لبنان کی کمیونسٹ پارٹی کا لیڈر جارج حاوی مسیحی ہے۔ عوامی محاذِ آزادی کا لیڈر عیسائی مارکسی جورج حبش ہے، جمہوری محاذِ آزادی کا لیڈر بھی ایک اور کمیونسٹ عیسائی نائف حواتمہ ہے، لیکن وہ بدنصیب نوجوان جو لڑتے ہیں اور جان دیتے ہیں ان کی اکثریت شیعہ ہوتی ہے، اِس طرف بھی شیعہ اور اُس طرف بھی شیعہ۔ یوں آپ دیکھ سکتے ہیں کہ وہ تاریخی پس منظر اور وہ ذہنی الجھن جو ان نوجوانوں کو پریشان کرتی ہے اور تشیع سے فرار پر آمادہ کرتی ہے اس سے بائیں بازو کی جماعتیں فائدہ اٹھاتی ہیں اور مختلف حکومتیں ان نوجوانوں کو ایک دوسرے سے اُلجھاتی ہیں تاکہ اپنے مقاصد حاصل کریں۔ میں آپ سے ایک چیز عرض کرتا ہوں جو بڑی دردناک ہے اور ہر انسان کو خون کے آنسو رُلاتی ہے۔ یہ بائیں بازو کی جماعتیں ہر ماہ اپنے مرنے والوں کی تعداد کے لحاظ سے اپنی آقا حکومت سے پیسے حاصل کرتی ہیں۔ یعنی عراقی بعث پارٹی اگر ایک مہینے میں دو سو افراد کو مروائے تو اسے بیس لاکھ لیرے ملتے ہیں اور اگر تین سو افراد کو موت کے گھاٹ اتروائے تو اسی نسبت سے زیادہ پیسے وصول کرتی ہے۔ یہ خدا کو نہ ماننے والی جماعتیں جن کے لیڈر جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ شیعہ نہیں ہیں، ان میں شرافت نام کو نہیں، ان کے لیے یہ بات بالکل معمولی ہے کہ اس مہینے میں

تین سو افراد مرتے ہیں یا چار سو۔ ان کے لیڈر کہتے ہیں مرنے دو تاکہ یوں زیادہ پیسے ملیں۔ ان کے دل اس بات پر بالکل نہیں کڑھتے کہ یہ بدنصیب شیعہ نوجوان کس آسانی سے ان چپقلشوں میں اپنی جان کی بازی لگا دیتے ہیں۔ میں خود جنوب مشرقی بیروت کے علاقے الشیاح میں حزب امل' کے دفتر میں بیٹھا تھا، یہ علاقہ وہ ہے جس میں مصیبت زدہ شیعوں کا بہت بڑا مرکز ہے اور جس نے ہر علاقہ سے زیادہ شہید پیش کیے ہیں؛ اس دفتر میں ایک شیعہ نوجوان ہماری تلاش میں آیا اور کہنے لگا کہ میرا گھر بالکل سرحد پر ہے یعنی عیسائی اس کے گھر سے بیس میٹر کے فاصلے پر ہیں اور کوئی بعید نہیں کہ میرے گھر پر حملہ کر دیں۔ وہ اسلحہ طلب کرتا تھا تاکہ اپنی جان و آبرو اور اپنے ماں باپ کا دفاع کرے لیکن حزب 'امل' ایک غریب جماعت ہے، اس کے پاس اسلحہ کہاں کہ وہ کسی کو دے، کوئی حکومت اس کی پشت پناہی نہیں کر رہی کہ اسے اسلحہ اور پیسہ پہنچائے۔ حزب امل نے اسے واپس کر دیا اور کہا کہ بھائی! ہمارے پاس تو ہتھیار خود اپنے رضا کاروں کے لیے نہیں تمہارے لیے کہاں سے لائیں۔ یہ نوجوان کمیونسٹ پارٹی کے دفتر میں چلا گیا جو وہاں سے بیس میٹر کے فاصلے پر تھا۔ انھوں نے اسے فوراً ایک کلاشنکوف (دستی مشین گن) دے دی اور یہ بھی نہ پُوچھا کہ اسے وہ چلانا بھی آتی ہے یا نہیں، یا اس نے لڑائی کی تربیت بھی حاصل کی ہے یا نہیں۔ یہ کلاشنکوف دے کر اُسے ایک نہایت خطرناک محاذ پر بھیج دیا۔ الشیاح کے علاقے میں ایک قتل گاہ ہے جسے شارع اسعد الاسعد کہتے ہیں جہاں ہمارے بہترین رضا کار شہید ہوتے ہیں۔ وہاں پر اس ناتجربہ کار نوجوان کو بھیج دیا گیا۔ وہ بے چارہ اس مشین گن کو چلانا بھی نہ جانتا تھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ پانچ منٹ میں موت سے ہم آغوش ہو گیا۔ اس قسم کا کام ان پارٹیوں کے لیے تجارت ہے۔ ایسے نوجوانوں کا خون بیچ کر وہ اپنی حامی حکومت سے زیادہ پیسے کھرے کرتے ہیں۔ ان کا دل اس بات پر نہیں کڑھتا کہ اس قسم کے جوان اپنی جان دے دیں اور پارٹی یہ اعلان کرے کہ اس مہینے ہمارے دو سو آدمی مارے گئے اور ان مرنے والوں کے معاوضے کے طور پر عراق یا لیبیا یا سعودی عرب کی حکومتوں سے مال حاصل کریں۔ اس قسم کی گندی تجارت ان شیعہ

Presented by Ziaraat.Com

نوجوانوں کے خون پر پھل پھول رہی ہے جو اپنی ناداری اور دربدری کی بناء پر اپنے آپ کو ایسی تجارت پیشہ جماعتوں کے ہاتھ میں بیچ دیتے ہیں کیونکہ ان کے پاس کوئی اور چارۂ کار ہی نہیں۔ ہم نے اپنی آنکھوں سے یہ ظلم و ستم اور یہ جرائم لبنان میں سرزد ہوتے ہوئے دیکھے ہیں اور اب بھی دیکھ رہے ہیں۔

باب پنجم

لبنان میں آقائے سیّد صدر کی آمد اور اُن کی جد و جہد کا آغاز

خاندان اور تعلیم

آقائے صدر تقریباً بیس سال قبل ایران سے لبنان تشریف لائے۔ ان کے والد آیت اللہ صدر جو ساداتِ علوی کے ایک سربرآوردہ فرد تھے اور اپنے زمانے میں قم کے مراجع تقلید میں شمار ہوتے تھے، اپنی وفات کے بعد وہ حضرت معصومۂ قم کے حرم کے قریب دفن ہوئے۔ سیّد اسماعیل الصدر بھی اپنے دَور کے مراجع میں شمار ہوتے تھے ـــــ وہ نجف اشرف میں رہتے تھے اور اپنے علم و تقویٰ اور پرہیزگاری کے لیے مشہور تھے۔ ان کا شجرۂ نسب شیعانِ لبنان کے ایک عظیم دانشمند سیّد شرف الدین تک جا پہنچتا ہے۔ ان کا مزار اب بھی لبنان میں موجود ہے اور ان کا شمار جنوبی لبنان کے منطقہ جبلِ عامل کے بزرگ ترین شیعہ علماء میں ہوتا ہے۔ یہ بات تو آپ کو معلوم ہو ہی گئی ہوگی کہ ان کے چچازاد بھائی آیت اللہ سید محمد باقر الصدر شیعان عراق کے سربرآوردہ رہنما اور مرجع تھے اور عراق میں اسلامی انقلاب کے لیڈر تھے۔ وہ اپنی جلیل القدر بہن سیدہ بنت الہدیٰ کی ہمراہی میں جو عراق کے ادیبوں میں بڑا مرتبہ رکھتی تھیں، صدام کی سفاکی کا نشانہ بن کر شہید ہوئے۔ قصور ان کا یہ تھا کہ وہ ایران کے اسلامی انقلاب اور آقائے خمینی کی حمایت کرتے تھے۔ اس بناء پر کہا جا سکتا ہے کہ ان کے خاندان میں عظمت ایک روایت بن چکی تھی۔

Presented by Ziaraat.Com

آقائے صدر ۴ مارچ ۱۹۲۹ء کو پیدا ہوئے۔ انھوں نے قُم اور نجف کے دینی مدارس اور تہران یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کی۔ فلسفے اور معقولات میں انھوں نے بے نظیر صلاحیت کا اظہار کیا اور اپنے دوستوں میں انھی خصوصیات کی بناء پر مشہور ہوئے۔ ان کے ہم جماعتوں میں آیت اللہ ڈاکٹر بہشتی اور آیت اللہ موسوی اردبیلی اور ان جیسے دیگر مشہور حضرات ہیں جو اپنے علم و فضل کی بناء پر عہدِ حاضر کے ایران میں بے نظیر ہیں۔ انھیں فلسفے سے بے حد شغف تھا۔ مجھے بھی فلسفے سے بڑی دلچسپی ہے۔ میں کبھی کبھی اپنے بزرگوں کے سامنے فلسفے کے مباحث کو پیش کرتا رہتا ہوں اور انھیں اپنے سوالات اور بحثوں سے پریشان کرتا ہوں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ کئی مرتبہ سید موسوی سے فلسفے پر بات ہوئی اور ہمیشہ میں نے احساس کیا کہ تھوڑی ہی دیر بعد انھوں نے مجھے بحث میں پچھاڑ دیا اور مجھ میں دم نہ رہا کہ میں ایک بات بھی کر سکوں۔ میں محسوس کرتا تھا کہ سید صدر میں فلسفیانہ فکر کی اتنی قدرت تھی کہ کسی اور میں میں نے کم دیکھی ہے۔ ان کی خصوصیات میں سے ایک امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اُن اوّلین طلباء علومِ دینیہ میں سے تھے جو تہران یونیورسٹی میں داخل ہوئے اور وہاں کے لاء کالج سے علمِ اقتصاد میں ایم۔اے کی ڈگری حاصل کی اور یہ اس زمانے کی بات ہے جب تیل کی صنعت کے قومیائے جانے کی جنگ زوروں پر تھی جو دراصل ملّتِ ایران کا امپیریلزم کے خلاف ایک جہاد تھا۔ ان سیاسی کشمکشوں کے دوران انھوں نے نہ صرف قم اور نجف سے کسبِ فیض کیا بلکہ اس زمانے کی تہران یونیورسٹی میں انقلابی افکار سے بھی ہمکنار ہوئے اور طالب علموں کے احساسات اور ان کی جدوجہد سے آشنا ہوئے۔ میں خود اس زمانے میں تہران یونیورسٹی میں پڑھتا تھا اور میں نے اپنی آنکھوں سے ظلم و استبداد اور امپیریلزم کے خلاف جدوجہد کے دوران میں خونین حوادث دیکھے ہیں۔ مثال کے طور پر، ۷ دسمبر کے مظاہرات جن کے دوران میں ہمارے کالج (Arts College) کے تین طالبعلموں نے ہمارے سامنے جامِ شہادت پیا۔

سید موسیٰ الصدر پہلے شخص ہیں جنھوں نے ایک علمی اور اسلامی رسالہ جاری کیا جس کا نام 'مکتبِ اسلام' تھا اور جو اب تک قُم سے نکلتا ہے۔ خود آقائے صدر نے اپنی جوانی

میں بہت سے مقالات اس رسالے میں چھپوائے۔ ان کے یہ مقالات جو اسلامی اقتصادیات کے بارے میں تھے کتابی شکل میں شائع ہو چکے ہیں۔

اسی زمانے میں جب سید الصدر دینی علوم کی تعلیم حاصل کر رہے تھے اس وقت کے لبنان کے شیعہ رہنما سید عبدالحسین شرف الدّین کو آقائے صدر بہت پسند آئے اور انھوں نے ان کا تعارف اپنے جانشین کے طور پر کروایا۔ اتفاقاً اس کے دو سال بعد سید عبدالحسین شرف الدّین انتقال فرما گئے۔ جنوبی لبنان کے شیعوں کا ایک وفد سیّد عبدالحسین شرف الدین کی وصیت کے مطابق ایران آیا اور آقائے صدر کو اصرار کے ساتھ لبنان لے گیا۔ یہ ۱۹۵۹ء کا واقعہ ہے۔ آقائے صدر ایسی شخصیت اپنی ذہانت اور خاندان کی علمی روایات کے ساتھ لبنان پہنچ گئی۔ انھوں نے وہاں تمام مظالم، تمام جرائم، لوگوں کی بے بسی اور فقر و ناداری اور مادی و معنوی افلاس کو دیکھا۔ تصوّر کیجیے کہ انھوں نے ان سب چیزوں کو کیسے برداشت کیا ہوگا۔ وہ لبنان پہنچتے ہی جبلِ عامل کے علاقے میں وہاں کے سب سے بڑے شہر صور میں مقیم ہو گئے اور وہاں کی جامع مسجد کی امامت شروع کی۔

جنوبی لبنان میں مؤسسات کی بنیاد :

اس فقر و فاقہ اور غربت و فلاکت کے مقابلے میں جس نے شیعوں کو گھیر رکھا تھا، یہ خیال سوجھتا ہے کہ جنوب میں ایسے ادارے اور ایسے مؤسسات قائم ہونے چاہییں، جن میں شیعوں کو اقتصادی بہبود کی راہیں دکھائی جائیں۔ انھوں نے چند برس کی مدّت میں جنوبی لبنان میں پانچ مختلف ادارے قائم کیے جن میں سب سے بڑا "مدرسہ صنعتی جبل عامل" ہے جس میں میں خود آٹھ سال تک پرنسپل کی حیثیت سے کام کرتا رہا ہوں۔ یہ وہ مدرسہ ہے

ا؎ سید عبدالحسین شرف الدین اعلیٰ اللہ مقامہٗ اپنے دور کے عظیم علماء اور رہنماؤں میں سے تھے۔ انھوں نے نہ صرف شیعیانِ لبنان کو ہوش میں لانے کی کوشش کی بلکہ لبنان میں شیعہ سنی اتحاد کی تحریک بھی شروع کی، جس میں بیروت کے ایک اور بزرگ مجتہد سید محسن الامین ان کے شریکِ کار تھے۔ انھوں نے صور میں الکلیۃ الجعفریۃ قائم کیا جہاں الثانویۃ العامۃ (انٹرمیڈیٹ) تک تعلیم دی جاتی ہے۔ فرانسیسیوں کے خلاف ان کی جدوجہد نے انھیں جبر و تشدد کا شکار بنایا۔ ان کی لائبریری جلا دی گئی۔ ۱۹۵۸ء میں ان کا انتقال ہوا۔ ان کی تصنیفات میں 'المراجعات' بے حد مشہور ہوئی۔

Presented by Ziaraat.Com

جس میں یتیم اور غریب شیعہ بچے داخل ہوتے ہیں جن میں سے اکثر کے ماں باپ اور خاندان اسرائیلی حملوں میں مارے گئے۔ یہ بچے اس مدرسے میں مفت تعلیم حاصل کرتے ہیں اور رہتے بھی وہیں ہیں۔ انھیں عام تعلیم کے علاوہ سات مختلف فنی شعبوں میں تربیت دی جاتی ہے مثلاً چوب کاری، لوہار کا کام، ویلڈنگ، بجلی اور الیکٹرونکس کا کام، زرعی مشینری وغیرہ۔
جب طالب علم چار سال کے بعد اپنی تعلیم سے فارغ ہو جاتا ہے تو وہ معاشرے میں شامل ہو کر اپنے خاندان کی کفالت کے لیے معقول مشاہرے پر کام کرنا شروع کر دیتا ہے۔ یہ مدرسہ جنوبی لبنان کے اعلیٰ ترین مدارس میں سے ہے اور اپنی عمارت اور کیفیتِ تدریس کے لحاظ سے بے نظیر ہے۔ اکثر اوقات لبنان میں اوّل آنے والے طالب علم اسی مدرسے سے فارغ ہوتے ہیں۔ یہ وہ طالب علم ہیں کہ عملی اور نظری و فکری اعتبار سے پورے لبنان میں بے مثال ہیں۔ یہاں کے فارغ التحصیل طالب علم ویلڈنگ، مکینکس، خراد کا کام وغیرہ میں پورے لبنان میں دوسروں سے بازی لے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ مجھے یاد ہے کہ کچھ اساتذہ ملازم رکھنا تھے۔ بہت سے امیدوار آئے۔ ان میں سے عیسائی مدارس کے فارغ التحصیل بھی تھے اور بعض نے یورپ میں تعلیم حاصل کی تھی۔ میں نے ان کا امتحان لینے کے لیے اپنے ایک طالبعلم سے کہا کہ وہ خراد کی مشین پر ان کا ٹیسٹ لے۔ ہمارا یہ طالب علم جو شاید تیسرے سال میں پڑھتا تھا، اس استاد سے کہیں زیادہ صلاحیت رکھتا تھا جو باہر سے آیا تھا۔ اس کا ایک سبب یہ تھا کہ اس غریب مدرسے میں ہم مجبور تھے کہ باہر والوں کے لیے کام کریں تاکہ اپنا خرچ نکال سکیں۔ اس بناء پر یہ طالب علم بامرِ مجبوری مارکیٹ کے لیے دروازے اور کھڑکیاں تیار کرتے تھے۔ اسی طرح وہ طالب علم جو ویلڈنگ کا کام سیکھتے تھے وہ دوسرے مدارس کے طالب علموں کے مقابلے میں کئی گنا زیادہ کام کرتے تھے۔ یہاں تک کہ راتوں کو بھی اور چھٹی کے دن بھی ویلڈنگ کا کام ہوتا تھا۔ اسی طرح خراد کی مشینوں پر ہم بڑے بڑے پیچ اور کابلے تیار کرتے تھے اور انھیں بازار میں بیچتے تھے تاکہ ان سے اپنا خرچ نکال سکیں۔ اس بناء پر اس مدرسے کا ایک طالب علم تربیت کے دوران میں پچاس ساٹھ پیچ تیار کرتا تھا، یہاں تک کہ وہ آنکھیں بند کر کے بھی پیچ یا کابلا بنا سکتا تھا۔ میں خود انجینئرنگ اور

ٹیکنالوجی کے کالج کا فارغ التحصیل ہوں اور مجھے یاد پڑتا ہے کہ میں نے اپنی تمام زندگی میں ایک پیچ بنایا تھا۔ چونکہ ان پیچوں اور کابلوں کے بنانے کے لیے لوہا حاصل کرنے کے لیے پیسہ چاہیے، لیکن چونکہ ہم اس مدرسے میں پیچ بنا کر باہر بیچ دیتے تھے اس لیے ہر طالب علم اس بات کے لیے تیار تھا کہ جس قدر پیچ بنا سکتا ہو بنائے۔ یہاں تک کہ وہ اس قابل ہو جاتا تھا کہ باہر سے آنے والے استادوں کا امتحان لے۔ میں نے کہا تھا کہ اگر کوئی اُستاد آ کر ہمارے طالب علم کے ساتھ مقابلہ کر لے تو ہم اسے استاد رکھ لیں گے۔ یہ ہمارے مدرسے کا قانون تھا۔ لبنان کے بہترین طالب علم یہیں سے فارغ ہوتے تھے۔ پھر یہ مدرسہ ایسی درس گاہ نہ تھا جس میں طلبہ کو صرف تعلیم اور ٹیکنالوجی کی تربیت دی جاتی ہو اور وہ دوسروں کے لیے نمونہ تھے بلکہ یہ بھی تھا کہ یہ مدرسہ اسلامی آئیڈیالوجی کی کارگاہ بھی تھا۔ یہاں باجماعت نماز ہوتی تھی، آئیڈیالوجی کے درس دیے جاتے تھے اور انھیں انتظام و انصرام کی تربیت دی جاتی تھی۔ جب طالب علم اس مدرسے میں داخل ہوتے تھے تو اسی وقت سے وہ جنگ آزمائی کی تربیت حاصل کرتے تھے اور چھاپہ مار دستوں کے طریق کار سے آشنا ہوتے تھے۔
جب کبھی اسرائیلی حملہ کرتے تھے تو یہاں کے طالب علم مطالبہ کرتے تھے کہ اپنی کلاسوں کو چھوڑ دیں۔ اس مدرسے کے طالب علموں اور استادوں میں سے پندرہ اشخاص اسرائیل اور عیسائی کتائب (Phalangists) کے خلاف لڑتے ہوئے شہید ہوئے۔ اس چھوٹے سے مدرسے نے پندرہ شہید گذرانے ہیں اور ایسے مجاہدین کی تربیت کی ہے جو پورے لبنان میں چھاپہ مار جنگوں میں اپنی مثال آپ ہیں۔ یہ ایسے ستارے ہیں کہ جن کی چمک دمک کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا۔ میں آٹھ سال تک اس درس گاہ کا پرنسپل رہا ہوں اور ہمارا سب سے بڑا اڈہ یہی مدرسہ تھا۔ اسرائیل نے بارہا اسے اپنی گولہ باری کا نشانہ بنایا۔ ۱۷۵ ملی میٹر کی بڑی توپوں سے اس مدرسہ کو اپنی زد میں لیا اور اس کی عمارت کو تباہ کرتا رہا۔ دوسری جانب سے عراقی حکومت کے پٹھوؤں نے بھی جن کے بارے میں آگے چل کر ہم گفتگو کریں گے، بارہا اس مدرسے پر حملہ کیا اور راکٹوں اور مارٹروں کے ذریعے اس مدرسے کو اپنی زد میں لیا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ صرف دائیں بازو والے اور اسرائیلی ہی اس مدرسے کو اپنی زد میں نہیں

Presented by Ziaraat.Com

لیتے رہے بلکہ بائیں بازو کی جماعتوں کے ارکان اور کمیونسٹ اور عراقی حکومت کے اجیر بھی اس مدرسے پر حملہ آور ہوتے رہے اور اس کے بہت سے افراد کو اپنا نشانہ بناتے رہے۔ انھوں نے مدرسے کے دربان، وہاں کے ایک استاد اور بعض دوسرے افراد کو مرتبۂ شہادت پر پہنچایا۔ ان خون ریز جنگوں میں اس مدرسے کے کم عمر طالب علم ہتھیار لے کر حملہ آوروں کے مورچوں پر برستے رہے، چاہے یہ حملہ آور عراق کے پٹھو ہوں یا اسرائیلی درندے، ان سے جنگ آزما ہوتے رہے۔ یہ بات اس مدرسے کے لیے سب سے زیادہ باعثِ افتخار تھی

مجھے یاد ہے کہ دو سال قبل (۱۹۷۸ء) جب اسرائیل نے جنوبی لبنان پر حملہ کیا تو سب لوگ وہاں سے نکل کھڑے ہوئے، یہاں تک کہ فلسطینیوں نے بھی جنوبی لبنان کو ترک کر دیا۔ اس منطقے میں فلسطینی مہاجرین کے بڑے بڑے کیمپ تھے۔ ان کیمپوں میں ایک بھی شخص نظر نہیں آتا تھا۔ بوڑھے، بچے اور عورتیں، حتّٰی کہ ان کے لڑاکا دستے بھی فرار ہو گئے۔ صرف یہی نہیں بلکہ یہ جنگ آزما اپنا اسلحہ، چھوٹی مشین گنیں، آر۔ پی۔ جی (ٹینک شکن اسلحہ) وغیرہ ہمارے طالب علموں کے بستروں میں چھپا کر خود چلے گئے۔ جب اسرائیل حملہ کرتا تو اس کے مقابلے میں یہی ہمارے نوعمر طالب علم ڈٹ جاتے اور جنگ آزما ہوتے۔ اس حالت میں کہ انھیں معلوم تھا کہ وہ مارے جائیں گے، لیکن وہ اس بات کو ترجیح دیتے تھے کہ اپنے مدرسے میں رہیں اور موت کے منہ میں چلے جائیں۔ ہمارے لیے یہ بات کس قدر تکلیف دہ تھی کہ ہم ان بچوں سے یہ کہیں کہ اپنی جان بچانے کے لیے مدرسہ چھوڑ دیں اور اپنے گھروں کو چلے جائیں یا مدرسے سے دور رہیں۔ وہ طالب علم روتے تھے اور آنسو بہاتے تھے اور تقاضا کرتے تھے کہ ہم یہیں رہیں گے اور شہادت حاصل کریں گے۔ لبنان کی خانہ جنگیوں کے دوران میں لبنان کے تقریباً سارے مدرسے بند تھے لیکن یہ مدرسہ کھلا تھا اور اپنا کام کر رہا تھا کیونکہ اس کے طالب علم اس بات کے لیے تیار نہ تھے کہ مدرسہ چھوڑیں۔ شاید اس کا یہ بھی سبب تھا کہ اگر مدرسہ چھوڑ بھی دیتے تو غالباً ان کے پاس کوئی جگہ نہ تھی کہ جائیں۔ ان کا گھر بار کوئی نہ تھا۔ ان کی اکثریت یتیم بچوں پر مشتمل تھی میں اس بات کو ترجیح دیتا تھا کہ وہ مدرسے میں رہیں تاکہ انھیں دو وقت کی روٹی اور سونے کو

جگہ تو ملتی رہے۔ جب اسرائیلی توپ خانہ اور اسرائیلی جہاز مدرسے کو اپنا نشانہ بناتے، اس کی عمارت کو، اس کے شیشوں کو اور اس کے دروازوں اور کھڑکیوں کو برباد کرتے تو یہ کم عمر طالب علم یہاں ہی رہتے، گولیوں کی بارش میں مزاحمت کرتے، لیکن بھاگتے نہیں تھے۔ یہ تھے اس مدرسے کے طالب علم اور یہ تھیں ان کی امتیازی خصوصیات۔ بہرحال یہ مدرسہ جنوبی لبنان میں ایک نمونے کا مدرسہ تھا جس کی سربراہی کا شرف آٹھ سال تک مجھے حاصل رہا۔ اس مدرسے کے بارے میں بے شمار باتیں ہیں جو مجھے یاد ہیں، میرا گھر اس مدرسے میں تھا، ہمارا مرکز اور ہمارا مورچہ یہی مدرسہ تھا، یہیں سے ہم ہدایات جاری کرتے تھے، یہیں پر ہم لوگوں کو تربیت دیتے تھے اور یہیں پر ہمارا مرکزی ہیڈ کوارٹر تھا۔ اسی بناء پر اسرائیل اور دائیں اور بائیں بازو کی جماعتوں کے لوگ اس مدرسے پر حملہ آور ہوتے تھے، اور اس کو اپنا نشانہ بناتے تھے۔ اس مدرسے میں گیارہ، بارہ سال سے لے کر بیس سال تک کے لڑکے پڑھتے تھے اور جب وہ فارغ التحصیل ہو جاتے تھے تو اپنے کام کاج میں لگ جاتے تھے تاکہ اپنے گھر والوں کی مدد کریں۔

ایک طالب علم کے باپ سے جھگڑا:

مکینک کے شعبہ کا ایک طالب علم جو یتیم نہ تھا، عید الفطر کی چھٹیوں میں اپنے گھر جانے کے بجائے بنتِ جبیل[۱] کے جنگی محاذ پر چلا گیا تاکہ اپنے بھائیوں کے دوش بدوش اپنے وطن کا دفاع کرتے ہوئے اسرائیل اور کتائب (Phalangists) کے خلاف جنگ آزما ہو۔ اس کے گھر والے اس کی غیر حاضری سے پریشان ہوئے اور اسے ڈھونڈتے ہوئے مدرسے آئے لیکن وہ انھیں وہاں نہ ملا۔ آخرکار انھیں معلوم ہوا کہ اُن کا بیٹا محاذِ جنگ پر چلا گیا

[۱] بنتِ جبیل، جنوبی لبنان کا مشہور شہر اور وہاں کی ایک تحصیل کا صدر مقام تھا۔ اس کے قریب سعد حداد نے اسرائیل کی کھلم کھلا حمایت سے اپنی الگ حکومت بنا رکھی ہے اور لبنانی حکومت نے کبھی اس باغی کی سرکوبی کی جرأت نہیں کی کیونکہ وہ مارونی عیسائیوں اور جمیل خاندان کی ساختہ پرداختہ جماعت الکتائب اللبنانیہ کی زرخرید کنیز ہے اور سعد حداد مارونی تھا۔

Presented by Ziaraat.Com

ہے۔ وہ غصّے کے عالم میں مدرسے آئے اور وہاں کے ذمّہ دار لوگوں کو بُرا بھلا کہنا شروع کر دیا۔ اس کے والد نے کہا کہ میں نے اپنے لڑکے کو پڑھنے کے لیے مدرسے بھیجا تھا نہ کہ جنگ میں جانے کے لیے۔ اس لے اس کی تمام کتابیں اور کپڑے اٹھائے اور اُس کا نام مدرسے سے کٹوا دیا۔ میں نے بھی اس بات سے اتفاق کیا۔ دو ہفتے بعد اس کا باپ چند سفارشیں لے کر واپس آیا اور کہا کہ اس کا لڑکا گھر سے نکل گیا ہے اور پھر محاذِ جنگ کی طرف چلا گیا ہے۔ اس کی خواہش تھی کہ میں کسی نہ کسی طریقے سے اس لڑکے کو سمجھا بُجھا کر اس کے باپ کے گھر بھجوا دوں۔ میرے لیے یہ بات سخت تکلیف دہ تھی کہ دوبارہ اس بزدل شخص کو دیکھوں کہ وہ اپنے بہادر فرزند اور اس کے نگران افراد کو بُرا بھلا کہے یا اس مدرسے کی مذمّت کرے۔ جس نے اس قسم کے خیالات اس طالب علم کے ذہن میں ڈال دیے ہیں۔ میں نے ان سے کھُل کر باتیں کرنا شروع کیں اور اپنے دل کا غبار نکالا۔ اس طالب علم کے باپ اور اس کے ساتھ آنے والے سفارشیوں کو میں نے کھری کھری سُنا دیں اور کہا کہ "میری خواہش ہے کہ آپ کے جوانوں کی شرافت، ان کا احساسِ ذمّہ داری، ان کا ایمان اور ان کا جذبۂ قربانی تھوڑا بہت آپ حضرات میں سرایت کر جائے اور آپ اپنے سرفروش فرزندوں سے کچھ سبق سیکھیں۔ تعجب کی بات ہے کہ آپ کے بیٹے تو کمال رضا و رغبت سے اپنا سب کچھ قربان کرتے ہیں اور کمال شعور سے اپنے وطن کی عزّت و شرف کے دفاع کے لیے تیار ہیں لیکن آپ بزرگ بجائے اس کے کہ خدا کا شکر ادا کریں، ان سرفروشوں اور حق کے پرستاروں کو بُرا بھلا کہتے ہیں۔ میں نے ان سے کہا :

"ہم اپنے مدرسے میں کسی کو محاذِ جنگ پر نہیں بھیجتے اور کسی صورت بھی انھیں جماعتوں سے باہر نہیں نکالتے کہ انھیں محاذِ جنگ پر بھیجیں، لیکن طالب علم یہ دیکھتے ہیں کہ ان کا پرنسپل خود میدانِ جنگ میں جاتا ہے اور فدا کاری کے جوہر دکھاتا ہے، مدرسے کے بہترین استاد محاذ پر جاتے ہیں اور دادِ شجاعت دیتے ہیں۔ یہاں کے طالب علم دیکھتے ہیں کہ اس مدرسے نے راہِ خدا میں بہت سے فدائی قربانی کے طور پر پیش کیے ہیں، وہ یاد کرتے ہیں کہ ان کے بہترین اساتذہ اور مدرسے کے طالب علم درجۂ شہادت پر فائز ہو چکے ہیں اور بہت بڑی تعداد ایسی ہے جن کے جسم جنگ میں زخم کھانے کے تمغے لگائے پھرتے ہیں۔ یہ مدرسہ وہ

ہے جس کے مؤسس سیّد موسیٰ الصدر شیعہ فرقے اور حسینی جنگ آزمائی کے استمرار کی علامت ہیں۔ وہ دیکھتے ہیں کہ 'منظمۂ امل' کے سرفروش گرد آلود صورت لیکن آہنی ارادے اور بعض اوقات خون میں نہائے ہوئے جسموں کے ساتھ اس مدرسے میں آتے ہیں اور پھر چلے جاتے ہیں۔ وہ اس بات کا مشاہدہ کرتے ہیں کہ 'امل' کا کوئی نہ کوئی سرفروش کسی نہ کسی دن جامِ شہادت پیتا ہے اور اس شہید کی یاد میں جو تقریبات منعقد ہوتی ہیں ان میں کس عشق و احترام اور جوش و جذبے کا اظہار ہوتا ہے۔ وہ یہ دیکھتے ہیں کہ کم تر، ڈرپوک، بے شخصیت اور مصلحت طلب لوگوں کی اکثریت فرار کر گئی ہے اور میدانِ جنگ کو دشمن کے لیے خالی چھوڑ گئی ہے۔ یہ بات بھی ان کی نگاہ میں آتی ہے کہ انتہا پسند جماعتوں کے ارکان غیر ملکی پیسے اور اسلحے کے ساتھ اپنے وطن، اپنی آزادی اور اپنی تقدیر کے پودے کو جڑ سے کاٹتے ہیں اور جہالت کی بناء پر یا ذاتی مصلحتوں کی رُو سے اپنی قوم سے خیانت کرتے ہیں۔ اس مدرسے کے یہ طالب علم یہ سب کچھ دیکھتے ہیں اور سمجھتے ہیں اور اپنی ذمّہ داری کا احساس کرتے ہیں اور فرضِ کفایہ کے ادا کرنے کی صورت میں شریکِ معرکہ ہوتے ہیں تاکہ اپنی وطنی، تاریخی اور انسانی ذمہ داری کو سرانجام دیں۔ یہ لڑکے اپنی رضا و رغبت سے اپنے ارادے اور اپنی منصوبہ بندی کے تحت از خود ہتھیار اُٹھاتے ہیں اور جنگ کے مراکز کی طرف کُوچ کرتے ہیں اور یوں شہادت سے بغل گیر ہو جاتے ہیں تاکہ دوسروں کو راہِ درست کی نشان دہی کریں، "تاکہ عملاً اپنی ذمّہ داری اور اپنے فریضہ کو دوسروں سے متعارف کروائیں اور اگر اس کوشش میں انھوں نے اپنی جان جانِ آفریں کے سپرد کر دی تو پھر اسی طریقہ سے اپنے پاکیزہ خون کے چھینٹوں کے ذریعے سے مصلحت کوش اور حقیر قوم کے خوابیدہ اشخاص کو بیدار کر دیں۔

"یہ جوان جنوبی لبنان کے شیعوں کی طویل اور اندوہناک تاریخ کا بہت گراں قیمت، مخلص ترین اور پاک ترین سرمایہ ہیں۔ یہ جوان علیؑ و حسینؑ کے طرفداروں میں شمار ہوتے ہیں۔ وہ اپنے کاندھوں کو شہادتِ حسینی کے پرچم سے سجا کر ہمارے پُر افتخار پیغام کی راہ کو روشن کرتے ہیں۔ یہ بات کس قدر تکلیف دہ ہے اور افسوسناک بھی کہ آپ جیسے باپ اس قسم کے گرامی قدر، پاک طینت اور سرفروش فرزندوں کو بُرا بھلا کہیں۔ یہ درست ہے کہ یہ ظلم

Presented by Ziaraat.Com

بے انصافی ہے۔ خدا تمھیں ہرگز نہیں بخشے گا۔ تاریخ تمھیں نہیں بخشے گی۔ علیؑ تمھیں نہیں بخشیں گے۔ حسینؑ تمھیں نہیں بخشیں گے اور ظلم و بدنصیبی کے اس طویل دور کے دوران میں شہید ہونے والے شیعوں کا خون تمھیں نہیں بخشے گا۔ کیا اچھا ہوتا کہ اگر آپ جیسے باپ، ان جیسے پاک طینت، بہادر اور سرفروش فرزندوں سے شرافت، بزرگی اور انسانیت کا سبق حاصل کرتے، ایسے بیٹوں پر فخر کرتے اور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ذلت و غلامی و بدبختی کے جوئے کو توڑ پھینکتے اور دشمنوں کے مقابلے میں یوں ذلیل و خوار نہ ہوتے۔ آپ تشریف لے جائیے اور مجھے تنہا چھوڑ دیجئے۔ مجھے آپ کی باتیں سُن کر شرم دامن گیر ہوتی ہے اور میں نہیں چاہتا کہ میں انسانوں کو اس طرح بے انصاف، جاہل اور کم فہم دیکھوں۔"

یہ لوگ غصّے اور شرمندگی کے مِلے جلے جذبات لے کر مدرسے سے چلے گئے۔

جبلِ عامل کا صنعتی مدرسہ لڑکوں کے لیے تھا لیکن ایک اور بات آپ سے کہتا چلوں اور وہ یہ کہ سید موسیٰ الصدر نے تین ادارے لڑکیوں کے لیے قائم کیے تھے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جنوبی لبنان میں لڑکیوں کا مسئلہ لڑکوں کے مسئلہ سے زیادہ نازک تھا۔ آپ شاید یہ جانتے ہوں کہ بیروت شرقِ اوسط کا عشرت کدہ اور عرب شیوخ کی عیاشی کا اڈا تھا۔ بیروت کو شرقِ اوسط کا سوئٹزرلینڈ کہتے تھے۔ بیروت کی ۸۵ فیصد خود فروش عورتیں جنوبی لبنان کی شیعہ لڑکیاں تھیں۔ وہ لڑکیاں فقر و فاقے کی ماری بیروت چلی آتی تھیں تاکہ گھریلو ملازمت کریں، لیکن آہستہ آہستہ خود باختگی انھیں اپنے شکنجے میں جکڑ لیتی تھی اور وہ اس قابل نہ رہتی تھیں کہ اپنے گھروں کو واپس جاسکیں۔ یہ بات سید موسیٰ الصدر کے دل میں نشتر گھنگھولتی تھی۔ وہ ان کے لیے کام کرنا چاہتے تھے۔ وہ ان بچیوں کو کیونکر فسادِ خلق کے مرکزوں کی طرف جانے دیتے کہ وہ یہاں پہنچ کر یوں تباہ و برباد ہو جائیں۔ انھوں نے جنوبی لبنان کی لڑکیوں کے لیے "بیت الفتاۃ" کے نام سے ایک مدرسہ قائم کیا تاکہ یہاں لڑکیاں سلائی اور کشیدہ کاری وغیرہ کا کام سیکھیں۔ یہ لڑکیاں یہاں سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد اپنی روزی کمانے کے قابل ہو جاتی تھیں۔ اسی طرح ایک اور مدرسہ انھوں نے اس غرض سے قائم کیا کہ لڑکیاں وہاں نرسنگ کا کام سیکھیں۔ وہ لڑکیاں جن کے ثانوی تعلیم کا سرٹیفکیٹ

(بکالوریا) ہوتا تھا وہ یہاں آکر نرسنگ سیکھتی تھیں۔ سید موسیٰ الصدر نے ایک اور ادارہ قائم کیا جس میں قالین بافی سکھائی جاتی تھی۔ اس کی نگرانی بھی میرے سپرد تھی۔ اس مدرسے میں ۲۰۰ سے زیادہ لڑکیاں قالین بافی سیکھتی تھیں۔ جب کوئی لڑکی فارغ التحصیل ہو جاتی تھی تو قالین بافی کا لازمی سامان اس لڑکی کے گھر میں منتقل کر دیا جاتا تھا تاکہ وہ اپنے گھر میں ہی قالین بُنے اور ماہانہ تنخواہ اس ادارے سے حاصل کرے۔ یہ قالینیں ایسی دکانوں پر فروخت ہونے کے لیے پہنچا دی جاتی تھیں جو خیراتی کاموں کے لیے کھولی گئی تھیں۔ اس قسم کے ادارے ان لڑکیوں کے لیے قائم ہوئے اور مجھے یہ کہتے ہوئے افسوس ہو رہا ہے کہ یہ سب ادارے اس وقت بند ہو چکے ہیں۔ سید موسیٰ الصدر کے گُم ہو جانے کے بعد وہ چندے بھی بند ہو گئے جو انھیں دیے جاتے تھے[1] قالین بافی کا مدرسہ، نرسنگ کا سکول اور بیت الفتاۃ تینوں کے تینوں بند پڑے ہیں۔

انھوں نے ایک اور مدرسہ قائم کیا جس کا نام "معہد الدراسات الاسلامیۃ" (Institute of Islamic Studies) تھا جس میں علمائے دین کو تربیت دی جاتی تھی[2] اس مدرسے میں افریقہ، افغانستان، انڈونیشیا اور دوسرے ممالک کے بہت سے طلبہ تعلیم حاصل کرتے تھے اور فقہ جعفری سے آشنا ہو کر اپنے اپنے وطن کو لوٹ جاتے تھے۔ اس زمانے میں افریقی ممالک میں بھی تشیع پھیل رہا ہے اور اس کی نشر و اشاعت کرنے والے وہی علمائے دین ہیں جو اس مدرسے سے فارغ التحصیل

---

[1] ان چندوں کے بند ہونے کا سبب بظاہر یہی ہے کہ سید موسیٰ الصدرؒ کی شخصیت لوگوں کو چندہ دینے کی ترغیب دیتی تھی کیونکہ انھیں سید موسیٰ الصدرؒ پر اعتماد تھا اور اس میں صرف شیعہ ہی نہ تھے بلکہ غیر شیعہ بھی سید موسیٰ الصدرؒ کو احترام کی نگاہوں سے دیکھتے تھے اور ان پر اعتماد کرتے تھے۔ لیکن ان کے گُم ہو جانے کے بعد اب جنوبی لبنان میں کوئی مرکزی شخصیت نہیں جس پر لوگ بھروسہ کر سکیں۔

[2] مترجم کو اس مدرسے میں تقریباً تین سال تک انگریزی کا درس دینے کا شرف حاصل رہا کیونکہ سید موسیٰ الصدرؒ نے اس مدرسے کو ان معنوں میں دینی مدرسہ نہیں بنایا تھا جو ہمارے تصوّر میں ہے۔ یہاں کے طلبہ کو انگریزی، تاریخ، جغرافیہ، حساب اور مسائلِ حاضرہ پڑھائے جاتے تھے۔ انھیں والی بال کھیلنے اور تن سازی کی تربیت بھی دی جاتی تھی۔

Presented by Ziaraat.Com

ہو چکے ہیں۔ یہ نہایت خوبصورت مدرسہ شہر صور (Tyre) میں بحیرۂ روم کے کنارے واقع تھا۔ افسوس کہ آج یہ بھی بند ہو چکا ہے۔

سیّد موسیٰ الصدر کی بیروت کو روانگی:

یہ وہ ادارے تھے جو سیّد موسیٰ الصدر نے جنوبی لبنان میں قائم کیے لیکن انھیں احساس ہوا کہ جو مشکلات درپیش ہیں ان کی فضا میں شیعوں کے درد کا کوئی علاج نہیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ کوئی بنیادی کام کیا جائے۔ شیعہ بنیادی حقوق سے محروم ہیں۔ انھیں تو انسان بھی نہیں سمجھا جاتا۔ یہ ممکن ہے کہ ان کے لیے اقتصادی ترقی کے وسیلے پیدا کیے جائیں لیکن جس دور میں ان کا انسان ہونا ہی مشکوک ہو، ضرورت اس امر کی ہے کہ ان کے بنیادی حقوق کے کد و کاوش کی جائے۔ اسی بناء پر وہ بیروت چلے گئے۔ جہاں انھوں نے شیعوں کے غصب شدہ حقوق کو واپس لینے کے لیے ایک وسیع کوششوں کا سلسلہ جاری کیا۔ اس زمانے میں تمام مذہبی فرقوں کا، جن کا میں نے ذکر کیا ہے، بیروت میں ایک مرکز تھا جہاں ان کا ذمہ دار رہنما رہتا تھا۔ مثلاً اہلِ سنت کا مرکز دار الفتویٰ تھا جہاں اس کے سربراہ شیخ حسن خالد، مفتیٔ اعظم اہلِ سنت رہتے تھے اور اب بھی رہتے ہیں اور اہلِ سنت کی رہنمائی فرماتے ہیں وہ حکومتِ لبنان کے نزدیک اہلِ سنت کے نمائندے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ حکومت سے اپنے فرقے کے لوگوں کے لیے حقوق طلب کرتے ہیں، ان کی ایک سرکاری حیثیت ہے جسے قانون تسلیم کرتا ہے۔ دروز جن کی تعداد دو لاکھ پچاس ہزار کے قریب ہے، اپنے لیے بیروت میں ایک مرکز رکھتے ہیں جہاں ان کا رہبر جسے "شیخ العقل" کہا جاتا ہے، رہتا ہے اور دروز کے حقوق کی نگہداشت کرتا ہے۔ اسی طرح مارونیوں کا بھی ایک سربراہ "مُنخریش" کے نام سے ہے جو ان کے حقوق اور مصلحتوں کی نگہبانی کرتا ہے۔ یوں تمام فرقے بیروت میں اپنا اپنا مرکز اور رہبر رکھتے تھے، سوائے شیعوں کے جو کسی قطار شمار میں نہ تھے اور کوئی نہ تھا جو ان کے حقوق کے لیے مطالبہ کرتا اور یوں ۲ : ۳ : ۵ کا فارمولا اکثر پسِ پشت ڈال دیا جاتا تھا اور شیعوں کو مزید نقصان پہنچتا تھا۔ جب شیعہ مطالبہ کرتے تو کوئی نہ تھا جو انھیں جواب دیتا۔

انھیں کہا جاتا کہ تمہارا تو کوئی مرکز ہی نہیں، تمہارا کوئی رہبر ہی نہیں۔ جب ووٹ دینے کا مسئلہ ہوتا۔ مثال کے طور پر وزیرِ اعظم کا انتخاب ہونا ہے یا مجلس (پارلیمنٹ) کے لیے نمائندے چُنے جانے ہیں تو شیعوں کو مسلمانوں میں شمار کیا جاتا[1]۔ ہمارے سُنی بھائی یہ چاہتے تھے کہ شیعہ ان کے ساتھ مل کر ووٹ دیں تاکہ ان کا امیدوار کامیاب ہو جائے۔ لیکن جب منافع کی تقسیم کا مسئلہ ہوتا اور مراعات بانٹے جاتے تو یکبارگی شیعوں کو رافضی بنا دیا جاتا، انھیں کافر کہہ دیا جاتا، انھیں حیوان شمار کیا جاتا اور انھیں ان کے حقوق سے محروم کر دیا جاتا۔ ہمارے سنی بھائیوں کے رسالے جب شیعوں کے بارے میں کچھ لکھتے یا کہتے تو انھیں رافضی یا خارجی اور بے دین کہا جاتا۔ یوں شیعوں پر حملے ہوتے یہاں تک کہ آج بھی بعض اوقات یہ سلسلہ جاری رہتا ہے۔ موجودہ دور میں بیروت میں اہلِ سنت کے سب سے بڑے مفکر اور مصنف ڈاکٹر صبحی الصالح جو بیروت کی عربی یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہیں اور تاریخ اسلام کے استاد، انھیں مفتیٔ اعظم حسن خالد کے بعد اہلِ سنت

---

[1] میرا خیال ہے کہ یہاں ڈاکٹر مصطفیٰ چمران شہید (مؤلف کتاب) کو اشتباہ ہوا ہے۔ لبنان کے دستور کے مطابق شیعہ اکثریت کے علاقوں سے صرف شیعہ امیدوار ہی انتخاب میں حصہ لے سکتا ہے۔ اسی طرح سنی یا مارونی اکثریت کے علاقے میں سنی یا مارونی ہی امیدوار ہو سکتا ہے اور اس مخصوص انتخابی حلقے کے سب ووٹر اسی امیدوار کے لیے ووٹ دیتے تھے۔ جہاں تک وزیرِ اعظم کے انتخاب کا تعلق ہے اسے صدرِ مملکت منتخب کرتا تھا اور وہ اپنی کابینہ کی تشکیل کے بعد مجلس سے اعتماد کا ووٹ حاصل کرتا تھا۔ ووٹ دینے والے مجلس کے ارکان ہوتے تھے چاہے ان کا تعلق کسی بھی فرقے سے کیوں نہ ہو۔ مترجم کی رائے میں لبنان میں مسلمانوں کے خلاف جو طوفان اُٹھا ہے اس کا ایک سبب یہ ہے کہ سید موسیٰ الصدر نے سنی، شیعہ اور دروزی رہنماؤں کی ایک کانفرنس ۱۹۷۱ء میں بلائی جس میں حکومت سے مطالبہ کیا گیا کہ تمام مسلمان فرقوں کے ووٹ یکجا شمار کیے جائیں۔ اگر ایسا ہو جاتا تو فرقہ وارانہ توازن میں فرق پڑ جاتا جس کا سب سے زیادہ نقصان مارونیوں کو پہنچتا جو ۱۹۳۲ء کی مردم شماری کے اعداد و شمار کے بل بوتے پر اپنی اکثریت کا راگ الاپتے ہیں۔ یاد رہے کہ ۱۹۳۲ء کی مردم شماری میں ان مارونی عیسائیوں کو بھی شمار کر لیا گیا تھا جنھیں شمالی یا جنوبی امریکہ میں وہاں کی شہریت حاصل کیے ہوئے بیس بیس پچیس پچیس سال گزر چکے تھے۔ اس بارے میں اصل ستم یہ تھا کہ شیعہ اکثریت کے علاقوں میں (اور سنی علاقوں میں بھی) کامیاب ہونے کے لیے امیدوار کو ان حضرات کے ووٹوں پر انحصار کرنا ہوتا تھا جو غیر شیعہ ہوں بالخصوص غیر مسلم۔ اور یہ غیر مسلم ووٹر اُسی امیدوار کا ساتھ دیتے تھے جو ان کی مصلحتوں کا نگہبان ہو یوں ایسے شیعہ امیدوار کا کامیاب ہونا محال ہے جو واقعی شیعوں پر ہونے والے ظلم و ستم کے خلاف آواز بلند کرے

Presented by Ziaraat.Com

کی سب سے بڑی شخصیت گردانا جاتا ہے، وہ یونیورسٹی میں مقرر شدہ نصاب میں شیعوں کے بارے میں لکھتے ہیں (صفحہ ۹۳ : اسلام شناسی) "شیعوں کا تاریخ میں کوئی وجود نہ تھا۔ یہاں تک کہ عبداللہ ابن سبا آیا۔ یہ عبداللہ ابن سبا یہودی تھا" دوسرے لفظوں میں وہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ حضرت سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی وفات سے عبداللہ ابن سبا کے، جس کی حیثیت محض خیالی اور افسانوی ہے، آنے تک نہ شیعوں کا کوئی وجود تھا نہ لفظِ شیعہ کا اطلاق کسی پر ہوتا تھا۔ ایک یہودی آیا جس کا نام عبداللہ ابن سبا تھا اور اس ابن سبا نے تشیع کی داغ بیل ڈالی۔ یہ بات لبنان کے اہلِ سنت کے سب سے بڑے مفکر و مصنف اور دانشور کے منہ سے نکلتی ہے۔ اس سے آپ تصور کریں کہ دوسرے کیا کچھ نہ کہتے ہوں گے۔

دار الفتوی بیروت کا ایک رسالہ ہے۔ دو سال پہلے کہ میں لبنان ہی میں تھا یونیورسٹی کے ایک استاد نے شیعوں کے بارے میں ایک مفصل مقالہ لکھا جو تقریباً ۲۵ صفحوں پر پھیلا ہوا تھا۔ اس مقالے میں شیعوں کو دل کھول کر گالیاں دی گئی تھیں اور برا بھلا کہا گیا تھا۔ ان صاحب نے جو چیزیں لکھی ہیں انھیں پڑھ کر میں کانپ اٹھتا ہوں اور ادب مجھے اجازت نہیں دیتا کہ میں ان الفاظ کو دوبارہ لکھوں۔ اس مقالے میں ان صاحب نے یہ بات ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ شیعوں نے ہمیشہ خیانت کی ہے اور غداری سے کام لیا ہے سید موسیٰ الصدر نے ہمارے برادرانِ اہلِ سنت کے رہنما سے شدید احتجاج کیا اور اس کے جواب میں ایک شیعہ مؤرخ ڈاکٹر مکّی نے اس مقالے کا مفصل جواب دیا جس میں دلائل سے یہ ثابت کیا کہ شیعہ وہ نہیں جیسا انھیں سمجھا جاتا ہے۔ بہرحال اس قسم کی فضا تھی جس میں شیعوں کو کوئی حق نہیں دیا جاتا تھا، ان کا کوئی رہبر نہ تھا، ان کی کوئی تنظیم نہ تھی اور غیر شیعوں کی طرف سے انھیں رافضی و کافر اور خارجی گردانا جاتا تھا۔ اس قسم کی فضا میں سید موسیٰ الصدر واردِ بیروت ہوئے۔ انھوں نے یہ محسوس کیا کہ جب تک شیعوں کی کوئی مرکزیت نہ ہوگی، کوئی رہبر نہ ہوگا جو ان کی ترجمانی کر سکے، اس وقت تک ممکن نہیں کہ حکومت سے یا کسی اور شخص سے حقوق طلب کیے جائیں۔

لبنان میں المجلس الاسلامی الشیعی الاعلیٰ کا قیام:

سید موسیٰ الصدر نے کہا کہ لبنان کے ۱۵ فرقوں میں سے سوائے شیعوں کے ہر ایک کا اپنا مرکز ہے، اپنا رہنما اور ترجمان ہے۔ اس لیے شیعوں کو جو لبنان میں مسلمانوں کی اکثریت ہیں اور ۱۲ لاکھ کی آبادی رکھتے ہیں، حق پہنچتا ہے کہ ان کا بھی ایک مرکز ہو۔ لیکن دنیائے عرب نے اس تجویز کی شدّت سے مخالفت کی۔ کیونکہ وہ نہیں چاہتے تھے کہ کوئی ایسا مرکز قائم ہو جس کا تعلق شیعوں سے ہو۔ یہاں تک کہ انھوں نے چند بار سید موسیٰ الصدر کو دہشت پسندی کا نشانہ بھی بنایا[1] لیکن سید موصوف نے بعلبک کے شیعوں کی مدد سے جو لبنان کے شیعوں میں سب سے زیادہ جدوجہد کرنے والے اور باشعور ہیں، ایسی طاقت حاصل کی کہ لبنان کی حکومت پر زور دے کر اُسے اس بات پر مجبور کیا کہ شیعہ مرکز کو تسلیم کرے اور یوں چند سال کی جدوجہد کے بعد سید موسیٰ الصدر اس بات میں کامیاب ہوئے کہ ۱۹۶۹ء میں المجلس الاسلامی الشیعی الاعلیٰ کے قیام کا قانون لبنان کی پارلیمنٹ سے پاس کروا سکے یعنی جس طرح دوسرے فرقوں کی مرکزی مجلسیں ہیں اور ان کے رہبر ہیں، اسی طرح شیعوں کا بھی ایک مرکزی ادارہ ہو۔ بڑی کشمکش کے بعد یہ مرکز تشکیل پذیر ہوا اور اسے "المجلس الاسلامی الشیعی الاعلیٰ" کا نام دیا گیا اور سید موسیٰ الصدر اس کے سربراہ منتخب ہوئے۔ یہ مجلس اس مجلس سے مختلف حیثیت رکھتی ہے جس نے یہ قانون پاس کیا تھا۔ وہ ہماری زبان میں پارلیمنٹ

---

[1] دہشت پسندی کی ایک مثال یہ ہے کہ شہر صور میں رات کے وقت سید موسیٰ الصدر کے سونے کے کمرے میں ایک شخص گھسا اور ان کے تمام کاغذات بکھیر کر چلا گیا۔ اس پر شہر میں خاصا ہنگامہ ہوا۔ لطف کی بات اس میں یہ ہے کہ سید موسیٰ الصدر کی مخالفت صرف غیروں ہی نے نہیں کی بلکہ خود شیعہ زعما اور علما نے بھی اس تجویز کے خلاف ردِ عمل ظاہر کیا۔ لبنان کے مشہور عالم سید عبدالحسین شرف الدین اعلی اللہ مقامہ کے صاحبزادے سید جعفر شرف الدین جو اس وقت پارلیمنٹ کے ممبر تھے اور عراق کی بعثی حکومت کے ہمنوا تھے، سید موسیٰ الصدر کی مخالفت میں لبنان کے شیعہ جاگیرداروں کے ساتھ تھے۔ اسی طرح لبنان کے مشہور عالم دین نبطیہ کے شیخ تقی صادق، صیدا کے شیعہ قاضی محمد علی ناصر، صور کے شیخ موسیٰ عز الدین مرحوم وغیرہ بھی سید موصوف کے شدید ترین مخالفین میں سے تھے۔

Presented by Ziaraat.Com

کہلاتی ہے لیکن یہ مجلس اسلامی شیعی اعلیٰ صرف شیعوں کا مرکزی ادارہ ہے جس کے صدر سید موسیٰ الصدر منتخب ہوئے تھے[1]۔

یہ مجلس ایک سرکاری اور قانونی حیثیت رکھتی ہے جس میں ۹ عدد علمائے دین شامل ہیں۔ اس کی ایک مجلسِ عاملہ ہے جس کے ۱۲ رکن ہیں جنھیں لبنان کے شیعہ منتخب کرتے ہیں۔ یہ پہلی بار تھا کہ لبنان کے شیعوں نے اپنے تشخّص کا احساس کیا۔ انھیں یہ احساس ہوا کہ وہ کچھ ہیں اور اس قابل ہیں کہ دوسرے فریق سے کھُل کر بات کرسکیں۔ اس مجلس کے قیام کے ایک سال بعد یعنی ۱۹۷۰ء میں سید موسیٰ الصدر نے حکومتِ لبنان سے مطالبہ کیا، کہ وُہ جنوبی لبنان کے شیعوں کے مسائل کو حل کرے کیونکہ اسرائیلی دستے آتے تھے اور جنوبی لبنان کو گولہ باری کا نشانہ بناتے تھے اور بے گناہ شیعہ مارے جاتے تھے، ان کے گھر برباد ہو جاتے تھے اور ان کی داد رسی کرنے والا کوئی نہ ہوتا تھا[2]۔

میں آپ سے عرض کرچکا ہوں کہ پورے جنوبی لبنان میں جتنے دیہات ہیں، اُن کی آبادی شیعہ ہے۔ صرف تین مقامات پر فلسطینیوں کے کیمپ ہیں اور یہ کیمپ اسرائیلی سرحد سے خاصے دُور ہیں کیونکہ یہ کیمپ دُور اس لیے بنائے گئے ہیں کہ یہاں کے رہنے والوں کی اسرائیل سے مڈھ بھیڑ نہ ہو۔ اب فلسطینیوں کو اسرائیل میں داخل ہونے کے لیے لازم ہے کہ وہ شیعہ دیہات سے ہو کر گزریں۔ یہ لوگ جب شیعہ دیہات سے گزر جاتے تھے تو اسرائیلی ہوائی اور بری فوج ان دیہات کو اپنا نشانہ بناتی تھی اور ان کی بے گناہ آبادی کو قتل کرتی تھی۔ اسرائیلی بمبار انھیں موت کے آغوش میں دھکیل دیتے تھے اور انھیں یہ پتا

---

[1] اسی مجلس کے نائب صدر حجۃ الاسلام شیخ محمد مہدی شمس الدین حال ہی میں پاکستان تشریف لائے تھے اور سُنا ہے کہ پاکستان کے شیعوں کے بارے میں نہایت "اچھے خیالات" لے کر واپس ہوئے ہیں۔

[2] یہاں ستم ظریفی کی بات یہ ہے کہ لبنان کی بہادر فوج پہلے تو ان اسرائیلی دستوں کو لبنان میں دَر آنے کا موقع دیتی تھی اور جب وہ لبنانی سرحد کے اندر دُور تک چلے جاتے تو پھر پیچھے سے ان پر گولہ باری کرتی، جس کا نشانہ اسرائیلیوں کے بجائے وہاں کے مقامی لوگ ہوتے۔

نہ چلتا تھا کہ ایسا کیوں ہوا۔ لیکن اگر ایک فلسطینی شہید ہو جاتا تو فلسطینی مزاحمت کے ادارے اس کے خاندان کو اس کے خون کے عوض رقم دیتے تھے کیونکہ یہ ادارے سمجھتے تھے کہ وہ فلسطینیوں کی زندگی کے ذمّہ دار ہیں۔ لیکن جو شیعہ مرجاتے تھے ان کے بارے میں فلسطینی کہتے تھے کہ یہ تو لبنانی ہیں اس لیے ہم ان کے خاندانوں کی مدد نہیں کریں گے۔ حکومتِ لبنان یہ کہتی تھی کہ ان مارے جانے والے لوگوں کا سبب تو فلسطینی ہیں اس لیے ان کا خون بہا فلسطینیوں کو دینا چاہیے، حکومتِ لبنان کیوں دے۔ اور یوں حکومتِ لبنان بھی انکاری ہو جاتی تھی۔ مرنے والے شیعوں کے خاندانوں کو نہ فلسطینی جماعتیں کچُھ دیتی تھیں اور نہ حکومتِ لبنان۔ حالانکہ اس کشت و خون میں سب سے زیادہ نقصان جنوبی لبنان کے شیعوں ہی کو پہنچا ہے۔

بہت سے لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ جنوبی لبنان میں جو شہید ہوتے ہیں وہ سب کے سب فلسطینی ہیں۔ حقیقتِ حال اس کے برعکس ہے۔ دو سال پہلے (۱۹۷۸ء) میں اسرائیل نے جنوبی لبنان پر جو حملہ کیا، میں اور منظر ہلال کے ساتھی اس کے عینی شاہد ہیں اور جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں، شہید ہونے والوں میں ۱۵ فلسطینی تھے لیکن شیعہ آبادی میں سے دو ہزار سے زاید افراد شہید ہوئے۔ دُنیا نہ جانتی ہے نہ سمجھتی ہے وہ تمام شہداء کو فلسطینیوں کے حساب میں لکھ دیتی ہے۔ حالانکہ جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں شہر صور کے قریب فلسطینیوں کے تین کیمپ ہیں۔ جب اسرائیلی حملہ شروع ہوا تو وہ سب کے سب وہاں سے چلے گئے۔ ان کا کوئی شخص یہاں باقی نہ رہا۔ بدنصیب شیعہ جو اپنے گھروں میں بیٹھے رہے اور اپنے گاؤں کو نہ چھوڑ سکے کیونکہ ان میں ایسا کرنے کی سکت نہ تھی، اسرائیلی بمباروں نے انھیں کو نشانہ بنایا اور وہ شہید ہو گئے۔ شیعہ نوجوان بھی یہاں سے نکل گئے تھے ورنہ شہید ہونے والوں کی تعداد کئی ہزار سے بڑھ جاتی۔ مرنے والوں میں صرف بوڑھے، بچے اور عورتیں تھیں کیونکہ وہ بھاگ نہ سکتے تھے۔ جنوبی لبنان کے بعض قصبے ایسے برباد ہوئے کہ ان کی ایک دیوار تک بھی باقی نہ رہی۔ ان قصبوں میں 'غندوریہ'، 'طیبہ' اور 'عباسیہ' وغیرہ شامل ہیں۔ یہ ظلم و ستم سالہا سال سے جنوبی لبنان کے شیعوں کو اپنا نشانہ بناتے رہے ہیں۔ سید موسیٰ الصدر نے حکومتِ لبنان

Presented by Ziaraat.Com

سے اسی بناء پر درخواست کی کہ حکومت کی بہر حال یہ ذمہ داری ہے کہ ان مرنے والوں اور اس بربادی اور نقصان کو اپنے ذمہ لے کیونکہ اگر فلسطینیوں نے اس کا مداوا نہ کیا تو پھر حکومت کے سوا اور کون کرے گا اور کون اس درد کی دوا دے گا۔

اوّلین ہڑتال :

حکومت لبنان اس ذمہ داری کو قبول نہیں کرتی تھی۔ سید موسیٰ الصدر نے حکومتِ لبنان کے خلاف شدید جد وجہد کا آغاز کیا اور لبنان میں ایک عظیم الشان ہڑتال کو راہ دکھائی۔ اس ہڑتال میں سب سے بڑا مظاہرہ شیعوں کی طرف سے ہوائی اڈے کو بند کرنا تھا جو ۱۹۷۰ء میں وقوع پذیر ہوا۔ لبنان کے محروم شیعوں کے لیے مرنا باعثِ افتخار ہے کیونکہ اس کی روزمرہ کی زندگی ایک دردناک تدریجی موت شمار ہوتی ہے۔ جب امام موسیٰ صدر نے حکم دیا شیعہ ہوائی اڈے پر ٹوٹ پڑے اور اس کے تمام رن وے بند کر دیے۔ نہ کوئی جہاز وہاں اُتر سکتا تھا، نہ وہاں سے پرواز کر سکتا تھا۔ بہر حال انھوں نے بیروت میں سب کام کاج بند کروا دیا۔ دوسرے شہروں نے بھی اس ہڑتال میں شرکت کی اور حکومتِ لبنان مجبور ہو گئی کہ سید موسیٰ صدر کے مطالبات کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دے۔ حکومت نے جنوبی لبنان کے لوگوں کے حقوق کے دفاع کے لیے "مجلسِ جنوبِ لبنان" تشکیل دی جس کا سالانہ میزانیہ تین کروڑ لیرہ تھا تاکہ اس سے مرنے والوں کے خاندانوں کی مدد کی جائے اور اجتماعی بہبود کے منصوبے تیار کیے جائیں۔ اس وقت تک پورے جنوبی لبنان میں ایک آدھ مدرسہ تھا، ہسپتال کوئی نہ تھا، پانی بجلی اور زرعی مراعات تقریباً نہ ہونے کے برابر تھیں۔ حکومتِ لبنان نے تجویز پیش کی کہ سید موسیٰ صدر مجلسِ جنوبِ لبنان کے سربراہ بن جائیں لیکن انھوں نے اسے قبول نہ کیا کیونکہ وہ نہیں چاہتے تھے کہ وہ سرکاری خرابیوں، رشوت خوریوں اور اقربا پروریوں میں شریک ہوں۔ مجلسِ جنوبِ لبنان بھی اس قابل نہ تھی کہ لبنان کے حالیہ نظام کی انتظامی آلودگیوں سے مستثنیٰ ہو خصوصاً اس وقت جب وہ لبنانی پارلیمنٹ کے سپیکر کامل الاسد کے زیرِ تسلط آ گئی۔ اس نے اپنے کاسہ لیسوں کو اس پر مسلط کر دیا۔

اور اس میزانیے کا بیشتر حصہ خرد برد ہو گیا لیکن اس کے باوجود کافی اجتماعی منصوبے تکمیل پذیر ہوئے۔ ۷۵ سے زیادہ مدرسے بنے، ۴ بڑے بڑے ہسپتال قائم ہوئے مجلس الاسلامی الشیعی الاعلیٰ کی طرف سے ایک سو گشتی ڈسپنسریاں کام میں مشغول ہو گئیں، آبپاشی، زراعت اور سڑکیں تعمیر کرنے کے منصوبے معرضِ وجود میں آئے یوں جنوبی لبنان کے لوگوں کی بہبود کے لیے نسبتاً بہتر اقدامات ظہور پذیر ہوئے۔

اس بناء پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ لبنانی شیعوں کی پہلی فتحیابی تھی۔ اپنی تاریخ میں پہلی بار شیعہ کامیاب ہوئے ہیں۔ وہ حکومتِ لبنان سے پنجہ آزمائی کرتے ہیں اور اپنا حق حاصل کر لیتے ہیں کہ ہر شہید ہونے والے کے عوض میں دس ہزار لیرے اس کے خاندان کو دیے جائیں اور جب اسرائیلی بمبار کسی مکان کو برباد کریں تو حکومت اس کا خسارہ خود برداشت کرے۔

سید موسیٰ الصدر اس بات کے معتقد تھے کہ ان ویران گھروں کو از سرِ نو تعمیر کرنا چاہیے تاکہ شیعہ اپنے گھروں کو واپس آ جائیں اور ہجرت نہ کریں کیونکہ شیعوں کو اپنے گھروں سے بے گھر کرنا اسرائیلیوں کے پروگرام میں شامل ہے۔ اسرائیل یہ چاہتا ہے کہ وہ دُنیا سے یہ کہے کہ اس علاقے میں کوئی آباد نہیں اور اسرائیل کے پاس نفری زیادہ ہے لہٰذا لازم ہے کہ وہ اپنے لوگوں کو اس جگہ منتقل کرے۔ اُس نے یہی حیلہ فلسطین کو ہڑپ کرنے کے لیے استعمال کیا تھا۔ اس سلسلے میں ہماری کوشش یہی رہی ہے کہ شیعہ واپس آ جائیں، اپنے گھروں کو از سرِ نو تعمیر کریں، وہیں رہیں اور اپنے آباء و اجداد کی زمین کو ترک نہ کریں۔ ہمارے لیے باعثِ فخر بات یہ ہے کہ ان لوگوں نے اپنے گھروں کو ترک نہیں کیا وہیں رہے۔ وہ شہید پیش کرتے ہیں، مقابلہ کرتے ہیں، لیکن رہتے وہیں ہیں۔ یہ بہت بڑا کارنامہ ہے جو سید موسیٰ الصدر نے سرانجام دیا۔

بہر حال ہم یہ دیکھتے ہیں کہ سید موسیٰ الصدر نے بیروت میں آ کر مجلس الاسلامی الشیعی الاعلیٰ تشکیل دی اور لبنان کی حکومت سے ایک عظیم مقابلہ کیا اور کامیاب ہوئے۔ یہ کامیابی اس بات کا باعث ہوئی کہ وہ شیعہ جو بائیں بازو کی جماعتوں میں شامل ہو گئے تھے، انھوں نے

Presented by Ziaraat.Com

سیّد موسیٰ صدر کی طرف توجہ کی۔ وہ اس لیے متوجہ ہوئے کہ اب ایک شیعہ کے لیے ممکن تھا کہ وہ آئے اور اپنے چھنے ہوئے حقوق کو حاصل کرے۔ کمیونسٹ پارٹی نے ۵۰ سال لبنان میں کام کیا لیکن اس قابل نہ ہوئی کہ شیعوں کے لیے ایک حق حاصل کر سکے۔ انھوں نے دو سال کی مدّت میں شیعوں کے لیے بڑی بڑی مراعات حاصل کیں اور لبنان کی حکومت کو جھنجوڑ کر رکھ دیا۔ یہ بات اس چیز کا باعث ہوئی کہ شیعہ اپنے احساسِ کمتری پر غلبہ حاصل کر لیں جو ان کے دل میں کھٹکتا رہتا تھا اور انھیں پریشان کرتا تھا۔ اس کامیابی سے اس احساس میں خاصی کمی واقع ہو رہی تھی۔ وہ نوجوان جو مختلف پارٹیوں میں منتشر ہو گئے تھے آہستہ آہستہ سیّد موسیٰ الصدر کے گرد جمع ہو رہے ہیں۔ آقائے صدر کی شہرت اور مجلسِ اسلامی شیعی الاعلیٰ کی عظمت روز بروز بڑھتی جا رہی ہے۔

بیس مطالبات :

مجلسِ جنوب کا قیام اور اس کے اجتماعی پروگرام جنوبی لبنان کی بے سروسامانی اور مشکلات کا مداوا نہ تھے۔ جنوب کے لیے تین کروڑ لیرے کے میزانیے کے مقابلے میں پورے لبنان کے لیے اجتماعی اور معاشرتی بہبود کے کاموں کے لیے جو میزانیہ تھا اس کی مقدار نوّے کروڑ لیرہ تھا۔ جنوبی لبنان اور بعلبک و عکار کے افراد کی سالانہ آمدنی تقریباً ۵۷ لیرے ہے جبکہ جبل لبنان اور لبنان کے مسیحی مناطق میں افراد کی اوسط سالانہ آمدنی کئی ہزار لیرے تک پہنچتی ہے۔

سیّد موسیٰ الصدر ہمیشہ شیعوں کی اجتماعی بہبود کے لیے کوشش کرتے رہتے تھے اور نئے نئے مطالبات پیش کرتے تھے۔ یہاں تک کہ ۱۹۷۲ء میں جب انھوں نے خاصی قوت حاصل کر لی تو انھوں نے حکومتِ لبنان سے محروموں اور مستضعفوں کے لیے بیس مطالبات پیش کیے۔ ان میں سے ایک مطالبہ یہ تھا کہ جنوبی لبنان میں شیعہ نوجوانوں کو مسلح کیا جائے تاکہ وہ اسرائیل کے خلاف جنگ آزما ہو سکیں۔ ایک اور مطالبہ یہ تھا کہ جنوبی لبنان کے ان قریوں اور قصبوں میں پناہ گاہیں تعمیر کی جائیں جو اسرائیل کی زد میں آتے تھے۔ ایک اور مطالبے میں

یہ کہا گیا تھا کہ بیروت سے جنوب تک ایک شاہراہ تعمیر ہو تاکہ لوگوں کو آنے جانے میں سہولت ہو۔ سیّد موسیٰ صدر کے اجتماعی بہبود کے پروگرام میں سب سے بڑا لیطانی بند کی تعمیر تھا۔ لیطانی لبنان کا سب سے بڑا دریا ہے جو وادی بقاع سے ہوتا ہوا شہر صور کے ذرا شمال میں بحیرۂ رُوم میں آگرتا ہے۔ اسرائیل کی خواہش یہ ہے کہ وہ اس دریا کا رُخ موڑ کر اپنے علاقے میں لے جائے کیونکہ اسے پانی کی شدید احتیاج ہے۔ ۱۶، ۱۷ سال قبل حکومتِ لبنان نے ایک منصوبہ تیار کیا تھا کہ اس دریا پر ایک بند باندھا جائے تاکہ اس سے جنوبی لبنان کے علاقوں کو سیراب کیا جائے لیکن اسرائیل اس کی مخالفت کرتا ہے۔ اسرائیل نہیں چاہتا کہ جنوبی لبنان میں زمینیں آباد ہوں۔ اس کے عوض میں اس کی خواہش یہ ہے کہ دریا کا رُخ موڑ کر اس کا پانی اسرائیل لے جائے۔ اس امر کے باوجود کہ اس بند کی تعمیر کے لیے پیسہ موجود ہے، نقشے بنے ہوئے ہیں، یہ بند تعمیر نہیں ہو سکا۔ گزشتہ ۱۷ سال سے اسرائیل اس بند کی تعمیر کی مخالفت کر رہا ہے اور حکومتِ لبنان جو اسرائیل کی دستِ نگر ہے اپنے اندر یہ کس بَل نہیں رکھتی کہ وہ اسرائیل کی مخالفت مول لے۔ لیکن سیّد موسیٰ الصدر آگے بڑھے اور انھوں نے اعلان کیا کہ اس بند کی تعمیر جنوبی لبنان کے باشندوں کا فطری حق ہے اور اسی لیے انھوں نے حکومت سے مطالبہ کیا کہ یہ بند فوری طور پر تعمیر کیا جائے۔

ایک اور مطالبہ یہ تھا کہ ان ہزارہا ۔۔ نوں کو لبنانی شناختی کارڈ دیے جائیں جن کے پاس یہ کارڈ نہیں ہیں کیونکہ انھوں نے فرانسیسی انتداب کے زمانے میں یہ قبول نہ کیا کہ فرانس کی استعماری حکومت سے یہ شناختی کارڈ حاصل کریں۔ ان بیس مطالبات میں سے مزید اہم مطالبات میں یہ شامل تھا کہ حکومت لبنان کی سول اور فوجی آسامیوں کی تقسیم عادلانہ ہو، ذخیرہ اندوزی کی روک تھام ہو، دولت کی عادلانہ تقسیم ہو اور محروم و مظلوم لوگوں کے لیے اجتماعی عدل مہیا کیا جائے۔

یہ بات مسلّم تھی کہ حکومتِ لبنان ان مطالبات کو تسلیم نہیں کرے گی۔ لبنانی حکومت یہ کہتی تھی کہ اگر ہم لبنانی شیعوں کے ان مطالبات کو تسلیم کر لیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اوّل سے آخر تک ان مطالبات کو قبول کر لیا جائے اور ان کے مطابق اقدامات کیے جائیں۔ لہٰذا لبنانی حکومت نے ان تمام مطالبات کے مقابلے میں مزاحمت کا ردِّ عمل پیش کیا۔

Presented by Ziaraat.Com

۱۹۷۴ء میں شیعہ مطالبات کا مسئلہ شدید ترین زور پکڑ گیا اور لبنان کی تمام سیاسی سرگرمیوں اور اس کے اخبارات و جرائد کو اس نے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ آقائے صدر نے حکومت کو الٹی میٹم دے دیا اور شیعہ وزراء نیز ارکانِ مجلس سے کہا گیا کہ اگر ایک معین مدت تک حکومت سے مناسب جواب نہ ملے تو وہ اپنے اپنے مناصب سے استعفیٰ دے دیں اور اگر یہ بات بھی حکومت کو متاثر نہ کرے تو پھر سول نافرمانی شروع کی جائے اور اسے اس وقت تک جاری رکھا جائے جب تک کامیابی حاصل نہ ہو اور اس کے لیے حالات کے مطابق طریقِ کار وضع کیا جائے۔ یہ سلسلہ جاری تھا کہ ۱۹۷۳ء کے رمضان میں عربوں اور اسرائیل کے درمیان جنگ چھڑ گئی جس کا تقاضا یہ تھا کہ تمام توجہات بیرونی دشمن کے خلاف نبرد آزما ہوں۔ اس کے نتیجے میں شیعہ مطالبات کا مسئلہ خاموش پڑ گیا اور اس جنگ کے ختم ہونے کے چھ ماہ بعد اس مسئلے نے دوبارہ سر اٹھایا۔

بعلبک میں مسلح مظاہرات

لبنانی شیعوں کی جد و جہد کے زور پکڑنے اور حکومت کی طرف سے مناسب جواب نہ ملنے پر سید موسیٰ الصدر نے بعلبک میں عام مظاہرات کا حکم دیا تاکہ مخالفوں کو اپنی قوت کا اندازہ کروایا جائے۔ بعلبک کے ۷۵ ہزار باشندوں نے بڑے جوش و سرگرمی سے آقائے صدر کی آواز پر لبیک کہی اور مسلح مظاہرات کے ذریعے سے لبنان کی عیسائی حکومت کو لرزہ براندام کر دیا۔ یہ مظاہرات ۱۷ مارچ ۱۹۷۴ء کو عمل میں آئے۔ مظاہرین کی تعداد اور توپوں اور مارٹرول کے گولوں کی آواز سے کان پھٹے پڑتے تھے۔ عربوں کا ایک طریقہ ہے کہ جشن کے موقع پر یا کسی کی موت کے موقع پر گولیاں چلاتے ہیں لیکن ان مظاہرات میں بندوقوں سے فائرنگ کی بجائے، توپوں، مارٹروں اور راکٹوں سے زمین و آسمان میں چراغاں کر دیا گیا تھا۔ ۷۵ ہزار بعلبکیوں نے اس مسلح مظاہرے میں شرکت کی جو لبنان کی تاریخ میں اپنی مثال آپ تھا۔ لبنان کی پوری فوج کی نفری ۱۲ ہزار افراد پر مشتمل تھی۔ اس بات کے تصور نے کہ سید موسیٰ الصدر ۷۵ ہزار مسلح بعلبکیوں کو جمع کرنے پر قادر ہیں، حکومت کے ایوانوں میں زلزلہ

پیدا کر دیا۔ یہ ۷۵ ہزار مظاہرین ان مظاہرات میں شریک ہوئے اور انھوں نے قسم کھائی کہ اپنے خون کے آخری قطرے تک ظلم و ستم اور فرقہ وارانہ امتیازات کے خلاف جنگ آزما ہوں گے اور اپنے غصب شدہ حقوق کو دوبارہ حاصل کریں گے۔

طاقت کے اس اظہار کے مقابلے میں لبنان کی حکومت لرز اٹھی اور پریشان ہو گئی، کیونکہ بعلبک کے جوان جنگ جوئی میں شاید دنیا میں اپنی مثال نہ رکھتے ہوں۔ یہاں کے نوجوان بچپن ہی سے نشانہ بازی اور گھڑ سواری کی مشق کرتے ہیں۔ لبنان کے علاقے میں اگر کوئی شخص طبعی موت مر جائے تو کہتے ہیں کہ بے کار مرا۔ لازم ہے کہ شہید ہو اور لڑتا ہوا مارا جائے۔ یہ جنگ جو افراد جب اسلحہ لے کر شہر میں ظاہر ہوتے ہیں تو کوئی شخص اور کوئی طاقت ان کی راہ میں رکاوٹ نہیں ڈال سکتی۔ چونکہ یہاں کے عیسائی کاروباری لوگ ہیں اور ان کی اپنی مصلحتیں ہیں اس لیے ایک عیسائی نوجوان یہ پسند نہیں کرتا کہ وہ خواہ مخواہ مارا جائے اور یہی کیفیت غیر شیعہ مسلمانوں کی ہے۔ لیکن بعلبکی شیعہ ایک طرف تو فقر و محرومی کا شکار ہے اور مظلوم و مستضعف ہے اور دوسری طرف اس کی رگوں میں خونِ حسینی دوڑتا ہے اور سید موسیٰ الصدر ایسا رہنما اس کی قیادت کرتا ہے۔ جب وہ "یا علیؑ" کا نعرہ بلند کرتا ہے تو ٹینک لرز اٹھتے ہیں۔ میں نے میدانِ جنگ میں دیکھا ہے کہ جب بعلبکی نوجوان باہر نکلتا ہے تو افسر ہوں یا سپاہی، سب بھاگ جاتے ہیں چونکہ انھیں معلوم ہے کہ یہ وہ شخص ہے جسے ڈرنا نہیں آتا اور وہ فوراً گولیوں کی بوچھاڑ شروع کر دے گا، رُکے گا نہیں۔ اس اظہارِ قوت کا نتیجہ یہ نکلا کہ لبنانی حکومت لرزہ براندام ہو گئی اور اس نے سات ارکان کا ایک کمیشن مقرر کیا کہ شیعوں کے مطالبات کا جائزہ لے۔ اس کمیشن میں بڑے بڑے افسر شامل تھے۔ انھوں نے ان مطالبات کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ رپورٹ پیش کی کہ وہ سب مطالبات جائز ہیں اور انھیں پورا ہونا چاہیے۔ لیکن حکومتِ لبنان سرِ تسلیم خم کرنے پر آمادہ نہ تھی۔ اس لیے انھوں نے اس رپورٹ پر عمل کرنے سے انکار کر دیا۔ آقائے صدر نے اپنی طاقت کے اظہار کے طور پر جنوبی لبنان کے شہر صور میں جو اسرائیلی سرحد سے بہت کم فاصلے پر ہے ایک اور مسلح مظاہرہ کروایا۔

لبنان کی حکومت نے کوشش کی کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بعلبک کے مظاہرے

Presented by Ziaraat.Com

کی یاد فراموش ہو جائے اور یہ بھی کوشش کی کہ شیعوں میں پھوٹ ڈلوائے ۔ کامل الاسعد (لبنانی مجلس کے شیعہ سپیکر) جو جاگیردارانہ نظام کی پیداوار ہے سید موسیٰ الصدر کے خلاف اعلانیہ جنگ پر اُتر آیا۔ اس نے اپنے اردگرد ایسے عمامہ پوشوں کو جمع کر لیا جن کی نہ کوئی حیثیت تھی نہ کوئی مقام، اور جن کے عماموں کے نیچے ایسے سر تھے جن میں نہ مغز تھا، نہ شعور، اُس نے ٹیلیویژن پر تقریروں میں یہ بات کہی کہ اصل جنگ سید موسیٰ الصدرؒ اور علمائے شیعہ کے مابین ہے اور یہ اس لیے کہی کہ شیعیان لبنان کے حملے کا رُخ حکومتِ لبنان سے پھیر کر خود شیعوں کی طرف کر دیا جائے اور آزادی طلب کرنے والی اور عدالت تلاش کرنے والی قوتیں داخلی جھگڑوں میں مبتلا ہو جائیں۔ لیکن سید صدر نے اپنی بلند نظری اور ژرف نگاہی سے کام لے کر کامل الاسعد کے حملوں کا جواب نہ دیا۔ انھوں نے رسمی طور پر اعلان کیا کہ شیعہ بزرگوں کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے اور ہماری جنگ صرف حکومت سے ہے اور اس لیے ہے کہ تمام محروم اور مظلوم لوگوں کے لیے اجتماعی انصاف حاصل کیا جائے ۔ لیکن کامل الاسعد اور نظامِ حکومت اپنی کارروائیوں سے دست بردار نہ ہوئے ۔ انھوں نے بعلبک کے مظاہرات کو بے اثر کرنے کے لیے یہ کہنا شروع کیا کہ بعلبک اور چیز ہے اور شیعہ فرقہ اور چیز۔ بعلبک والے تو سید موسیٰ الصدر کے پُرانے طرف دار ہیں لیکن جنوبی لبنان، جہاں شیعوں کی اکثریت ہے کامل الاسعد کے طرفدار اور حمایتی ہیں لہٰذا سید موسیٰ صدر کے مخالف ہیں ۔ اس بناء پر حکومتِ لبنان نے جس کی صدارت سلیمان فرنجیہ ایسے قاتل ستم کیش اور خبثِ باطن سے مملو شخص کے پاس تھی، بڑی ڈھٹائی سے آقائے صدر اور شیعوں کی ضد میں ان کے مطالبات تسلیم کرنے سے انکار کر دیا ۔

شہر صور (Tyre) کے مظاہرات

کامل الاسعد کے بے بنیاد دعوے کے جواب میں اور اس بات کی پیش بندی کے لیے کہ حکومتِ لبنان اس سے ناجائز فائدہ حاصل نہ کرے سید موسیٰ الصدر نے جنوبی لبنان کے ایک بڑے شہر صور میں عام مظاہرات کا اعلان کیا (یہ شہر جس کو انگریزی میں

لکھا جاتا ہے) اسرائیل کی سرحد سے ۲۰ کلومیٹر کے فاصلے پر ہے ۔ جنوبی لبنان کے لوگ ظلم و ستم کا مسلسل شکار ہونے کے باعث حوصلے کے ذرا بودے تھے لہٰذا ڈرا کرتے تھے لیکن اس کے باوجود جنوبی لبنان کے ایک لاکھ پچاس ہزار افراد نے ۵ مئی ۱۹۷۴ء کو ایک عظیم الشان مظاہرے میں شرکت کی ۔ پورے جنوبی لبنان میں چار لاکھ کی آبادی ہے۔ اس میں سے ایک لاکھ پچاس ہزار افراد ان مظاہروں میں شریک ہوئے ۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ چھوٹے بڑے تمام مردوں نے اس میں شرکت کی اور وہاں یہ قسم اُٹھائی کہ وہ اپنے خون کے آخری قطرے تک اپنے غصب شدہ حقوق کو دوبارہ حاصل کرنے کے لیے جنگ آزما ہوں گے ۔

لبنانی حکومت نے اس بات کے پیشِ نظر کہ لوگ مظاہروں میں نہ جائیں تمام سڑکوں پر بڑے بڑے کیل پھینک کر انھیں ناقابلِ استعمال بنا دیا ۔ بے شمار لوگ جو ان مظاہرات میں شریک ہونا چاہتے تھے وہ مجبور تھے کہ ایک دن یا ایک رات پہلے اپنے آپ کو شہر صور میں پہنچا دیں ۔ لیکن تمام گاڑیاں رستے میں پنکچر ہو گئیں اور وہیں کی وہیں رہ گئیں ۔ میں خود مدرسۂ جبلِ عامل سے ایک بہت بڑے زرعی ٹریکٹر میں پہنچا ۔ ہم نے ٹریکٹر کے دونوں طرف درخت باندھ رکھے تھے جس کی شاخیں جھاڑو کی طرح زمین کو صاف کرتی تھیں ۔ ہم نے ٹریکٹر بھیجے تاکہ وہ سڑکوں کو صاف کریں اور لوگ صور پہنچ سکیں ۔ میں یہ جانتا تھا کہ جب ہمارے ٹریکٹر سڑکوں کو صاف کریں گے تو لبنانی فوج انھیں روکے گی ۔ اس بناء پر میں نے بعلبک کے دو افراد ٹریکٹر میں چھپا دیے ۔ انھوں نے اپنا خاص علاقائی لباس پہن رکھا تھا اور ان کے ہاتھوں میں کلاشینکوف (ہلکی مشین گن) تھیں ۔ جب ٹریکٹر نے سڑک کو صاف کرنا شروع کر دیا تو سپاہیوں کے ایک دستے نے اسے روکا ۔ ان کا افسر آیا اور ڈرائیور سے بڑے تلخ انداز سے پوچھا کہ "تم کون ہو"۔ اُس نے کہا "میں مدرسہ جبل عامل کا طالب علم ہوں"۔ اس نے اسے گالیاں دیں اور بڑے توہین آمیز لہجے میں کہا "تمھیں کیا حق ہے کہ ان میخوں کو صاف کرو"۔ اس اہانت کو سُن کر دونوں بعلبکی جو ٹریکٹر کے پیچھے بیٹھے ہوئے تھے اُٹھ کھڑے ہوئے اور اپنی کلاشینکوف کا رُخ اُس کی طرف کر کے کہنے لگے کہ "اگر ایک لحہ تم اور ٹھہرے تو ہم

Presented by Ziaraat.Com

تمھیں بھُون ڈالیں گے۔" اس افسر نے فوراً فوجی سلام کیا اور کہا کہ "معافی چاہتا ہوں، میں نے آپ کو نہیں دیکھا تھا۔ معذرت قبول کیجیے۔" یہ کہہ کر وہ اپنے سپاہی لے کر وہاں سے چلا گیا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ ان ببلیکیوں سے آنکھیں چار کرنا مشکل ہے، اگر انھیں روکا تو موت یقینی ہے۔

اس قسم کے ہولناک مظاہرے تھے جو لبنان میں ہو رہے تھے اور اس قسم کے سرفروش اور زندگی سے سیر جوان تھے جو اس پروگرام کو چلا سکتے تھے اور اب بھی بیروت میں اگر آپ دیکھیں کہ عراق اور دوسری طاقتوں کے زرخریدوں کے مقابلے میں یہ لوگ مردانہ وار جنگ کر رہے ہیں تو وہ اسی قسم کے جوان ہیں جو موت سے نہیں ڈرتے اور شہادت ان کے لیے باعثِ فخر ہے۔

کامل الاسعد کے کرائے کے آدمیوں نے جنوبی لبنان کے تمام شہروں اور قصبوں میں خوف وہراس کی ایک فضا پیدا کر دی تھی اور وہ یہ افواہیں پھیلا کر کہ مظاہرے کے دن کامل الاسعد کے آدمی مسلح حملے کریں گے، خون ریزی ہوگی اور جو کوئی شخص مظاہرے میں گیا اسے جان کا خطرہ لاحق ہوگا۔ لبنانی فوج کے دستوں نے بھی مختلف طریقوں سے سڑکوں پر رکاوٹیں کھڑی کر کے کامل الاسعد کے پروپیگنڈے کو تقویت دی۔ اس کے علاوہ کرائے کے مسلح آدمی بھی لائے گئے تاکہ وہ سید الصدر کے حمایتیوں پر حملے کریں۔ ان کرائے کے آدمیوں میں ایک شخص محمد حیدر نامی بھی تھا جو ایک پیشہ ور دہشت پسند تھا اور قتل کے جرائم میں قید خانے میں سزا بھگت رہا تھا، حکومتِ لبنان نے اسے اس موقع پر اسی کام کے لیے آزاد کر دیا اور تھپکی دی۔ اسے کافی رقم دی گئی، اسلحہ دیا گیا اور خود فروش مسلح آدمی دیے گئے تاکہ وہ عوام کو تنگ کریں۔ انھوں نے ہر اس گاڑی کو جس پر سید الصدر کی تصویر نصب تھی گولیوں کا نشانہ بنایا اور کافی لوگوں کو زخمی کر دیا لیکن سید الصدر نے اس خیال کے پیشِ نظر کہ حکومت کو بہانہ حاصل نہ ہو، یہ حکم دیا کہ کسی صورت بھی ان غنڈوں کا مقابلہ نہ کیا جائے۔ کس قدر ان لوگوں کا صبر تھا جن پر حملے ہوتے تھے، جو زخمی ہوتے تھے، لیکن انھوں نے کوئی جوابی کاروائی نہ کی اور حکومت کو کوئی بہانہ ہاتھ نہ آنے دیا۔

مظاہرے کا دن آپہنچا۔ ہزارہا اشخاص جوق در جوق مختلف قسم کی گاڑیوں پر، ٹرکوں پر، ٹرالیوں پر اور گدھوں پر سوار ہو کر، یا پھر پا پیادہ صور کی جانب رواں دواں تھے تاکہ تمام سازشوں کے برخلاف اپنی اس تحریک کے رہبر کے ساتھ اپنی وفاداری کا ثبوت دیں۔ ایک محشر بپا تھا۔ لبنانی فوج اور رجعت پسند قوتیں عوام کے اس سیلِ عظیم کے سامنے خاموش ہو گئیں اور شہر صور میں ایک لاکھ پچاس ہزار سے زائد اشخاص جمع ہو گئے۔ آقائے صدر نے ان ضمیر فروش چمگادڑوں پر شدید حملہ کیا اور ان کی اور ان کے پٹھوؤں کی فریب کاریوں کے چہرے سے نقاب اتار دی اور لبنان کے شیعوں کو اتحاد کی تلقین دی اور لوگوں نے ان کے سامنے یہ قسم اٹھائی کہ اپنے خون کے آخری قطرے تک استحصال سے آزادی، اجتماعی عدل کے حصول اور بیرونی دشمن کے مقابلے میں لبنان کے دفاع کے لیے کوشاں رہیں گے اور اس کے لیے کسی قسم کی قربانی پیش کرنے سے گریز نہ کریں گے۔

بہرحال یہ مظاہرے برپا ہو گئے اور لبنانی حکومت اس نتیجے پر پہنچی کہ شیعوں اور محروموں کی تنظیم کے مقابلے میں وہ کمزور ہے اور اکیلے کچھ کام نہیں کر سکتی۔

بیروت کے مظاہرات کی روک تھام:

صور کے کامیاب مظاہروں کے بعد کامل الاسعد اور اس کے حمایتیوں کے پوچ دعوٰی کے ڈھول کا پول کھل گیا اور شیعوں کی جدوجہد بڑی کامیابی اور تیزی کے ساتھ حکومتِ لبنان کے خلاف صف آرا ہو گئی۔ اب چپقلشیں اور آویزشیں بالکل واشگاف ہو گئی تھیں اور اب یہ طے پایا تھا کہ لبنان کے دل یعنی بیروت میں شیعوں کے مظاہرات برپا کیے جائیں تاکہ اب بھی اگر کوئی سو رہا ہو تو بیدار ہو جائے۔ یہ طے پایا کہ ان مظاہرات کا آغاز ایک عام ہڑتال سے کیا جائے اور اگر اس سے کوئی نتیجہ حاصل نہ ہوا تو پھر سول نافرمانی کا آغاز کیا جائے اور ایک عوامی بھوک ہڑتال کر کے اور شہر کے بڑے بڑے بازاروں میں دھرنا مار کر بیروت کا تمام کاروبار بند کر دیا جائے۔ لیکن لبنان کچھ اور حادثات کی گرفت میں آنے والا تھا۔ ان حادثات میں فلسطینی مزاحمت کو ناپید کرنا اور لبنان کے

Presented by Ziaraat.Com

آزادی پسند اور ترقی پسند لوگوں پر ہر جانب سے شب خون مارتا تھا۔ ان حوادث کی بناء پر مفادِ عامہ کے پیشِ نظر شیعوں اور مظلوموں کے مطالبات از سر نو سرد خانے میں جا گرے۔

محرومون کی تحریک کا آغاز:

جب ۱۹۷۱ء میں میں جنوبی لبنان میں وارد ہوا تو میں نے "انجمن ہمای اسلامی دانشجویان" کے انداز میں اسلامی آئیڈیالوجی کی تدریس کے لیے جماعتوں کا آغاز کیا۔ میں نے ہر گاؤں سے ایک یا دو نفر ایسے اُستاد چنے جو دل میں اسلام اور ایمان کی روشنی رکھتے تھے۔ ان کی تعداد کوئی ۱۵۰ افراد تھی۔ یہ سب لوگ ہفتے میں ایک بار مدرسے آتے اور وہاں اسلامی موضوعات پر جلسے ہوتے جن میں خود آقائے صدر، شیخ مہدی شمس الدین، سیّد محمد حسین فضل اللہ اور دیگر حضرات تقاریر فرماتے اور اس کے بعد بحث مباحثے کا بازار گرم ہوتا۔ اس کے بعد میں بھی آہستہ آہستہ بحث میں شریک ہونے لگا اور یوں اسلامی آئیڈیالوجی کی تدریس کا آغاز ہوا۔ اس تعداد میں سے نصف کے قریب اس دُنیا سے انتقال کر گئے اور باقی نصف تعداد جو بچ رہے، انھی لوگوں نے جنوبی لبنان میں "حرکت محرومین" (محروموں کی تحریک) کو تشکیل دیا۔

بیروت میں بھی ہم نے اسی قسم کا کام جاری رکھا۔ مشکلات کافی تھیں تاہم یہ فکری تحریک چل نکلی جس نے لوگوں میں فکری وحدت اور آئیڈیالوجی کی گہرائی پیدا کرنے میں بڑی مدد کی۔

یوں ہم نے چیدہ چیدہ شیعہ نوجوانوں کو منظم کیا اور انھیں تیار کیا۔ انھی باایمان نوجوانوں سے بعد ازاں "جنگی دستے"، "محروموں کی تحریک" اور "تحریکِ امل" تشکیل پذیر ہوئے اور لبنان کی شیعہ آبادی ساری کی ساری محروموں کی تحریک اور سیّد موسیٰ صدر کی طرف متوجہ ہوگئی۔

یہ شیعہ جوق در جوق اس تحریک میں شامل ہوئے جس کی نگرانی بھی اسی فقیر کے سپرد ہوئی۔ یہ نوجوان پارٹیوں کو چھوڑ دیتے اور اس تنظیم میں شامل ہو جاتے جو تنظیم عقیدے کی اساس پر، اسلامی آئیڈیالوجی کی اساس اور علیؑ و حسینؑ کے طریقے پر تشکیل پذیر ہوئی تھی۔ ہر ایک شیعہ اپنے اندر ایک طوفان محسوس کرتا اور اشک بہاتا۔ قصبوں اور دیہات میں "حرکت محرومین" کے

دفتر کے سامنے جمع ہو جاتے تاکہ اپنا نام لکھوائیں اور اس تحریک میں شامل ہو جائیں۔ ہم نہیں چاہتے تھے کہ انھیں قبول کریں۔ ہم انکار کر دیتے تھے کیونکہ ہم میں یہ قدرت نہ تھی کہ انھیں منظم کر سکیں۔ ہمیں کچھ معلوم نہ تھا کہ ان کا کیا کریں۔ ہم فقط اساتذہ کو، مدرسوں سے فارغ التحصیل لوگوں کو یا ان طلبہ کو جو ہائی سکولوں کے آخری سال میں تعلیم حاصل کر رہے تھے قبول کر لیتے تھے تاکہ ان سے دستے منظم کیے جائیں اور یہ بات اس لیے بھی تھی کہ ہم جانتے تھے کہ ساری کی ساری شیعہ آبادی اس تحریک میں شامل ہے اس لیے اس کی ضرورت نہ تھی کہ ہم ان کے نام لکھتے۔ پھر ہم یہ بھی نہیں چاہتے تھے کہ یہ تحریک ایک دکان بن جائے اور ہر کس و ناکس یا ہر قسم کے غلط سلط افکار اس میں شامل ہو جائیں اور خدانخواستہ لبنان کی دیگر پارٹیوں کی طرح ایک اور پارٹی اُبھر آئے جس کا کام دروغ بافی، تہمت تراشی، ہیرا پھیری، لوگوں کی جیب تراشی، حکومت سے سودے بازی اور مفادات کی تقسیم ہو۔ ہم نے ابتدا ہی سے اس بات کو واضح کر دیا تھا۔ کہ ہم نے ایک تحریک شروع کی ہے، کوئی پارٹی نہیں بنائی اور تحریک اپنے نفس کے خلاف جنگ اور اس کی تربیت نیز اخلاق کی اصلاح سے شروع ہوتی ہے نہ کہ مادی فوائد اور شخصی مصلحتوں سے۔ ہماری فکری بنیاد اس تحریک کے منشور کی پہلی شق تھی۔ ایمان باخدا تھا۔ جب تک کوئی شخص خدا کو نہیں جانتا اور اس پر ایمان نہیں لاتا وہ اس تحریک میں شامل نہیں ہو سکتا تھا۔ خدا پر ایمان اور قوانینِ الٰہیہ کے مطابق عمل اس تحریک میں شمولیت کے لیے ضروری تھا۔ جو کوئی اپنی زندگی کی منزل خدا کو قرار دے، خدا کے لیے جنگ کرے، اس زمین میں خلیفۂ خدا بنے، اپنے صفات و اعمال سے صفاتِ الٰہیہ کی جھلک دکھائے اور مختصراً یہ کہ علیؑ و حسینؑ کا نمائندہ بنے، وہی اس تحریک میں شامل ہو سکتا تھا۔

اس تحریک کی آئیڈیالوجی، اسلام کی آئیڈیالوجی تھی۔ اس اسلام کی جس کا سردارانِ قبائل، جاگیرداروں، فرسودہ خیال عورتوں اور مردوں اور لبنان کے رواجی دین سے کوئی تعلق نہ تھا۔ یہ فکر اور یہ حرکت تیزی سے آگے بڑھی اور سچ کہتا ہوں کہ اس کی ترقی، اس کا استمرار اور اس کی کامیابی آقائے صدر کے وجود کی برکت سے تھی۔

Presented by Ziaraat.Com

انسانوں کی قدر و قیمت اس تحریک پر مبنی ہوتی ہے جسے وہ چلاتے ہیں :

ہم ہر انسان کو اس کے فکر و عمل کے لحاظ سے جانتے ہیں۔ آپ کو یہ معلوم ہے کہ انسانی تاریخ میں بڑے بڑے افراد آتے ہیں اور چلے جاتے ہیں۔ فرض کیا جائے کہ بہت بڑا پہلوان یا بہت بڑا ویٹ لفٹر ظاہر ہوتا ہے اور شہرت کی بلند سطحوں پر پہنچ جاتا ہے لیکن جب وہ بوڑھا ہو جاتا ہے یا جب وہ مر جاتا ہے تو پھر اس کا کوئی نشان باقی نہیں رہتا بس اس دُنیا سے چلا جاتا ہے اور اس کی داستان ختم ہو جاتی ہے۔ بے شمار ادیب، سخن ور اور سیاستدان مشہور ہوتے ہیں لیکن اس کے بعد چلے جاتے ہیں، ختم ہو جاتے ہیں۔ تاریخ میں ہم نے ایسے بے شمار افراد کو دیکھا ہے لیکن کچھ ایسے لوگ ہوتے ہیں جو کسی تحریک کا آغاز کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم۔ انھوں نے ایک ایسی تحریک کی بنیاد رکھی جو ان کے اس دُنیا سے چلے جانے کے بعد صدیوں تک مضبوط سے مضبوط تر ہوتی چلی جا رہی ہے، یعنی یہ ایک ایسی تحریک ہے کہ ان کے انتقال کے بعد ختم نہیں ہو جاتی۔ ایسی حرکت انسانوں کے دلوں میں، ان کی روحوں میں گھر کرتی ہے اور استمرار حاصل کرتی ہے۔ ایسے انسان اہمیت کے مالک ہیں۔ انھی انسانوں کی قدر و قیمت ہوتی ہے۔ آقائے خمینی جو ہمارے رہبر ہیں انھی بزرگ رہنماؤں کی صف میں آتے ہیں۔

آپ کو یہ معلوم ہے کہ بڑے بڑے رہنما چاہے مذہبی ہوں یا غیر مذہبی، ظاہر ہوتے ہیں، شہرت حاصل کرتے ہیں، کتابیں لکھتے ہیں لیکن ان کی وفات پر ان کا سارا کام بند ہو جاتا ہے۔ تاریخ میں اس قسم کا ایک نمونہ سید جمال الدین اسد آبادی (افغانی) ہیں۔ وہ اسلامی تاریخ میں بے حد بزرگ اور بے نظیر شخصیت ہیں۔ وہ ایک مجاہد دانشور تھے اور ثابت قدم۔ لیکن ان کے انتقال کے بعد ان کی تاریخ باقی نہ رہی، ختم ہو گئی۔ لیکن آقائے خمینی جو ہمارے رہبر و قائد ہیں ایک ایسی تحریک کا سنگِ بنیاد رکھ چکے ہیں جو ان شاء اللہ تاریخ میں زندہ و پائندہ رہے گی، جس کا ان کے جسمانی وجود سے کوئی تعلق نہیں۔ اگر خدانخواستہ ان کی وفات واقع بھی ہو جائے

تو بھی ان کی تحریک نے نہ صرف ایران میں بلکہ دنیا کے تمام مظلوموں میں اپنا اثر پیدا کر لیا ہے۔ اس نے دُنیا کی بڑی بڑی طاقتوں کو لرزہ براندام کر رکھا ہے۔ یہ ایک ایسی اسلامی تحریک ہے جو لاشرقیہ و لاغربیہ کا نعرہ بلند کرتی ہے۔ جس قدر کوئی انسان عظیم ہوتا ہے، اس کا اجتماعی عمل اسی قدر گہرا اور پائدار ہوتا ہے۔ ہم ایک بڑے انسان کو اس تحریک کے اعتبار سے جانچتے ہیں جس کی وہ بنیاد رکھتا ہے۔ جب ہم اس معیار کو سامنے رکھیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ سید موسیٰ الصدر نے بھی ایک تحریک کی بنیاد رکھی ہے۔ وہ ایک مشہور سخن ور یا ادیب یا سیاستدان نہیں تھے جنھوں نے اپنے کام کو اپنی ذات تک محدود رکھا ہوتا۔ وہ ایک فرد نہ تھے جنھوں نے کوئی غیر معمولی کام سرانجام دیا بلکہ انھوں نے ایک تحریک کا آغاز کیا اور وہ بھی کہاں، لبنان میں۔ جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں لبنان شرقِ اوسط کا وہ منطقہ ہے جس میں مغرب زدگی اپنے عروج پر پہنچی ہوئی تھی۔ شرقِ اوسط کی فاسد ترین حکومت لبنان ہی میں ہے۔ اس منطقے کے بدترین ظلم و ستم اسی لبنان میں وقوع پذیر ہوتے ہیں۔ اس منطقے میں جو اسرائیل، فرانس اور امریکہ کے تسلط میں ہے، اس مردِ عظیم نے شدید ترین حالات میں یہ قدرت حاصل کی کہ اس تحریک کو شروع کریں۔ انھوں نے ۴۰۰ سال کے بعد یہاں کے بدنصیب، ڈرپوک اور نفسیاتی الجھنوں کے شکار شیعوں کو متحرک کیا۔ انھوں نے ایک ایسی تحریک کی بنیاد رکھی ہے جس نے لبنانی حکومت کو لرزا دیا، اسرائیل کو پریشان کر دیا اور عرب ملکوں کے طاغوتی نظاموں کو متوحش کر دیا۔ ہمارے اسلامی انقلاب کے کامیاب ہو جانے سے کئی سال قبل اس مردِ بزرگ نے یہاں ایک تنظیم قائم کی جس کا نام "حرکتِ محرومان" ہے یعنی محروموں کی تحریک۔ یہ تحریک اسلامی آئیڈیالوجی کی بنیاد پر اور اسلامی عقائد کے مطابق لبنان میں رواں دواں ہے۔ اس نے انسانوں کو بنایا ہے، اس نے دستے منظم کیے ہیں۔ جب لبنان میں آئیڈیالوجی اور سیاست کی بناء پر پیدا ہونے والی جد و جہد نے استمرار پیدا کیا، جب لبنان کی خانہ جنگی وقوع پذیر ہوئی اور جب مسلح جنگ آزمائی کا احساس شدید ہو گیا اس وقت اس عظیم رہنما نے اسلامی آئیڈیالوجی کی بنیادوں پر ایک مسلح تنظیم کا آغاز کیا۔ حرکتِ محرومین کے عسکری بازو حرکتِ امل کی بنیاد رکھی جس کی تفصیل ہم آگے چل کر بیان کریں گے[1]۔ اس بناء پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ سید موسیٰ الصدر ہی وہ

---

[1] یاد رہے کہ سید موسیٰ الصدرؒ اس تحریک کے مؤسس تھے اور ڈاکٹر چمران شہید اس کے ناظم اور کرتا دھرتا تھے۔ لیکن انھوں نے کسر نفسی سے کام لے کر اپنا ذکر نہیں کیا۔ (مرتب کتاب)

Presented by Ziaraat.Com

شخص ہیں جنھوں نے اس تحریک کی قیادت کی اور لبنان میں موجودہ مشکلات، فقر و فاقہ اور تشدد کے باوجود اس قابل ہونے کہ وہاں کے شیعوں کو ایک مرکز دیں، انھیں قوت بخشیں، انھیں لبنان کی فاسد حکومت، ظلم پسند اسرائیل اور اس کے پٹھو سعد حداد کے مقابلے میں جنگ آزمائی کے لیے کھڑا کر دیں اور یوں ان میں ایک نئی رُوح پھونک دیں۔ یہاں کے شیعہ تاریخ کے ہر دَور میں ظلم و ستم کا نشانہ بنتے رہے ہیں، ہمیشہ ماتم کناں رہے ہیں اور اس ظلم و ستم کی بنا پر جو تاریخ کے ہر دَور نے ان کے لیے روا رکھا، احساسِ کمتری کا شکار بن چکے تھے اور ڈرتے تھے۔ آپ تصور کیجیے کہ اسرائیل جنوبی لبنان میں اپنی فوجیں بھیج چکا ہے جو دن رات ان پر گولہ باری کرتی ہیں، انھیں نیست و نابود کرنے کی کوشش کرتی ہیں، اس کے باوجود وہ کیا رُوح ہے جو ان لوگوں میں پیدا ہو چکی ہے اور وہ کس انداز سے اسرائیل کے ان حملوں کے مقابلے میں سینہ سپر ہیں۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ۶ یا ۷ سال قبل یعنی ۱۹۷۲ء میں اسرائیلی کمانڈوز کا ایک گروہ جنوبی لبنان میں داخل ہو گیا اور اس نے دو لبنانی کسانوں کو بڑی اذیت دے کر مار دیا۔ اس پر بہت سے کسان جمع ہو گئے اور احتجاج کیا۔ اس گروہ کے کمانڈر نے ان کی بے عزتی کی۔ یہاں تک کہ یہ کہا کہ لبنان پر قبضہ کرنے کے لیے ہمیں اپنے سپاہی بھیجنے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ ہم لڑکیاں بھیجیں گے اور کسی بھی وقت لبنان کے کسی بھی علاقے کو اپنے تسلط میں لے آئیں گے۔ یہاں کے شیعوں میں ضعف و ناطاقتی اور احساسِ کمتری اس قدر زیادہ ہو چکا تھا کہ ان میں یہ ہمت ہی نہ تھی کہ کسی بھی دشمن کے خلاف اپنے ردِّ عمل کا اظہار کر سکیں۔ مجھے یہ بھی یاد ہے کہ جب موسیٰ الصدر کی معیت میں مَیں اس علاقے میں گیا اور وہ مسجد میں تشریف لے گئے جہاں انھوں نے لوگوں سے خطاب کیا اور جوانوں کو رغبت دلائی کہ وہ اسرائیل کے مقابلے میں اُٹھ کھڑے ہوں اور لڑیں۔ اس وقت ایک جوان کھڑا ہوا اور کہنے لگا کہ جناب والا! ہمارے پاس ہتھیار نہیں، ہم اسرائیل جیسے قوی دشمن کے مقابلے میں ہتھیاروں کے بغیر کیوں کر لڑیں۔ اس وقت سیّد موسیٰ الصدر نے جواب دیا کہ اگر تمہارے پاس ہتھیار نہیں ہیں تو تمہارے لیے لازم ہے کہ اپنے ہاتھوں سے اور دانتوں سے اسرائیلیوں کا مقابلہ کرو اور اس داغ کو دھو ڈالو۔ آقائے صدر کی تقریر کے دوران ہی میں اسرائیلی گولیوں کی بوچھاڑ ہمارے سروں کے اُوپر سے گزری۔ یہ جگہ اسرائیلی سرحد کے نزدیک

تھی اور شاید اسرائیلیوں نے مسجد کے لاؤڈ سپیکر کی آواز سُن لی تھی اور انھوں نے لوگوں کو ڈرانے کے لیے اس قصبے اور اس مسجد پر گولیاں برسائیں۔ لیکن اس کے باوجود سیّد صدر نے اپنی باتیں جاری رکھیں اور لوگوں کو جنگ آزمائی پر اُبھارتے رہے اور آخر وہ کیفیت پیدا ہوئی کہ یہاں کے شیعوں میں پہلی بار اپنے آپ پر فخر کرنے کا شعور پیدا کیا۔ ان میں شہادت طلبی کی رُوح پھونکی، ان میں فداکاری اور حسینیت کا جذبہ بیدار کیا۔

اسرائیل کے خلاف پہلی مزاحمت اور شہادت:

ہماری سب سے بڑی قابلِ فخر بات یہ تھی کہ تقریباً ۷ سال قبل (۱۹۷۲ء) اسرائیل کے مقابلے میں جو شخص اوّلین بار مسلح طور پر کھڑا ہوا اور مرتبۂ شہادت پر پہنچا وہ شہر صور کے مدرسۂ صنعتی جبلِ عامل کا ایک ۱۵ سالہ طالب علم تھا۔ یہ نوجوان جس کا نام فلاح شرف الدین تھا مسجد میں اذان دیا کرتا تھا، نہایت خوش الحان تھا۔ اس کا گھر اسرائیلی سرحد کے قریب ایک قصبے طیبہ میں تھا جب اسرائیل نے اس قصبے پر حملہ کیا تو اس کے باپ نے آدھی رات کے وقت گھر کا دروازہ کھولا۔ دروازہ کھلتے ہی اسرائیلی فوجیوں نے اس پر گولیاں برسائیں اور اسے مار دیا۔ اس نوجوان کا بڑا بھائی اپنی کلاشینکوف لینے کے لیے بھاگا لیکن اس کی نوبت نہ آئی اور وہ بھی اسرائیل گولیوں کا نشانہ بن گیا اس پندرہ سالہ نوجوان نے جو ہمارے مدرسے کا طالب علم تھا اپنے بھائی کی کلاشنکوف اٹھائی اور سامنے والے کمرے میں چلا گیا اور وہاں سے ایک کھڑکی میں سے آدھ گھنٹہ اس نے یہودی فوجی دستوں کا مقابلہ کیا۔ اس دوران میں اس نے ۷ یہودی سپاہیوں کو مار گرایا آخر کار اسرائیلی دستوں نے اس کمرے پر راکٹ یا ہینڈ گرینیڈ پھینکا جس میں یہ نوجوان ان کا مقابلہ کر رہا تھا۔ یوں یہ بہادر جوان فداکاری کے جوہر دکھاتا ہوا ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔

یہ پہلا شہید ہے جس نے اسرائیل کا مسلح مقابلہ کیا اور مرتبۂ شہادت کو پہنچا۔ یہ ہمارے مدرسے کے طالب علموں میں سے تھا جنھوں نے سیّد موسیٰ الصدر کی تنظیم میں رہ کر اپنے اندر شجاعت اور فداکاری کی یہ رُوح پیدا کر لی تھی۔

وہی لوگ جو موت سے ڈرتے تھے اور دشمن کے مقابلے میں اپنے آپ کو کم تر و حقیر محسوس کرتے تھے اب اس مقام پر آ پہنچے تھے کہ شہادت حاصل کرنا ان کے لیے باعثِ افتخار بن چکا تھا جنوبی لبنان کے ایک گاؤں میں ایک جوان شہید ہوا تھا۔ ہم سیّد موسیٰ الصدر کے

Presented by Ziaraat.Com

ہمراہ اس شہید کے گھر والوں سے ملنے گئے۔ اس کی ماں ۶۰ سال کی تھی اور اس کا یہ جوان فرزند جو شہید ہوا لیسانس (بی۔اے) حاصل کر چکا تھا اور شہر کے مدرسے میں پڑھاتا تھا۔ وہ اپنے خاندان میں تنہا جوان تھا۔ اس بوڑھی خاتون کا شوہر زندہ نہ تھا اس کے اور کوئی اولاد بھی نہ تھی۔ صرف یہی ایک سعادت مند بیٹا تھا اور اسے بھی اس نے جنگ میں پیش کر دیا تھا۔ ہم اس کے گھر گئے چھوٹا سا گھر تھا۔ لوگ اس کے گھر میں اور اس کے اردگرد جمع ہو گئے۔ سید موسیٰ الصدر اس کمرے میں دیوار کے ساتھ لگ کر زمین پر بیٹھ گئے۔ کچھ اور لوگ بھی کمرے میں جمع ہو گئے تھے۔ یہ بوڑھی خاتون سر سے پاؤں تک سیاہ لباس پہنے ہوئے سید موسیٰ الصدر کے سامنے خاموش بیٹھی ہوئی تھی۔ یک دم اُس نے بولنا شروع کیا۔ اس کی آواز لرز رہی تھی اور اس کی حالت میں جذباتی کیفیت تھی میرا خیال تھا کہ وہ سید موسیٰ الصدر سے باز پرس کرے گی کہ تُو نے میرا بیٹا مجھ سے کیوں لے لیا اور اسے جنگ میں شہید کیوں کروایا؟ لیکن میں نے دیکھا کہ یہ خاتون اپنی جگہ سے اُٹھی اور شدید جذباتیت کی حالت میں فریاد کے سے انداز میں کہنے لگی کہ "اے سید تو نے عورتوں کے لیے تربیتی کیمپ کیوں نہیں بنایا تاکہ میں بھی وہاں جنگ کی تربیت حاصل کروں اور شہادت سے فیض یاب ہو سکوں۔"

اس قسم کی بے شمار مثالیں دیکھنے میں آتی تھیں۔ جو لوگ اپنے عزیزوں کو یوں میدانِ جنگ میں بھیج کر کھو بیٹھتے تھے وہ اس قسم کے جذبے سے دشمن کے مقابلے میں کھڑے ہو جاتے تھے۔ ایک کمزور قوم جو نفسیاتی الجھنوں کا شکار تھی اور دُنیا نے جسے پیس رکھا تھا وہ ان لڑائیوں کی آگ سے نکل کر یوں سونا بن گئی تھی۔ سید موسیٰ الصدر کے لیے یہ بات سب سے زیادہ پُر افتخار تھی۔ بعلبک کے شہر میں ایک ہی خاندان کے دو افراد شہید ہوئے۔ جب ہم اس خاندان سے ملنے گئے تو ان کے والد نے سید موسیٰ الصدر سے کہا کہ "اے سید! غمگین نہ ہو۔ میں نے اپنے دو بیٹے قربان کیے ہیں۔ ابھی میرے تین بیٹے باقی ہیں اور پھر میں خود ہوں اور میری بیوی۔ یہ سب پانچ افراد ہوتے ہیں اور سب کے سب شہید ہونے کے لیے تیار ہیں۔"

سب سے بڑی قدر جس پر ہر انسان کی نگاہ رہنا چاہیے وہ تحریک ہے جو کوئی شخص معرضِ وجود میں لاتا ہے۔ وہ تبدیلی اور وہ تغیر ہے جو اپنے دَور کے لوگوں میں پیدا کرتا ہے۔ سید موسیٰ الصدر

ایک ایسے شخص ہیں جنھوں نے فقر و غربت کی ماری ہوئی، محرومیوں کا شکار اور خائف قوم کو ایک جنگجو قوم میں بدل دیا جو اب تک تمام بیرونی اور اندرونی دشمنوں کے خلاف بڑی بہادری سے جنگ آزما ہے اور جس انداز میں شہادت سے بغل گیر ہوتی ہے اس کی مثال تاریخ میں موجود نہیں۔ جن لوگوں نے لبنان کو نہیں دیکھا، جو اس سے واقف نہیں اور جنھیں وہاں کی مشکلات اور مصائب کا اندازہ نہیں وہ اس مزاحمت کی گہرائیوں کو نہیں سمجھ سکتے۔

اسرائیل بڑی زبردست طاقت ہے جس نے ۲ گھنٹے کی مدت میں تین بڑے بڑے عرب ملکوں کو ختم کر دیا۔ ۱۹۶۷ء کی جنگ میں اس نے مصر، سوریا اور اردن کو ۲ گھنٹوں میں پچھاڑ دیا تھا۔ کہنے کو یہ جنگ ۵ روز تک جاری رہی تھی لیکن ان عرب ملکوں کی فوجی طاقت کی بربادی پہلے ۲ گھنٹوں میں مکمل ہو چکی تھی۔ وہ زبردست طاقت جس نے تین عرب ملکوں کو ۲ گھنٹے کی مدت میں ختم کر دیا تھا ایک طرف اور دوسری طرف کتائب (Phalangists) اور لبنان کے متعصب عیسائی جو بذاتِ خود ایک بہت بڑی قوت تھے اور جن کے پاس اسّی ہزار سے زیادہ کمانڈو موجود ہیں اور پھر لبنان کی بائیں بازو کی جماعتیں جن کے بارے میں ہم آگے چل کر تفصیل سے بات کریں گے۔ ان سب طوفانی موجوں کے تھپیڑے سہ کر زندہ و سلامت بچ نکلنا بہت مشکل کام ہے اور اس وقت تک ممکن نہیں جب تک خدا پر تکیہ نہ ہو اور تحریک کی بنیاد ایمان و اعتقاد پر نہ ہو۔ جس شخص کو لبنان کے گردابِ حوادث کے چکروں سے آشنائی نہ ہو وہ سید موسیٰ الصدر کی تحریک کی قدر و قیمت کو نہیں جان سکتا۔

سیاسی جماعتوں کا حکومتِ لبنان سے تعاون:

یہ بات آپ کے گوش گزار کرنا ضروری ہے کہ جب یہ محروم لوگ ظلم و ستم اور لبنان کی فاسد حکومت کے خلاف جنگ آزما تھے اس وقت بائیں بازو کی جماعتیں کمیونسٹ حکومت کے ساتھ متحد تھیں۔ میں چاہتا ہوں کہ چند باتیں ان کے بارے میں بھی کہوں تاکہ آپ تاریخ سے قدرے آگاہ ہو جائیں۔ لبنان کی بائیں بازو کی جماعتوں کی ایک تنظیم ہے جسے "الجبهة الوطنية" (قومی محاذ) کہتے ہیں لیکن یہ قومی محاذ اس قومی محاذ سے بالکل مختلف تھا جو مرحوم ڈاکٹر مصدق

Presented by Ziaraat.Com

کے زمانے میں ایران میں تشکیل پذیر ہوا۔ اس قومی محاذ میں ۵۷ مختلف تنظیمیں، بائیں بازو کی جماعتیں اور مارکسی شامل تھے۔ اس قومی محاذ کا لیڈر کمال جنبلاط کو چنا گیا تھا جو "حزب التقدمی الاشتراکی" یعنی ترقی پسند سوشلسٹ پارٹی کے رہنما تھے۔ کمال جنبلاط خود سوشلسٹ تھے اور اسی لیے انھیں لبنان کی بائیں بازو کی پارٹیوں نے اپنا لیڈر منتخب کیا تھا۔ یہ جنبلاط اور ان کے ساتھی لبنان کی حکومت میں شریک تھے (بعض وزیر کی حیثیت سے اور بعض لبنانی پارلیمنٹ کے ممبر کی حیثیت سے)۔ جب سید موسیٰ الصدر اور لبنان کے مظلوم و مقہور لوگ حکومتِ لبنان کے خلاف جد و جہد کر رہے تھے۔ تصور کیجیے کہ جن لوگوں کا نعرہ سوشلزم تھا اور جو مزدوروں کی حکومت کے گیت گاتے تھے وہ خود کمال جنبلاط کی طرح لبنان کے بڑے بڑے سرمایہ داروں اور جاگیرداروں میں شامل تھے۔ اور لبنان کی سرمایہ دار حکومت کے ساتھ شیر و شکر تھے۔ یہ ہے ان بائیں بازو کی جماعتوں کی ماہیت۔

تنظیم "امل" کا قیام

۱۹۷۰ء کے مظاہرات میں اور بعلبک و صور کے مظاہرات کے بعد لبنان کے شیعہ پورے جذبے اور جوش و خروش سے میدانِ جہاد میں اُتر آئے اور انھوں نے حلف اُٹھایا کہ اپنے خون کے آخری قطرے تک اپنے غصب شدہ حقوق کے حاصل کرنے کے لیے کوشاں رہیں گے۔ یہ اس جہاد کا پہلا مرحلہ تھا یعنی سیاسی شعور کی بیداری اور احساسات و جذبات کی برانگیختگی کا مرحلہ۔ آقائے صدر اور ان کے ساتھیوں کو اس بات کا احساس تھا کہ محض جذبات

لہ اتفاق سے مترجم کو کمال جنبلاط کی ملاقات کا شرف حاصل رہا ہے اور اس نے بیروت میں اور شوف کے پہاڑی علاقے میں مختارہ کے مقام پر کمال جنبلاط کے محلوں کی زیارت کی ہے۔ لبنان کے یہ دُروزی رہنما وسیع و عریض زمینوں کے مالک تھے۔ ان کی زمینوں کے ایک حصے میں فلسطینیوں کا کیمپ بنا تھا جس کا معاوضہ انھوں نے اقوامِ متحدہ کی ایجنسی برائے فلسطینی مہاجرین سے حاصل کیا تھا اور اس کے ساتھ یہ شرط لگائی تھی کہ اس کیمپ میں جتنے مکانات بنیں گے وہ فلسطینیوں کے چلے جانے کے بعد کمال جنبلاط کی ملکیت ہوں گے۔ یہ بزرگوار سوشلسٹ بھی تھے۔ اس کے ساتھ مغربی فلسفے اور ویدانت سے بھی شغف رکھتے تھے اور یوگا کی مشقیں بھی کیا کرتے تھے اور ان کی سوشلزم ان کی جاگیردارانہ ذہنیت پر غالب آسکی تھی۔ وہ حکومتِ لبنان میں مختلف وزارتوں کے سربراہ رہے ہیں اور ہر کابینہ کی مخالفت کرتے رہے حتیٰ کہ وہ خود [illegible]

اور مظاہرات کے ذریعے سے کام نہیں بن سکتا۔ ان کے مقابلے میں دائیں بازو اور بائیں بازو کی طاقتور تنظیمیں نبرد آزما تھیں۔ اس بناء پر سڑکوں پر مظاہرے کرنے سے یا جذبات کو ابھارنے سے کچھ حاصل نہیں ہو سکتا لہٰذا ضروری ہے کہ کوئی تنظیم بنائی جائے۔ اسی بناء پر ۱۹۷۳ء میں سید موسیٰ الصدر کی رہنمائی میں "تنظیم محرومین" کی بنیاد پڑی جس کی تشکیل اور کارکردگی کی ذمہ داری راقم الحروف پر تھی۔ اس تنظیم نے بہت جلد شیعیانِ لبنان کو اپنے جھنڈے تلے جمع کر لیا۔ اس تنظیم کی آئیڈیالوجی اسلام تھی، لیکن اصلی اسلام، انقلابی اسلام۔ وہ اسلام جس کے سپاہی شہادت کے ہتھیاروں سے مسلح ہوتے تھے۔

اس قسم کی تنظیم اور اس قسم کی آئیڈیالوجی دائیں بازو اور بائیں بازو کی جماعتوں کے علاوہ رجعت پسند علمائے دین کے بغض و حسد و کینہ کا ہدف بنی۔ اس کے باوجود اس تنظیم نے بڑی تیزی سے ترقی کی راہیں طے کیں۔ جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں، بے شمار بدنصیب اور قسمت کے مارے شیعہ نوجوان اس خلاء کی بناء پر جو ان کے اردگرد موجود تھا، کمیونسٹ پارٹیوں، بائیں بازو کی جماعتوں اور فلسطینیوں کی انتہا پسند تنظیموں (مثلاً الجبہۃ الشعبیۃ) کے سائے تلے آجاتے تھے۔ لیکن آقائے صدر کی اس تنظیم کے قیام کے بعد از سرِ نو اپنی اصل کی طرف لوٹ آئے اور ایک مشہور قول کے مطابق انھوں نے ان پارٹیوں کے قدموں تلے سے ان کی بساط کھینچ لی: ہر اس گاؤں میں جہاں ایک یا دو نفر بائیں بازو کی جماعتوں کے لیے کام کر رہے تھے، وہاں آقائے صدر کی تنظیم کے سو، دو سو افراد مصروفِ کار ہو گئے۔

شیعیانِ لبنان کو یوں منظم کرنے کے دوسرے مرحلے کے بعد تیسرا مرحلہ شروع ہوا اور وہ یہ تھا کہ انھیں ایک عسکری تنظیم دی جائے۔ لبنان اور ایران میں بہت فرق ہے۔ لبنان ایک ایسا ملک ہے جہاں قبائل آباد ہیں اور وہ سب کے سب مسلح ہیں۔ جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں دائیں بازو کی جماعتوں کے پاس چالیس ہزار جنگجو اور وافر مقدار میں اسلحہ موجود تھا اور یوں وہ اپنے تسلط و غلبے کی حفاظت کرتے تھے۔ اس قسم کی عسکری تنظیم کے لیے ضرورت اس امر کی ہوتی ہے کہ اس کے مقابل بھی ایک عسکری تنظیم ہو۔ اسی بناء پر "تنظیم محرومین" کا تیسرا شعبہ "امل" عسکری تنظیم کی شکل میں ظاہر ہوا۔ یہ نام تین کلمات کے ابتدائی حروف سے مل کر بنا ہے: افواج، مقاومت

Presented by Ziaraat.Com

اور لبنانیہ۔ افواج کا "الف"، مقاومت کی "میم" اور لبنانیہ کا "لام" لے کر "امل" نام رکھا گیا جس کے معانی آرزو اور اُمید کے ہیں، یعنی اسلامی پیغام اور حکومت حضرت ولی العصر عجل اللہ فرجہ کو عملی شکل دینے کی آرزو۔ اس تنظیم نے ۱۹۷۴ء میں شیعہ نوجوانوں کی تربیت کا کام سنبھالا۔ یہ تربیت بعلبک کے پہاڑی علاقے میں سوریا کی سرحد کے قریب دی جاتی تھی۔ اس تربیت میں فلسطینی تنظیم آزادی ہمارے ساتھ تعاون کر رہی تھی۔ فلسطینی رہنما یاسر عرفات بارہا اس مرکز میں گئے اور جب تربیت لینے والے فارغ التحصیل ہو جاتے تو وہ ان سے خطاب کرتے۔ چند فلسطینی اُستاد بھی پہلے سال تنظیم امل کے اس مرکز میں ہمارے ساتھیوں کی تربیت میں شریک رہے لیکن اب "امل" کے ان مجاہدین کی تربیت پہلے کے مقابلے میں بہت بہتر ہو چکی ہے۔ اور وہ اپنے تربیتی مراکز کا انتظام خود سنبھالے ہوئے ہیں۔ ہمارے بہترین ایرانی نوجوانوں میں سے کئی سو نے لبنان میں امل کے ان مراکز میں تربیت حاصل کی ہے۔ تین سال قبل (۷۵/۱۹۷۶) میں سابق شاہِ ایران کے سفیر منصور قدر نے سید موسیٰ الصدر کی شدید مخالفت کی بناء پر حکومتِ لبنان سے شکایت کی کہ بعلبک میں امل کے تربیتی مرکز میں ۱۸۰ یا ۲۰۰ ایرانی تربیت حاصل کر رہے ہیں۔ سید موسیٰ الصدر کے خلاف لبنانی حکومت اور وہاں کے عیسائیوں کی شدید مخالفت کا تعلق اس بات سے بھی تھا۔ بہر حال اس انداز میں تنظیم امل کی عسکری تربیت شروع ہوئی۔ ۷۰ افراد کے پہلے گروہ نے جن کا تعلق مدرسۂ صنعتی جبلِ عامل سے تھا بعلبک کے نزدیک ایک گاؤں 'یمونہ' میں ایک ہفتے کا تربیتی کورس پورا کیا اور اس کا نتیجہ بے حد تسلی بخش تھا۔ اس کے بعد فلسطینی تنظیم "الفتح" کے تعاون سے اور ان کے تربیت دینے والوں کی نگرانی میں بعلبک کے نزدیک ایک گاؤں عین البنیۃ میں فوجی تربیت کا ایک بہت بڑا مرکز کھولا گیا۔ اس تربیت کا نتیجہ بھی بے حد تسلی بخش رہا یہاں تک کہ ایک بارودی سرنگ کے پھٹنے سے ہمارے ۲۴ نوجوان شہید اور ۷۰ کے قریب مجروح ہوئے اور یہ مرکز بند ہو گیا۔ اس کے بعد 'جنتا' کے مقام پر ایک اور مرکز کھولا گیا جو شروع شروع میں "فتح" کے تربیت یافتہ لوگوں کی نگرانی میں کام کرتا تھا لیکن اس کے بعد امل کے نوجوانوں نے خود کام سنبھال لیا۔ بعلبک کے کیمپ میں دھماکے کے نتیجے میں بے حد شور برپا ہوا اور یہ تنظیم جو ابھی تک خفیہ تھی کھل کر سامنے آ گئی اور ۶ جون ۱۹۷۵ء کو امل کی تنظیم کا اعلان ہوا۔ جس پر ہر جانب سے اس کی مخالفت شروع ہو گئی۔ عیسائی بھی اس کے مخالف تھے اور بائیں بازو کے لوگ بھی اور یہ اس لیے کہ خوب جانتے تھے کہ اگر سید الصدر کے ساتھی منظم ہو گئے اور انھوں نے جنگی تربیت حاصل کر لی تو پھر کسی میں ان کے منہ آنے کی سکت نہ ہو گی۔ اس وقت تک بائیں بازو کے لوگ سید موسیٰ الصدر سے کچھ پرخاش نہ رکھتے تھے کیونکہ ان کا خیال تھا کہ وہ بھی دوسرے علمائے دین کی طرح ہیں جو کبھی کبھی تیز و تند نعرے بلند کرتے ہیں۔ لہٰذا انھیں آقائے صدر سے کوئی سروکار نہ تھا۔ لیکن جب انھیں یہ معلوم ہوا کہ وہ اس طریقے پر نوجوانوں کو منظم کر رہے ہیں اور انھیں جنگی تربیت دے رہے ہیں تو اُن کے خوف کی کوئی حد نہ رہی اور انھوں نے ان کی مخالفت شروع کر دی۔ ابتداً میں یہ مخالفت خفیہ تھی لیکن بعد ازاں جب انھیں مناسب مواقع میسّر آئے تو انھوں نے سید موسیٰ صدر کے خلاف بغض و کینہ کا کھل کر اظہار کیا۔

لبنان کی کمیونسٹ پارٹی کو یہاں کام کرتے ہوئے پچاس سال ہو گئے تھے اور وہ یہ دیکھ رہی تھی کہ جوانوں کے گروہ کے گروہ تحریکِ محرومین میں شامل ہوتے جا رہے ہیں۔ اصولی طور پر شیعہ اپنے آپ کو تحریکِ محرومین کا فطری جزو سمجھتے تھے لہٰذا یہ تحریک ان پارٹیوں کے نیچے سے زمین نکال رہی تھی اور ان کے لیے کوئی اور مجال کار نہ چھوڑ رہی تھی لہٰذا قدرتی طور پر یہ پارٹیاں تنظیمِ امل اور سید موسیٰ الصدر کو ہدف بنانے کے لیے مواقع تلاش کرنے لگیں۔ سید موسیٰ الصدر اس لیے آئے تھے کہ وہ جنوبی لبنان کی فکری پسماندگی اور سیاسی و اجتماعی آئیڈیالوجی کے نہ ہونے کی بناء پر جو خلا پیدا ہو گیا تھا اُسے پُر کریں اور انھوں نے اس خلا کو پُر کر دیا تھا اور اب وہ بائیں بازو کی جماعتوں کو کسی قسم کا میدانِ کار دینے کے لیے تیار نہ تھے اور نہ انھوں نے کوئی حیلہ یا بہانہ ان کے لیے چھوڑا تھا۔ کمیونسٹ پارٹی کو جاگیردار اور خود فروش شیوخ اچھے لگتے تھے اگرچہ ظاہراً وہ انھیں بُرا بھلا کہتی تھی۔ اس کا سبب یہ ہے کہ یہ زمیندار اور شیوخ کمیونسٹ پارٹی کو کام کرنے کے مواقع مہیا کرتے تھے۔ لیکن سید موسیٰ الصدر نے ان پارٹیوں کو بے دست و پا کر دیا تھا، حتیٰ کہ سیاسی عمل میں بھی وہ ان سے زیادہ تیز تھے لہٰذا اس اعتبار سے انھوں نے کمیونسٹ پارٹی اور بائیں بازو کی دیگر جماعتوں سے ان کے تمام حربے چھین لیے تھے۔

Presented by Ziaraat.Com

لبنان کی خانہ جنگی کی ابتداء میں بنت جبیل میں ایک میٹنگ ہوئی (اس میٹنگ میں ہمارا بھی ایک کارکن چپکے سے داخل ہوگیا تھا) پارٹی کے ذمہ دار لیڈر اپنے کارکنوں سے یہ کہتے تھے "ہمیں لازم ہے کہ صدر کا قصہ پاک کریں لیکن ابھی مناسب موقع نہیں آیا۔ ہمیں اس موقع کا انتظار کرنا چاہیے۔"

انھی دنوں الجزائر میں عرب طالب علموں کی ایک کانفرنس ہو رہی تھی۔ اس کانفرنس میں تحریکِ محرومین کی طرف سے بھی دو اشخاص شامل ہوئے۔ "فتح" کے نمائندے ہانی الحسن بھی اس میں شامل تھے۔ جب کانفرنس کے صدر نے کانفرنس کے شرکاء کے نام پڑھنا شروع کیے تو تمام کمیونسٹ پارٹیوں نے تحریکِ محرومین کی شرکت پر اعتراض کیا اور چاہتے تھے کہ جلسے سے واک آؤٹ کر جائیں۔ کانفرنس کے صدر نے تحریکِ محرومین کا نام حذف کر دیا۔ اس پر ہانی الحسن کھڑے ہو گئے اور پوچھا کہ آخر کمیونسٹ پارٹیاں اس بات کا مطالبہ کیوں کر رہی ہیں۔ انھوں نے یہ بھی کہا، کہ اگر انھیں تسلی بخش جواب نہ ملا تو وہ واک آؤٹ کر جائیں گے۔ اس بات پر کمیونسٹ پارٹیوں اور "فتح" کے مابین سخت تُو تُو میں میں ہوئی لیکن "فتح" کی باتیں زیادہ وزنی تھیں، ان کا اثر بھی زیادہ تھا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہانی الحسن کا اعتراض مؤثر واقع ہوا اور تحریکِ محرومین نے کانفرنس میں شرکت کی۔ اس کے نمائندے نے جو تقریر کی وہ نہایت عمدہ تھی اور اس میں کمیونسٹ پارٹی پر کوئی حملہ نہ کیا گیا۔ اس تقریر میں زیادہ تر لبنان کے لوگوں کی بدنصیبی کی تفصیل پیش کی گئی تھی اور ان کے حقوق کے حصول کے لیے جد و جہد کی ضرورت پر زور دیا گیا تھا۔

جلسے کے بعد عام بحث شروع ہوئی اور دیگر شرکاء نے کمیونسٹ پارٹیوں سے پوچھا کہ آخر اس میں کون سی برائی کی بات تھی جو آپ نے اس قدر ہنگامہ برپا کیا ہے لیکن کمیونسٹ پارٹیوں کے پاس جواب کوئی نہ تھا۔ البتہ ہانی الحسن نے اس کا نتیجہ نکالا اور وہ یہ کہ اس سے قبل کمیونسٹ پارٹی اس کانفرنس میں لبنان کی طرف سے بات کرتی تھی اور اپنے آپ کو لبنان کا نمائندہ کہتی تھی لیکن جب تحریکِ محرومین کا نمائندہ اس کانفرنس میں شرکت کرے تو ظاہر ہے کہ وہ لبنان کے عوام کی نمائندگی کرے گا اور یوں پوری عرب دنیا میں کمیونسٹ پارٹی کے لیے کوئی جگہ نہ ہوگی[1]۔ لہٰذا

[1] یاد رہے کہ تمام عرب ممالک میں صرف لبنان ہی وہ ملک تھا اور ہے جہاں کمیونسٹ پارٹی کارگزاری دکھاتی ہے اور کسی ملک میں اس پارٹی کا وجود نہیں یہاں تک کہ سوریا اور مصر میں بھی اس پارٹی کے لیے کبھی کوئی گنجائش نہ نکل سکی۔ عراق نے بھی اپنے تمام تر سوشلسٹ رجحانات کے باوجود کمیونسٹ پارٹی کو برداشت نہ کیا۔

وہ پورا زور لگا رہی تھی کہ تحریکِ محرومین کو کانفرنس سے نکلوا دیا جائے تاکہ وہ اپنا مقام محفوظ رکھ سکے۔ یہ واقعات ۷۵ء کے اوائل کے ہیں یعنی سوریا کی فوجوں کے لبنان میں داخل ہونے اور تل الزعتر کے حوادث سے کئی ماہ پیشتر۔ ان دنوں میں بظاہر یہ بائیں بازو کی جماعتیں آقائے صدر اور تحریکِ محرومین کو بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھتی تھیں۔ یہاں تک کہ اس تحریک کا نمائندہ بائیں بازو کی جماعتوں کے ہفت روزہ جلسے میں بھی شریک ہوا کرتا تھا۔

یہ دو باتیں اس امر کی نشان دہی کرتی ہیں کہ کمیونسٹ پارٹی شروع ہی سے تحریکِ محرومین، تنظیمِ امل اور آقائے صدر کی ذات کو ختم کرنے کا تہیہ کیے ہوئے تھی۔

امل کا تکیہ خدا پر ہے :

لبنان میں جو تجربات ہمیں حاصل ہوئے ہیں، ان کے مطابق لبنان کے بہترین جنگجو شیعہ ہیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ وہاں کا شیعہ محروم ہے، پسماندہ ہے اور مستضعف ہے۔ وہ موت سے نہیں ڈرتا۔ اس کی رگوں میں خونِ حسینیت دوڑ رہا ہے۔ اس بناء پر جب وہ شین گن ہاتھ میں لے لیتا ہے اور سڑک پر نکل آتا ہے تو پچاس مسیحیوں یا دوسرے مذاہب کے ماننے والوں کا مقابلہ کرتا ہے۔ موجودہ حالات میں آپ دیکھتے ہیں کہ بیروت کی کمیونسٹ یا سُنّی تنظیموں میں بھی لڑنے والوں کی اکثریت لبنانی شیعوں پر مشتمل ہے۔ قدرتی طور پر آپ یہ پوچھیں گے کہ یہ جوان ہمارے پاس کیوں نہیں آتے؟ اس کا جواب بڑا سیدھا ہے اور وہ یہ کہ ہمارے پاس امکانات کم ہیں۔ الشیاح کا ایک شیعہ نوجوان ہتھیار چاہتا تھا کہ اپنے گھر کی حفاظت کرے۔ وہ تنظیمِ امل کے پاس آیا اور ہتھیار مانگتا تھا لیکن ہمارے پاس ہتھیار نہ تھے۔ وہ کمیونسٹ پارٹی کے پاس چلا گیا اس نے اسے ہتھیار بھی دیے اور پیسے بھی۔ علاوہ ازیں اسے چاول، روٹی، آٹا اور دوسری چیزیں بھی دیں۔ ہمارے نوجوان نہ صرف یہ کہ ہم سے پیسے نہیں لیتے تھے بلکہ مجبور تھے کہ اس تنظیم کی ماہانہ مدد بھی کریں حالانکہ دوسری تنظیمیں پیسے اور اسلحہ مفت دیتی تھیں۔ اس کا اصلی سبب یہ تھا کہ دوسری تنظیموں میں سے ہر ایک کسی نہ کسی غیر ملکی حکومت سے وابستہ تھی۔ وہ ان سے پیسے اور اسلحہ حاصل کرتی تھی۔ لیبیا، عراق، سوریا، مصر وغیرہ، ہر ایک کی حکومت کسی نہ کسی تنظیم

Presented by Ziaraat.Com

د... ماعت کی سرپرست تھی اور وہ اپنی پروردہ جماعت کو وافر مقدار میں پیسہ اور اسلحہ مہیا کرتی تھی۔ لیکن تنظیم امل نہیں چاہتی تھی کہ وہ اپنے آپ کو کسی ملک یا کسی طاقت کے سپرد کر دے۔ میں پوری ذمہ داری سے یہ کہہ رہا ہوں کہ ان شیعہ نوجوانوں کو جو کمک ملی وہ یا تو ان کے ایرانی بھائیوں کی طرف سے تھی یا مراجع عظام کی طرف سے۔

اس تنظیم نے بڑی شدت سے اسرائیل کے خلاف جنگ لڑی اور اس راہ میں بے شمار شہداء کی قربانیاں پیش کیں۔ ان شہداء نے اپنی دلاوری اور شجاعت سے لوگوں کو گرمایا ہے اور نبرد آزمائی کے نشان چھوڑے ہیں۔ اگر میرے پاس وقت ہوتا تو میں آپ کے سامنے ان کی تفصیل بیان کرتا۔ میں نے خود کئی ہفتوں تک جنوبی لبنان میں مورچوں میں اسرائیل کے خلاف جنگ لڑی ہے۔ اس دوران میں ایسے لمحات بھی آئے ہیں جن کا تصور ممکن نہیں۔ ایسے لمحات جب اسرائیلی ٹینک اور ہوائی جہاز ہمارے مورچوں کو اپنی زد میں لاتے تھے۔ وہاں ہمارے سامنے صرف موت تھی، شہادت تھی اور راہِ فرار کوئی نہ تھی۔ لہٰذا اس وقت یہی لازم آتا تھا کہ لڑتے رہیں، لڑتے رہیں تاکہ منزلِ شہادت تک پہنچ جائیں۔ امل کے جیالے نوجوان ایک طرف تو بیروت اور زحلہ میں کتائب (Phalangists) کے خلاف جنگ کرتے تھے اور وہاں فداکاری اور جانثاری کی داستانیں تخلیق کرتے تھے اور دوسری طرف بائیں بازو کی جماعتوں، عراق کے پٹھوؤں اور خود فروش شیعوں کے خلاف نبرد آزما تھے جو تنظیم امل کی مخالفت عقائدی اختلافات کی بناء پر کرتے تھے۔

آخر کار حکومتِ لبنان اور بائیں بازو کی جماعتیں بعلبک اور صور میں شیعوں کے مظاہرات، تحریک محرومین اور اس کی فوجی شاخ تنظیم امل سے خوفزدہ ہو گئے۔ خاص طور پر وہاں کے عیسائیوں کو یہ احساس ہو گیا کہ لبنان میں ان کی مراعات، ان کی امتیازی حیثیت اور ان کی بالادستی کا دور ختم ہوا چاہتا ہے۔ لہٰذا انھوں نے اسرائیل کے ساتھ تعاون کر کے ایک بہت بڑی سازش کا آغاز کیا۔ اور اسرائیل بھی تو یہی چاہتا تھا کہ فلسطینی مزاحمت کو ختم کر دے۔

یہاں پر لازم آتا ہے کہ اس بحث کو شروع کرنے سے قبل لبنانی پارٹیوں کی تفصیل، فلسطینی مزاحمت کی مختصر سی تاریخ اور اس کے داخلی نظام کے بارے میں کچھ کہا جائے۔

باب ششم

لبنانی پارٹیاں

لبنانی سیاستدان

لبنانیوں کی تمام سرگرمیوں کی بنیاد منفعت جوئی اور مادہ پرستی پر ہے۔ یہ لوگ خود پسند، کوتاہ بین، مغرور، ہوشیار، چالاک اور مادہ پرست ہیں۔ اسی بناء پر لبنان کے سیاستدان بھی دُنیا کے غلیظ ترین گروہ میں سے ہیں۔ ان سیاستدانوں میں پستی اور رذالت، خود بینی، مادہ پرستی، اقدار سے بے رُخی، خیانت اور جرائم قسم کے تمام عناصر جمع ہو گئے ہیں اور لبنانی پارٹیاں بھی انھی سیاستدانوں کی فکر اور ان کی سرگرمیوں کی پیداوار ہیں۔ ان کے نزدیک تہمت تراشی، دروغ بافی، دھوکا بازی، دوسروں کا آلۂ کار بننا، غیروں سے روپیہ پیسہ ہتھیانا، سیاست بازی اور ہوشیاری میں شمار ہوتا ہے۔ وہ سیاستدان کامیاب قرار دیا جاتا ہے جو بیرونِ ملک سے زیادہ مال بٹورے اور غیروں کو اپنی طرف زیادہ متوجہ کر لے۔ لبنان کے اخبار اور رسالے بھی اس طریقۂ کار سے مستثنیٰ نہیں۔ وہ بڑی ڈھٹائی سے غیر ملکی حکومتوں سے پیسہ بٹورتے ہیں اور اس بات کی حمایت کرتے ہیں اور اس پر فخر کرتے ہیں۔ ان پارٹیوں کے ساتھ جو لوگ منسلک ہوتے ہیں وہ بھی اپنی روزمرہ کی مادی مصلحتوں کے پیشِ نظر ایسا کرتے ہیں اور اس میں ایمان یا آئیڈیالوجی کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ انتخابات کے وقت روپے پیسے کا سیلاب ووٹروں کو گھیر لیتا ہے۔ ووٹ خریدے جاتے ہیں اور بیچے جاتے ہیں اور کس ڈھٹائی کے ساتھ۔

لبنان کی دائیں بازو کی جماعتیں:

عیسائیوں نے فرانسیسی استبداد کے زمانے میں بڑی امتیازی مراعات حاصل کر لیں اور آزادی

Presented by Ziaraat.Com

کے بعد وہ فرانسیسیوں کے جانشین بن گئے۔ ہر قسم کی فوجی، سیاسی اور اقتصادی طاقت ان کے ہاتھ میں تھی۔ وہ اپنی مراعات یافتہ حیثیت کی نگہداشت کے لیے مغربی حکومتوں خصوصاً امریکہ اور یہاں تک کہ اسرائیل سے بھی تعاون کرتے تھے۔ جب فلسطینی مزاحمت نے لبنان میں طاقت پکڑلی اور خصوصاً اس وقت جب لبنان کے محروم طبقات جاگ اٹھے اور انھوں نے اپنے غصب شدہ حقوق کا مطالبہ کیا تو وہاں کے عیسائی سخت پریشان ہوئے اور انھوں نے بڑی سرعت کے ساتھ تنظیمیں بنانے، ان کو مسلح کرنے اور ان کو فوجی تربیت دینے کا ساز و سامان فراہم کرنا شروع کر دیا۔ انھوں نے اپنے وافر علمی اور مادی امکانات، لبنانی فوج، لبنانی حکومت اور مغربی سیاست کی سرپرستی میں بڑی تھوڑی سی مدت میں بڑی زبردست فوجی طاقت منظم کرلی۔ لبنان میں خانہ جنگی سے قبل کتائب (Phalangists) کی فوجی طاقت کم از کم چالیس ہزار مسلح جنگ آزماؤں پر مشتمل تھی۔

بحیثیت عمومی لبنان میں دائیں بازو کی تین بڑی بڑی جماعتیں ہیں :

۱۔ ان میں سب سے بڑی جماعت "حزب الکتائب" ہے جسے انگریزی میں ——— کہا جاتا ہے اور اس کی رہنمائی پیئر الجمیل (Pierre Gumayyel) کے ہاتھ میں ہے۔ یہ پارٹی لبنان کی بہت بڑی سیاسی طاقت شمار ہوتی ہے۔ (بوقت حاضر پیئر الجمیل کے بیٹے بشیر جمیل کے مرنے کے بعد کتائب کی اور دائیں بازو کی رہبری نادی افرام کے ہاتھ میں ہے)۔

۲۔ حزب الوطنیین الاحرار (National Liberal Party) جس کی رہنمائی کمیل شمعون[1] کے ہاتھ میں ہے پہلے ذکر آچکا ہے کہ یہ شخص کمیل شمعون ۱۹۵۸ء میں لبنان کی صدارت کی مدت ختم کرنے کے بعد دوبارہ صدر ہونا چاہتا تھا اور جس کی حمایت کے لیے امریکی بیڑہ بھی لبنان کے ساحل پر لنگر انداز ہوگیا تھا۔ (مترجم)

[1] امریکہ کا آلۂ کار اور اسرائیل نواز ہے یہی وہ شخص ہے جس سے ہمارے طاغوتی بادشاہ کی دوستی تھی۔ وہ کئی بار ایران بھی آیا اور سابق شاہ کے ساتھ شکار پر بھی گیا۔ جس نے جنگ کے دوران میں اسے بے حد مالی مدد دی۔

وہ شیعوں کو مزید مارے اور نابود کر دے[1]۔ یہی کمیل شمعون وہ شخص ہے جس نے اسرائیل کے ساتھ تعاون کیا اور مسلمانانِ لبنان کو شدید زک پہنچائی۔

۳۔ حزب حراس الارز : ارز لبنان کا مشہور درخت ہے جو دیودار سے ملتا جلتا ہے اور لبنان کا قومی نشان ہے۔ حراس الارز کے معنیٰ ہیں "درختِ ارز کے رکھوالے"۔ اس جماعت کے ارکان نہایت متعصب عیسائی ہیں (غالب اکثریت مارونی)۔ وہ اپنے سینے پر ہمیشہ ایک بڑی سی صلیب لٹکائے رہتے ہیں اور لبنان کے خون خوار ترین لڑنے والوں میں شمار ہوتے ہیں۔ اگر کوئی مسلمان ان کے قابو میں آجائے تو فوراً اسے تہ تیغ کر دیتے ہیں۔ ان کا اعتقاد ہے کہ وہ صلیبیوں کے پسماندگان میں سے ہیں۔ آپ کو یاد ہوگا کہ کچھ صدیاں پہلے یورپ کے عیسائیوں نے لبنان اور فلسطین کی طرف بڑی بڑی فوجیں بھیجی تھیں جنھوں نے مسلمانوں کا قتلِ عام روا رکھا تھا۔ ان کو صلیبی کہتے ہیں کیونکہ یہ ہمیشہ اپنے ہاتھوں میں صلیب اٹھائے پھرتے تھے اور سینے پر بھی صلیب لٹکائے رہتے تھے۔ حراس الارز اپنے آپ کو ان صلیبیوں کی اولاد سمجھتے ہیں اور ان کی خواہش ہے کہ صلیبیوں کے وحشیانہ پروگرام کو از سرِ نو لبنان میں جاری کریں۔ اس وقت اس پارٹی کا لیڈر اتیان سقر ہے جسے "ابو ارز" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

یہ تین جماعتیں لبنان کے دائیں بازو کی بڑی بڑی جماعتیں ہیں اور مسلمانوں کے خلاف جنگ آزما ہیں۔ طاقت کے اعتبار سے سب سے بڑی پارٹی حزب الکتائب یعنی (Phala ngist) ہیں، اس کے بعد حزب الاحرار اور تیسرے درجے پر حراس الارز۔ علاوہ ازیں مارونی راہبوں کا فرقہ بھی کافی طاقتور ہے۔ لبنان کی خانہ جنگی کے دوران میں عیسائیوں اور ان

[1] ان بادشاہ سلامت کی داستانیں بھی بہت دلچسپ ہیں۔ وقت پڑنے پر یہ اپنے آپ کو شیعوں کا محافظ کہلوایا کرتا تھا لیکن جہاں اس کا بس چلتا وہ ان کو زک پہنچانے میں دریغ نہ کرتا۔ ایران میں شیعوں پر جو ظلم و ستم اس نے کیے اور جس طرح عزاداری اور جمعہ کے اجتماعات پر پابندیاں عائد کیں اس کے لیے تو شاید وہ کوئی علت بھی بیان کر سکتا لیکن غیر ایرانی شیعوں پر جو اس نے ظلم کیے ہیں وہ ایک طویل داستان ہے۔ سلطنت مسقط و عمان میں ان بادشاہ سلامت کی افواج قاہرہ نے بظاہر ظفار کے باغیوں کی سرکوبی کے لیے سابق سلطان کی مدد کی لیکن در اصل ان شاہی افواج کا نشانہ ظفار کی شیعہ آبادی تھی جنھیں مسقط و عمان میں حیدر آبادی کہا جاتا ہے۔ ان مظلوموں کو شاہ کی فوجوں نے کمیونسٹ قرار دے کر انھیں اپنے ظلم و ستم کا نشانہ بنایا۔

Presented by Ziaraat.Com

کی فوجی تنظیموں (یعنی کتائب، احرار اور حراس الارز) نے مغربی سیاست کا پٹھو بن کر فلسطینی مزاحمت کے خلاف بہت بڑی سازش کی۔ ان کی تمام سرگرمیاں بڑی نپی تُلی تھیں۔ ان کی خواہش یہ تھی کہ یا تو مسلمانوں کی طاقت کو پراگندہ کر دیں اور اپنے مراعات و امتیازات کو محفوظ رکھیں اور یا پھر لبنان کو تقسیم کروا کے عیسائی اکثریت کے علاقے میں ایک آزاد ریاست بنائیں۔

لبنان کے عیسائی عربوں کے بحرِ ذخار میں اپنے آپ کو اقلیت شمار کرتے ہیں۔ لہٰذا دوسری اقلیتوں سے تعاون کرتے ہیں۔ ان کے اور اسرائیل کے درمیان نقطۂ التقا یہی بات ہے۔ اسی بناء پر انھیں توقع تھی کہ شیعہ بھی ان سے تعاون کریں گے۔ چونکہ لبنان کے شیعہ بھی عرب ممالک میں ایک اقلیت رہے اور اسی بناء پر وہ عرب ممالک کی طرف سے اہانت کا نشانہ بنتے رہے ہیں اور ان کے ظلم وستم کا ہدف۔ خانہ جنگی کے ابتدائی ایام میں ان عیسائی جماعتوں نے شیعوں کو مارنے سے گریز کیا۔ لیکن جب آقائے صدر نے فلسطینی مزاحمت کی غیر مشروط حمایت کا اعلان کیا تو شیعہ بھی ان کے غیظ وغضب کا نشانہ بن گئے۔ انتہا پسند مسیحی آقائے صدر کو ان تمام مشکلات کا ذمہ دار گردانتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ سید موسیٰ الصدر ہی تھے جنھوں نے 'فتح' کو طاقت بخشی اور اس کی حمایت کی اور شیعہ عوام کو جو فلسطین کے مخالف تھے فلسطینی طرفداری کے لیے مسلح کر دیا۔ وہ یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ شیعہ اور مسیحی دُنیائے عرب میں دو اقلیتیں ہیں اس لیے لازم ہے کہ وہ مجبوراً ایک دوسرے سے اتحاد کریں تاکہ زندہ رہیں لیکن سید موسیٰ الصدر نے عیسائیوں کے ساتھ اتحاد کو پسِ پشت ڈال دیا اور فلسطینیوں کے ساتھ مل کر عیسائیوں کے خلاف جنگ آزما ہو گئے۔ اگر سید موسیٰ الصدر اور شیعہ عیسائیوں کے ساتھ نہ لڑتے تو فلسطینی مزاحمت میں یہ دم خم نہ تھا کہ وہ اس طرح لڑ سکتے۔ وہ یہ کہتے ہیں کہ "سید موسیٰ الصدر ہی ہیں جنھوں نے فلسطینی مزاحمت کو شعائرِ مقدس گردانا، خیرِ مطلق شمار کیا اور دل وجان سے ان کی مدافعت کی"۔ وہ اسے سید الصدر کی سب سے بڑی غلطی شمار کرتے ہیں۔ روزنامہ 'العمل' (حزب الکتائب یعنی فلینجسٹ کا سرکاری ترجمان) حزب الکتائب کے ارکان اور دیگر انتہا پسند مسیحی اخبار سید موسیٰ الصدر کو بڑی سختی سے ہدفِ دُشنام بناتے ہیں۔ میں نے خود

الشیاح[1] میں مورچوں کے پیچھے سے اور عین الرمانہ کے قلعہ بند علاقوں سے سید موسیٰ الصدر پر گالیاں پڑتے ہوئے سُنی ہیں۔ حتیٰ کہ امیر المومنین علیہ السلام اور امام حسین علیہ السلام پر بھی دشنام طرازیاں سُنی ہیں۔

لیکن بحیثیتِ مجموعی کہا جا سکتا ہے کہ اعتدال پسند عیسائی[2] جو کتائب اور احرار کے مخالف ہیں سید موسیٰ الصدر کو واحد قابلِ اعتماد لبنانی شخصیت گردانتے ہیں اور اس بات کے معتقد ہیں کہ سید موسیٰ الصدر کے ارشادات پر عمل نہ کرنے سے لبنان اس خانہ جنگی اور اس بدنصیبی کا شکار ہوا ہے۔

لبنان کی بائیں بازو کی جماعتیں :

لبنان کی بائیں بازو کی جماعتیں زیادہ تر فلسطینیوں کی مختلف جماعتوں کے ساتھ گھلی ملی ہوئی ہیں۔ یہاں تک کہ لبنان کی خانہ جنگی کے دوران میں بائیں بازو کی یہ ساری جماعتیں اور فلسطینیوں کی بائیں بازو کی تنظیمیں کمال جنبلاط کی رہنمائی میں متحد ہو کر قومی تحریک (حرکۃ الوطنیۃ) میں شامل ہو گئی تھیں۔

۱۔ لبنان کی بائیں بازو کی جماعتوں میں سب سے بڑی جماعت لبنانی کمیونسٹ پارٹی

---

[1] بیروت کے ہوائی اڈے سے شہر کو جاتے ہوئے ایک بہت بڑا محلہ ہے جس میں غالب اکثریت شیعہ مسلمانوں پر مبنی ہے۔ بیروت کی خانہ جنگی میں اس منطقے کو عیسائی جارحیت کا ہدف بننا پڑا کیونکہ اس کے ساتھ ہی حدث اور بعبدا وغیرہ کے عیسائی مناطق ہیں جو بلندی پر واقع ہیں۔ تنظیم امل کا سب سے بڑا مرکز اسی محلے میں واقع ہے۔

[2] لبنان کی خانہ جنگی میں جن عیسائیوں نے مسلمان دشمنی کا ثبوت دیا ہے ان میں سرِفہرست مارونی ہیں۔ کتائب، احرار اور حراس الارز میں اکثریت انھی کی ہے۔ لیکن مشرقی عیسائی جن میں اکثریت آرتھوڈوکس عیسائیوں کی ہے اس جنگ سے الگ رہے ہیں۔ یہ عیسائی پاپائے روم کو تسلیم نہیں کرتے اور ان عیسائیوں کے پسماندگان ہیں جو مسلمانوں کے اس منطقے میں آنے پر یہاں آباد تھے اور اصلاً ونسلاً عرب ہیں۔ ان کے بارے میں تفصیلی بحث اس کتاب کے مقدمۂ مترجم میں دی گئی ہے۔

Presented by Ziaraat.Com

(حزب الشیوعی اللبنانی) ہے جو سوویٹ یونین کی طرفدار ہے اور اس کا لیڈر ایک عیسائی جارج حاوی ہے۔ لبنانی کمیونسٹ پارٹی کو لبنان میں کام کرتے ہوئے کم و بیش پچاس سال ہوگئے ہیں۔ اس کے ۹۵ فیصد ارکان اور اس کے لڑنے والوں کی اکثریت شیعہ ہے جو آہستہ آہستہ اس پارٹی سے علیحدہ ہو چکے ہیں یا علیحدہ ہو رہے ہیں اور شیعہ تنظیم میں شامل ہو رہے ہیں۔

۲۔ منظمۃ العمل الشیوعی (کمیونسٹ مزدور تنظیم): یہ جماعت درحقیقت کمیونسٹ پارٹی کی ایک شاخ ہے۔ ان کی تعداد بہت کم ہے لیکن اس کے ارکان نہایت انتہاپسند ہیں اور چینیوں کے طرفدار ہیں۔ (ایران اور یورپ میں کمیونسٹ پارٹیوں میں جو اختلافات ہیں وہ لبنان میں بھی دکھائی دیتے ہیں۔)

۳۔ الحزب التقدمی الاشتراکی (پروگریسو سوشلسٹ پارٹی): یہ کمال جنبلاط کی جماعت ہے جو اپنے آپ کو سوشلسٹ سمجھتا ہے۔ یہ کمیونسٹ نہیں لیکن خود کو سوشلسٹ اور ترقی پسند گردانتا ہے۔ (چندسال قبل کمال جنبلاط کو دہشت پسندوں نے اپنا نشانہ بنا دیا اور اب اس کا بیٹا ولید جنبلاط اس کا جانشین اور پارٹی کا سربراہ ہے)۔ جنبلاط کا بیشتر کام سیاست بازی تھا۔ جب اس کی سیاست کا تقاضا ہوتا مثال کے طور پر لبنان کی خانہ جنگی کے دوران میں، تو وہ کچھ لوگوں کو جمع کر لیتا، انھیں پیسے دیتا، فوجی تربیت دیتا اور ایک مسلح تنظیم بنا لیتا تاکہ اپنے عقائد اور افکار لوگوں سے قبول کروالے۔

۴۔ منظمۃ حزب البعث العربی الاشتراکی (عرب سوشلسٹ بعث پارٹی): اس پارٹی کا سربراہ عاصم قانصوہ ہے۔ یہ پارٹی سوریا کے ساتھ متعلق ہے۔

۵۔ حزب البعث العربی الاشتراکی: یہ جماعت عراقی بعث پارٹی کی ہمنوا ہے۔ اس کا رہنما ڈاکٹر عبدالمجید الرافعی ہے۔

۶۔ المرابطون: یہ لبنان کے ناصری گروہوں میں سے ہے۔ اس کا رہبر ابراہیم قلیلات ہے جس کا کچھ ذکر ہو چکا ہے۔ یہ جماعت دوسری ناصری جماعتوں کی طرح جمال عبدالناصر

کی ہمنوا اور اسی کی پالیسی پر عمل پیرا ہے[۱]۔

۷۔ اتحاد قوۃ الشعب العامل (عوامی مزدور پارٹیوں کی یونین): اس کا لیڈر کمال شاتیلا ہے۔

۸۔ حزب القومی السوری الاجتماعی (سوری نیشنلسٹ پارٹی): اس کا رہنما انعام رعد ہے۔

---

[۱] آج کل یہ جماعت لیبیا کی ہمنوا ہے اور اس کی حکومت سے پیسے وصول کرتی ہے۔

[۲] اس پارٹی کا بنیادی نعرہ یہ ہے کہ سوریا کی قدیم حدود میں ایک متحدہ حکومت قائم ہو جس میں موجودہ سوریا، لبنان، فلسطین، اردن اور عراق شامل ہوں۔ اس پارٹی نے ۱۹۶۱ء میں لبنان میں انقلاب برپا کرنے کی کوشش کی تھی لیکن یہ کوشش ناکام ہوگئی اور اس کے لیڈروں کو سزائیں ہوگئیں۔ یہ پارٹی بھی دوسری بائیں بازو کی جماعتوں کی طرح بظاہر مذہب کے خلاف ہے لیکن اصل میں عیسائیت کا فروغ اور عیسائیوں کا غلبہ اس پارٹی کا انتہائی مقصود ہے۔

Presented by Ziaraat.Com

باب ہفتم

فلسطینی مزاحمت کی تحریک

تنظیم آزادی فلسطین کا قیام؛

جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ لبنان فلسطینیوں کا گڑھ ہے اور فلسطین کی تحریکِ آزادی کا مرکز۔ اس تنظیم کا آغاز ۱۹۶۵ء میں ہوا اور اس کے اساسی ارکان میں ۱۲ افراد تھے جن میں یاسر عرفات اور ابو جہاد کو رہنمائی حاصل تھی۔ اس زمانے میں عرب ممالک میں جمال عبدالناصر کو عروج حاصل تھا اور آپ جانتے ہیں کہ مصر میں لاکھوں افراد مظاہرے کرتے تھے اور کہتے تھے کہ ہم اسرائیل کو ختم کر دیں گے، اسرائیلیوں کو سمندر میں پھینک دیں گے، یہ کر دیں گے، وہ کر دیں گے۔ لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ یہ سب زبانی جمع خرچ تھا۔ آپ یہ دیکھ چکے ہیں کہ ۱۹۶۷ء میں اسرائیل نے ۲ گھنٹے کی مدت میں تین بڑے بڑے عرب ملکوں، مصر، سوریا اور اردن کو شکست دی اور اس دوران میں ان تینوں ملکوں کی فضائی طاقت کو ختم کر کے رکھ دیا۔ یہ درست ہے کہ یہ جنگ ۵ دن جاری رہی لیکن اس جنگ کی تقدیر ان پہلے ۲ گھنٹوں ہی میں لکھی جا چکی تھی۔ جب فضائی طاقت ہی ختم ہو گئی تو بے چارے مصری لڑنے والے سینا کے صحرا میں جو ایک غیر آباد اور لق و دق صحرا ہے اسرائیلی ٹینکوں، توپوں اور ہوائی جہازوں سے کیسے لڑ سکتے تھے۔ موت ان کا مقدر ہو چکی تھی۔ ۷۰ ہزار مصری کمانڈو صحرائے سینا میں موت سے ہمکنار ہو گئے تھے۔ دہشت گردی کا دیو منہ پھاڑے ہوئے تھا۔ اسرائیلی ہوائی جہازوں نے بغیر کسی رکاوٹ کے مصری ٹینکوں کو راکٹ مار مار کر بے کار کر دیا تھا اور اسرائیلی فوج نے صحرائے سینا پر حملہ کر کے ۷۰ ہزار بہترین جنگ آزماؤں کو محاصرے میں لے لیا۔ میں خود ۲ سال

تک مصر میں رہ چکا ہوں۔ میں نے مصری کیمپوں میں مصری کمانڈوز کے ساتھ دن گزارے ہیں اور میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ انھیں کس قسم کی شدید تربیت سے گزارا جاتا تھا۔ لیکن یہ بے چارے کمانڈو کیا کر سکتے تھے۔ یہ بڑی دردناک صورتِ حالات ہے۔ میں کبھی نہیں بھول سکتا کہ میرے دوست اور میرے استاد جن کے ساتھ میں مصر میں رہا ہوں صحرائے سینا میں یوں ناپید ہو جائیں۔ میرے لیے یہ بات ناقابلِ برداشت تھی۔ ایک امریکی خبر نگار نے لکھا ہے کہ جب اسرائیلی بکتر بند گاڑیاں آگے بڑھیں تو ان مصری فوجیوں میں سے ایک کی آنکھیں پیاس کی وجہ سے اندھی ہو چکی تھیں۔ اسے کچھ دکھائی نہ دے رہا تھا۔ اس کے ہونٹ جلی ہوئی مٹی کی طرح ہو چکے تھے اور جب آپس میں ملتے تھے تو ان سے کورے برتنوں کے آپس میں ٹکرانے کی آواز پیدا ہوتی تھی۔ وہ قدم نہیں اٹھا سکتا تھا۔ اس کے گھٹنے زمین سے لگے ہوئے تھے۔ اسے بس ایک ہی بات یاد تھی پانی! پانی! اور کچھ نہیں کہ سکتا تھا پسپا ہونے والے سپاہی اس کی طرف توجہ نہیں کر رہے تھے۔ کچھ دیر کے بعد زمین پر گر گیا اور موت کے آغوش میں چلا گیا۔ ان مصری فوجیوں میں وہ لوگ موجود تھے جنھوں نے صحرائے سینا میں مدت تک تربیت حاصل کی تھی۔ وہ سانپ اور چوہے کھا کر گزر کرتے تھے۔ بن پانی پیے زندگی بسر کرنے کی عادت ڈالے ہوئے تھے۔ ان مصری کمانڈوز میں سے کچھ اس قابل ہوئے کہ وہ اپنے آپ کو پانی تک پہنچا لیں لیکن اس سے قبل اسرائیلی فوجوں کے بکتر بند ڈویژن نہر سویز تک جا پہنچے تھے اور ساحل ان کے تسلط میں آ چکا تھا۔ انھوں نے مصری فوجیوں کو گرفتار کر لیا اور ٹرکوں میں بٹھا کر انھیں صحرائے سینا کے اندر ۱۵۰ کیلومیٹر دور لے جا کر ٹرکوں سے اتار دیا اور کہا کہ اگر ہمت ہے تو واپس آ جاؤ۔ کتنا بڑا جرم ہے یہ۔ یہ بے چارے سپاہی صحرا میں سرگرداں پڑے تھے۔ ان میں جو کمزور تھے وہ موت کے منہ میں چلے گئے اور ان کی لاشیں آج بھی صحرائے سینا کی ریت پر پڑی ہوئی ہیں۔ لیکن جو کمانڈو طاقتور تھے اور تجربہ کار تھے، وہ اپنے آپ کو دوبارہ ساحل سویز تک پہنچانے میں کامیاب ہو گئے۔ انھوں نے ۱۵۰ کیلومیٹر کا فاصلہ ننگے پاؤں، پا پیادہ اس جلتی ہوئی ریت میں پانی اور خوراک کے بغیر طے کیا اور اپنے آپ کو نہر سویز تک پہنچا دیا۔ لیکن انھوں نے اپنے آپ کو اسرائیلی فوجوں کے حوالے نہیں کیا۔

Presented by Ziaraat.Com

دو ماہ تک وہ اسرائیلی فوجوں کے گرد و نواح میں بھٹکتے رہے۔ انھیں پانی میسر نہ تھا۔ رات کو وہ صحرا میں روٹیوں کے ٹکڑے اور اسرائیلیوں کا پھینکا ہوا کھانا تلاش کر کے اپنی بھوک مٹاتے اور پھر صحرا میں چھپ جاتے۔ دو ماہ تک انھوں نے یونہی زندگی کے دن گزارے۔ اس کے بعد ان کی طاقت جواب دے گئی اور انھوں نے احساس کیا کہ مصر کی حکومت مکمل طور پر شکست کھا چکی ہے اور اب اس سے کوئی امید نہیں۔ اب انھوں نے ایک خطرناک منصوبہ بنایا اور وہ منصوبہ یہ تھا کہ اسرائیلی فوجوں پر جا پڑیں اور لڑیں تاکہ انھیں شہادت نصیب ہو۔ یہ حملہ انھوں نے کیا۔ بہت شدید حملہ جس میں ان میں سے اکثر شہید ہو گئے۔ صرف چند نفر اسرائیلیوں کے ہاتھ گرفتار ہوئے۔ ایک غیر ملکی نامہ نگار اس قابل ہوا کہ وہ ان لڑنے والوں میں سے ایک کے بارے میں کچھ کہے۔ اس کا بدن گولیوں سے چھلنی ہو چکا تھا۔ اس کی جلد پر آبلے پڑے ہوئے تھے۔ وہ ہڈیوں کا ایک ڈھانچہ تھا جس پر کھال منڈھی ہوئی تھی۔ یہی وہ شخص ہے جس نے وہ واقعہ بیان کیا ہے جو میں نے ابھی عرض کیا اور جس سے وہ گزرا تھا اور آخر کار یوں اسیر ہو گیا تھا۔

اسرائیل ایک ایسا مجرم ہے جسے انسانیت اور شرافت سے کوئی سروکار نہیں۔ جنوبی لبنان میں اسرائیلیوں سے جو جرائم سرزد ہو رہے ہیں وہ اسی نوعیت کے ہیں۔

خیر میں یہ بات کر رہا تھا کہ اسرائیل کی اس طاقتور حکومت نے ۲ گھنٹے کی مدت میں تین عرب ممالک کا تیا پانچا کر دیا اور اس بات کا سبب ہوئی کہ تمام عرب عبدالجمال ناصر اور عرب حکومتوں سے مایوس ہو گئے۔ جب وہ مایوس ہو گئے تو انھوں نے فلسطینی مزاحمت کا آسرا لیا۔ فلسطین کی تنظیم آزادی ۲ سال قبل یعنی ۱۹۶۵ء میں قائم ہو چکی تھی اور اس نے جمال عبدالناصر کی شکست کے بعد عروج حاصل کیا۔ پُرجوش نوجوانوں کی ایک بہت بڑی تعداد فلسطینی مزاحمت کی طرف کھنچی آئی اور وہ اس بات کے معتقد ہو گئے کہ ان کے لیے کامیابی کا ایک ہی راستہ ہے اور وہ فلسطینی مزاحمت کی تنظیم اور مسلح لڑائی ہے۔ اس تنظیم نے جنگ کے دوران میں صحرائے سینا، غزہ اور دوسرے جنگی محاذوں میں وہ اسلحہ جمع کر لیا جو مختلف فوجی چھوڑ گئے تھے اور اسے غاروں میں اور دوسری جگہوں پر چھپا دیا۔ یہی اسلحہ ان حملوں کی بنیاد بنا جو بعد میں فلسطینی مزاحمت نے اسرائیلیوں پر کیے۔

اس زمانے میں تنظیم آزادی فلسطین میں ایسے لوگ شامل تھے جنھیں یقینِ کامل حاصل تھا۔ ان میں سے بعض میرے دوست تھے اور مجھے بتایا کرتے تھے کہ کس فقر و فاقہ اور بدنصیبی کی زندگی وہ بسر کرتے ہیں۔ جب کبھی ان میں سے کوئی ایک شہر سے دوسرے شہر تک جانا چاہتا تھا تو پا پیادہ وہ چلنے پر مجبور تھا کیونکہ اس کے پاس پیسے نہ ہوتے کہ بس میں بیٹھ سکتا، اُردن میں جو پہلا بم پھٹا وہ بارُود، کپڑے کی دھجیاں، نوشادر اور اس قسم کے معمولی دھماکہ دینے والی اشیاء سے بنا ہوا تھا اور جس بم کو آج کل ایران کا چھوٹے سے چھوٹا بچہ بھی بنانے پہ قادر ہے۔ اس قسم کی غربت میں وہ زندگی گزارتے تھے۔ لیکن یہ افراد ایمان اور پاکیزگی کی دولت سے مالامال تھے۔ ہر چند کہ کمالِ فقر اور محرومیت بھی ان کے شاملِ حال تھی لیکن اب عرب ان کی طرف متوجہ ہو رہے تھے اور تحریک شدت پکڑ رہی تھی۔

معرکۂ کرامہ:

اس کے ایک سال بعد اُردن میں کرامہ کی مشہور لڑائی واقع ہوئی۔ اس زمانے میں فلسطینی مزاحمت کا مرکز اُردن میں تھا۔ اُردن اور اسرائیل کے درمیان بہت بڑا علاقہ (دریائے اردن کا مغربی کنارہ) فلسطینیوں کے پاس تھا اور اسرائیل پر فلسطینیوں کے حملے کے لیے جنگی نقطۂ نظر سے بہت مناسب علاقہ تھا چونکہ وہ اردن اور اسرائیل کے درمیان واقع ایک چھوٹے سے دریا کو عبور کر کے اسرائیل میں داخل ہو سکتے تھے اور اپنا کام سرانجام دینے کے بعد اسی راہ سے واپس آ سکتے تھے۔ اس وقت "فتح" کی ساری نفری ۴۵۰ افراد پر مشتمل تھی اور یاسر عرفات ان کے رہنما تھے۔ کرامہ کا مقام اردن میں دریائے اردن سے کوئی ۲ کلو میٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ کرامہ کی لڑائی ان اہم اور قابلِ فخر لڑائیوں میں سے ہے جو فلسطینی مزاحمت نے اسرائیل کے خلاف لڑی ہیں۔ جو لوگ اس میں شہید ہوئے اور جنھوں نے اس جنگ میں حصہ لیا وہ سب کے سب خلوص و ایثار، پاک نفسی اور فداکاری کا نمونہ تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جو یہ جانتے تھے کہ ایک دن کے بعد وہ شہید ہو جائیں گے۔ ان جیالوں نے قصبے کے وسط میں ایک مدرسے میں اپنا مرکز بنایا اور مورچہ بند ہو کر بیٹھ گئے۔ یہاں تک کہ اسرائیل نے

Presented by Ziaraat.Com

قصبے کا محاصرہ کر لیا اور مدرسے پر قبضہ کر لیا جس پر ان فدائیوں نے اپنے آپ کو بھی بموں سے اُڑا دیا اور اس کے ساتھ اسرائیلی سپاہیوں کو بھی ناپید کر دیا اور یوں فداکارانہ کاموں کی ایک مثال پیش کی۔ ۴۵۰ فلسطینی مجاہدوں میں سے ۱۵۰ افراد شہید ہو گئے یعنی ان کی ایک تہائی تعداد نے اپنے آپ کو فدا کر دیا لیکن اس کے ساتھ بے شمار اسرائیلیوں کو بھی ناپید کر دیا اور بعض اسرائیلی ٹینکوں کو بھی۔ اسرائیلی فوجیوں نے اپنی گلوخلاصی کرائی اور راہِ فرار اختیار کی۔ اسرائیلی کسی لڑائی میں اس بات پر تیار نہیں ہوتے کہ اپنے مرنے والوں کی لاشیں چھوڑ کر بھاگ نکلیں، لیکن اس لڑائی میں انھیں اپنے ساتھیوں کی لاشیں چھوڑ کر فرار ہونے پر مجبور ہونا پڑا۔ البتہ یہ بات ضرور ہے کہ اردنی فوج نے بھی اور اردنی توپ خانے نے بھی فلسطینی حمایت میں اسرائیلی دستوں پر کاری ضرب لگائی اور اس حالت میں جب وہ میدان چھوڑ کر پسپا ہو رہے تھے۔ کرامہ کی لڑائی فلسطینیوں کی طاقت کا معراج ہے۔ اس لڑائی میں انھوں نے جس ایثار، پاک نفسی اور فداکاری کے جوہر دکھائے، اس کی بناء پر دُنیا کے ہر گوشے میں جہاں جہاں کوئی شخص اسرائیل کے خلاف جنگ آزما ہونا چاہتا ہے وہ فلسطینی مزاحمت کی تحریک کی طرف کھنچا چلا آتا ہے۔ وہ پاک احساسات جو اس وقت ہمارے ایرانی نوجوانوں کے دل میں ہیں۔ اسی قسم کے احساسات اس وقت تمام عرب نوجوانوں کے دل میں موجزن تھے۔ صرف ایک ماہ کی مدت میں ایک لاکھ افراد فلسطینی مزاحمت کی تحریک میں شامل ہو گئے۔ تصور کیجیے کہ کویت، سعودی عرب، مصر، سوریا اور عراق اور خود اردن میں سے ایک ماہ کی مدت میں ایک لاکھ عرب فلسطینی مزاحمت کی تحریک میں شامل ہو گئے۔ اس تحریک کا سب سے بڑا مسئلہ اسی وقت سے پیدا ہوا ہے چونکہ ان کے پاس ایسے ذی شعور، بایقین اور منتظم افراد نہ تھے جو ان ایک لاکھ افراد کی تربیت کرتے، انھیں منظم کرتے۔ مختلف افراد مختلف احساسات و افکار، مختلف آئیڈیالوجی اور مختلف عقائدی رویوں کے ساتھ "فتح" میں شامل ہو گئے اور "فتح" نے بھی ان سب کو قبول کر لیا لیکن ان کے بارے میں کوئی تحقیق نہ کی اور نہ انھیں پہچاننے کی کوشش کی گئی۔

ایک بار اور آپ کی خدمت میں یہ گزارش کر دوں کہ فلسطینیوں پر جو تیس سال کی مدت

میں تشدد ہوا ہے، جس ظلم و ستم سے وہ گزرے ہیں کہ حکومتِ اسرائیل نے بھی انھیں مارا ہے اور عرب حکومتوں نے بھی بُرا بھلا کہا ہے۔ ان سب چیزوں کی بناء پر ان میں بھی اسی قسم کا احساسِ کمتری پیدا ہو گیا ہے جس قسم کا احساسِ کمتری شیعوں میں پیدا ہوا تھا، جس کا ہم ذکر کر چکے ہیں۔ فلسطینیوں میں یہ احساس زیادہ شدید ہے۔ اس احساس کی بناء پر جو فلسطینیوں کے دل میں ہے وہ یہ چاہتے ہیں کہ اسرائیل سے انتقام لیں عرب حکومتوں سے انتقام لیں اور ہر اس شخص سے انتقام لیں جو ان کے مقابل آئے یا دوسرے لفظوں میں وہ تمام دنیا سے انتقام لیں اس لیے جب انھیں شعور ہو گیا کہ فتح کے نام سے ایک مسلح تنظیم وجود میں آئی ہے تو ہر شخص نے کوشش کی کہ اپنے آپ کو اس تنظیم میں شامل کرے اور سلاحِ جنگ ہاتھ میں لے۔ لیکن اس لیے نہیں کہ راہِ خدا میں جنگ آزما ہو بلکہ اس لیے کہ انتقام لے، اپنے احساسِ کمتری کا مداوا کرے اور ان لوگوں سے انتقام لے جنھوں نے ان پر تشدد روا رکھا ہے، انھیں بُرا بھلا کہا اور انھیں یہ روزِ سیاہ دیکھنے پر مجبور کیا۔ اس بناء پر ایک ماہ کی مدت میں ایک لاکھ فلسطینی اور عرب فلسطینی مزاحمت کی تحریک میں شامل ہو جاتے ہیں اگرچہ ان کی سوچ ایک دوسرے سے مختلف تھی۔ وہ ہتھیار اُٹھا لیتے ہیں مگر 'فتح' کی تنظیم کے پاس ایسے افراد کافی تعداد میں موجود نہ تھے جو انھیں تربیت دے سکتے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ خلوص وہ قربانی کا جذبہ، وہ ایثار اور وہ پاکیزہ جذبات جو 'فتح' کی سرگرمیوں کے ابتدائی ایام میں تھے اب ناپید ہو گئے۔ جو لوگ اب اس تنظیم میں شامل ہوتے ہیں وہ اپنی ذاتی مصلحتوں اور شخصی منفعتوں کے لیے اس میں شریک ہو کر اس بات کے لیے تیار ہوتے ہیں کہ وہ کسی دوسرے انسان کو مار دیں اس سے انتقام لیں۔ یہ بات 'فتح' کی تنظیم کے تار و پود میں سرایت کر چکی ہے۔ مجھے یاد ہے کہ چند سال قبل ہمارے مدرسے (مدرسۂ صنعتی جبلِ عامل) میں کچھ لڑکے میرے پاس آئے اور شور مچایا کہ یہ فلسطینی لڑکے چاہتے ہیں کہ گدھے کو ماریں۔ میں فوراً مدرسے سے باہر آیا۔ ہمارے مدرسے کی دیوار کے ساتھ فلسطینیوں کا کیمپ ہے[1]۔ یہاں جتنے لڑکے تھے وہ سب کے سب فلسطینی تھے۔ میں نے دیکھا کہ یہ فلسطینی لڑکے جن کی عمریں چھ سات سے زیادہ نہ تھیں، ہر ایک چاقو لیے ہوئے ایک بوڑھے اور لاغر گدھے کی جان کے دَرپے ہیں اور اسے چاقو مار رہے ہیں۔ یہ گدھا

---

[1] اس کیمپ کا نام "کیمپ برج شمالی تھا۔ جب یہ تحریر لکھی گئی تھی اس وقت یہ کیمپ موجود تھا، اب یہ کیمپ موجود نہیں، تاریخ کا جزو بن چکا ہے۔

Presented by Ziaraat.Com

زمین پر گرا پڑا تھا اور اس میں اتنی سکت نہ تھی کہ اپنا سر اٹھا سکے اور یہ لڑکے اسے مار رہے تھے۔ لیکن میرے لیے یہ بات بالکل واضح تھی۔ میں یہ سوچ رہا تھا کہ یہ انتقام لینا چاہتے ہیں۔ اسرائیل اور امریکہ پر تو ان کا بس نہیں چلتا، جو کوئی کمزور و ناتواں ان کے ہتھے چڑھ جاتا ہے، اُسے اپنا ہدف بنا لیتے ہیں، میرے دھمکانے پر وہ لڑکے بھاگ گئے۔ ہمارے لڑکے اس گدھے کو ایک تختے پر لاد کر مدرسے میں لے آئے۔ انھوں نے دو دن تک اس کا علاج معالجہ کیا لیکن آخر کار وہ گدھا مر گیا اور اس کی خلاصی ہوئی۔ یہ نمونہ ہے اس احساسِ کمتری کا جو ان کے دلوں میں پیدا ہو چکا ہے۔ جہاں کہیں ان کا بس چلتا ہے وہ انتقام لیتے ہیں۔ یہ بات تو آپ جانتے ہیں کہ جو شخص کسی عقیدے کی بنیاد پر حرکت کرتا ہے وہ خدا کی خاطر جنگ کرتا ہے۔ اگر جنگ کے دوران میں اس کا ہدف راہِ خدا سے ہٹ جائے اور وہ اپنے شخصی انتقام یا ذاتی مصلحتوں میں الجھ کر رہ جائے تو وہ شکست کھا جاتا ہے اور فنا ہو جاتا ہے۔ اس قسم کا عمل بہت بُرا ردِ عمل پیدا کرتا ہے۔

سیاہ ستمبر:

بہرحال اس قسم کے لوگ "فتح" میں شامل ہو گئے اور "فتح" کے کارکن اس قابل نہ تھے کہ وہ ان لوگوں کی فکری یا تنظیمی تربیت کر سکیں۔ ان کی مشکلات کا آغاز اسی دن سے شروع ہوا اور یہ مشکلات زیادہ تر اردن میں پیدا ہوئیں۔ یہ مشکلات جن کا میں ذکر نہیں کرنا چاہتا بالآخر اردن اور فلسطینی مزاحمت کے درمیان جنگ کی صورت اختیار کر گئیں اور یہیں سے فلسطینی تنظیم میں داخلی چپقلشوں کا آغاز ہوا اور یوں اردن کی فوجوں نے فلسطینیوں کے خلاف کارروائیاں شروع کر دیں۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں جارج حبش اور اس کی جماعت کے ذریعے سے اردن میں ۵ ہوائی جہازوں کو اغوا کرنے اور ان کو بم سے اُڑا دینے کے نتیجے میں اردنی فوج اور فلسطینی مزاحمت کے مابین تصادم پیدا ہوا۔ یہ تصادم جس نے سیاہ ستمبر کو وجود دیا پندرہ ہزار فلسطینیوں کی شہادت کا باعث ہوا۔ اردن میں فلسطینی مزاحمت کی بساط لپیٹ دی گئی اور باقی ماندہ فلسطینی جنگ آزما لبنان چلے گئے اور وہیں پر مقیم ہو گئے۔ جب جارج حبش نے

یہ کہا گیا کہ تم لوگوں نے جنگ کی آگ بھڑکائی اور تصادم کو ہوا دی اور اس کے بعد اردن سے بھاگ گئے اور جب "فتح" یا فلسطینی مزاحمت کی تحریک شہید پیش کر رہی تھی اس وقت تم نے ثابت قدمی کا ثبوت کیوں نہ دیا تو اس نے کہا کہ ہمارے پاس سپاہی نہیں ہیں۔ ہمارے ساتھی تو سارے کے سارے دانشور ہیں اور ہم نہیں چاہتے کہ ہمارے یہ دانشور افراد مارے جائیں۔ اس لیے ہم نے انھیں ہدایت کی کہ وہ بیروت چلے جائیں اور لبنان میں رہ کر سیاہ ستمبر کے حوادث میں مارے نہ جائیں۔

یہ باتیں جو میں کر رہا ہوں وہ ماضی کے حوادث کا تجزیہ ہے۔ اس لیے کر رہا ہوں کہ آئندہ کے لیے عبرت حاصل کی جائے چونکہ اردن کی حکومت استعمار کی آلۂ کار تھی اس لیے وہ چاہتی تھی کہ "فتح" کی تحریک کو ختم کر دیا جائے[1] اس کے ہاتھ فلسطینیوں کے خون سے رنگین ہیں لیکن اس بات کو فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ کچھ لوگ فلسطینی مزاحمت کی صفوں میں شامل تھے جنھوں نے اردن کی حکومت کو بہانہ دیا، اسے تحریک دی اور اس تصادم کو پروان چڑھایا اور بالآخر اس بات کا سبب ہوئے کہ اردنی فوج فلسطینی مجاہدین کے خلاف نبرد آزما ہو اور سیاہ ستمبر وجود میں آئے۔ جس طرح ہم اردن کی حکومت کو قابلِ معافی نہیں گردانتے اسی طرح ہمیں ان غلطیوں اور انگیختوں کو بھی فراموش نہیں کرنا چاہیے جو فلسطینی مزاحمت میں شریک لوگوں کی طرف سے اس دوران میں عمل میں آئیں۔ ہمیں ان سے عبرت حاصل کرنا چاہیے کہ دوبارہ ایسا نہ ہو۔

---

[1] پاکستان کے جوشیلے اور رومان پسند دانشور جورج حبش کی جماعت کی طرف سے ہوائی جہازوں کے اغوا اور ان کے تباہ کرنے کے کارناموں پر بہت عش عش کرتے ہیں لیکن مترجم کا نظریہ ہے کہ اردن میں فلسطینی تحریک کے ناپید ہونے کا سبب صرف اردن کی حکومت نہیں بلکہ جارج حبش اور نائف حواتمہ کی جماعتیں الجبہۃ الشعبیہ اور الجبہۃ الشعبیۃ الدیمو قراطیہ اساسی طور پر فلسطینی مزاحمتی تحریک اور حکومتِ اردن کے مابین تصادم کی ذمہ دار ہیں۔ ان دونوں جماعتوں کے مٹھی بھر ارکان اسرائیل کے خلاف جنگ آزما نہیں ہوئے تھے کیونکہ اس میں موت یقینی تھی اور شہرت بالکل نہیں تھی۔ ان لوگوں نے ہوائی جہازوں کو اغوا کرنے اور یونان یا سوئٹزرلینڈ ایسے ملکوں میں بم پھینکنے کے کارنامے سرانجام دیے جن میں انھیں شہرت ملی، اخباروں میں تصویریں چھپیں اور مترجم کے دل میں جائز شکوک پیدا ہوتے ہیں کہ یہ دونوں جماعتیں کسی غیر ملکی اشارے کے ماتحت فلسطینی مزاحمت کو بدنام کرنے اور ختم کرنے کے لیے کام کرتی رہی ہیں۔ اسی قسم کے خیالات کے اظہار پر مترجم کو الجبہۃ الشعبیہ کے "بہادر" کارکنوں نے اغوا کیا اور تین دن رات ستّین گھنٹوں کے عالم میں ایک کرسی پر بیٹھے رہنے پر مجبور کیا۔

Presented by Ziaraat.Com

لبنان میں فلسطینی مجاہدین کی آمد :

فلسطینی مجاہدین اردن سے نکل کر لبنان چلے آئے اور یہاں اردن سے کہیں بڑا واقعہ رونما ہوا۔ لبنان کے شیعوں نے ان کا استقبال کیا اور انھیں قبول کیا۔ سید موسیٰ الصدر نے جو اس زمانے میں شیعیانِ لبنان کے رہنما تھے ان فلسطینی مجاہدین کے حق میں مظاہرات کروائے، ان کے لیے چندے جمع کیے، ان کی مدد کی، ان کا ساتھ دیا، ان کے لیے زمینیں اور مکان مہیا کیے اور ان کے لیے ایسے امکانات پیدا کیے کہ وہ لبنان میں بہتر طریقے پر رہ سکیں۔

لیکن لبنان ایک تاجر پیشہ ملک ہے۔ فنیقیوں، یونانیوں اور رومیوں کے زمانے سے لے کر اب تک دُنیا کے بڑے بڑے بحری تاجروں میں فنیقی یا لبنانی شامل رہے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو سیاست بازی اور فریب کاری میں اپنی مثال آپ ہیں۔ ساری دُنیا کو یہ چکمہ دے سکتے ہیں اور انھیں چُونا لگانے میں ماہر ہیں۔ اسی بناء پر آپ دیکھتے ہیں کہ لبنان میں ۲۷ سے زیادہ پارٹیاں ہیں۔ جو شخص اپنے گرد پانچ، چھ افراد جمع کر لیتا ہے ایک پارٹی کا اعلان کر دیتا ہے اور فوراً اخبار چھاپنا شروع کر دیتا ہے، دونوں ہاتھوں سے روپے سمیٹ کر اپنے لیے سرمایہ جمع کر لیتا ہے۔ یہ ملک سیاست پیشگی اور فریب کاری کی دُنیا ہے۔

جب فلسطینی لبنان میں آئے تو وہ لبنان کی سیاست بازی کی فضا میں محو ہو گئے۔ آپ یہ جانتے ہیں کہ ایک انقلابی کے لیے سیاست بازی کی روش اختیار کرنا درست نہیں۔ اس کے لیے لازم ہے کہ راست باز ہو، راست گو ہو اور حق کا طرفدار ہو۔ ایک انقلابی اس لیے لڑتا ہے کہ شہادت حاصل کرے۔ وہ چکمہ باز اور فریب کار نہیں ہوتا۔ وہ حق کا علمبردار ہوتا ہے اور حقیقت کا پرستار۔ جب فلسطینی تحریکِ آزادی کے کارکن اردن سے لبنان میں آئے تو وہ ان صفات سے آراستہ تھے لیکن لبنان میں پہنچ کر وہاں کے سیاسی طرزِ فکر و عمل کو اختیار کر گئے اور انھوں نے بھی سیاسی کھیل کھیلنا شروع کر دیا۔ اس بناء پہ آپ دیکھتے ہیں کہ جن لوگوں کا وطیرہ انقلاب تھا جو اس کی راہ میں جان دیتے تھے اور جامِ شہادت نوش کرتے تھے، ان پہ لبنانی پارٹیوں کے اسلوب و روش نے اپنا اثر کیا، ان پارٹیوں کا اسلوب اور وطیرہ دروغ بافی، تہمت تراشی

افترا پردازی اور چکمہ بازی تھا اور مقامِ افسوس ہے کہ فلسطینی مزاحمت کی تحریک بھی اس قسم کی سیاست بازی کا شکار ہو گئی اور یوں اپنے پاؤں پر کلہاڑا مار بیٹھی اور جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ خود فلسطینیوں کے مختلف گروہوں کے درمیان آویزشیں اور چپقلشیں وجود میں آئیں۔ بیروت کے شہر میں مختلف جماعتوں کے مابین خون ریز لڑائیاں ہوتی ہیں جبکہ دونوں جماعتیں فلسطینیوں کی ہیں۔ وہ مارٹروں، کلیشنکوفوں اور دوسرے چھوٹے بڑے ہتھیاروں سے ایک دوسرے پر اس شدت سے حملے کرتی ہیں کہ اسرائیل کے مقابلے میں بھی ایسی جنگ نہیں لڑتیں۔ یہ روش فلسطینیوں کی صفوں میں پیدا ہو گئی ہے۔ ایک طرف ان کے ہاں آئیڈیالوجی کا فقدان ہے اور عقیدہ ناپید ہے، اس کے ساتھ نفسیاتی الجھنیں ہیں، کمتری کا احساس ہے جو ان کے دلوں میں جاگزیں ہے، جس بناء پہ وہ چاہتے ہیں کہ طاقت حاصل کریں۔ اور دوسری طرف وہ لبنان کی سیاست باز فضا کا شکار ہو چکے ہیں جس کی بناء پر ان کی صفوں کے مابین بے شمار مسائل اٹھ کھڑے ہوئے ہیں اور پھر فلسطینیوں اور لبنانیوں کے مابین آویزشیں رونما ہوئی ہیں اور ان سب چیزوں کی زد خود ان پر پڑتی ہے۔

بڑی بڑی فلسطینی تنظیمیں

فلسطینی مزاحمت میں تقریباً ۳۵ مختلف تنظیمیں ہیں۔ جس وقت ہم فلسطینی تنظیم کہتے ہیں تو اس سے مراد یہ ہرگز نہیں کہ اس کے سب لڑنے والے فلسطینی ہیں بلکہ بہت سے لبنانی بالخصوص شیعہ اس کے رکن ہیں اور اس کے لیے جنگ آزما ہوتے ہیں۔ اگر ہم بڑی بڑی فلسطینی تنظیموں کا جائزہ لیں تو ان میں ۸ زیادہ اہم تنظیمیں ہیں۔ یہ ۸ تنظیمیں بعض چھوٹی چھوٹی تنظیموں کے ساتھ مل کر اور ان کی مدد سے فلسطینی مزاحمت کی تشکیل کرتی ہیں۔

۱۔ ان تنظیموں میں سب سے بڑی تنظیم یاسر عرفات کی رہنمائی میں کام کرنے والی تنظیم "حرکۃ التحریر الفلسطینیہ" یعنی "فتح" ہے۔ یہ تنظیم قومیت کے اصول پر مبنی ہے۔ اس کی اپنی کوئی مخصوص آئیڈیالوجی نہیں بلکہ وہ ہر آئیڈیالوجی اور مذہب کے ماننے والوں کو قبول کر لیتی ہے بس شرط یہ ہے کہ وہ فلسطین کی آزادی کی راہ میں جنگ آزما ہو۔

Presented by Ziaraat.Com

۲۔ "فتح" کے بعد دوسری بڑی جماعت "الجبهة الشعبية التحرير الفلسطين" یعنی عوامی محاذ آزادی فلسطین (Peoples Front for Librationof Palestine) الجبهة الشعبية اساسی طور پر کمیونسٹ جماعت ہے جس کا لیڈر ایک عیسائی جارج حبش ہے۔ اس تنظیم میں بہت سے لبنانی اور شیعہ شامل ہیں لیکن مجموعی طور پر یہ فلسطینی تنظیم ہے جس کی لیڈری فلسطینیوں کے ہاتھ میں ہے اور اس کی عقائدی روش کمیونزم سے معین ہوتی ہے۔

۳۔ تیسری اہم جماعت "الجبهة الشعبية الديموقراطية" یعنی عوامی جمہوری محاذِ آزادی ہے۔ اس کی رہنمائی بھی ایک عیسائی کمیونسٹ کے ہاتھ میں ہے جس کا نام نائف حواتمہ ہے۔ ابتداء میں نائف حواتمہ جارج حبش کا دستِ راست تھا اور اس کا ہمنوا۔ آٹھ سال اکٹھے کام کرنے کے بعد اس نے جارج حبش سے علیحدگی اختیار کر لی اور ایک منشور صادر کیا جس میں کہا "کہ آٹھ سال جارج حبش کے ساتھ کام کرنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ جارج حبش امریکہ کا جاسوس ہے"۔ اس بنا پر اس نے جارج حبش کے الجبهة الشعبية سے الگ ہو کر ایک جماعت بنا لی جس کا نام "الجبهة الشعبية الديموقراطية" رکھا۔ نائف حواتمہ بھی روس کا آلۂ کار ہے اور اس سے پیسے اور اسلحہ حاصل کر کے روس کی سیاست کو لبنان میں رائج کرتا ہے۔

۴۔ ایک اور طاقتور جماعت "جبهة التحرير العربية" یعنی عرب محاذِ آزادی" ہے۔ یہ تنظیم عراق کی کاسہ لیس ہے اور صدام کے اشاروں پر کام کرتی ہے۔ اس تنظیم نے خوزستان (ایران) میں تیل کی پائپ لائنیں کاٹ دی تھیں۔ اس کا دعویٰ ہے کہ خوزستان عرب علاقہ ہے جسے وہ "عربستان" کا نام دیتے ہیں۔ اس کے کارکن یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ خوزستان کو ایران سے الگ ہو کر عراق کا حصہ ہونا چاہیے۔

پیسے اور امکانات کے لحاظ سے یہ تنظیم یعنی جبهة التحرير العربية باقی تمام فلسطینی تنظیموں سے زیادہ طاقتور ہے۔ عراقی حکومت لبنان میں اس جماعت پر ایک کروڑ پچاس لاکھ ڈالر فی ماہ خرچ کرتی ہے۔ یہ پیسہ اخباروں، اسلحے، سامانِ جنگ اور ارکان کو خریدنے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ محروم اور محتاج لوگوں کو یہ تنظیم دو ہزار لیرہ ماہانہ دے کر خرید لیتی ہے، انھیں اسلحہ دیتی ہے اور پھر انھیں مارنے دھاڑنے کے لیے چھوڑ دیتی ہے۔ اس تنظیم یعنی جبهة التحرير العربية میں

پرلے درجے کے غنڈوں اور قاتلوں نے رکنیت حاصل کر رکھی ہے۔ آئیڈیالوجی کے اعتبار سے یہ عراقی بعث پارٹی کی ہمنوا ہے اور اشتراکی نظام کی داعی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کے پاس اپنا کوئی فکری نظام نہیں ہے۔ یہ تنظیم اس لیے بنی ہے کہ کتابیں اور رسالے چھاپے، اس لیے وجود میں آئی ہے کہ لوگوں کو مارے۔ میں اس بات کا ذکر کر چکا ہوں کہ مدرسہ صنعتی جبل عامل، جس کا میں ۸ سال تک پرنسپل رہا ہوں ان یتیم طلبہ کو، جن کے باپ اسرائیل کے ساتھ لڑتے ہوئے شہید ہو گئے، مفت تعلیم دیتا تھا اور جس کا اسلوب اسلامی تھا، جہاں تمام بچے مسجد میں نمازِ جماعت ادا کرتے تھے اور جس کے طلبہ فوجی تربیت حاصل کر چکے تھے اور دشمنوں کے ساتھ جنگ آزما تھے، جبهة التحرير العربية کی نگاہوں میں کھٹکتا تھا۔ اس تنظیم کے ارکان نے کئی مرتبہ اس مدرسے پر حملہ کیا۔ ایک بار ۷۰/۸۰ افراد نے جو بھاری اسلحے سے مسلح تھے اور جن کے پاس راکٹ اور مارٹر بھی موجود تھے، مدرسے کا محاصرہ کر لیا اور اس پر حملہ کر کے اسے خاصا نقصان پہنچایا اور چند افراد کو شہید بھی کر دیا۔ اس تنظیم کے لڑنے والوں نے مدرسے پر مارٹروں اور دستی بموں سے حملہ کیا، تاکہ مدرسے پر قبضہ کر لیں۔ اس وقت مدرسے کے لڑکے جن کی عمر چودہ پندرہ سال سے زیادہ نہ تھی ان کے مقابل کھڑے ہو گئے اور آدھ گھنٹہ تک شدید ترین لڑائی جاری رہی۔ ان بچوں نے حملہ آوروں کی اکثریت کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ سخت لڑائی کے باوجود جب انھوں نے دیکھا کہ مدرسے پر قبضہ کرنا مشکل ہے تو انھوں نے مارٹروں اور راکٹوں سے مدرسے کی عمارت کو شدید نقصان پہنچایا جس کے آثار اب تک موجود ہیں۔ اس مدرسے پر ان لوگوں کے بار بار حملوں کی بنا پر وہ تمام لوگ جن کے بچے یہاں تعلیم حاصل کرتے ہیں جبهة التحرير العربية سے متنفر ہو گئے، وہ ان پر لعنت کرتے ہیں اور انھیں یزیدی شمار کرتے ہیں۔ افسوس یہ ہے کہ جنوبی لبنان کے لوگوں کے پاس اسلحہ نہیں ہے اس لیے ان کے پاس یہ طاقت نہیں کہ اس فلسطینی تنظیم کے مقابل میں کھڑے ہو سکیں جو عراق یا لیبیا یا دوسری عرب حکومتوں سے اسلحہ حاصل کرتی ہو۔ بہرحال اس جبهة التحرير العربية نے جنوبی لبنان میں بے شمار جرائم کا ارتکاب کیا ہے۔ میں اس کے لیڈر کو جانتا ہوں اور مجھے اس کے کارکنوں کے خبثِ باطن اور مجرمانہ اندازِ فکر کا پورا علم ہے۔

۵۔ ایک اور فلسطینی محاذ ہے جس کا نام بھی عوامی محاذِ آزادی (جنرل کمانڈ) ہے اس کی قیادت

Presented by Ziaraat.Com

سوریا کے طرفدار ایک فلسطینی عیسائی احمد جبریل کرتے ہیں۔

۶۔ اسی طرح کی ایک اور تنظیم "جبہۃ التحریر الفلسطینیہ" یعنی فلسطینی محاذِ آزادی کے نام سے طلعت یعقوب اور ابوالعباس کی قیادت میں قیام کرتی ہے۔ یہ جماعت احمد جبریل کی جماعت سے الگ ہوئی۔ ابتداء میں یہ عراق کی آلۂ کار تھی لیکن اب انھوں نے اپنا مؤقف بدل لیا ہے اور وہ عراق کی حمایت نہیں کرتے۔

۷۔ ایک اور بڑی تنظیم "صاعقہ" کے نام سے کام کرتی ہے۔ یہ سوریا کی حکومت کی سرپرستی میں کارفرما ہے اور وہیں سے پیسہ اور اسلحہ حاصل کرتی ہے۔ ان کا کام سوریا کے وضع کردہ پروگرام پر چلنا ہے۔ اس کی قیادت زہیر محسن کے ہاتھ میں ہے۔ (زہیر محسن کچھ دیر پہلے جنوبی فرانس میں دہشت گردی کا شکار ہو گئے)۔

۸۔ ایک اور محاذ "جبہۃ النضال" یعنی محاذ جہاد کے نام سے ہے جس کی قیادت سمیر غوشہ کے ہاتھ میں ہے۔

یہ چند ایک فلسطینی تنظیمیں ہیں جن کا میں نے ذکر کیا۔ ان میں سب سے بڑی اور اہم ترین تنظیم "فتح" ہے جس کا عربی میں نام "حرکۃ التحریر الفلسطینیہ" ہے جس کے قائد یاسر عرفات ہیں۔ یاسر عرفات کی مخالفت میں اور "فتح" کے مقابلے میں جو تنظیم کام کر رہی ہے اس کا مشترکہ نام "جبہۃ الرفض" ہے جس میں بہت سی فلسطینی تنظیمیں شامل ہیں یعنی جارج حبش کا "الجبہۃ الشعبیۃ"، نائف حواتمہ کا الجبہۃ الشعبیۃ الدموقراطیہ، احمد جبریل کا الجبہۃ الشعبیۃ (القیادۃ العامۃ) اور عبدالرحیم احمد کا جبہۃ التحریر العربیہ۔ یہ چاروں فلسطینی جماعتیں یاسر عرفات کی مخالف ہیں اور فلسطینی مزاحمت کی دشمن ہیں اور وہ کھلم کھلا اس دشمنی کا اظہار کرتی ہیں۔ (یہ تقسیم اس وقت کی ہے جب صدام نے اس علاقے کے رجعت پسندوں میں شمولیت نہیں کی تھی اور امریکہ کی ہمنوائی اختیار نہیں کی تھی۔ اب جبہۃ التحریر العربیہ نے اس گروہ سے علیحدگی اختیار کر لی ہے اور عبدالرحیم احمد یاسر عرفات کا دوست بن چکا ہے)۔ ان لوگوں کا فلسفہ یہ ہے کہ اگر اسرائیل آجائے اور جنوبی لبنان چھوڑ پورے لبنان پر قبضہ کرلے تو وہ انقلاب کے لیے مفید ہوگا کیونکہ عوام اور اسرائیل میں تضاد زیادہ ہو جائے گا اور اس اندرونی دباؤ کی بنیاد پر لوگوں کا شعور بڑھ جائے گا۔ فلسفیانہ نقطۂ نظر سے ان کی

یہ باتیں بڑی خوشنما ہیں اور جوان اس سے خاصا فریب کھا جاتے ہیں۔

فلسطینی تنظیموں کی آئیڈیالوجی:

"فتح" کے ماسوا تمام فلسطینی تنظیمیں مارکسی ہیں یا خود ان کے قول کے مطابق سوشلسٹ یا بائیں بازو کی جماعتیں ہیں۔ ان میں سے بعض تو سو فیصد کمیونسٹ ہیں، بعض سوشلسٹ ہیں۔ بہرحال یہ ساری کی ساری جماعتیں "فتح" کے سوا، بائیں بازو کی جماعتیں ہیں۔ تنظیم "فتح" اس بات کی معتقد ہے کہ اسے کسی قسم کی آئیڈیالوجی سے وابستہ نہیں ہونا چاہیے، اسے اپنے دروازے ہر شخص کے لیے کھلے رکھنا چاہییں، چاہے اس کی آئیڈیالوجی کچھ ہی کیوں نہ ہو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہرچند "فتح" کی تنظیم کمیونسٹ نہیں، یا بائیں بازو کی جماعتوں کی طرفدار نہیں، تاہم وہ اسلامی آئیڈیالوجی کو قبول نہیں کرتی، کیونکہ اس کے خیال میں ہر شخص کو چاہے وہ کچھ ہی آئیڈیالوجی کیوں نہ رکھتا ہو، "فتح" میں شرکت کا موقع ملنا چاہیے۔ یہ تنظیم آئیڈیالوجی کے بغیر ہے، اس کا کوئی عقیدہ اور کوئی معین فکری منہج نہیں۔ اس لیے "فتح" کی تنظیم میں کمیونسٹ بھی ہیں، مسلمان بھی ہیں، ہر قماش کا شخص اس میں شامل ہے۔ یہ تنظیم ایک فکری خلا میں بس رہی ہے۔ جب وہ یہ کہتی ہے کہ ہماری کوئی آئیڈیالوجی نہیں، ہماری کوئی فکری منہج نہیں، اس کا مطلب یہی ہے کہ اس تنظیم کے اندر ایک فکری خلا موجود ہے چونکہ "فتح" کی تنظیم میں کمیونسٹ جماعتوں کے کارکن کافی تعداد میں شامل ہو چکے ہیں، اس لیے وہ اس قابل ہیں کہ اس فکری خلاء کو پُر کریں اور نوجوان افراد کو اپنی فکری روش پر چلائیں۔ مجھے امید ہے کہ آپ اس بات پر توجہ کریں گے کہ جب اس تنظیم کے پاس کوئی آئیڈیالوجی نہیں اور اس میں بہت سے کمیونسٹ ارکان موجود ہیں اور مختلف اعلیٰ عہدے ان کے ہاتھ میں ہیں تو ان میں یہ قدرت ہے کہ وہ اپنی کتابوں، اپنی افکار اور اپنی تنظیمی کارکردگی کے ذریعے سے "فتح" کے بے گناہ اور سادہ لوح نوجوانوں کو اپنی طرف جذب کر سکیں۔ اسی بناء پر ہم دیکھتے ہیں کہ عین اس وقت جب تنظیم الفتح یہ کہتی ہے کہ ہماری کوئی مخصوص آئیڈیالوجی نہیں، اسی وقت ہم یہ بھی مشاہدہ کرتے ہیں کہ وہ مارکسیوں اور بائیں بازو کے لوگوں کی پیروی کرتی ہے ایسا کیوں ہے؟ اس کا سبب یہی ہے کہ اس کے اہم ترین اور فعال ترین کارکن کمیونسٹ ہیں۔ جب کسی تنظیم کے

Presented by Ziaraat.Com

اندر منصوبہ سازی کرنے والے مارکسی یا کمیونسٹ ہوں گے تو ظاہر ہے کہ پھر وہ اس تنظیم کو اپنے افکار کی طرف راغب کریں گے۔ "فتح" کی مرکزی کمیٹی میں ۱۵ ارکان ہیں۔ ان کی اکثریت مسلمان ہے، ماسوا چند اشخاص کے، مثلاً ابوصالح اور ماجد ابوشرار جو فلسطینی پبلسٹی کے لیے ذمہ دار ہیں اور روس کے حامی کمیونسٹ ہیں۔ باقی کے سب لوگ کم از کم شناختی کارڈوں کے اعتبار سے مسلمان ہیں اور غیر کمیونسٹ ہیں۔

اگرچہ مرکزی کمیٹی میں چند ایک کمیونسٹ اور مارکسسٹ ہیں لیکن جب تنظیم "فتح" کے ڈھانچے میں مرکزی کمیٹی سے نیچے اتریں تو وہاں مارکسیوں کی اکثریت ملتی ہے۔ وہ لوگ جو "فتح" کے انتظامی امور کے لیے ذمہ دار ہیں ان میں مارکسیوں کی اکثریت ہے اور نچلے درجے کے کارکنوں میں، یونیورسٹیوں اور سکولوں میں اور دیگر مقامات پر آپ دیکھیں گے کہ ان کی اکثریت مارکسیوں پر مشتمل ہے۔ ان میں سے مسلمان صرف وہ ہیں جو کسان یا مزدور ہیں، یا ان پڑھ ہیں۔ ان میں سے جو لوگ کسی سکول میں گئے ہیں، یا یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کر چکے ہیں وہ مارکسیت کی طرف مائل ہیں۔ یہ سب کچھ اس لیے ہے کہ اس تنظیم کی کوئی آئیڈیالوجی نہیں، کوئی فکری نہج نہیں، جس نے اس تنظیم کو کمیونسٹوں کے ہاتھ میں دے دیا۔ ظاہر ہے کہ کمیونسٹ آگے چل کر اس قابل ہو جائیں گے کہ باقی ماندہ افراد کو بھی اپنے اندر جذب کر لیں اور انھیں بھی منحرف کر دیں۔

جنوبی لبنان میں ہماری سب سے بڑی مشکل یہی کمیونسٹ تھے جو "فتح" کے نام پر یہاں کرتا دھرتا تھے۔ ایک طرف تو یہ تھا کہ "امل" کی تنظیم "فتح" کے ساتھ تعاون کر رہی تھی، جسے عربی میں "تنسیق" کہتے ہیں۔ محاذِ جنگ پر، وہ اسرائیل کے خلاف ہو یا کتائب (Phalangists) کے، تنظیم "امل" نے بڑی قربانیاں دی ہیں اور اس سلسلے میں "فتح" کی مدد کی ہے۔ اور دوسری طرف یہ حالت ہے کہ "فتح" کے کمیونسٹ کارکن جنوبی لبنان میں ہمیں اپنا ہدف بناتے رہے ہیں کیونکہ انھیں اس بات کا احساس تھا کہ ہماری فکری اور عقائدی نہج انھیں ختم کر دے گی۔ اگر جنوبی لبنان میں اسلامی نہج تسلط حاصل کر لے تو ان کی بساط اُلٹ دے گی۔ اس لیے وہ کوشش یہی کرتے رہے کہ وہ اپنی پوری طاقت سے ہمیں ماریں۔ آپ یہ جانتے ہیں کہ فلسطینی مزاحمت کے رہنما یاسر عرفات نے ڈاکٹر علی شریعتی کے چہلم پر منعقد ہونے والے سب سے بڑے اجتماع میں یہ نعرہ

بلند کیا کہ "امل" کی تنظیم "فتح" ہی تو ہے۔ "امل" کے بارے میں، میں آپ سے کچھ باتیں کر چکا ہوں، 'امل' کی تنظیم 'فتح' ہے اور 'فتح' کی تنظیم 'امل'۔ اگر جنوبی لبنان میں 'امل' کی تنظیم 'فتح' والوں کی مدافعت نہ کرے تو 'فتح' ختم ہو جائے۔ اب دیکھیے کہ یاسر عرفات تو ایک طرف یہ کہتے ہیں اور دوسری طرف جنوبی لبنان میں 'فتح' کے کمانڈر ابوموسیٰ تھے جو انسان کو ابوموسیٰ اشعری کی یاد دلاتے ہیں۔ یہ ابوموسیٰ ایک کمیونسٹ ابوصالح کے کارکنوں میں سے تھے اور اس کے تمام ساتھی کمیونسٹوں پر مشتمل تھے اور یوں جنوبی لبنان کے تین بڑے بڑے علاقے ان کمیونسٹوں کی دست بُرد میں تھے ہماری زندگی اور ہماری ناموس ان کمیونسٹوں کے رحم و کرم پر تھی۔ یہی وہ لوگ ہیں جو کمیونسٹ پارٹی اور الجبہۃ الشعبیۃ اور دیگر لوگوں کی مدد سے ہم پر حملہ آور ہوتے تھے اور شیعوں کو قتل کرتے تھے۔ یہاں تک کہ ایک میٹنگ میں مَیں نے خود جنوبی لبنان میں "فتح" کے اس سب سے بڑے لیڈر اور وہاں کے ابنِ زیاد ابوموسیٰ سے تُو تُو مَیں مَیں کی۔ اُس نے واضح ترین الفاظ میں کہا کہ "تم موسیٰ الصدر کی حمایت کرتے ہو اور اسے امام کہتے ہو اور ہم یہ چاہتے ہیں کہ جنوبی لبنان کے ہر شیعہ گاؤں میں بارہ امام پیدا کریں۔" (اس کی تفصیل لبنان کی خانہ جنگی کے بیان میں پیش کی جائے گی۔) ذرا اس غرور کو ملاحظہ فرمائیے۔ اس تکبر اور خود بینی کو دیکھیے کہ ایک کمیونسٹ ہماری فکری روش کے مقابلے میں کیا کرتا ہے اور اپنے کمیونسٹ کمانڈروں کے سامنے سید موسیٰ الصدر کو بُرا بھلا کہتا ہے، ان پر حملے کرتا ہے اور اس کے بعد کہتا ہے کہ وہ جنوبی لبنان کے ہر گاؤں میں بارہ امام پیدا کر دے گا۔

یہ وہ مسائل ہیں اور مشکلات ہیں جو فلسطینی تنظیموں کے اندر موجود ہیں۔

ان کی کوئی فکری نہج نہیں، کوئی آئیڈیالوجی نہیں اور ان میں سے جن کی آئیڈیالوجی ہے وہ کمیونسٹ ہیں۔ ان میں سے کوئی ایک تنظیم بھی ایسی نہیں جو اسلامی آئیڈیالوجی کی قائل ہو اور اسلامی نہج پر چل رہی ہو۔ ان میں سے سب سے بہتر "فتح" ہے جو یہ کہتی ہے کہ ان کی کوئی آئیڈیالوجی نہیں۔ باقی سب کے سب مارکسی اور بائیں بازو کے ہیں۔ آپ یہ دیکھتے ہیں کہ جب یاسر عرفات کوئی ایسا موقف اختیار کریں جو کمیونسٹ پارٹی کے برخلاف ہو تو بائیں بازو کی ساری جماعتیں حرکت میں آ جاتی ہیں اور "فتح" کے اندر بھی بائیں بازو کے سارے عناصر سرگرم ہو جاتے ہیں اور جارج حبش کے ساتھ مل کر متحدہ محاذ بنا لیتے ہیں اور یوں یاسر عرفات کی مخالفت میں صف آرا ہو

Presented by Ziaraat.Com

جاتے ہیں اور یاسر عرفات یہ جراٴت نہیں کرسکتے کہ وہ روس یا کمیونسٹ پارٹی کے خلاف کوئی مؤقف اختیار کرسکیں اور انہیں مجبور ہو کر ان کا ہمنوا بننا پڑتا ہے۔

فلسطینی مزاحمت اور لبنان میں فلسطینی جماعتوں کے لیے سب سے بڑی مصیبت یہی بات ہے۔ یاسر عرفات اور "فتح" کے عسکری معاملات کے انچارج ابو جہاد انہیں مجبوریوں کے ساتھ کام کررہے ہیں۔ وہ جراٴت نہیں کرسکتے، ان میں یہ طاقت نہیں کہ درست خط روش اختیار کرسکیں۔

ایران میں بہت سے لوگ اس بات پر تعجب کرتے ہیں کہ فلسطینی مزاحمت کی تنظیم افغانستان کے مسئلے میں روس کی طرفداری کیوں کرتی ہے اور مسلمانوں کے خلاف مؤقف کیوں اختیار کرتی ہے۔ خود یاسر عرفات اور ابو جہاد نہیں چاہتے کہ وہ مسلمانوں کی مخالفت کریں اور روس کی حمایت کریں لیکن ان کی پالیسی اور ان کے درمیان موجود کمیونسٹوں کی طاقت ان کو مجبور کرتی ہے کہ وہ افغانستان کے مسلمانوں کی حمایت نہ کریں۔ وہ مجبور ہیں کہ روس کا ساتھ دیں۔ اب لوگ حیران ہوتے ہیں اور انہیں پریشانی ہوتی ہے کہ آخر یاسر عرفات ایسا کیوں کرتے ہیں۔ کیا اختیار ان کے ہاتھ میں نہیں؟ آپ یہ جانتے ہیں کہ ماسکو میں ہونے والے اولمپک کھیلوں کا بے شمار ملکوں نے بائیکاٹ کیا تھا اور اس میں شرکت نہ کی البتہ یاسر عرفات جاتے ہیں اور ان کھیلوں کا افتتاح کرتے ہیں اور اپنی افتتاحی تقریر میں یہ فرماتے ہیں کہ "جن لوگوں نے ان کھیلوں کا بائیکاٹ کیا ہے اور ان میں شرکت نہیں کی وہ باعثِ نفرت و باعثِ شرم ہیں۔ ان کی اس حرکت سے گھن آتی ہے اور ایران بھی ان ملکوں میں شامل ہے[1]۔

پھر آپ یہ ملاحظہ فرماتے ہیں کہ یاسر عرفات ماسکو سے سیدھے عراق پہنچتے ہیں اور وہاں امپیریلزم اور صیہونیت کے ایجنٹ صدام یاسر عرفات سے ملاقات کرتے ہیں، دونوں ایک دوسرے کو چومتے ہیں، ایک دوسرے سے بغل گیر ہوتے ہیں اور ان کے مابین قول و قرار طے پاتے ہیں۔ حالانکہ یاسر عرفات کو اچھی طرح معلوم ہے کہ عراق امریکیوں کا اڈہ بن چکا ہے اور ایران کے اسلامی نظام کو ختم کرنے کا مرکز[2] سوال پیدا ہوتا ہے کہ یاسر عرفات ایسا کیوں کرتے ہیں؟ کیا

[1] صرف ایران نہیں پاکستان بھی ان میں شامل تھا اور یاسر عرفات پاکستان کے بھی دوست ہیں۔ [2] اس سے بھی کہیں یہ بات دلچسپ ہے کہ جب تیونس کے صدر حبیب بورقیبہ نے ۱۹۶۶ء میں لبنان میں یہ تجویز پیش کی تھی کہ اسرائیل کا اعتراف کرلیا جائے اور جنگ کی تیاری کی جائے تو فلسطینی اور لبنانی مسلمانوں کے مظاہروں سے مجبور ہو کر بورقیبہ کو اپنا دورۂ لبنان منسوخ کرنا پڑا۔ اس وقت یاسر عرفات جمال عبدالناصر کی ہمنوائی میں بورقیبہ کے خلاف آتش فشاں بنے ہوئے تھے اور آج اسی بورقیبہ کی رہنمائی میں وہاں فلسطینی مزاحمت کا مرکز قائم ہوتا ہے۔

وہ ہمارے خلاف ہیں؟ ایسا نہیں۔ لیکن جو ماحول پیدا ہو چکا ہے اس میں ۱۵ مارکسی جماعتیں حتّٰی کہ خود تنظیم "فتح" جس میں بائیں بازو والوں کا اثر و رسوخ بڑا زیادہ ہے، یاسر عرفات کو اس امر کی اجازت نہیں دیتیں کہ وہ کمیونسٹ طریقۂ کار اور روسی روش کے علاوہ کوئی اور راستہ اختیار کرسکیں۔ آپ جانتے ہیں کہ وہ کس سمت کھنچے چلے جا رہے ہیں۔

ہمارے اسلامی انقلاب کے لیے سب سے بڑی قابلِ فخر بات یہ ہے کہ وہ کمال جراٴت اور جسارت سے یہ نعرہ لگاتا ہے کہ "لاشرقیہ ولاغربیہ" اور یوں دنیا کی دونوں سپر طاقتوں کو دھتکار دیتا ہے۔ یہ بہت اہم بات ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ ہماری پٹائی ہوتی تھی۔ ملک سے باہر ہمیں موردِ الزام قرار دیا جاتا تھا اور کہا جاتا تھا کہ تم روس کی مخالفت کرتے ہو اس لیے امریکہ کے ایجنٹ ہو۔ اسی قسم کے ایک کٹر بعثی سے لبنان کے شہر صور میں میری بحث ہوئی۔ میں معذرت چاہوں گا کہ اس بحث کا موضوع بیان کروں اور آیت اللہ خمینی کے بارے میں ان الفاظ کو دوبارہ کہوں جن سے ان کی بے حرمتی ہوتی ہے۔ لیکن میں یہ چاہتا ہوں کہ میں یہ کہوں تاکہ آپ جان سکیں کہ ان کا فکر کا انداز کیسا ہے۔ وہ شخص کہتا تھا کہ "تمہارا رہنما (یعنی آیت اللہ خمینی) امریکی ایجنٹ ہے"۔ میں اس سے کہتا تھا کہ اے مردِ بے شرف کیا تو نہیں دیکھتا کہ اس کی ساری زندگی طاغوتی طاقتوں اور امریکہ کے خلاف صف آرائی سے عبارت ہے۔ ایسی باتیں کیسے کہہ سکتے ہو۔ وہ یہ کہتا تھا کہ "یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی۔ اس دنیا میں یا تو کوئی شخص امریکہ کا ایجنٹ ہوسکتا ہے یا روس کا۔ کیونکہ تمہارا رہبر روس کا ایجنٹ نہیں اس لیے لازم ہے کہ وہ امریکی ایجنٹ ہو"۔ اور اسی بناء پر انہیں عراق سے نکالا گیا ہے۔ عراق کی بعثی حکومت نے یہی توجیہہ پیش کی تھی کہ آیت اللہ خمینی امریکی ایجنٹ ہیں۔ اسی بناء پر اس نے انہیں عراق ترک کرنے پر مجبور کیا ورنہ اس کے پاس کوئی اور سبب نہ تھا۔" ان لوگوں کی سوچ کا انداز یونہی کچھ تھا۔ وہ ہمیں بھی مطعون کرتے تھے کہ چونکہ ہم روس کے ہمنوا نہیں اس لیے امریکی ایجنٹ ہیں اور میں ان لوگوں سے کہتا تھا کہ میں نے زندگی کے ۲۵ سال اسرائیل اور امریکہ کے خلاف صف آرائی میں بسر کیے ہیں اور اب بھی ان کے خلاف صف آرا ہوں۔ لیکن کسی بناء پر اس بات پر تیار نہیں کہ اپنے آپ کو سوویٹ روس یا شرقی امپیریلزم کے حوالے کردوں۔

Presented by Ziaraat.Com

وہ ایک ہی انقلاب ہے جو دنیا میں "لاشرقیہ ولاغربیہ" کا نعرہ لگاتا ہے اور وہ انقلاب ہمارا اسلامی انقلاب ہے۔ اولین اور بزرگ ترین رہبر جس میں یہ جرأت ہے اور یہ شجاعت ہے کہ ان دو سُپر طاقتوں کے مقابل کھڑا ہو، ان دونوں کے خلاف جنگ آزما ہو اور اس مقدس نعرے کو بلند کرے، وہ آیت اللہ خمینی ہیں۔

اس بنا پر ہم یہ دیکھتے ہیں کہ فلسطینی مزاحمت ان مسائل سے دوچار ہے اور افسوس کی بات یہ ہے کہ بائیں بازو کی جماعتیں فلسطینی مزاحمت کے نام اور اس کے تقدس سے غلط فائدہ حاصل کر رہی ہے۔

فلسطینی مزاحمت اور لبنانی فوج کے درمیان چپقلش

ستمبر سیاہ (۱۹۶۷ء) کے بعد سے سن ۷۳ تک فلسطینی مزاحمت خاصی کمزور تھی۔ اس کے ارکان اور کارکنوں کی تعداد خاصی ختم ہو چکی تھی۔ ستمبر کے حوادث کے بعد فلسطینی مزاحمت نے یہ سمجھا کہ اس کی شکست کا سبب اس کی صفوں میں ایسے اشخاص کا وجود ہے جو نااہل ہیں۔ اس نے ہزاروں افراد کو اپنی صفوں سے خارج کر دیا اور نئی قسم کی تقریباً نیم خفیہ تنظیمیں وجود میں آئیں۔ یہ سلسلہ ۱۹۷۳ء تک جاری رہا جس سال لبنانی فوج اور فلسطینیوں کے مابین جنگ کے شعلے بھڑک اُٹھے اور جس کے دوران میں یہ کوششیں ہوئیں کہ اردن کی طرح لبنان میں بھی ایک سیاہ ستمبر وجود میں آجائے۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں لبنان میں ان حوادث کی آگ کو بھڑکانے کی ذمہ داری الجبہۃ الشعبیۃ پر آتی ہے۔ ہوا یوں تھا کہ الجبہۃ الشعبیۃ کے ۲ یا ۳ افراد نے بیروت کے ہوائی اڈے کے اندر بیت الخلا میں بم رکھ دیا۔ ہوائی اڈے کی پولیس نے بم کو دریافت کر لیا اور ان افراد سے باز پُرس کی۔ جبہہ شعبیہ نے پولیس سے درخواست کی کہ ان لوگوں کو چھوڑ دیا جائے لیکن حکومت نے انھیں رہا نہ کیا اور کہا کہ یہ بم رکھنے کے ذمہ دار ہیں لہٰذا انھیں اس بم کے ساتھ اور دیگر دستاویزی شہادتوں کے ساتھ عدالت میں حاضر ہونا چاہیے۔ الجبہۃ الشعبیۃ نے پولیس کے ایک افسر اور ایک سپاہی کو جو سڑک پر جا رہے تھے پکڑ لیا اور صبرا کے محلے میں فلسطینی کیمپ میں لے گئے اور یہ اعلان کیا کہ جب تک گرفتار ہونے والے فلسطینیوں کو رہا نہیں کیا جاتا ان لوگوں

کو بھی رہا نہیں کیا جائے گا۔ لبنانی فوج چند توپیں لے کر صبرا کے کیمپ میں پہنچ گئی اور جنگ شروع ہو گئی جو ۱۴ دن تک جاری رہی۔ الجبہۃ الشعبیۃ کے لوگ بھاگ نکلے لیکن یاسر عرفات "فتح" اور فلسطینی مزاحمت نے ثابت قدمی دکھائی اور خوب لڑے۔ اس سال لبنانی ہوائی جہازوں نے فلسطینی کیمپوں پر بمباری کی۔ ۴۰۰ فلسطینی شہید ہوئے۔ لبنانی فوج کا ارادہ یہ تھا کہ اردن کی طرح فلسطینی کیمپوں کو زیروزبر کرے اور سب کو خاک و خون میں غلطاں کر دے۔ اس موقع پر آقائے صدر نے دخل دیا اور انھوں نے ایک حیرت انگیز بیان صادر کیا جس میں لبنانی فوج پر شدید حملہ کیا اور کہا کہ ہم اس بات کی اجازت نہیں دیں گے کہ تم لبنان میں فلسطینی مزاحمت کو ختم کر دو اور ایک نیا سیاہ ستمبر برپا کرو۔ انھوں نے دوسرے مذہبی رہنماؤں سے بھی درخواست کی کہ فلسطینیوں کی حمایت کے لیے ایک کمیٹی تشکیل دیں۔ انھوں نے فوج کو یہ دھمکی بھی دی کہ اگر اس نے حملہ کیا تو وہ شیعہ ملیشیا افراد سے کہیں گے کہ وہ فوج کے خلاف مورچہ بند ہوں اور اس پر حملہ کریں۔ فوج کے کمانڈر ان چیف[1] نے جو سلیمان فرنجیہ (لبنان کے اس وقت کے صدر) کا مقرر کردہ تھا اپنے آپ کو شیعہ ملیشیا کے مقابل پایا۔ اس دباؤ کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس وقت کے لبنان کے صدر سلیمان فرنجیہ جھک گئے اور جنگ ختم ہو گئی۔ البتہ اب ایک نئی مشکل پیدا ہوئی اور وہ یہ تھی کہ سوریا نے لبنان پر حملہ کر دیا اور لبنان کے دو شہروں پر قبضہ کر کے بہت سے لوگوں کو مار دیا۔ سلیمان فرنجیہ نے کہا کہ جب تک سوریا کی حکومت لبنان کی سرزمین پر اپنی فوج رکھے ہوئے ہے، اس وقت تک ہم جنگ سے دست بردار نہیں ہوں گے۔ دوسری طرف اسرائیلی فوجیں جنوبی لبنان میں داخل ہو گئیں اور پورے علاقے میں انھوں نے اپنے مورچے بنا لیے۔ لبنانی فوج اسرائیلی فوج کے مقابلے میں راہِ فرار اختیار کر گئی اور اُس نے

---

[1] یاد رہے کہ لبنانی فوج کا کمانڈر انچیف کسی سینیارٹی کی بنا پر مقرر نہیں ہوتا بلکہ اس کو لبنان کا صدر مقرر کرتا ہے، چاہے وہ جونیئر ہی کیوں نہ ہو اور اس کے لیے اولین شرط یہ ہے کہ وہ مارونی عیسائی ہو۔ مسلمان افسر صرف کرنل کے عہدے تک ترقی حاصل کر سکتے ہیں بشرطیکہ ان کے ساتھ اتنے مارونی عیسائی بھی اسی عہدے پر متعین ہوں۔

Presented by Ziaraat.Com

جنوبی لبنان کا علاقہ خالی کر دیا[1] ۔ یہ وہ وقت تھا جب مکمل اور ہمہ جہتی لڑائی کی پیش گوئی کی جاتی تھی۔ یہ کہ اسرائیل جنوبی لبنان میں پوری قوت سے داخل ہوگا اور وہاں کے باشندوں کو فلسطینیوں سمیت موت کے منہ میں دھکیل دے گا اور یہ بھی خیال پیدا ہوتا تھا کہ بیروت میں خانہ جنگی طول پکڑ جائے۔ اس موقع پر آقائی صدر نے کہا کہ میں اس بات کی ضمانت دیتا ہوں کہ سوریا کی فوجیں لبنان سے واپس ہو جائیں۔ انھوں نے سوریا کے صدر حافظ الاسد سے رابطہ پیدا کیا جس کے نتیجے میں سوریا کی فوجیں دو دن کے اندر اندر لبنان سے چلی گئیں۔

یہ مثال میں نے اس لیے دی ہے کہ ہم یہ دیکھیں کہ الجبھۃ الشعبیۃ نے کس طریقے پر سازش کی اور پولیس کے ایک افسر اور ایک سپاہی کو پکڑ لیا اور پھر میدان سے فرار اختیار کیا اور یہ صورت پیدا کی کہ فلسطینی مزاحمت کو ناپید ہونے کا خدشہ درپیش ہوا۔ اگر خدا کی رضا اور پیدا ہونے والے حالات رونما نہ ہوتے تو ایک دوسرا ستمبر سیاہ وجود میں آچکا ہوتا۔

---

[1] یاد رہے کہ لبنانی فوج کے افسروں کی بھاری اکثریت مارونی عیسائیوں پر مشتمل ہے۔ انھوں نے کسی وقت بھی اسرائیلی حملوں کو روکنے کی کوشش نہیں کی، بلکہ یوں محسوس ہوتا تھا (مترجم کا ذاتی تجربہ ہے) کہ اسرائیلی فوجی، لبنانی فوج کی آشیرباد سے جنوبی لبنان میں داخل ہوتے تھے اور نہتے لوگوں کو قتل و غارت کا نشانہ بنا کر واپس چلے جاتے تھے۔ انھی فوجیوں کے ایک گروہ نے میجر حداد کی سرکردگی میں جنوبی لبنان میں اسرائیلی سرحد کے نزدیک ایک عیسائی منطقے میں اپنی آزاد حکومت قائم کی ہوئی ہے جسے اسرائیل کی پوری مدد حاصل ہے۔ یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے اور یہ مشاہدہ سن ۶۲-۶۳ء سے تعلق رکھتا ہے کہ لبنانی اور اسرائیلی فوجی سرحدی چوکیوں پر آپس میں لین دین کرتے ہیں اور گپیں ہانک رہے ہیں۔ اس کا واضح سبب اس کے سوا کچھ نہیں کہ اسرائیلی فوجیوں کی تباہ کاریوں کا نشانہ بننے والے شیعہ تھے اور لبنانی حکومت ان پسماندہ شیعوں کی خاطر صیہونی فوج کو ناراض کرنا نہیں چاہتی تھی۔

باب ہشتم

لبنان کی خانہ جنگی ۔ تیاریاں

لبنان میں دو متوازی انقلابی تحریکیں :

اردن میں ستمبر سیاہ کا وقوع پذیر ہونا، تقریباً ۱۵ ہزار فلسطینیوں کا قتلِ عام اور باقی ماندہ لوگوں کا اردن سے نکل کر لبنان میں آنا اور اس کے بعد سنہ ۷۲ء میں فلسطینی مزاحمت اور لبنانی فوج کے مابین تصادم، یہ سب واقعات ہو چکے تو دو متوازی تحریکیں آگے بڑھیں۔ ایک فلسطینی مزاحمت کی تحریک تھی جس نے اسرائیل کو خاصہ نقصان پہنچایا اور کامیابیاں حاصل کیں۔ دوسری انقلابی تحریک مسلمانوں خصوصاً پسے ہوئے اور محروم شیعوں کی تحریک تھی جس نے لبنانی حکومت اور لبنان میں عیسائی تسلط کو زک پہنچائی۔ یہ دونوں تحریکیں اس بات کا سبب ہوئیں کہ تمام عیسائی جماعتیں متحد ہو جائیں اور لبنانی حکومت اسرائیل کے ساتھ خفیہ عہد و پیمان کر لے جس سے لبنان کی خانہ جنگی کا آغاز ہوا۔

---

[1] ہر چند کہ لبنانی حکومت دیگر عرب ممالک کے خوف سے اور بالخصوص مصر کے سابق صدر جمال عبدالناصر کی ہیبت کی بناء پر بظاہر اسرائیلی حکومت کے خلاف رہی ہے لیکن آثار سے معلوم ہوتا ہے کہ لبنان کے عیسائی بالخصوص مارونی عیسائی خفیہ طور پر اسرائیل کے صیہونی حکمرانوں کے ساتھ تھی۔ ۶۷ء کی لڑائی میں نہ اسرائیل نے لبنان پر حملہ کیا اور نہ لبنانی فوجیں ہی اسرائیل کے خلاف صف آراء ہوئیں۔ مزید برآں لبنانی اسرائیلی سرحد پر لبنانی فوج کے عیسائی افسروں کا اسرائیلی فوجیوں کے ساتھ میل جول کوئی ڈھکی چھپی بات نہ تھی۔ اسرائیلی فوجی بارہا لبنان پر حملہ آور ہوئے لیکن ریکارڈ سے پتا چلتا ہے کہ لبنانی فوج نے ایک بار بھی ان حملہ آوروں کو روکنے کی کوشش نہ کی۔

Presented by Ziaraat.Com

اسرائیل اور امریکہ کی سازش :

۱۹۶۷ء میں دو گھنٹے کی لڑائی میں اسرائیل نے امریکہ کی مدد سے عربوں کی فضائی طاقت کو نیست و نابود کر دیا اور شکست عرب فوجوں کے مقدر میں لکھی گئی۔ البتہ ۱۹۷۳ء میں معاملہ برعکس ہو گیا۔ اگر امریکہ تیزی کے ساتھ اسرائیل کی مدد نہ کرتا اور مصر اپنی فوجوں کو میدانِ جنگ سے واپس نہ بلا لیتا تو اسرائیل کی شکست یقینی معلوم ہوتی تھی۔ اس سے بھی اہم بات یہ ہے کہ اکیلے سوریا نے ۷ دن تک اسرائیلی فوجوں کے مقابلے میں بڑی بہادری اور ثابت قدمی سے مقابلہ کیا۔ اسرائیل نے اپنی تمام فوجی طاقت سوریا پر صرف کر دی۔ وہ ہر روز دعویٰ کرتا تھا کہ اس کی فوجیں کل دمشق پہنچ جائیں گی لیکن ایک طویل جنگ کے بعد وہ صرف ۱۲ کلومیٹر تک سوریا کی سرحد میں پہنچ سکا۔ عسکری طاقت اور بشری اور اقتصادی استعداد کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہو گا کہ عربوں کی ترقی کی رفتار طرفین میں سے تیز تر تھی اور جوں جوں وقت گزرتا جائے گا، عربوں اور اسرائیل کے درمیان ایک عام جنگ اسرائیل کی مصلحت میں نہیں ہو گی۔ امریکہ کو بھی تیل کی ضرورت ہے، اس لیے وہ اس قابل نہیں کہ شرقِ اوسط کے مسئلے میں خاموش بیٹھا رہے۔ وہ نہیں چاہتا کہ عربوں کے وہ ممالک جو اس سے ناراض ہیں رُوس کے فکری اور عسکری اڈے بن جائیں۔ اس لیے امریکہ یہ بات پسند کرتا ہے کہ فلسطین کے مسئلے کا کوئی ایسا حل تلاش کرے جس میں اسرائیل کو نقصان نہ پہنچے اور یوں اپنے تیل کے مفادات کی حفاظت کرے اور شرقِ اوسط کے مراکز کو ازسرِ نو رُوس کی گرفت سے نکال کر ان علاقے میں اپنے سیاسی اور اقتصادی تسلط کو یقینی بنا دے۔ امریکہ کا وزیرِ خارجہ کسنجر ایسا حل تلاش کرنے پر مامور ہوا۔

سادات کا امریکہ سے قرب :

مصر کے صدر انور السادات اپنے آپ کو سن ۶۷ء کی شکست کا ذمہ دار نہیں گردانتے تھے اور اس کے ساتھ ہی اپنے آپ کو سن ۷۳ء کی فتح یابی کا ہیرو تصور کرتے تھے اور اسرائیل سے مصالحت کرنے میں انھیں کوئی باک نہ تھا۔ مصر کے لوگوں کی بے حد غربت، ان میں سیاسی شعور

کی کمی، آہستہ آہستہ مصر کی جنگ آزمائی کو بدلتی چلی گئی۔ سادات نے بتدریج مصر کو عربوں کی حکومتوں کے دائرے سے نکال باہر کیا اور قبلِ اسلام کی تاریخ کا سہارا لے کر اور فراعنۂ مصر کے نظامِ حکومت کے گُن گا کر وہ اس بات کا قائل ہُوا کہ مصر کے لوگ ایک الگ نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ یوں اس نے مصر کو عرب اور اسلامی بلاک سے نکالنے کے لیے فکری زمین ہموار کی۔ سادات اپنی حکومت کو برقرار رکھنے کے لیے قبلِ اسلام کی تاریخ کی طرف رجعت کرنے کا محتاج تھا۔ امریکہ کو بھی عربوں کے اس رویے سے بڑے فوائد کی امید تھی۔ امریکہ کے صدر نکسن کا مصر میں بے مثال استقبال عمل میں آیا جس کی قیمت مصری عوام کو جنگ کے نتائج سے محروم کر کے ادا کی گئی۔ کسنجر آیا اور اس کے ذریعے سے مصر اور اسرائیل کے درمیان صلح و صفائی کے معاہدے پر سادات کے دستخط ہو گئے۔

یاسر عرفات کی مخالفت :

فلسطینی مزاحمت کی مجلسِ عاملہ کے سربراہ یاسر عرفات نے سادات و کسنجر کے مابین واقع ہونے والے تدریجی صلح صفائی کے معاہدے کی سرکاری طور پر مخالفت کی اور حکومتِ مصر نے قاہرہ سے کام کرنے والے ریڈیو "صدائے فلسطین" کو بند کر دیا۔ لیکن سادات کے نقطۂ نظر کے مقابلے میں فلسطینی مزاحمت کا مخالفانہ رویہ عربوں کی اکثریت پر کہیں زیادہ اثر کرتا ہے۔ اس لیے فلسطینی مزاحمتی تنظیم کی طرف سے ظاہر ہونے والی مخالفت نے تمام عربوں کی رائے کو سادات کے خلاف کر دیا اور یوں سادات اور امریکہ دونوں کو ناراض کر دیا۔ امریکہ اور اسرائیل دونوں پر یہ بات واضح کر دی کہ فلسطینی مزاحمت کی موجودگی میں کسی قسم کا مصالحانہ حل، چاہے وہ جزوی ہو، عملی نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا ضروری ہے کہ سادات اور کسنجر کے باہمی قول و قرار کو عملی شکل دینے کے لیے فلسطینی مزاحمت کو یا تو ختم کر دیا جائے، یا کم از کم اسے کمزور کر دیا جائے۔ اسی بناء پر امریکہ اور اسرائیل کی رایوں میں اتفاق پیدا ہوا کہ فلسطینی مزاحمت کو ختم کر دیا جائے یا اسے بالکل کمزور بنا دیا جائے۔ یہاں سے سازشوں کا بازار گرم ہوا۔ عربوں کے داخلی اختلافات زیادہ شدید ہو گئے۔ لبنان میں فلسطینی مزاحمت کو قربان کر دینے کے لیے عربوں کے ہاتھ میں ایک بہانہ آ گیا اور انھوں

Presented by Ziaraat.Com

نے اس کے لیے تیاریاں شروع کر دیں۔ لبنان وہ واحد ملک ہے جہاں فلسطینی مزاحمت کی تنظیمیں آزادانہ سرگرمِ عمل ہیں اور ان کے فوجی مرکز بھی یہاں ہیں۔ فلسطینی مزاحمت کی تنظیموں کے تمام سیاسی اور انتظامی امور لبنان ہی میں طے پاتے ہیں۔ اس لیے استعماری طاقتوں نے یہ فیصلہ کیا کہ لبنان کی دائیں بازو کی رجعت پسند قوتوں اور فلسطینی مزاحمت کی تنظیموں میں تصادم واقع ہو جس کے بعد فوج فلسطینیوں کے خلاف صف آرا ہو جائے۔ "منظمۃ التحریر الفلسطینیہ" (پی۔ ایل۔ او) فوجی اعتبار سے لبنانی فوج اور وہاں کی دائیں بازو کی طاقتوں سے کہیں زیادہ قوی ہے اور اس قابل ہے کہ اگر لبنانی فوج اور دائیں بازو کی جماعتوں کے ساتھ ان کا تصادم ہو اور کوئی تیسری طاقت دخل اندازی نہ کرے تو وہ انھیں ختم کر دے۔ لیکن لبنان کے داخلی اختلافات میں فلسطینی مزاحمت کے دخل دینے اور اس سے پیدا ہونے والے حادثات کا سہارا لے کر اسرائیل اپنی دشمنی کو کام میں لا کر فلسطینی مزاحمت اور ان کے طرفداروں کو اپنے حملے کا نشانہ بنائے اور یہ بھی ممکن ہے کہ سوریا فلسطینیوں کی حمایت میں شریکِ معرکہ ہو۔ اس وقت امریکہ کا چھٹا بیڑا بھی حرکت میں آ کر لبنان میں خون کی ہولی کھیلنے میں شریک ہو جائے۔ رجعت پسند جماعتیں اور دائیں بازو کی طاقتیں مثلاً کتائب بہانہ پیدا کرنے اور خانہ جنگی کو ہوا دینے کے لیے بہترین عامل شمار ہوتی رہی ہیں۔

دائیں بازو کی رجعت پسند قوتیں:

جیسا کہ بیان ہو چکا ہے لبنان میں کوئی ۱۵ مذہبی فرقے ہیں۔ ۱۹۳۵ء میں ہونے والی مردم شماری[1] جو فرانسیسیوں کے تسلط کے دوران میں ہوئی، اس کے مطابق مارونی عیسائی حکومت میں شمار ہوتے ہیں اور ملک کے صدر کا انتخاب صرف مارونیوں تک محدود کر دیا گیا۔ اس کے

[1] اس مردم شماری میں ایک طرف تو ان بے شمار مسلمانوں کو شمار نہ کیا گیا جنھوں نے فرانسیسی حاکموں کے سامنے سرِ تسلیم خم نہ کیا اور ان سے شناختی کارڈ لینے سے انکار کر دیا اور دوسری جانب ان تمام عیسائیوں کو شمار کر لیا گیا جنھیں لبنان سے ہجرت کیے ہوئے پچاس ساٹھ سال ہو چکے تھے، ان میں سے بہت سے مر چکے تھے اور باقی لوگ امریکہ اور افریقہ کے مختلف ممالک کی شہریت اختیار کر چکے تھے۔ یوں لبنان میں عیسائیوں بالخصوص مارونیوں کی اکثریت کا راگ الاپا گیا۔ (س۔ ر)

بعد عیسائی اس بات پر تیار نہ ہوسکے کہ وہ ایک اور مردم شماری ہونے دیں حالانکہ بالواسطہ مردم شماری جو چینی کے کوپنوں کی بنا پر سامنے آئی ہے اس نے اصل حقیقت کو واشگاف کر دیا ہے۔ ان اعداد و شمار کے مطابق مارونیوں کی تعداد ۴ لاکھ ۵۰ ہزار ہے، اہلِ سنّت ۵ لاکھ ۵۰ ہزار ہیں، کیتھولک ۳ لاکھ ہیں، دُرزی ۲ لاکھ ۵۰ ہزار ہیں اور شیعہ ۹ لاکھ ۸۵ ہزار ہیں۔ حالانکہ فرانسیسی استعمار کے سائے میں ہونے والی مردم شماری کے مطابق سب سے بڑی اکثریت مارونی عیسائیوں کی ہے جن میں سے صدرِ مملکت کا انتخاب ہوتا ہے۔ اہلِ سنّت دوسرے درجے پر آتے ہیں اور وزیرِ اعظم ان سے منتخب ہوتا ہے اور ان کے بعد شیعہ ہیں جن میں سے لبنانی پارلیمنٹ کا سپیکر چُنا جاتا ہے[1]۔ حالانکہ شیعہ مسلمانوں کی تعداد مارونی عیسائیوں سے دُگنی ہے اور یہیں سے اس ظلمِ بے جا کا سراغ ملتا ہے جو شیعوں پر روا رکھا گیا۔ (جدید ترین اعداد کے مطابق لبنان میں شیعوں کی آبادی کوئی ۱۲ لاکھ تک جا پہنچی ہے)۔ موجودہ زمانے میں لبنان میں ساری طاقت سیاسی ہو یا اقتصادی یا فوجی، مارونی عیسائیوں کے ہاتھ میں ہے اور یہ بات مسلمانوں کے لیے قابلِ قبول نہیں ہو سکتی۔ شیعوں نے اور "تحریکِ محرومین" نے اسی لیے اس پر اعتراضات کیے ہیں۔ یہ بات مسلّم ہے کہ اجتماعی عدل کے حصول، استحصال کے خاتمے اور طبقاتی ظلم کو دُور کرنے کے لیے یہ بات لازم ہے کہ حاکم طبقے خصوصاً مارونیوں کے مفادات کو کسی حد تک قربان کیا جائے اور مارونی بھی اس بات کے لیے تیار نہیں کہ اپنے مفادات کو اپنے ہاتھ سے جانے دیں۔ انھوں نے اب تک لبنان کے محروم طبقات کے اس مطالبے کی مخالفت کی ہے کہ اجتماعی عدل کو عملی شکل دی جائے۔ مارونی عیسائیوں کی سب سے بڑی طاقت "حزب الکتائب" (Phalangists Party)

[1] معلوم ہوتا ہے کہ فاضل مصنف کو اشتباہ ہوا ہے۔ ۱۹۳۵ء کی مردم شماری کے مطابق بھی شیعوں کو مارونیوں کے بعد سب سے بڑی جماعت گردانا جاتا ہے اور تیسری بڑی جماعت اہلِ سنّت ہیں اور لبنان کے پروٹوکول کے مطابق پہلا درجہ ملک کے صدر کا ہے، دوسرا پارلیمنٹ کے سپیکر کا اور تیسرا وزیرِ اعظم کا۔ یاد رہے کہ پارلیمنٹ کے سپیکر کے پاس صرف جلسوں کی صدارت کا اختیار ہے اور وزیرِ اعظم صدر کی خوشنودی کا مرہونِ منت، اور یوں اس انتظام کے مطابق اصل طاقت صدر کے پاس ہی ہے اور وہ اگر چاہے تو پارلیمنٹ کے ارکان کو نظر انداز کر کے غیر پارلیمانی وزارت کی تشکیل دے سکتا ہے جیسا کہ لبنان کے سابق صدر شارل حلو کے دورِ صدارت میں ہو چکا ہے۔ اس سلسلے میں مقدمۂ مترجم سے رجوع کیا جائے۔

Presented by Ziaraat.Com

ہے جو کئی سالوں سے تنظیمی کاموں اور فوجی تربیت میں مصروف ہے۔ اس جماعت کے ارکان کی تعداد [illegible] ہزار ہے جس میں چالیس ہزار افراد مسلح ہیں۔ یہ جماعت لبنان کی سب سے بڑی سیاسی پارٹی شمار ہوتی ہے اور اس کا ملیشیا سب سے زیادہ طاقتور ہے۔ یہ جماعت اپنے آپ کو فنیقیوں کی اولاد سمجھتی ہے اور اپنے آپ کو عربوں سے بہتر شمار کرتی ہے۔ یہ جماعت اس بات کو ترجیح دیتی ہے کہ لبنان کی حکومت عیسائی ہو، مغرب کی طرفدار ہو اور یورپ سے وابستہ ہو۔ اسی لیے حزب الکتائب لبنان میں فلسطینیوں کی موجودگی کی مخالف ہے اور بالواسطہ یا بلاواسطہ اس بات کا مطالبہ کرتی ہے کہ فلسطینیوں کو لبنان سے نکال دیا جائے۔ اس جماعت کا سرغنہ پیئر الجمیل ہے۔ اس کے بعد مارونیوں کی دوسری پارٹی حزب الاحرار ہے جس کا سربراہ کمیل شمعون ہے جو ۱۹۵۸ء میں لبنان کا صدر تھا اور جس نے امریکی فوجیوں کو لبنان میں آنے کی اجازت دی تھی تاکہ وہ جمال عبدالناصر کے حامیوں اور قوم پرست عربوں کو بے دست و پا کر دیں۔ یہ دونوں جماعتیں مغربی سیاست کی حامی اور فلسطینیوں کی مخالف ہیں۔

گذشتہ سالوں میں رونما ہونے والے واقعات سے اس بات کا سراغ ملتا ہے کہ مسلمانوں کی طاقت سیاسی، اجتماعی اور فوجی نقطۂ نظر سے روز افزوں ہے اور اگر اس کی ترقی کی یہ رفتار جاری رہی تو لبنان کی سیاسی، اقتصادی اور فوجی طاقت مسلمانوں کے ہاتھ میں ہوگی۔ اسی بناء پر عیسائی بالعموم اور مارونی عیسائی بالخصوص مسلمانوں کی بالخصوص شیعوں کی روز افزوں طاقت سے پریشان ہو رہے ہیں اور یہ نہیں چاہتے کہ مختلف مذہبی فرقوں کی طاقت میں توازن پیدا ہو جانے سے اپنے مفادات سے دستبردار ہوں لیکن وقت مسلمانوں کے حق میں ہے اور مارونی مفادات کے خلاف آثار سے پتا چلتا ہے کہ لبنان کا یہ غیر عادلانہ توازن محروم طبقوں کے حق میں بدل کر رہے گا۔ لبنان کے حاکم مارونی اسی بناء پر ہر وہ وسیلہ اختیار کر رہے ہیں جس سے مسلمانوں کی قوت کو زد پہنچے اور یوں وہ اپنے تسلط کی مدت کو بڑھا سکیں۔ وہ اپنے مقصد کے حصول میں بیرونی طاقتوں کے ساتھ تعاون کرنے سے بھی گریز نہیں کریں گے۔ اسرائیل اور امریکہ کو اس داخلی کشمکش کا علم ہے، وہ خانہ جنگیوں کو ہوا دے رہے ہیں اور چاہتے ہیں کہ کتائب کے ذریعے سے تصادم پیدا کریں اور یوں فلسطینی مزاحمت کو میدانِ جنگ میں ختم کر دیں تاکہ اردن کے مانند لبنان میں بھی ایک ستمبرِ سیاہ وجود میں

آئے اور اس ضمن میں مسلمانوں کی طاقت بھی پاش پاش ہو جائے۔

اس زمانے میں فلسطینی مزاحمت کو ختم کرنے میں اسرائیلی مفاد اور مسلمانوں کو کمزور بنانے میں کتائب کا مفاد ایک دوسرے کے متوازی ہیں۔ اسی بناء پر ان دونوں میں بہت تعاون ہے اور اسی بناء پر وہ تاریخی اور خطرناک موقع موجود ہے کہ کتائب اسرائیل، امریکہ اور مغربی ممالک کی مدد سے مسلمانوں کو زک پہنچائیں۔ لیکن فلسطینی مزاحمت نے بھی اردن میں ہونے والے ۱۹۷۰ء کے واقعات کو پسِ پشت نہیں ڈالا اور وہ نہیں چاہتی کہ ایک بار پھر اس قسم کے خطرناک معرکے میں الجھ جائے۔ اس لیے فلسطینی مزاحمت نے سالِ گزشتہ اور اس سال (۱۹۷۵) کی خانہ جنگیوں میں بڑی عقلمندی سے کام لے کر شرکت نہیں کی اور لڑائی بھڑائی سے گریز کیا ہے۔ حتیٰ کہ یہ کوشش بھی کی ہے کہ اپنے اثر و رسوخ سے کام لے کر ثالثی کے فرائض سرانجام دے اور لبنان کی خانہ جنگی کی روک تھام کرے۔

کتائب کے خلاف مزاحمت کی کامیابی:

۱۹۷۴ء کے اوائل میں اقوامِ متحدہ میں فلسطین کا مسئلہ زیرِ بحث آیا۔ فلسطینی مزاحمت کے راہنما ابو عمار (یاسر عرفات) نے اقوامِ متحدہ کی جنرل اسمبلی کے اجلاس میں شرکت کی اور پہلی بار فلسطینی قوم کو دنیا کے ۱۰۵ ممالک نے سرکاری طور پر پہچانا اور یوں فلسطینی مزاحمت فلسطین کے نمائندہ کی حیثیت سے متعارف ہوئی۔ یاسر عرفات پہلے شخص تھے جو اقوامِ متحدہ کی جنرل اسمبلی میں مسلح ہو کر شامل ہوئے اور ان کا سرکاری طور پر استقبال کیا گیا اور دوسروں سے کہیں زیادہ انھیں احترام حاصل ہوا۔ اس جلسے میں ۱۰۵ ملکوں نے فلسطینیوں کے حق میں مثبت ووٹ دیا۔ صرف ۴ ممالک نے مخالف ووٹ دیا۔ ان ممالک میں امریکہ اور اسرائیل بھی شامل تھے۔ یہ زبردست کامیابی فلسطینیوں کے لیے بڑی گرانقدر تھی اور اس نے اسرائیل سے پروپیگنڈے کا حربہ چھین لیا۔ اسرائیل کو اپنے مخبروں کے ذریعے سے جنرل اسمبلی کے عام اجلاس سے قبل رائے شماری کا کم و بیش اندازہ ہو چکا تھا اور اسے معلوم تھا کہ یاسر عرفات کی موجودگی میں جنرل اسمبلی کے عام اجلاس سے اس قسم کے نتائج برآمد ہوں گے۔ اس لیے اُس نے کوشش کی کہ اس اجلاس سے قبل لبنان کے اندر

Presented by Ziaraat.Com

خانہ جنگی اور فسادات شروع کروا دے۔ بلکہ یاسر عرفات کے اقوامِ متحدہ کے اجلاس میں شرکت کے راستے میں روڑے اٹکائے اور اس طریقے سے فلسطین کا مسئلہ اس اجلاس میں زیرِ بحث آ ہی نہ سکے۔

بحران کا آغاز :

اقوامِ متحدہ کے اجلاسِ عام سے ایک ماہ پہلے کتائبی بندوقچیوں نے ۱۱ فلسطینیوں کو "دکوانہ"[1] میں مار دیا۔ یاسر عرفات نے ان فلسطینیوں کی موت کی خبر نشر نہ ہونے دی تاکہ فلسطینیوں کے جذبات جوش میں نہ آئیں اور طرفین کے درمیان تصادم نہ ہونے پائے۔

اسی رات یاسر عرفات نے مجلس الاسلامی الشیعی کے مرکزی دفتر میں سید موسیٰ الصدر سے ملاقات کی اور ان سے درخواست کی کہ وہ اس معاملے میں مداخلت فرمائیں اور اپنے اثر و نفوذ کو کام میں لا کر متوقع فسادات کا سدِباب کریں۔ سید موسیٰ الصدر نے فلسطینی مزاحمت کی حمایت میں پوری آمادگی کا اظہار کیا اور اس کے لیے ہر قسم کی قربانی دینے کا اعلان فرمایا۔ یاسر عرفات نے درخواست کی کہ سید موسیٰ الصدر ذاتی طور پر کتائب کے لیڈر پیئر الجمیل سے رابطہ پیدا کریں اور ہر طریقے سے اس معاملے کو ختم کروائیں۔ سید موسیٰ الصدر نے دوسرے دن پیئر الجمیل سے ملاقات کی اور اس سے فلسطینیوں سے دشمنی کے اظہار اور ان کے قتل و غارت کا سبب دریافت کیا۔ پیئر الجمیل نے فلسطینی مزاحمت اور فلسطینیوں کو مطعون کیا کہ لبنان کی آزادی کا احترام نہیں کرتے۔ سید موسیٰ الصدر نے جواب دیا کہ فلسطینی مزاحمت لبنان کی خود مختاری اور آزادی کا احترام کرتی ہے اور پھر یہ کہ فلسطینیوں سے کہیں زیادہ لبنانی فساد برپا کرتے ہیں۔ پیئر الجمیل نے اس بات کو قبول نہ کیا اور بحث طول پکڑتی گئی۔ آخر کار سید موسیٰ الصدر نے کہا کہ میں ذاتی طور پر ضمانت دیتا ہوں اور تمام فلسطینیوں کی جانب سے ذمہ داری قبول کرتا ہوں۔ پیئر الجمیل نے مجبور ہو کر سید موسیٰ الصدر کی بات مان لی

[1] "دکوانہ" بیروت کے مضافات میں شمال کی جانب ایک محلہ ہے جہاں لبنانیوں کے علاوہ ارمنی پناہ گزینوں کی بستیاں بھی ہیں۔ ان ارمنی پناہ گزینوں کو لبنانی قومیت مل چکی ہے اور کتائب کے بعد شاید ان سے بڑا مسلمانوں کا دشمن کوئی نہ ہوگا۔

یوں اس لڑائی کا خاتمہ ہوا اور یاسر عرفات اس قابل ہو گئے کہ اقوامِ متحدہ کے جلسے میں شریک ہو سکیں۔ یوں فلسطینی مزاحمت کو یہ زبردست کامیابی حاصل ہوئی۔

دشمنوں کی سرگرمیوں کی شدّت :

اقوامِ متحدہ میں فلسطینی مزاحمت کی بے نظیر کامیابی نے اسرائیل کو سخت غصہ دلایا۔ اس لیے لبنان کی داخلی تحریکیں تیزی پکڑ گئیں۔ بہت کم دن ایسے ہوتے تھے کہ لبنان کے باہر یا اندر کوئی ہنگامہ برپا نہ ہوتا ہو۔ کتائب مختلف حیلے بہانے اختیار کر کے مسلمانوں پر حملے کرتے، جس کے نتیجے میں فوج اور فلسطینی مزاحمت کے درمیان تصادم ہوا۔ ایک دن "دکوانہ" کے صنعتی مدرسے پر بغیر کسی سبب کے کتائب کی طرف سے حملہ ہوا اور انھوں نے ہر شخص کو جس کا نام مسلمانوں جیسا تھا، مارا پیٹا اور بہت سے لوگ زخمی ہو گئے۔ اسی طرح لاء کالج اور ادبیات کے شعبوں پر حملہ کیا گیا اور ہر شخص کو جس کا نام محمدؐ یا علیؑ یا حسنؑ یا حسینؑ تھا، زد و کوب کیا گیا۔ لیکن فلسطینی مزاحمت دشمنوں کی حرکتوں سے آگاہ تھی اور وہ نہیں چاہتی تھی کہ وہ اس جال میں پھنسے اس لیے انھوں نے ہر اعتبار سے کوشش کی کہ کتائب کے ساتھ براہِ راست تصادم نہ ہو۔

صیدا کے ہنگامے :

مارچ ۱۹۷۵ء میں ماہی گیروں کے حقوق کی حمایت میں ایک امریکی کمپنی[1] کے خلاف جس میں کمیل شمعون بھی حصے دار تھا، صیدا میں زبردست ہنگامے ہوئے۔ ان مظاہروں کے رہنما صیدا

[1] یہ کمپنی (Tapline) کہلاتی ہے اور سعودی عرب سے پٹرول پائپ لائنوں کے ذریعے سے صیدا سے تقریباً ۵ میل جنوب میں زہرانی کی بندرگاہ تک لا کر بیرونی ممالک کو بھجواتی ہے۔ اس کمپنی کے ٹرمینل (زہرانی) سے تیل اور ڈیزل وغیرہ سمندر میں گرتا رہتا تھا اور اس سے مچھلیوں کی ہلاکت عمل میں آتی تھی جس سے صیدا کے ماہی گیروں کو جو سب کے سب مسلمان تھے، شدید نقصان پہنچتا تھا اور وہ آئے دن اس کمپنی کے خلاف مظاہرے کرتے تھے لیکن سعودی عرب کے تیل، امریکی کمپنی کے اثر اور لبنان کے بااثر حصہ داروں کی بناء پر ان کی شنوائی نہ ہوتی تھی۔

Presented by Ziaraat.Com

کے بزرگ ترین سیاستدان اور لبنانی پارلیمنٹ کے سابق رکن معروف سعد تھے۔ معروف سعد کا فلسطینی مزاحمت سے بڑا گہرا تعلق تھا اور انھوں نے ۱۹۴۸ء کی عرب اسرائیل لڑائی میں شرکت کی تھی اور انھیں فلسطینی مزاحمت کے بڑے پکے حمایتیوں میں شمار کیا جاتا تھا۔ معروف سعد ایک آزاد منش، متواضع، منکسر المزاج اور انتہا پسند شخص تھے جو "حرکت المحرومین" کے بھی حمایتی تھے اور سید موسیٰ الصدر کے بڑے نزدیکی دوستوں میں سے تھے۔ جب معروف سعد مظاہرین کی صفِ اوّل میں شریک ہو کر جلوس کی قیادت کر رہے تھے تو وہ گولی کا نشانہ بن گئے اور صیدا میں آگ سی لگ گئی۔ فوج نے مظاہروں کی روک تھام کے لیے تیاری کر لی۔ ملنے والی اطلاعات کے مطابق معروف سعد ایک فوجی کی گولی کا نشانہ بن کر شدید زخمی ہوئے تھے اس لیے فوراً صیدا کے لوگوں اور فوج کے درمیان تصادم شروع ہوا جس کی ابتدا ہی میں چند فوجی مارے گئے اور کچھ زخمی ہوئے اور یہ تصادم شدت پکڑ گیا۔ فوج کے چند ٹینک اور بکتر بند گاڑیاں لوگوں کے ہاتھوں تباہ ہو گئیں اور بیسیوں اشخاص نے اپنی جان جانِ آفریں کے سپرد کر دی۔ ابھی معروف سعد زندہ تھے اور بیروت کے ایک ہسپتال میں ان کا علاج ہو رہا تھا۔ فلسطینی مزاحمت کی براہِ راست مداخلت اور ابوزعیم کی وساطت سے جو ایک فلسطینی راہنما تھے دوبارہ صلح کی صورت پیدا ہوئی یعنی اس مرتبہ بھی فلسطینی مزاحمت کی ذہانت اور سوجھ بوجھ کی بناء پر یہ سازش ناکام ہوئی اور اس طرح سے فوج اور فلسطینی مزاحمت کے مابین براہِ راست تصادم کی روک تھام سے لبنان میں داخلی ہنگامے کچھ دیر کے لیے ختم ہو گئے۔

کتائب، فوج کی حمایت میں:

صیدا کے مظاہروں میں فوج کی مداخلت اور وہاں کے مشہور و معروف سیاسی اور قومی لیڈر معروف سعد کے گولی کا نشانہ بنانے کی بناء پر لوگوں کی نگاہوں میں فوج کا وقار گر گیا۔ یہاں تک کہ صیدا کے لوگ وہاں فوج کی آمد کی مخالفت کرتے تھے۔ وہ اسے استعمار پسندوں کی آلۂ کار اور فرقہ وارانہ نظام[1]

[1] صیدا کے لوگوں کو بلکہ لبنان کے تمام مسلمانوں کو یہ حق حاصل تھا کہ وہ لبنانی فوج کے بارے میں اس قسم کا تاثر رکھیں کیونکہ اس فوج نے کبھی یہ جرأت نہ کی کہ وہ اسرائیلی حملوں کو روکتی۔ اسرائیلی فوج کے سپاہی ان کے مورچوں کے سامنے سے گزر کر لبنان میں داخل ہوتے اور سرحد سے پانچ پانچ چھ چھ میل دور گاؤں کو تباہ کرتے اور لبنانیوں کو قتل کرتے لیکن یہ "بہادر" لبنانی فوج اپنے عیسائی افسروں کی سرکردگی میں تماشا دیکھتی رہتی۔

کی حامی گردانتے تھے۔ لوگوں کی طرف سے فوج اور سیاسی اقتدار کے رہبروں کے خلاف شدید تنقید جاری تھی۔

فوج کے خلاف اس فکری حملے کا مقابلہ کرنے کے لیے کتائب حرکت میں آئے اور انھوں نے ۳۵ ہزار افراد پر مشتمل ایک مظاہرہ بیروت میں برپا کیا۔ اس مظاہرے میں بڑے اشتعال انگیز نعرے لگائے گئے اور مسلمانوں، فلسطینیوں، فلسطینی مزاحمت اور سوریا کے خلاف جذبات کا اظہار کیا گیا اور اس کے ساتھ ہی فوج اور لبنان کے نظامِ حکومت کی طرفداری کی گئی۔ سڑکوں پر ہر جگہ بڑے بڑے کتبے نظر آتے تھے جن میں فوج کی حمایت اور مسلمانوں اور فلسطینی مزاحمت کے خلاف اشتعال انگیز بیانات لکھے ہوئے تھے۔ مظاہرہ کرنے والے مختلف سڑکوں کو طے کرتے ہوئے اور نعرے لگاتے ہوئے وسطِ شہر میں پہنچ گئے۔ ان مظاہرات نے سب کے دلوں پر خوف طاری کر دیا۔ مختلف گروہوں کے سیاستدانوں نے فوج کی حمایت میں بیانات داغے اور اخباروں میں ان لوگوں کے بیانات کو خوب اُچھالا گیا۔ ان بیانات میں کہا گیا تھا کہ ہم سب فوج کو مقدّس جانتے ہیں اور اگر اس پر تنقید کرتے ہیں تو اس کا سبب فوج کی حمایت کے سوا کچھ نہیں۔ لیکن اخباروں سے ان بزرگواروں کے بیانات سے یہ پتا چلتا تھا کہ خوف و ہراس کی فضا پھیل چکی ہے اور ان سب لوگوں نے کتائب اور فوج کے سامنے ہتھیار ڈال دیے ہیں۔ آہستہ آہستہ ایسی فضا وجود میں آئی جس میں فوج نے اپنا کھویا ہوا وقار حاصل کیا اور اس کے مخالف اور اس پر تنقید کرنے والوں کو خیانت اور وطن دشمنی کے الزامات سے نوازا جانے لگا۔ اس سبب سے کسی میں یہ جرأت نہ تھی کہ حکومت کے خلاف کوئی تنقید کر سکے۔ فوج کے وقار میں یہ اضافہ اور اس کا تنقید سے بالاتر ہونا حکومت کے ہاتھ میں ایک خطرناک ہتھیار تھا اور یوں اندازہ ہوتا تھا کہ جمہوریت اور آزادانہ تنقید کا خاتمہ ہو جائے گا اور حکومت کے حامی با اقتدار لوگ بغیر کسی روک ٹوک کے اپنی خودسری میں بڑھتے چلے جائیں گے اور اپنے مخالفین کو فوج کے تقدس کے حربے کے ذریعے سے نیست و نابود کر دیں گے۔ قدرتی بات ہے کہ اس ظاہری تقدس کے ڈراونے سائے میں کیسے کیسے جرائم کا ارتکاب ہوا ہوگا اور کیا خطرناک نتائج کی توقع ہو سکتی ہو گی۔ جیسا کہ بیان ہو چکا ہے سب لوگوں نے ڈر کے مارے اس تقدس کو مانا تھا اور حکومت کے سامنے خاموشی اختیار کر لی تھی اور یوں اس

Presented by Ziaraat.Com

خطرناک تقدس کو پائیدار بنانے کی راہ ہموار کر دی۔

معروف سعد کی شہادت اور سید موسیٰ الصدر

معروف سعد زخموں کی تاب نہ لاکر انتقال کر گئے اور صیدا پر غم و اندوہ کے بادل چھا گئے۔ معروف سعد کی لاش کو صیدا کی مرکزی مسجد میں لایا گیا اور تمام مسلمان اور فلسطینی کمانڈو اس شہید کی آخری رسوم میں شرکت کے لیے مسجد میں جمع ہو گئے۔ یہ جمعہ کا دن تھا۔ ہزارہا مرد، عورتیں، بچے، بوڑھے گلیوں میں، سڑکوں میں، بازاروں میں جلوسوں کی شکل میں پھر رہے تھے۔ معروف سعد کی لاش کو مسجد کی محراب میں رکھ دیا گیا۔ ہزارہا نمازی اشک آلود اور غم سے بھرے ہوئے دلوں کے ساتھ نماز کے لیے صف آراء ہو گئے۔ فلسطینی مزاحمت کے تمام لیڈر اور بائیں بازو کی جماعتوں کے رہنما کمال جنبلاط سمیت موجود تھے۔ البتہ بائیں بازو کے لوگ مسجد میں داخل نہ ہوئے آقائے موسیٰ الصدرؒ مسجد میں تشریف لے گئے اور انھیں کہا گیا کہ وہ نمازِ جمعہ پڑھائیں حالانکہ معروف سعد سنی تھے اور مسجد میں بہت سے سنی علماء موجود تھے۔ آقائے صدر منبر پر تشریف لے گئے اور انھوں نے خطبۂ جمعہ دیا۔ اس خطبے نے سننے والوں کے جذبات کو گرما دیا اور لوگ اپنے جذبات سے مجبور ہو کر رو بھی رہے تھے اور تالیاں بھی پیٹ رہے تھے۔ سید موسیٰ الصدرؒ نے بڑی سختی سے لوگوں کو ایسا کرنے سے منع فرمایا۔ انھوں نے معروف سعد کی لاش کی طرف اشارہ کیا جو ان کے سامنے موجود تھی اور خطبۂ جمعہ کو معروف سعد کے ذکر سے شروع کیا۔ انھوں نے اس بزرگ شخصیت کی مسلسل جد و جہد اور قربانیوں کا ذکر کیا اور لوگوں کے ذہنوں میں اس مجاہد کی قابلِ فخر زندگی کو دہرا دیا۔ انھوں نے فرمایا کہ "زمین و آسمان گواہ ہیں..... صیدا کے در و دیوار اور اس کے گلی کوچے گواہ ہیں..... چھوٹے بڑے، مرد، عورتیں سب گواہ ہیں کہ معروف سعد کی پوری زندگی استعمار کے خلاف، ظلم و ستم کے خلاف اور محروم لوگوں کی حمایت میں بسر ہوئی اور وہ ستم زدگان کی حمایت کرتے ہوئے ظالم حکومت کے خلاف جنگ میں شہید ہوئے"

اس کے بعد انھوں نے اصل خطبہ دیا۔ انھوں نے فوج کے تقدس کا لباس پارہ پارہ کرنے کے لیے، اور اس مصنوعی بت کو توڑنے کے لیے، اور ظالم و ستم گر اہلِ حکومت کی فرعونیت کو پاش پاش

کرنے کے لیے کہا " فوج کے لیے لازم ہے کہ وہ عوام کی پشت پناہی کرے، وطن کا دفاع کرے اور دشمنوں کے خلاف ملک کی سرحدوں کو محفوظ کرے۔ لیکن اگر وہ فوج جنوبی وطن کا دفاع کرنے کی بجائے آزاد شہریوں کو ان کے اپنے گھروں میں گولی کا نشانہ بنائے تو بہتر ہے کہ ایسی فوج نیست و نابود ہو جائے "۔ (لوگوں کا تالیاں پیٹنا اور آقائے صدر کا انھیں منع کرنا اب آنسوؤں میں تبدیل ہو چکا تھا) ..... اس کے بعد انھوں نے پھر کہا کہ " اگر وہ گولی جنوبی لبنان کی سرحدوں پر کسی اسرائیلی کے سینے میں لگنے کی بجائے ایک مجاہدِ ملت معروف سعد کو خاک و خون میں غلطاں کر دے تو پھر بہتر ہے وہ فوج نہ رہے ..... فوج کو چاہیے کہ وہ اتحادِ ملت اور تمام شہریوں کی عزت و آبرو کی نگہبان ہو۔ لیکن اگر فوج کسی خاص فرقے یا کسی خاص گروہ کی مصلحت کے حصول کا آلۂ کار بن جائے تو پھر اس فوج کا مٹ جانا بہتر ہے"۔

اس طریقے سے آقائے صدرؒ نے بڑی جرأت اور بے نظیر شجاعت کے ذریعے سے لبنانی فوج کے جسم پر پڑے ہوئے تقدس کے پردوں کو چاک کیا اور اسے مسندِ الوہیت سے نیچے گرایا اور تمام لبنانیوں کو یہ پیغام دیا کہ وہ لبنان کی نجات اور جمہوریت و آزادی کے لیے قربانیاں دیں۔ سید موسیٰ الصدرؒ نے کہا کہ غنڈوں اور مصلحت کوش چودھریوں کو اس امر کی اجازت نہیں دی جا سکتی کہ وہ لوگوں کے مقدس احساسات سے کھیل سکیں اور جمہوریت کو یا فوج کو یا وطن پرستی کو اپنی مذموم اغراض کے حصول کا ذریعہ بنائیں۔ وہ شخص جو اس قابل تھا کہ لبنان میں اس عظیم کام کا بیڑا اُٹھائے اور کمال شجاعت اور حقیقت پسندی سے کام لے کر اس عظیم خطرے کو اپنے وطن سے دُور کرے سید موسیٰ الصدرؒ کے سوا کوئی اور نہ تھا۔

اس خطبے اور نماز کے بعد لوگوں نے معروف سعد کی لاش کو اُٹھا لیا اور صیدا کے کوچہ و بازار میں گشت کی۔ سید موسیٰ صدر اور شہر کے دیگر سر برآوردہ لوگ اس جنازے کے پیچھے پیچھے صف بستہ جا رہے تھے اور پھر معروف سعد کی لاش کو غم و اندوہ کے اظہار کے ساتھ سپردِ خاک کیا گیا۔

آقائے صدرؒ کے قتل کی افواہ :

فوج پر آقائے صدرؒ کے شجاعانہ حملے نے لبنان کی حکومت کے چودھریوں کے بنائے ہوئے

Presented by Ziaraat.Com

نقشے کو نقش برآب کر دیا اور خوف زدہ لیکن آزادی پسند لوگوں کو ایک بار ہمت دلائی کہ وہ سچائی کی حمایت کریں اور اہلِ حکومت کے خلاف تنقید کا اظہار کریں۔ اس بات سے حکومت کے اہل کاروں کو شدید غصہ آیا۔ پُورے لبنان میں دس منٹ میں یہ افواہ پھیل گئی کہ "کحالہ" کے مقام پر سید موسیٰ الصدر کی کار پر مسلح حملہ ہوا ہے اور کار میں بیٹھے ہوے لوگ یا قتل ہو گئے ہیں یا مجروح۔ اس افواہ کا مقصد لوگوں میں خوف و ہراس کی فضا کا پیدا کرنا تھا اور اس کے ساتھ ہی آقائے صدر کو دھمکانا بھی مقصود تھا اور پھر یہ بھی خیال تھا کہ لوگوں کا ردِ عمل دیکھا جائے یہ ردِ عمل اتنا شدید تھا اور انقلابی کہ افواہ پھیلانے والوں کو یہ بات سمجھ میں آگئی کہ اس قسم کے کاموں سے وہ اپنے لیے موت کا سامان پیدا کر رہے ہیں۔

معروف سعد کی تدفین کے ایک ہفتے بعد آقائے صدر نے ہفتۂ معروف سعد کی تقریبات میں شرکت کی اور اپنی شعلہ بیان تقریر میں یہ اعلان کیا کہ وہ کسی محافظ کے بغیر یکہ و تنہا صیدا آئے ہیں۔ اگر کسی کی خواہش ہو اور ہمت ہو تو آئے اور انھیں اپنی دہشت گردی کا نشانہ بنائے۔

باب نہم

لبنان کی خانہ جنگی۔ پہلا دَور

کتائب کی جنگی تیاریاں:

لبنان میں موجودہ فاسد نظام کی بناء پر مسلمانوں میں بے چینی پھیل رہی تھی اور اس کے مقابلے میں حزب الکتائب مغربی ممالک کی مدد سے اپنے رضا کاروں کو مسلح کر رہی تھی اور اسلحے سے بھرے جہاز لبنان اور وہاں کے عیسائیوں کے لیے مسلسل آ رہے تھے[1]۔ حزب الکتائب کے ملیشیا نے اپنے آپ کو مسلمانوں کے خلاف جنگ آزما ہونے کے لیے پہلے سے کہیں

---

[1] لبنان کے مسلمانوں کی غفلت اور وہاں کے عیسائیوں اور بالخصوص حزب الکتائب Phalangists Party کی پیش بینی اور چالاکی کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ بیروت کی بہت بڑی بندرگاہ کے ہوتے ہوئے سن ۶۵ یا ۶۶ء میں بیروت سے کوئی دس بارہ کلو میٹر شمال کی طرف "جونیہ" کی بندرگاہ کو توسیع دی گئی اور اسے ایک جدید بندرگاہ بنا دیا گیا۔ لبنانی پارلیمنٹ میں اس کے بارے میں وضاحت کی گئی کہ بیروت کی بندرگاہ میں جگہ کم ہے اس لیے "جونیہ" کی بندرگاہ کی تعمیرِ نو ہوئی ہے اور مسلمان اس وضاحت پر خاموش رہے۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ جونیہ کی بندرگاہ کی توسیع اور تعمیرِ نو ہوئی ہی اس لیے تھی کہ اسلحے سے بھرے ہوئے جہاز بیروت کی بجائے وہیں پر اپنا سامان اُتاریں اور وہاں سے یہ سامان خاموشی سے حزب کتائب کے ہیڈ کوارٹر اور لبنان کے مارونی عیسائی فرقے کے مرکز "بکرکی" میں پہنچ جائے۔ "بکرکی" اور "جونیہ" کے درمیان فاصلہ کم کرنے کے لیے "جونیہ" کے ساحل سے سامنے والے پہاڑ کی چوٹی تک کیبل کار کا آغاز کیا گیا تاکہ "بکرکی" پہنچنے میں آسانی ہو۔ یہ بات ایک باقاعدہ منصوبے کے تحت ہوئی اور مسلمانوں نے اس کا کوئی نوٹس نہ لیا۔ اس سلسلے میں یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ حزب الکتائب کو امریکہ کے بعد سب سے زیادہ مدد فرانس سے حاصل ہوئی۔ فرانس اپنے آپ کو لبنان کے عیسائیوں بالخصوص مارونی عیسائیوں کا محافظ گردانتا ہے اور لبنانی عیسائی فرانس کو "ام الحنون" یعنی شفیق ماں کے نام سے یاد کرتے ہیں کیونکہ فرانس ہی کی بناء پر انھیں لبنان میں جعلی اکثریت حاصل ہوئی اور وہ اقتدار پر قبضہ کر بیٹھے۔

Presented by Ziaraat.Com

زیادہ تیاریاں شروع کر دیں۔ لبنان کے ان پہاڑی علاقوں میں جہاں عیسائیوں کی اکثریت ہے باقاعدہ فوجی تربیت کے مرکز بن گئے۔ اسلام اور فلسطینیوں کے خلاف پروپیگنڈے کی مہم شدت پکڑ گئی۔ فلسطینی مزاحمت کو اور ان کے حامیوں کو وطن دشمنی اور غدّاری کا ملزم گردانا گیا۔ یہاں تک کہ ان میں سے زیادہ متعصب لوگوں نے جنوبی لبنان کے سارے مسلمانوں کو وطن دشمن اور غدّار کہنا شروع کر دیا اور اس کی دلیل وہ یہ دیتے تھے کہ جنوبی لبنان کے مسلمان فلسطینی مزاحمت سے دوستانہ روابط رکھتے ہیں اور اس بات کے حق میں نہیں کہ فلسطینیوں کو لبنان سے نکال باہر کیا جائے۔ حزب الکتائب کے یہ متعصب ارکان اس بات کو بھلا بیٹھے تھے کہ یہی جنوبی لبنان کے مسلمان تھے جو "کفر شوبا" اور "کفر کلا" اور اسرائیلی سرحد پر واقع دوسرے مناطق میں یہودیوں کے ساتھ جنگ آزما ہوتے تھے اور اپنے وطن کی حفاظت میں اپنی جانیں فدا کرتے تھے۔ ان جان پر کھیلنے والوں کو غدّار اور وطن دشمن کہنا بے انصافی کے سوا اور کچھ نہیں۔

"عین الرمانہ" کی سازش

جنگی تیاریاں اور سرد جنگ اپنے عروج پر پہنچ چکی تو پورا ماحول تصادم اور خانہ جنگی کے لیے تیار ہو چکا تھا۔ ہر لحظہ خانہ جنگی کا خطرہ اور امکان بڑھتا جا رہا تھا اور حالت یہ تھی کہ معمولی سے معمولی واقعہ بھی ایک دیا سلائی کے مانند اس بارود خانے کو بھڑکا سکتا تھا۔ اگر "عین الرمانہ" کا حادثہ پیش نہ بھی آتا تو کوئی اور واقعہ خانہ جنگی کا سبب بن سکتا تھا۔

اتوار ۱۳- اپریل ۱۹۷۵ء کو ظہر کے قریب جب ایک بس فلسطینی اور لبنانی افراد کو لیے جا رہی تھی جو ایک جشن کے بعد واپس ہو رہے تھے۔ جب وہ لوگ "عین الرمانہ" میں کتائب کے ایک گرجے کے سامنے پہنچے جس میں پیئر الجمیّل بھی موجود تھا تو ان پر نہایت وحشیانہ حملہ کیا گیا۔ بس میں سوار لوگ غیر مسلح تھے، اور انھیں قریب سے گولیاں ماری گئیں۔ ان میں سے ۲۷ افراد تو فوری طور پر قتل ہو گئے اور ان کی لاشیں کافی مدت تک زمین پر پڑی رہیں۔ حزبِ کتائب کے مسلح رضا کار ان لاشوں کو اٹھانے کی اجازت نہیں دیتے تھے حتیٰ کہ سرکاری اور فوجی ایمبولینس گاڑیوں کو بھی مرنے والوں کے قریب نہیں جانے دیا گیا۔ یہ حادثہ اتنا دردناک اور مؤثر تھا کہ مسلمانوں

کے جذبات بہت برانگیختہ ہو گئے۔ بائیں بازو کی جماعتوں نے بھی ان حالات سے فائدہ اٹھایا اور بیروت کے ہر گوشے میں، گلی کوچوں میں تصادم شروع ہو گئے جن میں ہر قسم کا اسلحہ استعمال ہوا۔ کتائب نے اپنے آپ کو خوب تیار کر رکھا تھا۔ اسلحے کے جہازوں نے ان کی ضروریات کو پورا کر دیا تھا اور ان کے رضاکاروں نے کافی جنگی تربیت حاصل کر لی تھی۔ اس کے مقابلے میں حزب الکتائب کے مخالف گروہ پراگندگی کے عالم میں تھے۔ ان میں تنظیم نہ تھی اور ان کے افراد کی فوجی تربیت بھی کافی نہ تھی۔ خانہ جنگی شروع ہوئی تو دونوں گروہوں کے مابین توازن نہ تھا۔

بائیں بازو کی جماعتوں میں لبنان کی کمیونسٹ پارٹی، کمال جنبلاط کی ترقی پسند سوشلسٹ پارٹی (الحزب التقدمی الاشتراکی)، کمیونسٹ لیبر پارٹی (حزب العمل الشیوعی)، عراقی حزبِ بعث کی طرفدار جماعت (جبھۃ التحریر العربیہ) عرب محاذِ آزادی، جارج حبش کے "الجبھۃ الشعبیۃ" نائف حواتمہ کے "الجبھۃ الشعبیۃ الدیموقراطیہ" اور احمد جبریل کی جماعت "القیادۃ العامہ" کے رضاکار شامل تھے۔ یہ جماعتیں اپنی تعداد اور ساز و سامان کے اعتبار سے اس قابل نہ تھیں کہ کتائب کے مقابلے میں کوئی اقدام کر سکتیں۔ ان کی طاقت کی پشت پناہی فلسطینی مزاحمت اور بالخصوص اس کے جنگی شعبہ "فتح" کی طرف سے تھی۔ اگر یاسر عرفات کی سربراہی میں فلسطینی مزاحمت میدان سے ہٹ جاتی تو بائیں بازو کی ساری طاقت بکھر کر رہ جاتی۔ بائیں بازو کی یہ جماعتیں مسلسل پبلسٹی، اپنے اخباروں اور رسالوں میں چھپنے والے بیانات کے ذریعے سے یہ چاہتی تھیں کہ فلسطینی مزاحمت کو معرکے میں شریک کریں اور کتائب کے ساتھ انھیں بھڑا دیں۔ ہر چند کہ فلسطینی مزاحمت کتائب کے مقابلے میں کہیں زیادہ طاقتور تھی اور اس قابل تھی کہ کتائب کو شکست دے لیکن اس کے معرکے میں شریک ہونے کا مطلب یہ تھا کہ اسرائیلی فوجیں لبنان میں داخل ہو جاتیں اور وہ جنوبی لبنان پر قبضہ کر لیتیں جہاں فلسطینی طاقت کے مراکز تھے۔ علاوہ بریں اسرائیل "صبرا" کے محلے، بیروت کے گرد و نواح میں فلسطینی کیمپوں اور لبنان کے شیعہ مناطق میں واقع فلسطینی تربیتی کیمپوں پر بمباری کرتا اور لبنان میں ایک اور ستمبرِ سیاہ وجود میں آتا۔ اسی بناء پر فلسطینی مزاحمت یہ نہیں چاہتی تھی کہ اس معرکے میں شریک ہو کر اسرائیل کو دخل اندازی کے لیے ایک بہانہ دے۔ اگرچہ وہ کتائب سے ڈرتے نہیں تھے۔ اردن میں ستمبرِ سیاہ کا تجربہ ہمیشہ

Presented by Ziaraat.Com

فلسطینی مزاحمت کی نگاہوں کے سامنے رہا ہے۔ اسی لیے فلسطینی مزاحمت نے ہمیشہ یہ کوشش کی کہ خانہ جنگی اور فسادات کی روک تھام کرے اور جذبات کی رو میں نہ بہے۔ فلسطینی مزاحمت کی ہمیشہ یہ کوشش رہی تھی کہ صبر اور حوصلے سے داخلی فسادات کے شعلوں کو بھڑکنے سے روکے لیکن اب صورتِ حال ایسی تھی کہ فلسطینی مزاحمت کے کنٹرول سے باہر تھی۔ شہر کے مختلف حصّوں میں مسلمان اور عیسائی مورچہ بند ہو کر بیٹھ گئے تھے اور ہر حرکت کرتی ہوئی چیز کو گولی کا نشانہ بنا دیتے تھے۔ سڑکوں پر ٹریفک ختم ہو چکی تھی۔ پُورا شہر فوجی قلعے کی شکل اختیار کر چکا تھا شہر کے ہر گوشے میں "قناص"[1] بیٹھے ہوئے تھے اور سڑکوں پر کسی کو حرکت نہیں کرنے دیتے تھے۔ بڑی بڑی توپوں، مارٹروں اور بموں نے شہر کو لرزا رکھا تھا۔ مختلف جگہوں سے آگ اور دھواں آسمان کی طرف بلند ہوتا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ ہر گلی کُوچے میں گولیوں اور بموں کے چلنے کی آوازیں گونجتی تھیں اور یوں معلوم ہوتا تھا کہ پُورے لبنان کو یہ فسادات نیست و نابُود کر دیں گے۔ عیسائیوں کے علاقے "حدث"، "عین الرمانہ"، "فرن الشباک" اور "اشرفیہ" کے مناطق مسلمان محلوں مثلاً "کفر شیما"، "حی مسلم"، "حی ماضی"، "الشیاح" اور "برج حمود" کے محاصرے میں تھا۔ مسلمانوں کے ان مناطق میں غالب اکثریت شیعوں کی ہے اور ان علاقوں نے عیسائی منطقے کو اپنے گھیرے میں لے رکھا ہے۔ خانہ جنگی کی آگ نے ان شیعہ مناطق کو متاثر کیا۔ بائیں بازو کی جماعتیں بھی عیسائیوں پر حملہ کرنے کے لیے ان شیعہ محلوں میں آگئیں۔ فلسطین کی تنظیم آزادی نے ان علاقوں کا دفاع کرنے کے لیے اپنے بیشتر فوجی یہاں بھیج دیے تھے۔ فلسطینی مزاحمت مسلمان اور بائیں بازو کی جماعتوں کی پشت پناہی کرتی تھی لیکن عملی طور پر جنگ میں شریک نہ تھی۔ فقط ان کی موجودگی مسلمانوں اور بائیں بازو کی جماعتوں کو حوصلہ دلانے کا باعث تھی جہاں تک حملوں کا تعلق ہے تو سارا کام لبنانی مسلمانوں اور بائیں بازو کی جماعتوں کے غیر منظم بلکہ اکثر غیر تربیت یافتہ رضاکاروں کی طرف سے ہوتا تھا۔ خانہ جنگی نے عیسائیوں اور مسلمانوں

---

[1] "قناص" سے مراد ایسا ماہر بندوقچی ہے جو دُوربین لگی ہوئی بندوقیں لے کر اونچے مقامات پر چُھپ کر بیٹھ جاتا ہے اور دُور دُور تک حرکت کرنے والی چیزوں کو اپنا نشانہ بنا دیتا ہے۔ چھپے ہوئے بندوقچی کا سراغ لگانا بہت مشکل ہوتا ہے۔ انگریزی میں اسے "(Sniper)" کہتے ہیں۔

کی جنگ کی شکل اختیار کر لی تھی اور یہ ممکن نہ تھا کہ حزبِ کتائب کے ارکان کو دوسرے عیسائیوں سے الگ کیا جا سکے اور یہ بھی ممکن نہ تھا کہ ایک عام مسلمان اور کسی جماعت میں شامل مسلمان کے درمیان فرق کیا جا سکے۔ لٰہذا یہ تمام عیسائی اور مسلمان منطقے جنگ کی لپیٹ میں آگئے اور بے شمار لوگ موت کا شکار ہوے اور یہ بات خاص طور پر یوں ہوئی کہ یہاں کوئی خندقیں یا مورچے نہ تھے اس لیے مسلح افراد بے تحاشا ایک دوسرے پر گولیاں برساتے اور بے شمار لوگوں کی لاشیں گلیوں اور سڑکوں کے سینوں کو ڈھانپ دیتیں۔

فلسطینی مزاحمت اور سیّد موسیٰ الصدر

جنگ کے شعلے بھڑک اُٹھے تو فلسطینی مزاحمت نے محسوس کیا کہ اس کی صفوں میں دھماکے کا خطرہ ہے۔ مزاحمت کے سربراہوں کے ذہنوں میں اردن کے ستمبرِ سیاہ کی یادیں تازہ ہو گئیں حزب الکتائب کے کارکنوں نے جس قسم کے جرائم کا ارتکاب کیا تھا ان کی بناء پر لوگوں کے دلوں میں پیدا ہونے والے احساسات ایسے نہ تھے جن پر قابو پایا جا سکتا۔ بائیں بازو کی جماعتیں بھی اپنے اخبارات اور اپنے سیاسی بیانوں کے ذریعے سے ان احساسات کو اور تیز کرتی تھیں اور یوں وہ جذبات کے اس آتش فشاں کو پھٹنے کے قریب لے آتی تھیں لیکن فلسطینی مزاحمت ہرگز اس بات کے لیے تیار نہ تھی کہ ان اسباب کی بناء پر اپنے آپ کو لوگوں کے احساسات و جذبات اور بائیں بازو کی جماعتوں کی حرکات کے سپرد کر دے اور یوں اپنے آپ کو اس سازش کا شکار بنا لے جس کی خاطر یہ سب حیلے بہانے تراشے گئے تھے اور اس خانہ جنگی کی بنیاد رکھی گئی تھی۔ لبنان کے وزیرِ اعظم رشید الصلح جو خود بائیں بازو کی جماعتوں اور بالخصوص کمال جنبلاط کے زیرِ اثر تھے اس قابل نہ تھے کہ وہ لبنان کی صورتِ حال پر کوئی اثر ڈال سکیں۔ وہ واحد شخصیت جس کا لبنان میں اثر و نفوذ تھا، جس کا سب لوگ احترام کرتے تھے اور فلسطینی مزاحمت اس کے اخلاص اور فداکاری پر ایمان رکھتی تھی، سیّد موسیٰ الصدر کی شخصیت تھی۔ وہ اس سے قبل بھی کئی بار فلسطینی مزاحمت کی مدد کر چکے تھے اور بالخصوص ۱۹۷۳ء میں انھوں نے فلسطینی مزاحمت کو ایک اور ستمبرِ سیاہ سے نجات دلائی تھی۔ لٰہذا فلسطینی مزاحمت کے ذمہ دار افراد نے یاسر عرفات

Presented by Ziaraat.Com

کے حکم سے جو اس وقت سوریا میں تھے، سید موسیٰ الصدر نے رابطہ پیدا کیا اور ان سے درخواست کی کہ وہ اس بحران کو کم کرنے اور جنگ بندی کروانے میں اپنا پورا اثر و نفوذ اور طاقت استعمال کریں۔ سید موسیٰ الصدر مختلف جماعتوں سے ملاقاتوں اور دونوں طرفوں سے سیاسی اور اخلاقی دباؤ کے بعد اس قابل ہوئے کہ پیر کو ظہر کے وقت دو گھنٹے کی مدت کے لیے جنگ بندی کروا دیں تاکہ مرنے والوں اور زخمیوں کو جنگی مناطق سے اٹھا کر ہسپتال منتقل کیا جائے اور ایمبولینس گاڑیوں پر گولیاں نہ برسائی جائیں۔ اس وقت تک کوئی ایمبولینس گاڑی اس قابل نہ تھی کہ وہ جنگی مناطق میں جا سکے کیونکہ اس صورت میں اُسے گولیوں کا نشانہ بننا لازم تھا۔ سڑکیں اور گلیاں مرنے والوں اور زخمیوں سے بھر چکی تھیں اور کوئی شخص یہ جرأت نہ کر سکتا تھا کہ زخمیوں کی فریاد کا جواب دے سکے۔ بے شمار زخمی اس کرب و اضطراب میں موت کے منہ میں چلے گئے اور کوئی شخص ان کی مدد کو نہ پہنچ سکا۔

دو بجے بعد از ظہر جنگ بندی شروع ہوئی۔ سید موسیٰ الصدر کا خیال تھا کہ وہ دو گھنٹے کی اس مدت کے دوران میں طرفین کے مابین کوئی صلح صفائی کروا دیں اور یہ جنگ بندی مستقل ہو جائے۔ لمبی چوڑی بحث و تمحیص کے بعد فلسطینی مزاحمت اور کتائب کے مابین اخلاقی اور سیاسی دباؤ کے نتیجے میں صلح صفائی کی بنیاد رکھی گئی۔ کتائب نے اس بات کو قبول کر لیا کہ وہ رسمی طور پر فلسطینی مزاحمت سے معذرت طلب کریں اور کتائب کے ان ۱۴ مجرموں کو جنھوں نے بس پر حملہ کیا تھا عدالت کے سپرد کر دیں۔ فلسطینی مزاحمت نے بھی یہ بات قبول کر لی کہ ان دو باتوں کے اساس پر صلح ہو جائے اور طرفین مار دھاڑ سے دست بردار ہو جائیں۔ دو بجے بعد از ظہر جب جنگ بندی شروع ہوئی تو ایمبولینس گاڑیاں گلی کوچوں میں نکل آئیں۔ انھوں نے زخمیوں اور مرنے والوں کو گلیوں سے اُٹھا اُٹھا کر ہسپتالوں میں لے جانا شروع کیا۔

اسی دن ڈھائی بجے حزب التقدمی الاشتراکی (پروگریسو سوشلسٹ پارٹی) کے لیڈر اور بائیں بازو کے متفقہ سربراہ کمال جنبلاط سید موسیٰ الصدر کے پاس مجلس الاسلامی الشیعی میں تشریف لائے ان کے ساتھ کمیونسٹ پارٹی کے لیڈر جارج حاوی اور محسن دلول اور انعام رعد نیز بائیں بازو کے بعض دوسرے لیڈر بھی تھے۔ میں بھی اس وقت موجود تھا۔ کمال جنبلاط نے کہا کہ میں جنگ بندی

کا مخالف ہوں اور لازم ہے کہ کتائب کے خلاف جنگ جاری رہے۔ سید موسیٰ الصدر نے جواب دیا کہ فلسطینی مزاحمت کسی بناء پر جنگ کے حق میں نہیں اور آپ لوگ فلسطینی مزاحمت کی مدد کے بغیر کچھ نہیں کر سکتے۔ جنبلاط نے بڑے زور کی بڑ ہانکی کہ ہم کتائب کے دانت کھٹے کر دیں گے ہمیں کتائب کی اس غلطی سے فائدہ اٹھانا چاہیے اور انھیں مزا چکھا دینا چاہیے۔ سید موسیٰ الصدر نے فرمایا کہ آپ لوگ اکیلے اس قابل نہیں کہ کتائب سے مقابلہ کر سکیں لیکن اگر آپ کا خیال یہی ہے تو بسم اللہ کیجیے اور میں جنگ بندی کے لیے کوشش نہیں کروں گا کیونکہ اس صورت میں آپ یہ کہیں گے کہ میں نے آپ کی پیش قدمی کو روکا ہے ورنہ آپ نہ جانے کیا کچھ نہ کر لیتے۔ جنبلاط اور بائیں بازو کے لیڈروں نے چائے تک نہ پی اور میں نے اپنے کانوں سے سنا کہ جب جنبلاط جانے لگے تو انھوں نے آقائے صدر سے کہا کہ لوگ آپ کو بہت پسند کرتے ہیں اور آپ کو بڑی شہرت حاصل ہے لیکن اگر آپ یہ چاہتے ہیں کہ آپ کی یہ نیک شہرت پائیدار ہو جائے تو آپ کو چاہیے کہ جنگ کی باتیں کریں، صلح کی باتیں نہ کریں۔ سید موسیٰ الصدر نے تعجب کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ میں اپنی ذاتی شہرت کے لیے کام نہیں کر رہا بلکہ بدنصیب لوگوں کی مصلحت میرے پیش نظر ہے۔ جنبلاط اور بائیں بازو کے دوسرے لیڈر مجلس کے دفتر سے چلے گئے اور چار بجے از سر نو جنگ شروع ہو گئی۔

بائیں بازو کی سب جماعتیں جمع ہوئیں اور انھوں نے ایک عام ہڑتال کے اعلان کا فیصلہ کیا۔ یہ وہ واحد کام تھا جس پر یہ جماعتیں قادر ہو سکیں اور وہ بھی ان شہروں میں جہاں سب دکانیں خود بخود بند تھیں اور راستے میں رکاوٹیں تھیں۔ لوگ اپنے گھروں میں بیٹھ رہے۔ بائیں بازو کی طرف سے ہڑتال کے حکم کو کامیابی حاصل نہ ہوئی البتہ خانہ جنگی میں کتائب کو کامیابیاں ضرور حاصل ہوئیں۔ انھوں نے شیعہ علاقوں پر خوفناک گولہ باری کی اور دلوں میں خوف و ہراس بھر دیا منگل کو کتائب نے ایک دن پہلے کے کیے ہوئے وعدے کی ایفا سے گریز کیا۔ اب وہ اس بات پر تیار نہ تھے کہ فلسطینی مزاحمت سے معذرت طلب کریں اور ۱۴ مجرموں میں سے فقط ۲ کو عدالت کے سپرد کرنے پر تیار تھے۔

کتائبیوں نے ہر مسلمان کو بڑی بے رحمی اور اہانت آمیز انداز میں مارا پیٹا اور پکڑ لیا۔

Presented by Ziaraat.Com

ان میں سے بعض کو قتل بھی کر دیا۔ آہستہ آہستہ ان اضطرابات نے مذہبی جنگ کی صورت اختیار کر لی اور تمام عیسائیوں نے کتائب کی حمایت میں اپنے آپ کو آمادۂ جنگ کر لیا اور کتائب نے علانیہ طور پر عیسائیوں میں اسلحہ تقسیم کیا۔

یہ مذہبی خانہ جنگی مسلمانوں کے لیے ضرر رساں تھی۔ اس کے نتیجے میں کتائب نے عیسائیوں کی حمایت حاصل کر لی اور ان کے ارد گرد تقدس کا ایک ہالہ بن گیا۔ اپنی کامیابیوں کے بعد وہ ہیرو کی شکل میں ظاہر ہوئے۔ مغرب کی عیسائی حکومتوں نے بھی کتائب اور لبنانی عیسائیوں کے حق میں موقف اختیار کیا۔ اس سے قبل کتائب کی جماعت ایک فاشسٹ جماعت گنی جاتی تھی۔ کیتھولک، آرتھوڈوکس (مشرقی عیسائیت کے ہمنوا) اور ارمنی، کتائب کے مخالفین میں سے شمار ہوتے تھے کیونکہ یہ سب مارونیوں کے سیاسی اور اقتصادی دباؤ کا شکار تھے۔ حتّٰی کہ مارونی دانشور بھی کتائب کے مخالف تھے اور لبنان کی پارلیمنٹ میں ۱۷ مارونی ارکان کتائب کے رول کے خلاف تھے۔ لیکن اس مذہبی جنگ نے، جس میں ہر عیسائی کے لیے جان کا خطرہ تھا، ان تمام عیسائیوں کو کتائب کا ہمنوا بنا دیا اور یہ فاشسٹ جماعت لبنان کی جنگی سٹیج پر ایک ہیرو کے انداز میں ظاہر ہوئی۔

لبنان کے دانشور اور فلسطینی مزاحمت کے لوگ اس بڑے خطرے سے آگاہ تھے آقائے صدر نے اس کی روک تھام کے لیے غیر کتائبی عیسائیوں کو دعوتِ فکر دی جس کے نتیجے میں سابق صدر شارل حلو، ہنری فرعون اور غسان توینی جیسے ۷ عیسائی افراد نے ایک کمیٹی بنائی تاکہ وہ کتائب کے نفوذ کا مقابلہ کر سکیں اور مذہبی جنگ کے اس خطرے کو ختم کریں۔ قریب تھا کہ یہ کمیٹی کامیاب ہو اور عیسائیوں میں کتائب کے سیاسی، اجتماعی اور اخلاقی نفوذ کی روک تھام کر سکیں لیکن اس کمیٹی پر دونوں طرف سے اعتراضات شروع ہو گئے۔ بائیں بازو اور دائیں بازو کے سب لوگوں نے اس کی مخالفت کی۔ بائیں بازو کی جماعتوں نے خاص طور پر سید موسیٰ الصدر پر نکتہ چینی کی کہ اس کمیٹی میں صرف عیسائی کیوں رکھے گئے ہیں[1] اور مسلمانوں کو اس میں شریک کیوں نہیں

[1] یہ قصہ صرف لبنان کا ہی نہیں بلکہ ساری دنیا کی بائیں بازو کی جماعتوں کا ہے۔ وہ اصولی اور نظری طور پر مذہب کو رد کرتے ہیں لیکن فائدہ اٹھانے کے لیے وہ شدید ترین مذہبی تعصبات کا شکار ہوتے ہیں۔ اور تو اور روس کی (بقیہ حاشیہ ص ۱۵۷)

کیا گیا۔ ان لوگوں نے اس کمیٹی کی تشکیل کے پس پردہ کارفرما فلسفے پر توجہ نہ کی یا وہ چاہتے ہی نہ تھے کہ اس پر غور کریں اور اس نکتہ چینی اور اعتراض کا مقصد کچھ اور ہی تھا۔ مختلف جماعتوں اور کتائب کی طرف سے اس کمیٹی پر جو اعتراضات ہوئے ان کی بناء پر یہ اس قابل نہ ہوئی کہ اپنا کام شروع کر سکے۔ جنگ کا دائرہ بر روز وسیع سے وسیع تر ہوتا جا رہا تھا، زیادہ سے زیادہ عیسائی ہر روز میدانِ جنگ میں اتر رہے تھے اور انھیں زیادہ کامیابیاں حاصل ہو رہی تھیں۔ ایک دن بعد کتائب یہ چاہتے تھے کہ مجرموں میں سے صرف ۳ افراد کو عدالت کے سپرد کیا جائے۔ وہ جنگ کو اپنے فائدے میں سمجھتے تھے اور ان کے خیال میں یہ بڑا اچھا وسیلہ تھا کہ فلسطینی مزاحمت میدانِ کارزار میں اُترے اور لبنان میں جنگ کی آگ پوری طرح بھڑک اُٹھے۔

سید موسیٰ الصدر کی دھمکی:

فلسطینی مزاحمت ان حالات سے خوش نہ تھی جو پیدا ہو رہے تھے۔ اسے معلوم تھا کہ بائیں بازو کی جماعتیں کتائب کے مقابلے میں کوئی حیثیت نہیں رکھتیں۔ اگر جنگ جاری رہے اور مرنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہو تو مسلمانوں کے احساسات مزید مجروح ہوں گے اور پھر مزاحمت کے پاس جنگ میں شریک ہوئے بغیر کوئی چارہ کار نہ تھا اور یہ بات وہ ہے جس سے فلسطینی مزاحمت کو ہر قیمت پر گریز کرنا چاہیے۔ کمال جنبلاط اور بائیں بازو کی جماعتیں بھی یہ جانتی تھیں کہ کتائب کے مقابلے میں بہت کمزور ہیں لیکن ان کی خواہش تھی کہ وہ لوگوں کے احساسات کو بھڑکا کر فلسطینی مزاحمت پر جذباتی اور اخلاقی دباؤ ڈالیں تاکہ وہ میدانِ جنگ میں شریک ہو جائے اور یوں فلسطینی مزاحمت کے ہاتھوں

(بقیہ حاشیہ ص ۱۵۶) کمیونسٹ پارٹی جو مذہب کی ہر شکل کی مخالفت کرتی ہے، وہ بھی وقت آنے پر ان تعصبات کا اظہار کرتی ہے۔ مترجم کو لبنان میں ایک دستاویزی فلم دیکھنے کا موقع ملا تھا جس میں ماسکو کے اسقفِ اعلیٰ کے عہدے پر متمکن ہونے کی رسم ادا کی گئی تھی۔ اس میں روس کے سربراہ خروشچیف اور دیگر لیڈر بڑے خشوع و خضوع سے ہاتھ باندھے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔ یہی کیفیت دوسرے سوشلسٹ ممالک کی ہے اور یہی کیفیت ہمارے ملک میں ان دانشوروں کے ہاں پائی جاتی ہے جو دعویٰ تو یہ کرتے ہیں کہ انھیں سُنّی شیعہ جھگڑے سے کوئی تعلق نہیں لیکن سو فیصد مواقع پر وہ اپنے مذہبی تعصبات کو آشکار کرنے سے گریز نہیں کرتے۔

Presented by Ziaraat.Com

کتائب کی قوت کو ختم کیا جائے جس سے یہ عناصر سیاسی فائدے حاصل کریں۔ انھیں اس چیز سے کوئی غرض نہیں تھی کہ لبنان پر اسرائیلی حملہ بھی ہو سکتا ہے اور فلسطینی مزاحمت کا اس جنگ میں شریک ہونا لوگوں کے لیے اندوہناک نتائج کا حامل بھی ہو سکتا ہے۔

بدھ ۱۶۔ اپریل ۷۵ء کو فلسطینی مزاحمت کے ایک سربرآوردہ لیڈر اور یاسر عرفات کے نمائندے ابو جہاد نے سید موسیٰ الصدر کو فون کیا اور کہا کہ ہم یہ چاہتے ہیں کہ آج ہر قیمت پر اس جنگ کو ختم کیا جائے۔ غیر ذمہ دار پارٹیاں کچھ بھی نہیں کر سکتیں اور اگر یہ کشت و خون جاری رہا تو فلسطینی مزاحمت کو بامرِ مجبوری اس کے نتائج بھگتنا ہوں گے جو بہت بڑی غلطی ہو گی۔ سید الصدر نے کہا کہ وہ شرطیں جو پہلے روز طے پائی تھیں اب وہ (کتائب) انھیں قبول نہیں کرتے۔ ابو جہاد نے کہا کہ ہم کوئی شرط نہیں لگاتے، حتیٰ کہ ہم ان ۳ مجرموں کا مطالبہ بھی نہیں کرتے۔ بس ہم تو یہ چاہتے ہیں کہ جنگ ختم ہو جائے۔ میں بیروت کے شیعہ علاقے "الشیاح" میں گیا تاکہ اپنے دستوں کو تیار کر سکوں۔ سید موسیٰ الصدر نے شیعہ رضاکاروں اور "حرکت المحرومین" کے لوگوں کو تیار رہنے کے لیے کہا تاکہ اگر ضرورت پڑے تو وہ جنگ میں شریک ہو سکیں۔ اسی دن سہ پہر کے وقت سید موسیٰ الصدر نے کتائب کے لیڈر پیئر الجمیل کو فون کیا اور تجویز پیش کی کہ کتائب جنگ بندی کو قبول کر لیں۔ لیکن پیئر الجمیل نے اس تجویز کو رد کر دیا اور کہا کہ انھیں جنگ سے کوئی ضرر نہیں پہنچا الہٰذا نہ پہنچے گا۔ سید موسیٰ الصدر نے کہا کہ شہر جل رہا ہے، خون بہہ رہا ہے، بے گناہ لوگ، چھوٹے، بڑے، مرد اور عورتیں خاک و خون میں غلطاں ہیں، تمام لبنانی اقدار زیر و زبر ہو رہی ہیں اور ملک کو نیست و نابود ہونے کا خطرہ ہے۔ ان سب باتوں کے باوجود پیئر الجمیل نے جنگ بندی کو قبول نہ کیا۔ اس پر سید موسیٰ الصدر نے کہا، "بہت بہتر، اگر تم لوگ جنگ کو طول دینا چاہتے ہو تو کل بیروت کے گلی کوچوں میں شیعوں کو اپنے مقابل نبرد آزما دیکھو گے۔ مزید یہ کہ "ہرمل" اور "بعلبک" کے قبائل بھی بیروت کو روانہ ہو چکے ہیں اور کل وہ یہاں پہنچ جائیں گے۔ اگر تم چاہتے ہو کہ بیروت برباد ہو جائے تو تمھاری مرضی۔" یہ سن کر پیئر الجمیل پر سید موسیٰ الصدر کی دھمکی کا اثر ہوا اور اُس نے جنگ بندی کو کتائب کی طرف سے قبول کر لیا۔ لیکن یہ شرط رکھی کہ صرف ۲ مجرموں کو عدالت میں بھیجیں گے۔ فلسطینی مزاحمت نے بھی سید موسیٰ الصدر کو اپنی رضامندی کی اطلاع

دے دی اور یوں یہ جنگ بندی عمل میں آئی۔

اس دن یعنی بدھ کو "الشیاح" کے سامنے ۴ افراد مارے گئے تھے۔ جمعرات کو بھی ۲ لڑکے اسی جگہ شہید ہوئے۔ بات یہ تھی کہ ایک کتائبی نشانہ باز ایک بلڈنگ کے اوپر بیٹھا ہوا تھا اور ہر متحرک چیز کو اپنا نشانہ بناتا تھا۔ آخر کار سید الصدر کے تقاضے پر فلسطینی مزاحمت نے ۵ ماہر لڑنے والوں کو بھیجا اور انھوں نے چند منٹ میں اس نشانہ باز کو مار گرایا۔ حالانکہ اس کے اردگرد بائیں بازو کے ۵۰۰ مسلح افراد موجود تھے اور وہ اس ایک نشانہ باز کا بندوبست نہ کر سکتے تھے۔

سید موسیٰ الصدر کی وضاحت

خانہ جنگی کے آخری دنوں میں بائیں بازو کی جماعتیں بالکل خاموش ہو چکی تھیں اور کچھ کرنا ان کے بس کا روگ نہ تھا۔ لیکن جنگ بندی کے بعد آہستہ آہستہ انھوں نے حرکت کرنا شروع کی۔ انھوں نے سید موسیٰ الصدر پر نکتہ چینی کی اور ان پر تہمت لگائی کہ وہ کتائب کے ساتھ تعاون کرتے ہیں۔ یہ تہمت کس قدر بے بنیاد تھی لیکن کس قدر کارگر ہو سکتی تھی۔ سید موسیٰ الصدر نے بائیں بازو سے وابستہ تمام لیڈروں کو مجلسِ اسلامی کے دفتر میں بلایا، ان کے ساتھ فلسطینی مزاحمت کے نمبر ۲ لیڈر ابو جہاد کو بھی دعوت دی تاکہ وہ بھی بطور گواہ اس جلسے میں شریک ہو۔ سید صدر نے ابو جہاد کی موجودگی میں بائیں بازو والوں سے کہا کہ ہمارا موقف وہی ہے جو فلسطینی مزاحمت کا موقف ہے، ہم نے جنگ بندی کے لیے جو کوشش کی ہے وہ فلسطینی مزاحمت کے مفاد کے پیشِ نظر اور اس کے مشورے سے کی ہے۔ انھوں نے بائیں بازو کے لوگوں کی اشتعال انگیزیوں اور فتنہ پردازیوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا، "آپ لوگ سالہا سال تک کتائب کے ساتھ مل کر حکومت میں شریک رہے ہیں۔ کتائب سے آپ کے اختلاف کی اساس پارلیمنٹ میں کرسیوں کی تقسیم اور مفادات کے حصول پر ہے۔ آپ چاہتے ہیں کہ آپ کے وزیر زیادہ ہوں اور کتائب بھی یہی چاہتے ہیں۔ ان سے آپ کا جھگڑا سطحی ہے اور خاص مفادات کے پیشِ نظر۔ درآں حالیکہ کتائب اور فلسطینی مزاحمت کا اختلاف اصولی اور بنیادی ہے۔ یہ بات بہت غلط ہے کہ آپ کے سطحی مفادات کی خاطر فلسطینی مزاحمت شریکِ معرکہ ہو اور اپنے آپ کو نیست و نابود

Presented by Ziaraat.Com

کرکے اس کی قیمت ادا کرے۔ اگر آپ لوگ یہ چاہتے ہیں کہ اپنے مفادات کی خاطر کنائب سے جنگ آزما ہوں تو آپ اس میں آزاد ہیں۔ لیکن یہ توقع نہ رکھیے کہ آپ کی خاطر فلسطینی مزاحمت جنگ میں شریک ہو جائے۔" ابو جہاد کی موجودگی میں بائیں بازو کے لیڈر مجبوراً خاموش ہو گئے اور انھیں نکتہ چینی کرنے کا اور حملے کرنے کا کوئی بہانہ نہ ملا۔ لیکن در پردہ انھوں نے اپنی کارروائیاں ویسے ہی جاری رکھیں۔ بہرحال پہلی جنگ بندی اس طریق پر عمل میں آئی۔

نئی خانہ جنگی :

پہلی جنگ بندی کے تقریباً دس روز بعد جنگ کی آگ دوبارہ بھڑک اٹھی اور جنگ کا یہ آغاز بے حد شرمناک اور مضحکہ خیز تھا۔ "عین الرمانہ" کے علاقے میں ایک ۱۴ سالہ عراقی لڑکا کسی عیسائی لڑکی سے رومانس لڑا رہا تھا کہ عیسائیوں نے اپنی اشتعال کی کیفیت میں اس عراقی لڑکے کو پکڑ لیا اور اس کی پشت میں خنجر مارا۔ اس کا ایک اور ساتھی عراقی لڑکا اس کی حمایت میں اُٹھ کھڑا ہوا اور اُس نے ان عیسائیوں پر گولیاں چلائیں اور بھاگ نکلا۔ جب اس عراقی لڑکے کو خنجر مارا گیا تو "جبھۃ التحریر العربیۃ" کے لوگ جو عراق کے حمایتی ہیں اپنی مشین گنیں اٹھا لائے اور "الشیاح" اور "عین الرمانہ" کے مناطق کے سنگم پر پہنچ کر انھوں نے عیسائیوں پر گولیاں برسانا شروع کر دیں۔ اس پر از سرِ نو مورچے بن گئے اور از سرِ نو مختلف گوشوں میں نشانہ بازوں نے پوزیشنیں سنبھال لیں۔ یوں ایک معمولی سبب اور نہایت غیر اہم مسئلے کی بناء پر دوبارہ جنگ شروع ہو گئی۔ عیسائی تو خدا سے چاہتے تھے کہ جنگ شروع ہو اور وہ مسلمانوں کو پیٹیں۔ انھیں تو ایک بہانہ چاہیے تھا کہ اپنی سازش کو جاری رکھیں۔ انھوں نے بھاری توپ خانے اور ٹینکوں وغیرہ سے "الشیاح" پر گولہ باری شروع کر دی۔ اب صورت یہ تھی کہ "الشیاح" کی طرف سے مسلمان گولیاں برساتے تھے یعنی کلاشینکوف کی چھوٹی چھوٹی گولیاں، اور اس کے جواب میں بھاری توپ خانے سے گولہ باری ہوتی تھی جس سے بے شمار لوگ مرتے تھے اور بے شمار مکان برباد ہو جاتے تھے۔ اس صورت میں یہ دوسری خانہ جنگی شروع ہوئی۔

یاسر عرفات کا استدلال :

مجھے یاد ہے کہ دوسری یا تیسری جنگ بندی کے دوران میں یاسر عرفات نے "الشیاح" میں موجود تمام پارٹیوں کے ذمہ دار افراد سے کہا کہ وہ ان کے دفتر میں جو "صبرا" کیمپ میں تھا جمع ہو جائیں۔ میں بھی اس میں شریک ہوا۔ یاسر عرفات نے تمام حاضرین سے جن کی تعداد کوئی ۱۷، ۱۸ تھی پُر زور انداز میں کہا کہ ہم جنگ کرنا نہیں چاہتے اور وہ ہمارے مفاد میں نہیں۔ بائیں بازو کے لوگ احتجاج کرتے تھے کہ نہیں ہمیں ضرور لڑنا چاہیے، ہمیں ضرور مارنا چاہیے۔ یاسر عرفات نے غصے میں کہا کہ میں ایک فوجی لیڈر کی حیثیت سے تم سے بات کر رہا ہوں۔ ایک مارٹر کا تصور کرو۔ یہ مارٹر ایک منٹ میں ایک گولہ پھینک سکتا ہے تو ایک گھنٹے میں کتنے گولے پھینکے گا اور ایک ہفتے میں کتنے؟ انھوں نے حساب کر کے بتایا کہ دس دن کے لیے ایک مارٹر کو کم از کم تین ہزار گولوں کی ضرورت ہے۔ اس کے بعد انھوں نے ان لوگوں کی طرف رُخ کر کے کہا، جو جنگ پر مُصر تھے، کہ آپ میں سے کس کے دفتر میں تین ہزار گولوں کا ذخیرہ ہے اور یہ ذخیرہ صرف ایک مارٹر کے لیے ضروری ہے۔ میں جانتا ہوں کہ آپ یہ چاہتے ہیں کہ میں آپ کو یہ گولے مہیا کروں اور میں آپ سے کھُل کر یہ بات کہ دیتا ہوں کہ میرے پاس بھی نہیں ہیں۔ اس صورت میں آپ مجھ سے توقع کیوں کر کرتے ہیں کہ میں جنگ میں شریک ہو جاؤں جبکہ میرے پاس ایک مارٹر کے ساتھ دس دن لڑنے کے لیے بھی کافی ذخیرہ موجود نہیں۔ آپ کیوں کر توقع کرتے ہیں کہ آپ مجھے زبردستی جنگ میں شامل کریں۔ اس کے بعد غصے کی حالت میں انھوں نے عراقیوں کی طرف رُخ کیا اور کہا کہ اپنی حکومت سے کہیے کہ ان کے پاس جو فالتو اسلحہ ہے یا وہ اسلحہ جو ہمیں ملنا چاہیے تھا اور انھوں نے ہڑپ کر لیا، پہلے ہمیں دیں اور اس کے بعد ہمیں جنگ پر مجبور کریں۔ اس کے بعد انھیں غصہ کچھ زیادہ ہی آ گیا اور کہا کہ میں یہ بھی نہیں چاہتا بلکہ میں تو یہ چاہتا ہوں کہ وہ سامانِ جنگ جو ان کے لیے بے کار ہے، جسے وہ پھینک دیتے ہیں، وہی ہمیں دے دیں۔ اس کے بعد ہم سے شریکِ جنگ ہونے کا مطالبہ کریں۔ بہرحال اس گفتگو کے بعد تمام پارٹیاں خاموش ہو گئیں اور انھوں نے یاسر عرفات کی بات کو قبول کر لیا۔ یاسر عرفات نے اس بات پر زور

Presented by Ziaraat.Com

دیا کہ یہ فیصلہ سیاسی فیصلہ ہے اس لیے لازم ہے کہ سب اس کی پابندی کریں اور اس کے مطابق عمل کریں۔ کوئی ڈیڑھ گھنٹے کے بعد یہ جلسہ ختم ہوا اور سب لوگ "الشیاح" کو لوٹ آئے۔ میں بھی واپس آ گیا۔

پے در پے لڑائیاں :

کوئی چھ بجے شام کو "خیابان اسعد الاسعد" میں "الشیاح" میں اپنے دفتر میں "فتح" کے ایک جنگی کمانڈر کے ساتھ باتیں کر رہا تھا۔ اس اثنا میں "الجبہۃ الشعبیۃ" کا ایک کارکن خیابان اسعد الاسعد میں آیا اور ایک چھوٹی سی مشین گن "سمینوف" سے "عین الرمانہ" کے عیسائیوں پر گولیاں برسانا شروع کر دیں۔ اس نے ان کی جانب چار راؤنڈ پھینکے۔ "فتح" کے یہ کمانڈر جن کا نام "قاہر" تھا اور جو ہمارے دوست تھے، انھوں نے اپنے سر پر ہاتھ مارا اور کہا کہ جنگ دوبارہ شروع ہو گئی ہے۔ میں نے اس سے کہا کہ جا کر اس شخص کو قابو کرو، یاسر عرفات کا حکم بھی یہی ہے، ان کو پکڑ لو، چھوڑو نہیں۔ انھوں نے کہا "اے کاش میں ایسا کر سکتا۔ یہ میرے بس کا روگ نہیں ہے۔ میں کچھ نہیں کر سکتا۔" کوئی دس منٹ گزرے ہوں گے کہ "عین الرمانہ" کی طرف سے بھاری گولے "الشیاح" پر گرنا شروع ہو گئے۔ "الشیاح" ان گولوں کی زد میں تھا اور لرز رہا تھا اور ہم چڑیوں کی طرح ایک کونے سے دوسرے کونے میں چھپتے پھر رہے تھے تاکہ ان لوگوں کے گولوں سے ہمیں نقصان نہ پہنچے۔ "فتح" کے یہ کمانڈر جو میرے ساتھ تھے اور باتیں کر رہے تھے، وہ شدید زخمی ہو گئے۔ ان کا ایک پاؤں اُڑ گیا۔ اس کے بعد انھیں ہسپتال لے جایا گیا، پھر میں نے ان کی شکل نہ دیکھی۔

جنگ شروع ہونے کے بعد یاسر عرفات نے اپنے باڈی گارڈ میں سے ایک شخص ابو حسن سلامہ کو "الشیاح" بھیجا کہ وہ تحقیق کرے اور دیکھے کہ جنگ شروع کیسے ہوئی ہے، جب ابو حسن سلامہ "الشیاح" آئے تو میں خود ان کے پاس گیا اور ان سے بات چیت کی۔ میں نے انھیں بتایا کہ میں نے جنگ شروع ہوتے ہوئے دیکھی ہے۔ ابو حسن سلامہ نے "الجبہۃ الشعبیۃ" کو گالیاں دیں۔ اس کے بعد کہا کہ "یہ بدبخت 'سمینوف' کی گولیاں چلاتے ہیں لیکن وہ بے شرم اس کے

جواب میں توپ سے گولہ باری کیوں کرتے ہیں۔" یہ وہ جواب تھا جو کتائب کی حرکت کے ردِعمل کے طور پر غصے کی حالت میں ظاہر ہوا۔ حالانکہ میری نگاہ میں بات یوں نہ تھی۔ کتائب کے لوگ زیادہ طاقتور تھے۔ ان کے پاس توپ تھی وہ توپ کو استعمال کرتے تھے۔ بہرحال ابو حسن سلامہ نے اپنا کام شروع کیا۔ انھوں نے عیسائیوں سے، فوج سے، اور لڑنے والے گروہوں سے رابطہ پیدا کیا اور کوئی ۹ بجے کے قریب "الشیاح" میں جنگ بندی ہو پائی۔ یہ جنگ بندی برقرار تھی کہ رات کے ایک بجے کے قریب میں ایک رضاکار کے ساتھ پہرہ دے رہا تھا جس کا نام حسین حسینی تھا اور جو بعد میں شہید ہو گیا۔ وہ "الشیاح" کا رہنے والا تھا اور ہر شخص کو جانتا تھا۔ ہم لوگ "الشیاح" میں رات کو ایک بجے سڑکوں پر گشت کر رہے تھے کہ ہم نے دیکھا کہ ۶، ۷ افراد بڑی تیزی سے ایک طرف کو جا رہے ہیں۔ ہم نے ان کا پیچھا کیا اور ایک سڑک میں جس کا نام "شارع عبدالکریم الخلیل" تھا پہنچے۔ ہم نے دیکھا کہ ان لوگوں کے پاس ۶۰ ملی میٹر کا ایک چھوٹا سا مارٹر تھا، انھوں نے اسے سڑک کے درمیان میں نصب کیا، بڑی پھرتی سے دو گولے پھینکے اور پھر یہ مارٹر اٹھا کر بھاگ گئے۔ ہم نے انھیں جا لیا اور حسین حسینی نے انھیں پہچان لیا وہ لبنان کی کمیونسٹ پارٹی کے ارکان تھے اور حسین حسینی ان کے مکان اور دیگر خصوصیات سے پوری طرح واقف تھا۔ وہ ۶، ۷ افراد مسلح تھے اور ہم دو اس قابل نہ تھے کہ انھیں گرفتار کر سکتے، اس لیے ہم نے انھیں چھوڑ دیا۔ اس کے بعد ہم نے ابو حسن سلامہ کو پیغام بھیجا کہ ان لوگوں نے عیسائیوں پر دو گولے پھینکے ہیں۔ ابو حسن سلامہ نے انھیں پیغام بھیجا لیکن انھوں نے انکار کیا۔ دس منٹ کے بعد کتائب نے گولہ باری پھر شروع کر دی۔ یہ گولہ باری شروع ہوئی تو رکنے ہی کو نہ آتی تھی۔

جنگ آخر کیوں؟

یہ چند ایک چھوٹے چھوٹے نمونے ہیں جو میرے کام کے دوران میں ٹھوس حقائق کے طور پر ابھرے ہیں اور جن سے پتا چلتا ہے کہ کس طرح فلسطینی مزاحمت جنگ کی روک تھام کرنا چاہتی تھی اور بائیں بازو کے لوگ کیوں کر جنگ کی آگ بھڑکا رہے تھے اور کتائب اسی بات

Presented by: Ziaraat.Com

کا انتظار کرنے تھے کہ جنگ کے شعلے بلند ہوں تاکہ وہ پوری قوت سے مار پیٹ کرسکیں اور بالآخر فلسطینی مزاحمت کو شریکِ معرکہ ہونا پڑے۔ یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ دونوں طرف یہ کیوں ہنگامہ برپا کرنا چاہتی تھیں اور آمادۂ جنگ تھیں۔ ایک طرف دائیں بازو کے لوگ اور دوسری طرف بائیں بازو کے۔ جہاں تک عیسائیوں اور بائیں بازو والوں کا تعلق ہے، ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ زمانۂ قدیم سے ان کو بڑی بڑی مراعات حاصل تھیں۔ جب مسلمانوں نے کچھ ترقی کرلی تو عیسائیوں کو یہ احساس ہوا کہ ان کا ترقی کرنا کتائب کے مفاد کے خلاف ہے اور یہ کہ مسلمان کچھ مطالبات منوانے کے درپے ہیں۔ سید موسیٰ الصدر نے "بعلبک" اور "صور" میں جو مظاہرے کروائے ان سے اس بات کا سراغ ملتا ہے کہ مسلمان اپنے حقوق کے حصول پر تلے ہوئے ہیں لہٰذا اب عیسائیوں کے لیے لازم ہے کہ وہ اپنی حاصل شدہ مراعات کے کچھ حصے سے کنارہ کشی کریں اور ان مراعات کو مسلمانوں کے حوالے کر دیں۔ لیکن وہ اس بات پر تیار نہ تھے کہ مسلمانوں کو ان کے حقوق دیں۔ اس اثنا میں فلسطینی مزاحمت ابھری۔ اس کی ترقی کی بناء پر قدرتی طور پر مسلمانوں کو پشتیبانی حاصل ہوئی اور لبنان کا سیاسی توازن مسلمانوں کے حق میں بدلا۔ اس زمانے میں جب جنگ ابھی شروع نہیں ہوئی تھی تو طاقت کا توازن مسلمانوں کے حق میں تھا یعنی اس تحریک اور اس سیاسی و اجتماعی بیداری کی بناء پر جو مسلمانوں میں بالخصوص شیعوں میں رونما ہوئی تھی اور پھر فلسطینی گوریلوں کا اس کشمکش میں موجود ہونا مسلمانوں کی قوت کے توازن کو بڑھانے کا باعث ہوا۔ عیسائی اس سے سخت پریشان تھے اور وہ ہرگز اس شکست اور اس کمزوری کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔ لہٰذا وہ یہ چاہتے تھے کہ کسی بیرونی طاقت سے تعاون کریں اور مسلمانوں کو ہٹائیں اور ضعیف کر دیں تاکہ یوں وہ اپنی پرانی مراعات کی حفاظت کرسکیں اسی زمانے میں ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اسرائیل بھی اس بات پر تیار تھا کہ فلسطینیوں کے خلاف اقدام کرے تاکہ ان کے خلاف از سرِ نو ایک سازش کھڑی ہوسکے۔ اس بناء پر اسرائیل اور کتائب دونوں کے مفادات میں ہم آہنگی پیدا ہوئی۔ یہ دونوں ایک دوسرے سے تعاون کرتے ہیں اور مسلمانوں کے قتلِ عام کے لیے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ اسرائیل فلسطینیوں کو ختم کرنے کے لیے اور عیسائی تمام مسلمانوں کو زد پہنچانے کے درپے ہوئے تاکہ وہ اپنے حاصل شدہ مراعات کی حفاظت کرسکیں

بلکہ کچھ مزید مراعات حاصل کرلیں، جیسا کہ انھوں نے کیا۔

البتہ یہ بائیں بازو والے کیوں لڑتے ہیں؟ جنبلاط، کمیونسٹ پارٹی کے لیڈر اور دیگر بائیں گروہ، طبقاتی جنگ کے قائل تھے وہ یہ کہتے تھے کہ مزدور طبقے کو سرمایہ داروں کے خلاف مسلح جدوجہد کرنا چاہیے تاکہ وہ انھیں ناپید کرسکیں۔ ہماری نگاہ میں یہ بات بالکل پوچ اور بے معنی تھی اور اس کا سبب یہ تھا کہ مسلمانوں کی طرف یا عیسائیوں کی طرف، دونوں جانب لڑنے والے محرومی کے شکار مزدور طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ یوں نہ تھا کہ عیسائیوں کی طرف صرف سرمایہ دار ہوں کہ لڑ رہے ہوں اور مسلمانوں کی طرف صرف مزدور جنگ آزما ہوں۔ بلکہ یہ جنگ تو مختلف ادیان، مختلف فرقوں اور مختلف نسلوں کے مابین جنگ تھی کہ ایک نسل اور دین سے تعلق رکھنے والے دوسری نسل اور دین سے متعلق لوگوں سے جنگ آزما تھے[1]۔ وہاں یہ مسئلہ زیرِ بحث نہ تھا کہ یہ سرمایہ دار ہیں اور وہ مزدور ہیں۔ لہٰذا کمیونسٹوں کی یہ بات بالکل بے محل تھی کہ یہ جنگ طبقاتی ہے اور ہم طبقات کے لیے لڑ رہے ہیں۔ دوسری بات جس پر جنبلاط بہت زیادہ انحصار کرتے تھے، وہ لبنان کے دستور اور نظامِ حکومت میں تبدیلی کا مسئلہ تھا۔ میں یہ بیان کرچکا ہوں کہ یہ دستور اور یہ نظام مارونیوں اور کتائبیوں کے مفاد میں تھا اور ہماری کوشش یہ ہے کہ ہم اس نظام کو تبدیل کریں اور اسے عادلانہ بنائیں لیکن اس زمانے میں کمال جنبلاط کا یہ نعرہ شعبدہ بازی کے سوا کچھ نہ تھا اور اس کا سبب یہ ہے کہ جب مسلمان پہلے سے زیادہ کمزور ہیں، ایک بین الاقوامی سازش انھیں کچلنے پر تلی ہوئی ہے اور یہ اپنی زندگی تک کے لیے بھی مطمئن نہیں، اس وقت وہ کیوں کر اس قابل ہوسکتے ہیں کہ نئے حقوق حاصل کریں اور نئے مراعات پیدا کریں۔ یہ بات

---

[1] شہید مصطفیٰ چمران نے نسلی آویزش کا ذکر کرکے بڑی گہری تاریخی سوجھ بوجھ کا ثبوت دیا ہے۔ مترجم نے اس سے قبل ذکر کیا ہے کہ لبنان کے عیسائیوں کی اکثریت مارونی اپنے آپ کو عرب شمار نہیں کرتے۔ یہی کیفیت ارمنی عیسائیوں کی ہے اور یہی انداز فکر رومن کیتھولک عیسائیوں کا ہے۔ جہاں تک آرتھوڈوکس عیسائیوں کا تعلق ہے، وہ اپنا رشتہ فنیقیوں (Phoemicians) سے استوار کرتے تھے۔ جمال عبدالناصر کی عرب قومیت کی تحریک کی مخالفت کا ایک بڑا سبب یہی تھا کہ لبنان کے عیسائی اور مصر کے قبطی Coptic عیسائی اپنے آپ کو عرب کہلوانے پر آمادہ نہ تھے۔ اس بناء پر ڈاکٹر چمران کی یہ بات بالکل درست ہے کہ لبنان کی خانہ جنگی کے عوامل میں سے ایک عامل یہ نسلی آویزش بھی تھی۔

Presented by Ziaraat.Com

بے حد بیوقوفی کی آئینہ دار تھی۔ یہ نعرے کھوکھلے تھے۔ دستور کی تبدیلی اور نظامِ حکومت کی تبدیلی، ایسی تبدیلی جو مسلمانوں کے مفاد میں ہو اور عیسائیوں کو جس سے اختلاف نہ ہو اور اسی قسم کی دوسری سکیمیں ان نعروں میں مذکور ہوتی تھیں۔ تبدیلیٔ نظام اور طبقاتی جنگ پر ان نعروں کا انحصار تھا۔

لیکن جس چیز کے بارے میں ہم سوچتے ہیں اس کے دو پہلو ہیں۔ ایک یہ کہ لبنان کی تقسیم سے بائیں بازو کی جماعتوں کا فائدہ تھا۔ عیسائی، لبنان کے عیسائی حصے میں اپنی حکومت بنالیتے تھے اور مسلمان علاقوں پر بائیں بازو کی جماعتیں تسلط حاصل کرلیتی تھیں اور یوں ایک بائیں بازو کی حکومت تشکیل پذیر ہوجاتی تھی۔ روسی حکومت بھی ان کی پشت پناہی کرتی تھی۔ ایسے شواہد موجود ہیں کہ رُوس کی حکومت نے بائیں بازو کی جماعتوں سے یہ مطالبہ کیا تھا کہ وہ لبنان کی ۳ بندرگاہیں "صور" "صیدا" اور "طرابلس" روس کے حوالے کردیں اور اس کے عوض روس مسلمان علاقوں میں قائم ہونے والی کمیونسٹ یا بائیں بازو کی حکومت کی حمایت کرے گا۔ اسی بناء پر کمال جنبلاط یہ بات کہتا تھا کہ مسلمان علاقوں میں اس کی سربراہی میں ایک حکومت قائم ہو۔ اس حکومت کے قیام میں فلسطینیوں کو بھی لالچ نے دلچسپی دکھائی تھی۔ وہ یہ احساس کرتے تھے کہ اگر کمال جنبلاط کی سرکردگی میں بائیں بازو کی ایک حکومت قائم ہوجائے تو فوجی طاقت فلسطینیوں کے ہاتھ میں رہے گی اور یوں انھیں بھی اقتدار میں حصہ مل جائے گا۔ اسی بناء پر جب آپ یہ دیکھتے ہیں کہ لبنان کے سلسلے میں فلسطینی بائیں بازو کی جماعتوں سے تعاون کرتے ہیں تو اس کا سبب یہی ہے کہ حصولِ اقتدار کے لالچ نے انھیں اپنے جال میں گرفتار کیا ہے۔ ان کی خواہش یہ ہے کہ لبنان عیسائی اور مسلمان مناطق میں تقسیم ہوجائے۔ یہ وہ سب سے بڑی دلیل ہے جو ہمارے اس احساس کی بنیاد ہے کہ جنبلاط یا بائیں بازو کی جماعتیں کس کی خاطر لڑتی ہیں۔ ابھی تک بائیں بازو کی حکومت کے قیام کے لاسہ سے وہ آزاد نہیں ہوے اور ابھی تک وہ اسی انداز سے سوچتے ہیں اور اسی کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔ (یہ بات ۱۹۷۸ء تک درست تھی)۔

دوسری بات جس کے بارے میں ہم اپنی رائے دے سکتے ہیں وہ شاید سخت ہو لیکن تجربے سے ہمیں یہی معلوم ہوا کہ بائیں بازو کی جماعتوں کے بہت سے لیڈر خفیہ طور پر اسرائیل کے ساتھ تعاون[1]

[1] اسرائیل کی کمیونسٹ پارٹی اور لبنان کی بائیں بازو کی جماعتوں نیز فلسطینی تنظیموں اور بائیں بازو کے عناصر میں واضح تعاون تھا۔ فلسطینی مزاحمت کا سب سے بڑا شاعر محمود درویش اسرائیلی کمیونسٹ پارٹی کا باقاعدہ رکن تھا۔

کررہے ہیں۔ اسی لیے جب اسرائیل لبنان میں سازش کا ایک جال پھیلانے کے لیے کارفرما ہوتا ہے اس وقت ایک طرف تو کتائب اور دائیں بازو کی جماعتیں اپنا کام دکھانا شروع کردیتی ہیں۔ اسی طرح عین اسی وقت بائیں بازو کی جماعتیں اسرائیل کی ہمنوائی میں گڑبڑ پھیلاتی ہیں۔ ہمارے اس احساس اور تجربے کے مطابق جو ہم نے اس زمانے میں حاصل کیا ہے، بائیں بازو کے بہت سے لیڈروں اور اسرائیل کے مابین بڑے گہرے روابط کا ثبوت ملتا ہے۔ جب ہم نے بائیں بازو کی جماعتوں سے کنارہ کشی اختیار کی اور ان سے الگ ہوگئے تو اس کا سبب یہی تھا کہ ان کی روش کی درستی پر ہمیں اطمینان نہیں تھا۔ ہمیں ہرگز اطمینان نہیں تھا کہ وہ شخص جو آج لڑ رہا ہے اسرائیل کا جاسوس نہیں اور اس کی ایما پر گڑبڑ نہیں پھیلا رہا۔

یہیں سے ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ خانہ جنگی کے ان دونوں مرحلوں میں جن کا ہم نے ذکر کیا ہے، فلسطینی مزاحمت نے جنگ میں شرکت سے گریز کیوں کیا۔ اس کا جواب واضح ہے اور وہ یہ ہے کہ فلسطینی مزاحمت نے پہلے دن ہی سے اسرائیلی سازش کو پالیا تھا یعنی وہ یہ سمجھ گئے تھے کہ اسرائیل چاہتا ہے کہ لبنان میں گڑبڑ ہو تاکہ فلسطینی مزاحمت کو میدان میں اترنا پڑے اور وہ لبنانی فوج اور عیسائیوں کے ساتھ پنجہ آزمائی کریں۔ اس کے بعد فلسطینی مزاحمت کی سرکوبی ہو اور وہ بکھر جائے جیسا کہ بعد کے واقعات نے ثابت کیا۔ یہاں تک کہ وہ اسلحہ دے کر اپنے فوجیوں کو بھیجتا تھا اور علانیہ طور پر یہ کہتا تھا کہ ہمارا اس خانہ جنگی سے کوئی تعلق نہیں۔

یہاں پر یہ بات بڑی اہم ہے کہ بائیں بازو کے بعض لیڈر اسرائیل کے ساتھ روابط کیوں رکھتے تھے۔ اس کے لیے بڑی اہم اسناد موجود ہیں۔ کچھ مدت پہلے لبنان کے عربی روزنامے "النہار" میں ایک رپورٹ چھپی تھی جس میں پیرس میں غسان توینی[1] کی موجودگی میں ہونے والی ایک گفتگو نقل کی گئی تھی جس میں ایک طرف "فتح" کی مجلسِ عاملہ کے ایک رکن خالد الحسن تھے اور دوسری طرف

[1] توینی لبنان کے آرتھوڈوکس عیسائیوں کے گروہ سے تعلق رکھتے تھے۔ روزنامہ "النہار" ان کی ادارت میں چھپتا تھا اور ایک مدت تک وہ لبنان کی کابینہ میں وزیرِ اطلاعات بھی رہے۔ اس اخبار کی پالیسی کھلم کھلا عیسائیوں کے حق میں تھی، عرب نیشنلزم کے اور جمال عبدالناصر کے خلاف تھی اور "لبنانیت" کی پشت پناہی کرتی تھی۔ لاہور میں منعقد ہونے والی مسلمان ملکوں کی سربراہی کانفرنس میں غسان توینی بھی لبنان کے وفد میں موجود تھے۔

Presented by Ziaraat.Com

سے کتائب کے ایک ایڈر ایلی رزق تھے۔ اس گفتگو کا ترجمہ یورپ میں ایرانی طالب علموں نے چھاپ کر تقسیم کیا تھا۔ اس میں ایک مقام پر خالد الحسن نے جو فلسطینی مزاحمت کے لیڈروں میں سے ہیں ذکر کیا ہے کہ ۱۹۵۰ء کے لگ بھگ صیہونیوں نے ایک فنڈ قائم کیا تھا جس کا مقصد فلسطینی لیڈروں کو رشوت دینا تھا۔ جب خانہ جنگی شروع ہوئی تو اس میں سو ملین (دس کروڑ) ڈالر موجود تھے۔ خالد الحسن کے قول کے مطابق اس فنڈ سے فلسطینی لیڈروں کو رشوت دی جاتی تھی تاکہ وہ اسرائیل کے لیے کام کریں۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ فلسطینی لیڈر کون تھے یا یہ کون ہو سکتے تھے؟ یاسر عرفات یا ابوجہاد تو اس قسم کے لوگوں میں نہیں۔ اول تو ان کے پاس پیسہ ہے اور ان کو اس کی ضرورت بھی نہیں۔ دوسرے وہ کہیں بلند ہیں کہ اسرائیل سے پیسے لینے پر راضی ہو جائیں۔ باقی فلسطینی لیڈروں میں وہ کون رہ جاتے ہیں جو اسرائیل سے رشوت لیں اور کس واسطے رشوت لیں۔ اس بناء پر ہم یہ دیکھتے تھے کہ خود فلسطینی مزاحمت کے لیڈروں کے قول کے مطابق اسرائیل بہت سے ایسے فلسطینیوں کو رشوت دیتا ہے جو عہدے رکھتے ہیں اور ان کی کوئی حیثیت ہے۔ اسرائیل ان کو رشوت دے کر تحریک کرتا ہے۔ وہ انھیں آپس میں لڑواتا ہے اور خود فلسطینی مزاحمت کو بھی یہ معلوم ہے کہ وہ لوگ کون ہیں لیکن وہ اسے قرینِ مصلحت نہیں سمجھتے کہ ان کا نام ظاہر کریں۔ لیکن یہ بات طے شدہ ہے کہ فلسطینیوں کے درمیان اسرائیل کے جاسوس بھی کام کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ فلسطینی قیادت میں بھی وہ موجود ہیں اور یہ بات خود خالد الحسن کے بیان سے ثابت ہوتی ہے جو فلسطینی مزاحمت کی مجلسِ عاملہ کے رُکن ہیں۔ (اسرائیل نے لبنان پر جو حملہ کیا ہے اور اس کے بعد لبنان میں جو کچھ ہوا ہے اس سے یہ بات بخوبی روشن ہو جاتی ہے صدام کے ہمنوا "جبہۃ التحریر العربیۃ" کے ارکان نے اپنے جھنڈے تلے شیعیانِ لبنان کے خلاف بے شمار جرائم کا ارتکاب کیا ہے۔ اسرائیل کے جنوبی لبنان پر حملے کے بعد انھوں نے اپنے اسی لباس اور ہتھیاروں سے "صور" میں کھلم کھلا اسرائیل کے مفاد میں غدارانہ حرکتیں کی ہیں۔ بس فرق یہ تھا کہ "جبہۃ التحریر العربیۃ" کے جھنڈے کی بجائے اسرائیل کا ستارۂ داؤد والا جھنڈا ان کے سروں پر سایہ فگن تھا)۔

فلسطینیوں کی سپر:

یہاں ایک اور سوال پیدا ہوتا ہے کہ سیّد موسیٰ الصدر اور "حرکتِ محرومین" نے اپنے آپ کو فلسطینیوں کے لیے سینہ سپر کیوں کیا اور کس حد تک فلسطینی مزاحمت کی حمایت کی۔ چونکہ جنگ میں شامل ہونا فلسطینی مزاحمت کے مفاد میں نہ تھا، سیّد موسیٰ الصدر اور اُن کے ساتھ "حرکتِ محرومین" نے خود جنگ میں شرکت کی تاکہ فلسطینی مزاحمت کی حمایت کر سکیں۔ یہ سوال بہت اہم ہے اور اس کا جواب بڑی طوالت کا طالب ہے لیکن مختصراً یہ کہہ سکتے ہیں کہ سیّد موسیٰ الصدر کو اس امر کا احساس تھا کہ لبنان میں خانہ جنگی کی صورت میں اور اس خانہ جنگی میں فلسطینیوں کی شرکت اور کتائب کے ساتھ ان کی لڑائی سے لبنان کی مشکلات میں اضافہ ہی ہوتا چلا جائے گا اس لیے جس طرح بھی ممکن ہو اس کی روک تھام کی جائے، لازم ہے کہ فلسطینیوں کو خاموش رکھا جائے اور ان کی طرف سے لڑا جائے تاکہ وہ جنگ میں شریک نہ ہوں یہاں تک کہ جب لبنان کے پہاڑی مناطق میں فلسطینی لڑائی میں شریک ہونے تو سیّد موسیٰ الصدر نے انھیں بڑی سختی سے روکا اور کہا کہ یہ کام تمہاری سٹرٹیجی کے خلاف ہے۔ اس سے تمھیں نقصان پہنچے گا اور ہمیں کوئی راہِ نجات نہ مل سکے گی، اور واقعات نے بتایا کہ ایسے ہی ہوا سیّد موسیٰ الصدر اس امر سے بخوبی آگاہ تھے کہ کتائب یہ چاہتے ہیں کہ گڑبڑ ہو اور فلسطینی اس میں شریک ہوں اور اس صورت میں لبنان میں جنگ کے شعلے اتنے بھڑک اٹھیں گے کہ پورا ملک اس کی لپیٹ میں آجائے گا اور اسی بناء پر وہ یعنی سیّد موسیٰ الصدر اس بات کو ترجیح دیتے تھے کہ شیعہ میدانِ جنگ میں اُتر آئیں تاکہ فلسطینیوں کی بلا اپنے سر لیں، کتائب کو ٹھنڈا کریں اور یوں ہونے والے دھماکے کی روک تھام کر سکیں۔ یہ ان کا مقصد تھا اور بڑا مقدس مقصد۔ لیکن یہ مقصد پورا نہ ہو سکا۔ مثال کے طور پر اسی خانہ جنگی کے پہلے مرحلے میں "تل زعتر" اور "ہ کوانہ" میں فلسطینیوں اور کتائب کے مابین جنگ شروع ہوئی لیکن فلسطینیوں کو یہ بات پسند نہ آئی کہ ان کے علاقے میں جنگ ہو اس لیے انھوں نے لڑائی کو "الشیاح" اور "عین الرمانہ" میں منتقل کر دیا یعنی جنگ کا بوجھ شیعوں کے کندھے پر ڈال دیا کیونکہ "الشیاح" شیعہ آبادی کا علاقہ ہے

Presented by Ziaraat.Com

اس کے بعد آپ دیکھتے ہیں کہ اس لڑائی میں اول سے آخر تک شیعہ علاقے ہی جنگ کا مرکز رہے ہیں[1] اور شیعوں ہی نے جانیں قربان کی ہیں۔ دوسرے الفاظ میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں، کہ شیعوں نے اس بات کو قبول کیا کہ جنگ ان کے علاقے میں ہو تاکہ فلسطینیوں اور لبنانیوں یا فلسطینیوں اور کتائب کے مابین لڑائی نہ ہو اور وہ جنگ کی آگ کو جلد بجھا سکیں۔ یہ وہ خیال تھا جو پہلے دن سے سید موسیٰ الصدر کے ذہن میں تھا کہ ہر طریقے سے فلسطینیوں کو جنگ سے دور رکھا جائے تاکہ یوں ایک تو خود فلسطینیوں کی حمایت ہو سکے اور پھر یہ کہ لبنان میں طویل خانہ جنگی نہ ہو پائے۔

یہاں کچھ فلسفیانہ اور تاریخی نکات بھی زیر بحث آتے ہیں جن کا تعلق شیعوں کے موقف سے ہے اور ان تہمت تراشیوں سے ہے جن کی مہم دوسروں نے شیعوں کے خلاف جاری رکھی اور جاری رکھ رہے ہیں۔ یہ بات عام ہے کہ شیعوں کو ہر دشمن کا "ففتھ کالم" شمار کر لیا جاتا ہے اور کوئی ایک شیعہ کوئی غلطی کر بیٹھے تو اس کی بڑے زور شور سے تشہیر ہوتی ہے اور اس پر خیانت اور جاسوسی کی تہمت لگائی جاتی ہے۔ اس لیے تمام لوگوں کے ذہنوں میں یہ بات راسخ ہو چکی ہے کہ شیعہ کا مطلب غدار ہے، شیعہ استعمار کا "ففتھ کالم" ہیں، شیعہ شاہِ ایران کے پٹھو ہیں اس قسم کی تہمتیں اور کچھ اور بھی شیعوں کے خلاف لگائی جاتی ہیں۔ اسی بناء پر جب سید موسیٰ الصدر نے لبنان میں اپنی سرگرمیوں کا آغاز کیا تو ان کا سب سے بڑا دینی اور مذہبی پروگرام یہ تھا کہ شیعوں کو ان تہمتوں سے "ففتھ کالم" ہونے کی تہمت سے، جاسوس ہونے کی تہمت سے، شاہِ ایران کے ہاتھ میں کھیلنے کی تہمت سے، یا کسی اور ملک کا پٹھو ہونے کی تہمت سے نجات دلائی جائے اور دنیا کو شیعوں کے اصلی انقلابی تشخص سے آشنا کرایا جائے۔ سید موسیٰ الصدر نے یہ کام سرانجام دیا اور وہ اس میں کامیاب بھی ہوئے۔ دس سال پہلے شیعوں کو جاسوس اور پٹھو

[1] بیروت میں عیسائی اور مسلمان مناطق کے مابین جو سبز لائن بنائی گئی تھی اس کے ایک جانب عیسائی مناطق تھے اور دوسری جانب مسلمان، جن میں شیعہ مسلمانوں کی اکثریت تھی لیکن غور طلب بات یہ ہے کہ عین الرمانہ اور وادی الجمیل اور دیگر علاقوں میں عیسائی اور مسلم مناطق کی نہ تو جنگ ہوئی اور نہ کوئی سبز لائن ابھری اور ان مسلم مناطق میں شیعہ نہ ہونے کے برابر ہیں۔

اور غدار وغیرہ سمجھا جاتا تھا اور آج لبنان میں شیعوں کو ایک انقلابی گروہ کی حیثیت سے پہچانا جاتا ہے، ایسا گروہ جو مجاہد بھی ہے، قربانیاں بھی دیتا ہے، دیندار بھی ہے اور سب کی نگاہیں شیعوں ہی پر لگی ہوئی ہیں۔ جب آپ یہ دیکھیں کہ دائیں بازو کی جماعتیں اور کتائب شیعوں سے اس قدر نفرت اور حسد کا اظہار کرتے ہیں تو اس کا سبب یہی گردانیے کہ شیعہ اب اپنے آپ پاؤں پر کھڑے ہیں، اب ان میں قدرت و صلاحیت پیدا ہو چکی ہے۔ ان کی باتیں لوگ سنجیدگی سے سنتے ہیں اور ان میں یہ طاقت ہے کہ اس ملک کی تاریخ کے دھارے کا رُخ بدل دیں، اور یہ سب باتیں سید موسیٰ الصدر کی سکیم کے مرہونِ منت ہیں کہ انھوں نے یہ بتایا کہ شیعوں کا بنیادی رول کیا ہے اور یہ رول اس کے بالکل برعکس ہے جو دوسرے بیان کیا کرتے تھے۔

یہ بات بڑی افسوس ناک ہے کہ ان ایام میں ہم بعض اوقات یہ دیکھتے ہیں کہ بائیں بازو کی جماعتیں یا شیعوں کی مخالف جماعتیں یہ کوشش کرتی ہیں کہ شیعوں کو اسرائیل کا ساتھ دینے پر اکسایا جائے یا انھیں کتائب سے وابستہ کیا جائے۔ اس کے ساتھ ہی جب وہ شیعوں کو اسرائیل یا کتائب کی طرف مائل کرانے کی کوشش کرتے ہیں، اخبار انھیں برا بھلا کہنا شروع کر دیتے ہیں کہ یہ جاسوس ہیں، ایجنٹ ہیں، پٹھو ہیں، ان کا خیال رکھو کہ کیا کر رہے ہیں اور یہ کیا کرنے والے ہیں۔

اس سلسلے میں ہم نمونے کے طور پر ایک واقعے کا ذکر کرتے ہیں جو خاصہ تکلیف دہ ہے۔ یہ واقعہ جنوبی لبنان کے ایک شیعہ گاؤں "مارون الرائس" میں پیش آیا۔ یہ گاؤں اسرائیل کی سرحد کے قریب ہے۔ اس کے اور اسرائیلی سرحد کے درمیان سو میٹر سے زیادہ فاصلہ نہیں اور اسرائیل نے ہمیشہ اس گاؤں پر تجاوز کیا۔ اس میں "حرکتِ محرومین" کے بہت سے ارکان بھی رہتے ہیں جو بڑے جنگجو اور بہادر ہیں۔ بائیں بازو کی جماعتیں خانہ جنگی کے دوران میں اس گاؤں پر گولیاں برساتی تھیں۔ انھوں نے ہمارے ایک نوجوان کے پاؤں میں گولی مار کر اسے زخمی کر دیا۔ اخباروں نے انھیں برا بھلا کہنا شروع کر دیا اور کہا کہ یہ جاسوس ہیں اور اسرائیل اس گاؤں کی حمایت میں ہم پر گولہ باری کرتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں انھوں نے وہ سب حالات

Presented by Ziaraat.Com

پیدا کر لیے جن کی بناء پر اس گاؤں کو اسرائیل سے وابستہ دکھایا جائے۔ ایک طرف تو بائیں بازو کی جماعتوں میں موجود اپنے پٹھوؤں کو اسرائیل یہ ہدایت کرتا تھا کہ وہ اس گاؤں پہ گولہ باری کریں اور دوسری طرف وہ بائیں بازو کی ان پارٹیوں کے اڈوں پہ گولہ باری کرتا تھا تاکہ ان گاؤں والوں کو یقین دلایا جائے کہ اسرائیل ان کی حمایت کر رہا ہے۔ بائیں بازو کے اخبارات بھی شور مچاتے تھے کہ دیکھیے یہ لوگ غدار ہیں، جاسوس ہیں، اور اسرائیل کے ساتھ ہمنوا ہیں۔ میں نے فلسطینی مزاحمت کے لیڈروں یاسر عرفات اور ابو جہاد سے اس بارے میں گفتگو کی۔ انھوں نے اس بات سے اتفاق کیا کہ میری یہ بات درست ہے اور یہ بائیں بازو کی پارٹیاں غلط پروپیگنڈہ کر رہی ہیں۔ ان پارٹیوں نے پروپیگنڈے کے ہتھیار کو استعمال کر کے یہ تأثر دیا ہے کہ اس گاؤں کے لوگ اسرائیل کے ایجنٹ ہیں اور یوں انھوں نے اس گاؤں کے لوگوں پر دباؤ ڈالا کہ وہ اسرائیل کی طرف جھکیں، اور اگر نہ بھی جھکنا چاہیں تو ان کو الزام تراشی کے ذریعے اسرائیل کا ہمنوا ظاہر کیا جائے۔ یہ بات فلسطینی مزاحمت کے لیے بھی ضرر رساں ہے، جنوبی لبنان کے لیے بھی اور عام مسلمانوں کے لیے بھی۔ ممکن ہے ان باتوں سے ابلاغ کی حد تک فائدہ حاصل ہو یا سید موسیٰ الصدر اور شیعوں کو کچلا جا سکے لیکن اس سے انقلاب کو ضرر پہنچے گا۔ ہم نے مختلف لوگوں سے رابطہ قائم کر کے اور پوری کوششوں سے کام لے کر بالآخر اس بات کی روک تھام کی کہ اس گاؤں میں سے کوئی شخص کتائب یا اسرائیل سے کسی قسم کا کوئی تعلق رکھے۔ خدا کی عنایت ہے کہ یہ گاؤں آج بھی اسرائیل کے مقابلے میں سینہ سپر ہے حالانکہ بہت سے عیسائی اور دروزی گاؤں اسرائیل کے ساتھ تعاون کر رہے ہیں، لیکن بائیں بازو کے اخبارات ان کے بارے میں کچھ نہیں کہتے۔ ایک ایسے گاؤں کے بارے میں جس نے کبھی اسرائیل کے ساتھ تعاون نہیں کیا، نہ وہاں کے لوگوں کی خواہش ہے، یہ جماعتیں اپنے تمام وسائل استعمال کر کے وہ عوامل مہیا کرتی تھیں کہ یہاں کے لوگ اسرائیل کے ساتھ تعاون کریں تاکہ یوں انھیں برا بھلا کہا جا سکے۔ ان جماعتوں نے اس گاؤں کے لوگوں کے خلاف کیا کچھ نہیں کیا۔ یہاں تک کہ انھوں نے اس گاؤں کے بہت سے لوگوں کو شہید کرنے کے احکام بھی صادر کر دیے اور پھر آہستہ آہستہ خود ان کی سرگرمیاں خود بخود ٹھنڈی پڑ گئیں۔[1] ہم

یہ دیکھتے ہیں کہ شیعوں کے خلاف ایک تاریخی اور فکری سازش رُو بہ پذیر ہے۔ یہ سازش اس وقت زیادہ تیز ہو جاتی ہے جب یہ پتا چلتا ہے کہ شیعہ اس قابل ہیں کہ یکجا ہو سکیں اور انھیں درست قیادت نصیب ہو سکے اور اس کے ذریعے انھیں طاقت حاصل ہو، یا دوسرے لفظوں میں وہ اس قابل ہیں کہ بائیں بازو کی جماعتوں کے ڈھول کا پول کھول دیں۔ اسی بناء پر شیعوں اور ان کے لیڈروں کے خلاف ان لوگوں کی دشمنی بڑھتی چلی جاتی ہے۔ جیسا کہ میں نے گزارش کی ہے یہ مسئلہ بہت دقیق ہے اور اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ اجتماعی، تاریخی اور فکری اعتبارات سے اس پر بحث کی جائے۔

۱۔ ان دنوں اس سازش کے آثار زیادہ واضح ہو رہے ہیں یورپ اور امریکہ کی یونیورسٹیوں میں شیعہ عقائد اور شیعہ ثقافت کا مطالعہ ہو رہا ہے اور تحقیق کرنے والے اس سلسلے میں پاکستان اور ہندوستان کے دورے کرتے ہیں تاکہ یہ دیکھا جائے کہ آخر یہ شیعہ ہیں کس قسم کے لوگ۔

لاہور میں برکلے یونیورسٹی کی جانب سے اردو کی تدریس کا ایک مرکز خاصی مدت سے کام کر رہا ہے جہاں امریکی طالب علم اردو پڑھتے ہیں۔ انقلابِ ایران کی کامیابی کے بعد سے اس مرکز میں تشیع پر لیکچر کروائے جاتے ہیں، اردو مرثیہ پڑھا جاتا ہے، یورپ اور امریکہ کے اخبارات اور رسالوں میں شیعوں کی دہشت پسندی کی داستانیں بیان کی جاتی ہیں۔ اور تو اور پاکستان میں ایک امریکی عیسائی نے یہ فتویٰ دیا تھا کہ آقائے خمینی کو ماننے والے شیعہ کافر و زندیق ہیں اور انھیں اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔ (نعوذ باللہ)

اخبارات میں عمارتیں بنانے والی کمپنیوں سے اشتہار چھپوائے جاتے ہیں جن کا مقصد شیعوں کی صفوں میں پراگندگی پیدا کرنا ہے اور ان خود ساختہ، خود فروش اور اَن پڑھ شیعہ لیڈروں کے قصیدے پڑھے جاتے ہیں جو ہر قیمت پر بکنے کے لیے تیار ہوں۔

Presented by Ziaraat.Com

باب دہم

فوجی حکومت اور اس کے بعد

ان اضطرابات اور چپقلشوں کے بعد رشید الصلح کی حکومت کا خاتمہ ہوگیا کیونکہ وہ عملی طور پر کوئی مثبت کام کرنے پر قادر نہ تھے۔ فوج، پولیس اور بلدیاتی حکام ان کی اطاعت نہ کرتے تھے اور خود اس کی حکومت نے بھی اپنے آپ کو بائیں بازو کے لوگوں کی تقلید میں مفلوج کر رکھا تھا۔ متشدد قسم کے بائیں بازو کے لیڈروں نے جن کی سربراہی کمال جنبلاط کر رہے تھے، یہ مطالبہ کر رکھا تھا کہ حزبِ کتائب کو سیاست کے میدان سے خارج کر دیا جائے اور کتائب نے بھی یہ چیلنج کر رکھا تھا کہ اگر حکومت ہمارے بغیر لبنان میں انتظامات کر سکتی ہے تو بسم اللہ کرے۔ کتائب کے بندوق بردار جب چاہتے سڑکوں پر ٹریفک کا نظام درہم برہم کر دیتے اور شہر میں غیر معمولی حالات پیدا کر دیتے۔ وزارت کے خاتمے کے بعد تمام کاروبارِ حکومت لبنان کے صدر سلیمان فرنجیہ کے ہاتھ میں آ چکا تھا جسے خود فلسطینی مزاحمت اور مسلمانوں کی دشمنی میں ید طولیٰ حاصل تھا۔ اس مایوس کن صورتِ حالات میں کسی کو یہ جرأت نہ ہوتی تھی کہ وہ حکومت کی ذمہ داری قبول کرے کیونکہ کتائب کی موافقت کے بغیر عملی طور پر امن و امان قائم کرنا ممکن نہ تھا۔ مسلمانوں کی طرف سے وزیرِ اعظم کے عہدے کے لیے ایک ہی امیدوار تھے اور وہ رشید کرامی تھے۔ رشید کرامی ایک قدیم سیاستدان اور پختہ کار شخصیت ہیں جو ۱۹۵۸ء کے بحرانی دور میں بھی وزیر اعظم بنے تھے اور ان کا شمار لبنان کے سربرآوردہ سیاستدانوں میں ہوتا ہے لیکن لبنان کے صدر سلیمان فرنجیہ کی ان سے بنتی نہ تھی اور وہ نہیں چاہتے تھے کہ رشید کرامی حکومت بنائے۔ اس لیے انھوں نے ایک ریٹائرڈ فوجی جنرل کو حکومت بنانے پر مامور کیا جس نے لبنان پر تسلط حاصل کرنے کے لیے فوجی حکومت تشکیل دی۔ اب فوج، پولیس اور شہری پولیس

نے کتائب کے ساتھ مل کر مزاحمت کے مراکز یعنی شیعہ علاقوں پر حملہ کیا۔ شیعہ محلوں خصوصاً "الشیاح" پر توپوں اور مارٹروں کی گولہ باری نے ایک طوفان کی شکل اختیار کر لی۔ الشیاح کے بے گناہ لوگوں کے گروہوں کے گروہ اس گولہ باری کا نشانہ بنے اور اپنے مکانوں کے ملبے میں مدفون ہو گئے۔ یاسر عرفات فوجی حکومت سے خائف تھے اور انھوں نے سیّد موسیٰ الصدر سے کہا کہ شاید اردن کی داستان دہرائی جائے۔ سیّد موسیٰ الصدر نے کہا کہ ہمیں ختم کیے بغیر ممکن نہیں۔ یاسر عرفات بیش از پیش پریشانی کا اظہار کرتے رہے اور انھوں نے کہا کہ فوج یا حکومت کے ساتھ کسی قسم کا تصادم نہیں چاہتے۔ یاسر عرفات نے سیّد موسیٰ الصدر سے درخواست کی کہ وہ سیاسی مظاہرات کے ذریعے سے فوجی حکومت کو ختم کریں۔ آقائے صدر نے وعدہ کر لیا اور اہلِ سنت کے لیڈر مفتی حسن خالد اور دروز کے مذہبی رہنما شیخ عقل (محمد ابی شقراء) کے تعاون سے ایک میٹنگ بلوائی جس میں ایک ریزولوشن پاس ہوا جس میں کہا گیا تھا کہ جب تک فوجی حکومت ختم نہیں ہوتی وہ ہڑتال کریں گے۔ پورے لبنان میں یہ ہڑتال جاری ہو گئی۔ یہاں تک کہ ایک شیعہ فوجی افسر نے جو فوجی حکومت میں وزیر تھا "المجلس الاسلامی الشیعی الاعلیٰ" کے دفتر میں سیّد موسیٰ الصدر کو ٹیلیفون کیا اور کہا کہ وہ ان سے گفتگو کرنا چاہتا ہے لیکن سیّد صدر نے انکار کر دیا اور کہا کہ وہ نئی حکومت کو تسلیم نہیں کرتے۔ ہڑتال جاری رہی اور ۴ دن کے بعد فوجی حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔ یہ کارنامہ شیعوں کے اس عظیم لیڈر کی فلسطینی انقلاب کی حمایت میں ایک بہت بڑی فتح تھی۔

یہاں ایک بات قابلِ توجہ ہے اور وہ یہ کہ جب رات کو فوجی حکومت کے قیام کا اعلان ہوا اور فوج، پولیس اور کتائب کے دستوں نے شیعہ علاقوں پر وحشیانہ حملہ کیا۔ فلسطینی گوریلوں نے یاسر عرفات کے حکم سے اپنے آپ کو پیچھے رکھا اور شیعہ علاقوں کے نزدیک اپنے مرکز کو خالی کر دیا۔ اب یہ افواہ اڑی کہ کتائب نے پروگرام بنایا ہے کہ اس رات وہ "الشیاح" اور اس کے اردگرد کے علاقوں پر قبضہ کر لیں۔ بائیں بازو کے گوریلوں نے جب یہ دیکھا کہ فلسطینی مزاحمت کے لوگ پیچھے ہٹ گئے ہیں تو وہ بھی غائب ہو گئے اور میدان کو خالی چھوڑ دیا اور یوں انھوں نے ثابت کیا کہ فلسطینی مزاحمت کی حمایت کے بغیر وہ صفر ہیں۔ اس رات "الشیاح" پر

Presented by Ziaraat.Com

کتائب اور فوج کا حملہ متوقع تھا اور "الشیاح" کی سڑکیں اس حملے کے مقابلے میں کسی پاسبان کے بغیر تھیں۔ بائیں بازو کی جماعتوں کے تقریباً ۵۰۰ مسلح افراد راہ فرار اختیار کر چکے تھے۔ اس وقت اس علاقے پر ایک عجیب وحشت وخوف طاری تھا۔ "الشیاح" کی عورتیں اور بچے اس علاقے سے دور جارہے تھے اور یوں معلوم ہوتا تھا گویا منگولوں کا حملہ ہونے والا ہے۔ پہلی بار لوگوں کی عزت و آبرو کی حفاظت کے لیے اپنی ذمہ داری کو محسوس کرتے ہوئے "حرکۃ المحرومین" کے رضاکار میدان میں اترے۔ انھوں نے "الشیاح" کی بڑی اور چھوٹی سڑکوں پر رکاوٹیں کھڑی کر دیں اور صبح تک کتائب کی گولہ باری کا مقابلہ کیا۔ سب سے بڑا معرکہ شارع اسعد الاسعد میں پیش آیا۔ اس میں ابتدا میں بائیں بازو کے ۳۰ سے زیادہ افراد دفاع کے لیے موجود تھے لیکن وہ سب کے سب بھاگ گئے اور وہاں ایک ۶۰ سالہ بوڑھا باقی رہ گیا جس کا گھر وہیں تھا اور اس نے یہ طے کر رکھا تھا کہ اپنے پیاروں کو مرتے دیکھنے سے پہلے خود مر جائے گا۔ "حرکۃ المحرومین" کے مسلح رضاکاروں نے بڑی بہادری اور دلیری سے "الشیاح" کا دفاع کیا اور اس علاقے کے بے بس لوگوں کی امیدوں کا مرکز بن گئے۔

غیر جماعتی حکومت :

سیاسی پارٹیوں کے خلاف نفرت اس قدر بڑھ گئی تھی کہ اب لوگوں نے اس بات کا مطالبہ کیا کہ غیر جماعتی بنیادوں پر حکومت بنے۔ ان حالات میں حکومت کا قیام مشکل تھا کیونکہ مسلمان اس بات پر تیار نہ تھے کہ وزارت میں کتائب کی شرکت قبول کریں اور کتائب بھی ہنگامہ کرتے تھے اور حکومت کے قیام کی اجازت نہیں دے رہے تھے اور وقت بھی اتنا موجود نہ تھا کہ موجودہ مشکلات کو حل کیا جائے اور تخریب کاروں کو قرار واقعی سزا دی جائے اس لیے سید موسیٰ الصدر نے رائے عامہ کو پیش نظر رکھ کر یہ تجویز پیش کی کہ ایک مختصر وزارت قائم ہو جس میں دائیں یا بائیں بازو کی کوئی جماعت شریک نہ ہو تاکہ یہ وزارت ایسے سازگار حالات پیدا کر سکے جس میں درست حکومت قائم ہو سکے۔ لیکن کتائب نے اس مختصر حکومت کے

نظریے کو بڑی شرارت سے رد کر دیا اور فسادات بڑھتے چلے گئے۔

اس مشکل کو حل کرنے کے لیے اور کتائب کی رضامندی کے حصول کی خاطر یاسر عرفات اور سید موسیٰ الصدر نے لبنان کے سابق صدر اور "حزب الاحرار" کے لیڈر کمیل شمعون سے ملاقات کی اور اسے اس بات پر راضی کر لیا کہ وہ اس "مختصر وزارت" میں شرکت کرے۔ وہ اس بات پر راضی ہو گیا لیکن کتائب کے گرگ باراں دیدہ پیئر الجمیل نے ایک بار پھر ایسی وزارت کے قیام کا نظریہ رد کر دیا اور اس نے کہا کہ وہ کسی ایسے شخص کو اپنا نمائندہ تسلیم نہیں کرتا جو کتائب سے باہر ہو، حتیٰ کہ کمیل شمعون کو بھی۔ اس بات کی بنا پر کمیل شمعون اور پیئر الجمیل میں مخالفت بڑھ گئی اور یہ بات مسلمانوں کے حق میں تھی۔

اب کتائب نے بھی مصالحت کی تجویز پیش کی اور کہا کہ فلسطینی مزاحمت اور کتائب دونوں ایک دوسرے کی دشمنی سے گریز کریں۔ فلسطینی مزاحمت نے اس بات پر رضامندی کا اظہار کر دیا لیکن کتائب اب بھی راضی نہ ہوے اور وہ یہ مطالبہ کرتے تھے کہ ان کا نمائندہ "مختصر وزارت" میں شریک ہو اور یہ بات عوام کو قبول نہ تھی۔

سید موسیٰ الصدر کی بھوک ہڑتال :

جیسا کہ بیان ہو چکا ہے سیاسی اور عسکری مشکلات نے لبنان کی زندگی کو ایک بنیادی خطرے میں ڈال رکھا تھا۔ بائیں بازو کی پارٹیاں ہر قسم کی شرارت کرنے سے گریز نہ کرتی تھیں اور کتائب بھی مسلمان مناطق کو بالخصوص شیعہ مناطق کو بھاری اسلحے کا نشانہ بنانے سے باز نہ آتے تھے۔ یہاں تک کہ کتائب کے ساتھ فوج اور پولیس کے دستے، نیز ٹینک اور توپیں بھی مسلمانوں کو اپنا ہدف بناتی تھیں۔ حادثہ عین الرمانہ سے اب تک (بھوک ہڑتال کی ابتدا یعنی ۲۷ جنوری ۱۹۷۵ء تک) مرنے والوں کی تعداد ۲،۶۴۵ تھی اور کوئی ۱۹،۰۰۰ کے قریب لوگ زخمی ہوئے تھے جن میں سے اکثریت یعنی ۹۵ فیصد سے زائد شیعہ تھے۔ یاسر عرفات اور سید موسیٰ الصدر کی سیاسی قرار دادیں، بائیں بازو کی جماعتوں اور کتائب کے ہاتھوں ہونے والی مجرمانہ خراب کاریوں پر اثر نہ ڈال سکیں۔ بہر حال جنگ بندی کے احکام صادر ہوتے تھے

Presented by Ziaraat.Com

بائیں اور دائیں بازو کے لیڈروں نے قبول کر لیا۔ لیکن اس کے فوراً بعد ہی ایک معمولی سی بات پر دوبارہ جھگڑا شروع ہوگیا۔ عیسائیوں کی اکثریت کتائب کے ساتھ تھی اور بائیں بازو کی جماعتیں ہر عیسائی کو، قطع نظر اس کے کہ وہ کتائبی ہے یا غیر کتائبی یا غیر مارونی، یا مارتے یا گرفتار کر لیتے۔ عیسائیوں کی اکثریت اپنے جان و مال کی حفاظت کے لیے کتائب کی پناہ میں چلی جاتی ان سے اسلحہ لیتے اور اپنے آپ کو کتائب کی فوجی اور تنظیمی طاقت کے حصار میں محفوظ کر لیتے۔ یوں کتائب نے عیسائیوں میں اپنا ایک مقام پیدا کر لیا جو اب عیسائیوں کے حامی شمار ہونے لگے تھے۔ اسلام کے خلاف پروپیگنڈہ زوروں پر جاری تھا۔ حتیٰ کہ جناب سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی ذاتِ گرامی کے بارے میں بھی اہانت سے کام لیا جاتا۔ یہ لوگ مسلمانوں کو پکڑ لیتے اور اُن کو مار پیٹ کر مجبور کرتے کہ حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی ذاتِ اقدس کے بارے میں گستاخی کا ثبوت دیں اور جو ایسا نہ کرتا اسے مار دیا جاتا۔ مذہبی جنگ شروع ہو چکی تھی، کتائب لبنان کے اندر اور باہر رہنے والے عیسائیوں کے جذبات سے کھیلتے تھے اور فائدہ حاصل کرتے۔ یورپ، امریکہ اور دیگر ممالک کے عیسائیوں کی پروپیگنڈا مشینری، لبنان کی عیسائیت یا کتائب کے مفاد میں استعمال ہو رہی تھی اور کتائب اسے اپنی بہت بڑی سیاسی کامیابی تصوّر کرتے تھے۔ تمام راہیں بند ہو چکی تھیں۔ بائیں بازو کی جماعتیں اپنی حرکتوں سے تخریب کاری سے باز نہ آتیں اور لڑائی کی آگ بھڑکاتی رہتیں اور یہ چاہتیں کہ تمام مسلمان قوتیں ان کے پیچھے چلیں اور وہ انھیں اپنی پارٹیوں کے مفاد کے لیے استعمال کریں۔ یہاں تک کہ وہ یہ بھی چاہتیں کہ لوگوں کے جذبات کو بھڑکا کر یاسر عرفات اور فلسطینی مزاحمت کو بھی جنگ کی لپیٹ میں لے آئیں اور اس سے اپنا سیاسی مفاد حاصل کریں۔ کتائب بھی اپنے ذاتی مفاد کی خاطر فرقہ وارانہ لڑائی کی آگ کو ہوا دیتے، اپنی سیاسی اور فوجی قوت کو بڑھانے کے لیے اس جنگ سے فائدہ اُٹھاتے، بے گناہ لوگوں کو قتل کرنے اور محروم لوگوں کو گھر سے بے گھر کرنے میں کسی کوشش سے دریغ نہ کرتے۔

ایک اور بات جو بڑی دردناک اور وحشیانہ ہے اسے لبنان میں "قتل علی الھویۃ" یعنی شناختی کارڈ کی بناء پر قتل کہتے ہیں اور بائیں اور دائیں بازو کی جماعتیں اس قسم کے کام

میں ملوث تھیں۔ عیسائی مناطق میں انھوں نے مسلمانوں کو مارنا شروع کیا۔ انھوں نے سڑکوں پر رکاوٹیں کھڑی کر دی تھیں اور جو کوئی مسلمان ان کے ہتھے چڑھتا اسے مار دیتے اور یہ نہ دیکھا جاتا کہ وہ کس گروہ سے تعلق رکھتا ہے۔ مسلمان مناطق میں بائیں بازو کی جماعتوں نے بھی حرکت کرنا شروع کر دی۔ وہ بھی ہر عیسائی کو پکڑ لیتے اور مار دیتے۔ بیروت کی ایک سڑک "کورنیش المزرعۃ" پر ایک عیسائی جا رہا تھا جو ارمنی تھا اور فلسطینی مزاحمت کا رکن تھا۔ بائیں بازو والوں نے اسے پکڑ لیا، مارا پیٹا اور قتل کا اہتمام کیا۔ اس دوران میں اس نے بہت شور مچایا کہ میں تو فلسطینی مزاحمت کا رکن ہوں، یہ میرا شناختی کارڈ ہے، میں فلسطینیوں کے ساتھ مل کر لڑ رہا ہوں۔ لیکن وہ اس کی کوئی بات سننے کو تیار نہ تھے۔ اس شخص کے نالہ و فریاد کی بناء پر انھوں نے اسے قتل تو نہ کیا کیونکہ وہ فلسطینی مزاحمت کا رکن تھا، لیکن اسے اس قدر زد و کوب کیا کہ وہ بے چارہ بے حال ہوگیا، اس کا منہ سر سُوج گیا اور اسے ہسپتال میں داخل ہونا پڑا۔

یہ بڑی وحشیانہ سرگزشت ہے۔ مثال کے طور پر وہ کسی بچے کو پکڑ لیتے، اس کے ٹکڑوں کو ایک تھیلے میں ڈال کر اس کی ماں کے پاس بھیج دیتے۔ جب اس کی ماں اور محلے دار اس بچے کے جسم کے ٹکڑے دیکھتے تو ان میں غصے کی آگ بھڑک اُٹھتی اور وہ بھی اپنے مخالف فرقے کے کسی شخص کو قتل کرنے کے درپے ہو جاتے۔ یہ بات ان سازشوں میں سے ایک تھی جو اسرائیل لبنان میں فرقہ وارانہ جنگ کی آگ بھڑکانے کے لیے کرتا تھا۔ یہ قتل و غارت ناقابلِ تصوّر۔ عورتوں کو، مردوں کو پکڑ لیا جاتا اور ان کے جسم کے اعضاء کاٹ دیے جاتے اور آخر کار انھیں اذیت دے کر مار دیا جاتا اور پھر ان کی لاشوں کو اُن لوگوں کے سامنے رکھ دیا جاتا جن کا تعلق ان کے مذہب سے ہوتا تاکہ وہ دیکھیں کہ اس مسلمان یا عیسائی کے ساتھ کیا ہوا ہے اور پھر وہ خود کسی مسلمان یا عیسائی کے ساتھ وہی حرکت کریں۔ اس عمل کو "قتل علی الھویۃ" کہا جاتا تھا۔ یہ وہ ایک سبب تھا جس نے لبنان میں فرقہ وارانہ لڑائیوں کی آگ کو بھڑکایا اور عیسائیوں کو مجبوراً کتائب کی جھولی میں لا ڈالا۔ یہ کتائب پہلے طاقتور نہ تھے، سارے عیسائی کتائب کے ہمنوا نہ تھے، حتیٰ کہ ان کی بہت بڑی تعداد کتائب کے

Presented by Ziaraat.Com

خلاف تھی۔ لیکن جب اس طرح کا کشت و خون شروع ہوا تو ہر عیسائی اپنی جان بچانے کے لیے خود کتائب کے پاس گیا اور ان سے اسلحہ لیا، یوں مسلح ہو کر اپنی مدافعت شروع کی۔ اور حزبِ کتائب کا رکن بن گیا۔ اسی بناء پر ہم یہ دیکھتے ہیں کہ "قتل علی الھویۃ" وہ اہم ترین سازش تھی جس نے کتائب کو طاقتور اور منظم بنا دیا اور تمام عیسائیوں کو کتائب کے جھنڈے تلے جمع کر دیا۔ ایک اور بات جو زیادہ دُور رس نتائج کی حامل ہے وہ یہ تھی کہ بیروت میں عیسائی مسلمانوں کو مار رہے تھے اور مسلمانوں سے کچھ بن نہیں پڑتا تھا تو "وادی بقاع" اور جنوبی لبنان کے دُور اُفتادہ عیسائی دیہات میں انھوں نے عیسائیوں کو مارنا شروع کر دیا۔ دوسرے الفاظ میں بائیں بازو کی جماعتوں نے ان دُور افتادہ گاؤں میں عیسائیوں کو جو مارا تو اس کا بہت بُرا ردِ عمل ظاہر ہوا اور یوں ان دُور افتادہ مقامات کے عیسائی بھی کتائب کے جھنڈے تلے جمع ہو گئے۔

اسی قسم کے ایک افسوسناک واقعے کے سلسلے میں سید موسیٰ الصدر "بعلبک" تشریف لے گئے تاکہ وہ اس فرقہ وارانہ کشت و خون کی روک تھام کر سکیں۔ انھوں نے اپنا مشہور فقرہ کہا کہ "اگر بیروت میں میرے بیٹے کو قتل کر دیا جائے تو بھی میں اس کی اجازت نہ دوں گا کہ بعلبک میں ایک بے گناہ عیسائی کو مارا جائے، کیونکہ ان دونوں کا آپس میں کوئی تعلق نہیں"۔ اس جملے کی بناء پر بائیں بازو کی جماعتوں اور ان کے اخبارات نے سید موسیٰ الصدر کو بے تحاشا سب و شتم کا نشانہ بنایا کہ وہ عیسائیوں کی حمایت کیوں کرتے ہیں، ان کے قتل سے گریز کیوں کرتے ہیں، وہ عیسائیوں کے پٹھو ہیں۔ یہ باتیں لبنان کی موجودہ تاریخ کا ایک دردناک باب ہیں۔ بہرحال ان حادثات کی بناء پر کتائب قوی سے قوی تر ہوتے چلے گئے، مسلمانوں کی کمزوری میں ہر روز اضافہ ہوتا چلا گیا اور جنگ بیش از پیش تیز ہوتی چلی گئی۔ خانہ جنگی کے اس مرحلے پر سید موسیٰ الصدر مجبور ہو گئے کہ جنگ بندی کرانے کے لیے بھوک ہڑتال کریں۔ انھوں نے مجبور ہو کر مسجدِ عاملیہ کا رُخ کیا اور بھوک ہڑتال کا اعلان کر دیا۔ یہ بھوک ہڑتال فساد انگیزی، قتل و غارت، نیز دائیں اور بائیں بازو کے لوگوں کی مفاد پرستی کے خلاف تھی۔ سید موسیٰ الصدر نے محسوس کیا کہ اس مسئلے کو ایک نئے طریقۂ کار سے ختم کیا جائے کیونکہ "حرکۃ المحرومین"

کے شریکِ جنگ ہونے سے صورتِ حالات بہتر ہونے کی توقع نہ تھی۔ کتائب کے مقابلے میں خاموش رہنا ممکن نہ تھا، دائیں اور بائیں بازو والوں کی شرارت پسندی کی روک تھام بھی ممکن نہ تھی کیونکہ ان حالات میں اس قسم کی ہر روک تھام مسلمانوں کے خلاف جاتی تھی علاوہ ازیں فلسطینی مزاحمت کا پلہ کتائب اور بائیں بازو کی جماعتوں پر بھاری تھا لیکن وہ یہ نہیں چاہتی تھی کہ وہ شریکِ معرکہ ہو کیونکہ اسے اپنی بقاء کا مسئلہ درپیش تھا۔

خونریزی کو ختم کرنے کے لیے سید الصدر کی بھوک ہڑتال کے اعلان نے پورے لبنان کو لرزا دیا۔ غیر کتائبی عیسائی ہوش میں آئے اور انھوں نے اس بات کا احساس کیا کہ سب مسلمان جنگ کے خواہاں نہیں اور کتائب کا یہ پروپیگنڈہ کہ مسلمان بربریت سے کام لے رہے ہیں، عیسائیوں کو مار پیٹ رہے ہیں اور انھیں سمندر میں پھینک رہے ہیں، بالکل بے بنیاد ہے۔ لہٰذا انھوں نے اس بات کو ضروری نہ گردانا کہ گونگے اور بہرے بن کر کتائب کے سیاسی پروگرام کی پیروی کریں یا اپنے آپ کو کتائب کے حوالے کر دیں۔

لیکن بائیں بازو کی وہ جماعتیں، جو غیر ملکی حکومتوں سے وابستہ تھیں، اور کمال جنبلاط اس پر سخت ناراض ہوئے۔ انھوں نے سید صدر کے خلاف بے شمار بیانات داغے اور ان سے مطالبہ کیا کہ مسجد میں بھوک ہڑتال کی بجائے "الشیاح" کے محاذِ جنگ میں آئیں اور لڑائی میں حصہ لیں۔ یہاں تک کہ بائیں بازو کی بعض جماعتوں نے اپنے پروردہ لوگوں کو مسجد میں بھی بھیجا تاکہ وہ لوگوں کے درمیان سید موسیٰ الصدر کے خلاف تحریک شروع کر دیں اور انھیں مسجد سے باہر نکلنے پر مجبور کریں۔

سید موسیٰ الصدر نے حسبِ ذیل مطالبات کا اعلان کیا:

۱ - تمام اطراف خونریزی ختم کریں اور جنگ بندی قبول کریں۔

۲ - "مختصر حکومت" کو مان لیا جائے جس میں دائیں بازو اور بائیں بازو کی کوئی جماعت شریک نہ ہو۔

۳ - ایک تحقیقاتی کمیشن مقرر ہو جو مجرمین کے بارے میں اپنی رپورٹ تیار کرے اور سزائیں تجویز کرے۔

Presented by Ziaraat.Com

۴ - ایک تحقیقاتی کمیشن ان نقصانات کا جائزہ لے جو لوگوں کو برداشت کرنا پڑے ہیں اور اُن کا معاوضہ تجویز کرے -

۵ - ایک تحقیقاتی کمیشن محرومین کے مطالبات کا جائزہ لے کر اپنی رپورٹ پیش کرے -

اس کے ساتھ ہی انھوں نے یہ کہا کہ جب تک یہ مطالبات پورے نہیں ہوتے وہ بھوک ہڑتال جاری رکھیں گے -

لوگوں کے گروہوں نے مسجد میں آنا شروع کیا تاکہ وہ بھی بھوک ہڑتال میں شامل ہو جائیں ۔"بعلبک" اور جنوبی لبنان سے ہزارہا اشخاص بیروت میں آنا شروع ہوئے ۔ہوسِ اقتدار کے مارے ہوئے لوگ تخریب کاری پر آمادہ تھے ۔مسجد میں اور سیّد موسیٰ الصدر کے پاس لوگوں کا جمع ہونا اُن کی مصلحت کے خلاف تھا ۔انھوں نے پٹرول سٹیشنوں پر پٹرول کی فروخت بند کردی تاکہ کوئی شخص باہر سے بیروت نہ آسکے ۔ ریڈیو سے بار بار اعلان ہوتا تھا کہ تمام سڑکوں پر بندوقچی مسلّط ہیں اور جو شخص گھر سے باہر نکلے گا اس کے لیے موت یقینی ہے - اس کے باوجود ہزارہا افراد مسجد میں آئے اور انھوں نے سیّد موسیٰ الصدر اور ان کے پروگرام کی پُرزور حمایت کی -

لبنان کے عیسائی بھی حرکت میں آئے ۔بھوک ہڑتال کے ایک روز بعد ارمنی جماعت "داشناک" نے جو پہلے کتائب کی طرفدار تھی، سیّد موسیٰ الصدر کے "مختصر حکومت" کے قیام کی تجویز کی حمایت کا اعلان کردیا ۔ دوسرے دن عیسائیوں کے بعض مذہبی رہنماؤں نے اپنے اپنے گرجوں میں بھوک ہڑتال کی اور بعض مسلمان بھی اس میں شریک ہوگئے ۔ تیسرے دن عیسائیوں کے بعض مذہبی رہنما اور سربرآوردہ لوگ مسجد میں آئے اور انھوں نے اپنی حمایت کا اعلان کردیا، یہاں تک کہ چند ایک نے بھوک ہڑتال میں بھی شرکت کی ۔بھوک ہڑتال کی بنا پر سیّد الصدر کے جسم پر کمزوری واضح تھی اور وہ بڑی مشکل سے اپنے آپ کو سنبھال رہے تھے - ان سے ہلا بھی نہیں جا رہا تھا ۔پورے لبنان میں ایک ہیجان برپا تھا، لوگوں کے گروہ کے گروہ گولیوں کی بارش میں مسجد میں آتے اور اپنی وفاداری کا اعلان کرتے ۔ تمام گروہوں کے مذہبی رہنما اور لبنان

کے سربرآوردہ لوگ مسجد میں آئے اور انھوں نے اپنی حمایت کا اعلان کیا ۔ اہلِ سنّت کے دینی رہنما مفتی حسن خالد، بہت سے عیسائی لیڈر، یاسر عرفات اور فلسطینی مزاحمت کے دیگر ذمہ دار افراد، حتیٰ کہ سوریا کے وزیر خارجہ بھی سیّد موسیٰ الصدر کی طرفداری میں ان سے ملنے مسجد میں آئے ۔ اس دوران میں گولیاں بھی چلتی رہیں اور خونریزی بھی ہوتی رہی ۔ لبنان کی کمیونسٹ پارٹی نے مسجد کے قریب ایک جگہ اپنا اڈا جمایا اور بغیر کسی سبب یا ہدف کے گولیاں برساتی رہی ۔ یہ گولیاں زیادہ تر اس وقت چلتیں جب سیّد الصدر مسجد میں تقریر کر رہے ہوتے تاکہ کوئی ان کی آواز نہ سُن سکے ۔ کتائب نے بھی مسجد کی جانب کو اپنے مارٹروں کی زد میں لے لیا ۔ان کے دو راکٹ مسجد کے قریب آگرے جس سے مسجد کے در و دیوار لرز اُٹھے -

بائیں بازو کی جماعتیں چھیڑ خانی کرتی رہیں ۔ وہ سیّد صدر پر طعن و تشنیع کی بارش کرتی تھیں اور کہتی تھیں کہ "تم نے تو "السلاح زینۃ الرجال" (اسلحہ مردوں کی زینت ہے) کا نعرہ لگایا تھا تو اب لڑتے کیوں نہیں " سیّد موسیٰ الصدر اس کے جواب میں کہتے تھے کہ "حرکۃ المحرومین" کے جوان سب سے پیش پیش ہیں اور دشمن کے مقابلے میں پہلی صف میں موجود ہیں ۔لیکن وہ اپنے علاقوں کی مدافعت کے لیے موجود ہیں، نہ کہ فساد و شرانگیزی کے لیے ۔ چونکہ یہ شرانگیزی، یہ فساد اور یہ خانہ جنگی استعمار اور اسرائیل کی ساختہ پرداختہ ہے اس لیے ہم نہیں چاہتے کہ ان کے آلۂ کار بنیں ۔ کشت و خون کے خلاف تحریک تیزی پکڑ گئی اور کتائب کو احساس ہوا کہ عیسائی گروہ یکے بعد دیگرے ان کی صفوں سے خارج ہو رہے ہیں اور وہ اکیلے رہ گئے ہیں ۔ ہر دن جو یوں گزرتا تھا کتائب کو عیسائیوں کے غم و غصہ کا نشانہ بنا تا جا رہا تھا ۔ لہٰذا انھوں نے سیّد الصدر کے نظریے کو قبول کیا، جنگ بندی پر راضی ہوگئے اور کتائب کے بغیر "مختصر حکومت" کی تجویز کے سامنے سرِ تسلیم خم کردیا -

مسلمانوں کی طرف سے رشید کرامی وزیرِ اعظم کے عہدے کے امیدوار تھے ۔ ہر چند کہ بائیں بازو کی جماعتیں اور کمال جنبلاط ان کے مخالف تھے تاہم انھیں موسیٰ الصدر اور یاسر عرفات کی پشت پناہی حاصل تھی ۔ لبنان کے صدر سلیمان فرنجیہ اور رشید کرامی میں پرانی دشمنی تھی اور وہ چاہتا تھا کہ ہر قیمت پر انھیں وزیرِ اعظم نہ ہونے دے لیکن عوام کے روزافزوں

Presented by Ziaraat.Com

دباؤ اور کتائب کے مان جانے سے وہ بھی راضی ہو گیا۔ بھوک ہڑتال کے چوتھے دن رشید کرامی وزیر اعظم بن گئے اور بیروت کے شہر کو آرام و سکون میسر آیا۔

رشید کرامی، یاسر عرفات اور عبدالحلیم خدام جو سوریا کے وزیر خارجہ تھے اور حافظ الاسد کی طرف سے جنگ بندی کے لیے بیروت آئے ہوئے تھے، ان سب نے سید موسیٰ الصدر سے درخواست کی کہ وہ بھوک ہڑتال چھوڑ دیں اور یہ کہ وہ باقی مطالبات کے پورا ہونے کے ضامن ہیں۔

بعلبک سازش کی آگ میں:

بھوک ہڑتال کے دوسرے دن سے بعلبک شدید ہیجان اور احتجاج کا مرکز بنا ہوا تھا۔ بعلبک کے شیعہ جو عام طور پر کسان، زمیندار اور مزدور ہیں، سخت قسم کے جنگجو شمار ہوتے ہیں اور سید موسیٰ الصدر کے اہم ترین حمایتی ہیں۔ ان کے لیے ان کے مذہبی رہبر کا بھوک ہڑتال کرنا ناقابلِ برداشت تھا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ بعلبک کے لوگوں کے دل میں شعلۂ انقلاب روشن ہو گیا۔ بھوک ہڑتال کے تیسرے دن انھوں نے سرکاری عمارتوں، حکومت کے مرکزی دفاتر اور پولیس کے مراکز پر حملہ کر دیا اور ان پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد انھوں نے یہ اعلان کیا کہ اگر یہ بھوک ہڑتال جاری رہی تو وہ بیروت پر مسلح حملہ کریں گے۔

لبنان کی حکومت بعلبک کے لوگوں کی صلاحیتوں سے ڈرتی تھی اور اس بات سے بے حد خوفزدہ تھی کہ بعلبک کے لوگ بے چون و چرا سید موسیٰ الصدر کی حمایت کریں۔ اس لیے ان بحرانی دنوں میں بعلبک میں بہت سی سازشیں ہوئیں جن کا مقصد یہ تھا کہ اس اہم اور قوی مورچے کو میدان جنگ سے دور ہی رکھا جائے۔ ان سازشوں میں سے ایک یہ تھی کہ بعلبک کے بارسوخ خاندانوں کے مابین باہمی چپقلش کو ہوا دی جائے تاکہ یہ آپس میں لڑ مریں۔ دوسری سازش یہ ہوئی کہ بعلبک کے گرد و نواح میں بعض عیسائی دیہات پر حملہ ہوا جس میں کچھ عیسائی مارے گئے۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ فرقہ وارانہ لڑائی کو وسعت دی جائے اور بالخصوص یہ کہ عیسائیوں کے خلاف مسلمانوں کے تشدد کا بہانہ بنا کر غیر ملکی طاقتوں کی مدد سے ان کا قتلِ عام کیا جائے۔

سید موسیٰ الصدر نے "مختصر حکومت" کے قیام اور جنگ بندی کے بعد بعلبک میں ان جھگڑوں کا خاتمہ کرنے کے لیے بھوک ہڑتال ترک کر دی اور فوراً بعلبک روانہ ہو گئے۔ وہاں پہنچ کر انھوں نے مختلف لوگوں سے رابطہ قائم کر کے بعلبک میں پھیلائے گئے سازشوں کے اس جال کو توڑ دیا گیا۔

بعلبک کے فوجی کیمپ میں دھماکہ:

سید موسیٰ الصدر چار روز کی کد و کاوش کے بعد بعلبک سے روانہ ہو گئے لیکن چوتھے دن ایک ایسا دردناک واقعہ ہوا جس نے پورے لبنان کو ہلا دیا اور تاریخ معاصر کے ایک اہم حصے کا رُخ بدل دیا۔ واقعہ یہ تھا کہ بعلبک میں "حرکۃ المحرومین" کے کیمپ میں اس وقت دھماکہ ہوا جب ایک بڑے اہم فلسطینی معلّم دھماکہ پیدا کرنے والے مواد کے بارے میں سبق دے رہے تھے اور ٹینک شکن سرنگ کے بارے میں وضاحت کر رہے تھے۔ اتفاق سے وہ سرنگ اس کے ہاتھ میں پھٹ گئی اور بہترین شیعہ گوریلوں میں سے ۲۷ افراد شہید ہو گئے اور ۵۰ سے زیادہ شدید مجروح ہوئے۔ یہ خبر پورے لبنان میں پھیل گئی اور تمام اخباروں نے اسے شہ سرخیوں سے چھاپا۔

لبنان کے دائیں بازو کے عیسائی بالخصوص کتائب سید موسیٰ الصدر اور "حرکۃ المحرومین" کے خلاف سرگرم عمل ہو گئے اور چاروں طرف سے ان کے خلاف آوازیں بلند ہونا شروع ہو گئیں۔ اس دھماکے سے قبل سید موسیٰ الصدر کو "مردِ امن" اور "نمائندہ مسیح" کہا جاتا تھا اور وہ ہر قسم کے اشخاص کے لیے قابلِ قبول تھے۔ عیسائی بالخصوص سید موسیٰ کو پسند کرتے تھے تاکہ وہ ان کے ملک کو استقرار بخشیں اور اس میں امن و امان کو قیام دیں کیونکہ ان کی نگاہ میں صرف سید موسیٰ الصدر ہی اس قابل تھے کہ لبنان کے امن و امان کو برقرار رکھیں اور کسی کی زندگی کو خطرہ نہ ہو۔ وہ لبنان کی زندگی اور اس کے وجود کا دفاع کرنے والے گردانے جاتے تھے۔ لیکن شیعوں کی ایک سیاسی تنظیم اور عسکری تنظیم کے وجود کا ظاہر ہونا بہت بڑے خطرے کی

Presented by Ziaraat.Com

گھنٹی تھا جس نے عیسائیوں کو بالعموم اور کتائب کو بالخصوص خوف و ہراس میں مبتلا کر دیا۔ وہ خوب جانتے تھے کہ اگر تمام شیعہ جو مختلف پارٹیوں اور مختلف لیڈروں کی ہدایات کے مطابق کام کر رہے ہیں، کسی ایک تنظیم میں جمع ہو گئے تو ایک بہت بڑی طاقت وجود میں آجائے گی جس کا برداشت کرنا ممکن نہ ہوگا۔

یہ درست ہے کہ سید موسیٰ الصدر امن و امان کے داعی تھے لیکن یہ بات بھی فراموش نہیں کی جا سکتی کہ وہ لبنان کے محروم طبقوں بالخصوص شیعوں کے نمائندے بھی تھے اور اس سلسلے میں ان کے پاس بہت بڑی ذمہ داری تھی۔ اگر پُرامن وسائل سے تمام لوگوں کے لیے اجتماعی عدالت میسر نہ ہو پائے، پھر ضروری ہے کہ زورِ بازو سے محروم لوگوں کے غصب شدہ حقوق حاصل کیے جائیں۔ یہ بات لبنان کی صورتِ حالات پر خاص طور پر صادق آتی ہے کیونکہ یہاں پہ ہر گروہ اور ہر طبقے کی اپنی فوجی تنظیم اور اپنی ملیشیا ہے۔ شیعہ گروہ کی بقا اور اس کے حقوق کی مدافعت کے لیے بھی اس امر کی ضرورت ہے کہ ایک طاقتور فوجی تنظیم موجود ہو۔

امل کی فوجی تنظیم کا رسمی اعلان :

بعلبک میں دھماکے کی خبر کے پھیل جانے کی بناء پر سید موسیٰ صدر نے "حرکۃ المحرومین" کے فوجی شعبے کے وجود کا ۶ رجون ۱۹۷۵ء کو اعلان کیا اور یوں "امل" کی تنظیم "حرکۃ المحرومین" کے فوجی بازو کے طور پر کھلم کھلا وجود میں آئی۔ اس کا نام "امل" تین الفاظ کے پہلے حروف کا مجموعہ ہے، یعنی "افواج"، "مقاومۃ" اور "لبنانیۃ"، جس کا اردو میں ترجمہ "لبنانی مزاحمت کے دستے" کر سکتے ہیں۔ شیعوں کی یہ فوجی تنظیم دو سال قبل وجود میں آئی تھی اور سرگرمِ کار تھی۔ وہ اپنے جوانوں کو تربیت دینے کے لیے بعلبک کے تربیتی کیمپ سے استفادہ کرتی تھی۔ یہاں تک کہ یہ نوجوان بعض عسکری سرگرمیوں میں بھی حصہ لیتے تھے۔ لیکن اب تک یہ تنظیم مخفی تھی اور کوئی سبب نہ تھا کہ اسے ظاہر کیا جائے۔ "حرکۃ المحرومین" کی طرف سے فوجی تربیت بعلبک کے دُور افتادہ کیمپوں میں ہوتی تھی اور "منظمۂ فتح" کے افسر نوجوانوں کو تربیت دیتے تھے۔ ان کیمپوں میں ہر قسم کے ہتھیاروں کی تربیت دی جاتی تھی اور اس کے ساتھ گلی کوچوں

میں لڑنے، دست بدست لڑائی اور چھاپہ مار دستوں کی ٹیکنیک سے بھی ان نوجوانوں کو آشنا کرایا جاتا تھا۔ عسکری اُمور کے علاوہ انھیں فکری اور نظریاتی تربیت بھی دی جاتی تھی۔ یہ فوجی کیمپ "کارخانہ انسان سازی" کے نام سے مشہور تھا اور ان کیمپوں میں تربیت حاصل کرنے کے بعد جو نوجوان باہر آتا تھا اُس میں اخلاقی اور ذہنی تغیرات نمایاں ہوتے تھے۔

اہم اور قابلِ غور بات یہ ہے کہ لبنان کے مسلمان گوریلوں میں تقریباً سب کے سب شیعہ ہیں۔ یہاں تک کہ کیمونسٹ پارٹی، جنبلاط کی ترقی پسند سوشلسٹ پارٹی اور سنّی سیاستدانوں کی پارٹیوں میں لڑنے والے شیعہ نوجوان ہیں۔ یہ بات ایک طرف تو فکری، دینی اور تاریخی پس منظر سے مربوط ہے اور دوسری طرف اس کا تعلق حد سے بڑھی ہوئی محرومی سے ہے۔ بات یوں ہے کہ ایک شیعہ جنگجو کے پاس اس کی جان کے سوا اور کوئی چیز نہیں جو اس سے چھن جائے۔ اس لیے میدانِ جنگ میں وہ کسی چیز سے نہیں ڈرتا۔ اس کے مقابلے میں عیسائی اور دوسرے لڑنے والوں کے اپنے اپنے مفادات ہیں۔ وہ اس لیے لڑتے ہیں کہ اپنے مفادات کی حفاظت کریں اور اسی لیے وہ مرنے سے گریز کرتے ہیں۔

لبنان کا نظامِ دگرگونی :

جیسا کہ کہا جا چکا ہے، اس مردم شماری کے اعداد کے مطابق جو فرانسیسی استعمار نے ۱۹۲۰ء سے ۱۹۳۰ء تک تیار کروائے تھے، عیسائیوں کو لبنان میں اکثریت گردانا گیا۔ لہٰذا صدر اور فوج کے کمانڈر ان چیف کا عہدہ ان کا حق سمجھا گیا۔ سنّی مسلمان دوسرے نمبر پر آتے ہیں اور شیعہ تیسرے نمبر پہ۔ البتہ اس کے بعد بالواسطہ اعداد و شمار کے ذریعے جو چینی کے کوپنوں کے ذریعے سے لکھے گئے ہیں، مختلف فرقوں کی تعداد حسبِ ذیل نکلتی ہے[1] :

[1] حال ہی میں لندن سے شائع ہونے والی ایک کتاب (Lebanon a Conflict of Minorities) میں اس مسئلے پہ بحث کی گئی ہے۔ اس کتاب کو ڈیوڈ میکڈاول DavidMc Dawall نے لکھا ہے اور (Minority Rights Group Report No : 61) کے طور پر بنجمن فرینکلن ہاؤس، ۳۶ کریوان سٹریٹ لندن (Benjamin Franklin House, 36 Craven Street, London)

Presented by Ziaraat.Com

۱۔ مارونی : ۴ لاکھ ۵۰ ہزار
۲۔ سُنّی : ۵ لاکھ ۵۰ ہزار
۳۔ درزی : ۲ لاکھ ۵۰ ہزار
۴۔ کیتھولک عیسائی : ۳ لاکھ ۵۰ ہزار
۵۔ آرتھوڈوکس عیسائی : ۳ لاکھ
۶۔ شیعہ : ۹ لاکھ ۸۵ ہزار
۷۔ دُوسرے فرقوں کی تعداد معمولی ہے۔

جیسا کہ ان اعداد و شمار سے ظاہر ہوتا ہے شیعوں کی تعداد مارونیوں کے مقابلے میں دگنی ہے اور دوسرا کوئی مذہبی گروپ شیعوں کی تعداد کے قریب بھی نہیں پہنچتا۔ لہٰذا لازم ہے کہ لبنان کے موجودہ نظام کے مطابق لبنان کا صدر شیعوں میں سے منتخب ہو۔ یاد رہے کہ شیعوں کی یہ تعداد اُن ہزارہا افراد کو گنے بغیر ہے جو اُن خاندانوں میں سے ہیں جنھوں نے فرانسیسی استعمار کو قبول نہ کیا اور اس وقت کی فرانسیسی حکومت نے انھیں شناختی کارڈ نہ دیا اور وہ لوگ لبنان میں زندگی بسر کرنے کے باوجود اب تک لبنانی نہیں۔ اس وقت لبنان میں شیعوں کی تعداد حتمی طور پر ۱۲ لاکھ سے کم نہیں۔ شیعوں کی تعداد، اُن کی قوت اور شیعہ نوجوانوں کی جنگجویانہ استعداد نے پورے لبنانی نظام کو زیر و زبر کر دیا ہے۔ بائیں بازو کی ساری جماعتیں اور عیسائی اس بات سے بے حد خوفزدہ ہیں کہ فرقہ وارانہ تناسب بدل گیا ہے۔ اس لیے ان میں سے ہر ایک یہ کوشش

(بقیہ حاشیہ گذشتہ صفحہ) سے چندماہ پہلے شائع ہوئی ہے۔ اس میں ۱۹۳۲ء اور ۱۹۸۲ء کے اعداد و شمار کا تقابل کیا گیا ہے۔ ۱۹۳۲ء کے اعداد و شمار کے مطابق مسلمان ۴۸ فیصد تھے اور عیسائی ۵۲ فیصد۔ لیکن ۱۹۸۳ء کے اعداد و شمار مسلمان ۵۷ فیصد ہیں اور ان میں لبنان میں مقیم فلسطینی اور غیر لبنانی مسلمان شامل نہیں۔ یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ ان اعداد و شمار کو جمع کرنے والا ادارہ برطانیہ کا عیسائی ادارہ ہے جسے کسی صورت بھی لبنان کے مسلمانوں کا طرفدار قرار نہیں دیا جاسکتا۔ اس کتاب میں دیے گئے اعداد و شمار کے مطابق آبادی میں اضافہ سب سے زیادہ شیعوں میں ہوا ہے جو ۱۹ فیصد سے بڑھ کر ۳۱ فیصد ہو گئے ہیں۔ سنّی اور دُرزی مسلمانوں کی تعداد میں بھی اضافہ ہوا ہے لیکن اضافے کا فیصد تناسب شیعوں کے مقابلے میں بہت کم ہے۔

کرتا ہے کہ شیعوں کو کمزور کیا جائے۔ ہزارہا شیعہ نوجوان جو اب تک بائیں بازو کی جماعتوں میں کام کرتے تھے اب "حرکۃ المحرومین" کی طرف مائل ہو چکے ہیں اور انھوں نے اس بات کو ترجیح دی ہے کہ دوسری تنظیموں کے لیے کام کرنے کی بجائے اپنے فرقے کے لیے کام کریں۔ اس سے قبل یہ نوجوان فکری اور سیاسی خلاء کے باعث بائیں بازو کی جماعتوں میں شامل ہو چکے تھے۔ لیکن اب شیعہ مجلس اعلیٰ اور شیعہ جماعت اور سید موسیٰ الصدر طاقت پکڑ رہے ہیں اور متواتر ترقی کی راہ پر گامزن ہیں۔ لبنان کمیونسٹ پارٹی کے ۹۵ فیصد ارکان شیعہ نوجوان تھے۔ کمیونسٹ پارٹی نے گذشتہ پچاس سال کی مدت میں کوئی مثبت کام سرانجام نہیں دیا۔ لہٰذا شیعوں کی ترقی اور ان کی فعالیت کے سبب سے کمیونسٹ پارٹی کے یہ ارکان ہوش میں آتے ہیں اور فرقہ وارانہ جذبے کے تحت، جو بہت طاقتور ہے، "حرکۃ المحرومین" میں شامل ہو جاتے ہیں۔ اسی لیے لبنان کی کمیونسٹ پارٹی اور وہاں کی دوسری جماعتیں شیعوں کی اس بڑھتی ہوئی طاقت اور ان کے یکجا ہونے کو بڑے خوف کی نگاہ سے دیکھتی ہیں اور یہ محسوس کرتی ہیں کہ اس عظیم تحریک کے مقابلے میں بے بس ہیں اور انھیں چاہیے کہ وہ ہر طرح سے سید موسیٰ الصدر "حرکۃ المحرومین" اور شیعوں کو زِک پہنچائیں اور ان میں پھوٹ ڈالیں۔

شیعوں کی طاقت نے عیسائیوں کو بھی خاصہ پریشان کر رکھا ہے اور ان کے سیاسی اور مذہبی رہنما سید موسیٰ الصدر کو بغض و کینہ کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ وہ لوگ جو ان سے دوستی رکھتے تھے اب ان سے دُور بھاگتے ہیں۔ لیکن یہ بات دھیان میں رہے کہ اس نقصان کے مقابلے میں یعنی عیسائیوں اور دینی و سیاسی رہنماؤں کے مقابلے میں، سید موسیٰ الصدر اور "حرکۃ المحرومین" کو کہیں بڑی کامیابی حاصل ہوئی اور وہ یہ ہے کہ انھوں نے مسلمانوں کو چاہے وہ سنّی ہوں یا شیعہ، "حرکۃ المحرومین" کی طرف مائل کیا اور سید موسیٰ الصدر کی شخصیت روز افزوں مقبولیت حاصل کرتی جا رہی ہے کہ وہ لبنان کے تمام محروم لوگوں کی توجہ اور محبت کا مرکز بن گئے ہیں۔

بعلبک کے دھماکے کا ردِ عمل توقع کے برخلاف مثبت نکلا۔ اس نے شیعوں کو خواب سے بیدار کیا اور ان میں ذوقِ عمل پیدا کیا۔ ایک موقع پر جب سید موسیٰ الصدر بعلبک میں شہداء کے خاندانوں سے ملنے کے لیے گئے تو ایک شخص نے جس کے دو بیٹے شہید ہو چکے

Presented by Ziaraat.Com

نخے، سید صدر سے کہا کہ میرے تین بیٹے اور ہیں، میں چار اور میری بیوی پانچ۔ ہم پانچ نفر ہیں میں ان سب کو تم پر قربان کرتا ہوں۔

خوابِ غفلت میں پڑا ہوا جنوبی لبنان بھی حرکت میں آیا۔ جنوبی لبنان کے ایک خاندان کا ایک لڑکا شہید ہوا جس کا باپ فوت ہو چکا تھا۔ اس کی غمزدہ ماں نے سیاہ لباس پہن رکھا تھا۔ جب موسیٰ الصدر اسے تسلی دینے کے لیے تشریف لے گئے، اس نے کہا: "اے سیّد! آپ عورتوں کے لیے کیمپ کیوں نہیں بناتے۔ ہم بھی چاہتی ہیں کہ فوجی تربیت حاصل کریں اور لڑیں"۔ اللہ اکبر، کیا جذبہ ہے۔

اس قسم کا احساسِ فداکاری اتنی تیزی سے بڑھا کہ اس سے قبل جنوبی لبنان میں اس کا کچھ نشان نہ تھا۔ یہ بات اس داخلی جنگ میں شیعوں کے لیے ایک نقطۂ تغیر ثابت ہوئی۔

جنوب کی بیداری :

جنوبی لبنان میں اپنی مدافعت کے لیے جنگ کا جذبہ اور شہادت کا فخر گردانے کا خیال زور پکڑ گیا، جس کا مظاہرہ ہر جگہ مشاہدے میں آیا ہے۔ اسرائیل نے ہمیشہ جنوبی لبنان پر تجاوز کیا۔ ہر رات اسرائیلی کمانڈو لبنانی دیہات میں آتے، مارتے پیٹتے، مکانوں کو برباد کرتے، دھماکے کرتے اور لوگوں کو گرفتار کر کے لے جاتے اور جنوبی لبنان کے لوگ اپنے دفاع کے لیے کچھ نہ کر سکتے۔ لیکن اب دفاع کرنا اور شہید ہونا رائج ہو چکا تھا۔ جیسا کہ پچھلے صفحات میں بیان کیا جا چکا ہے، کچھ مدت پہلے اسرائیلی کمانڈو جنوبی لبنان کے سرحدی گاؤں "طیبہ" میں آئے اور وہاں کے ایک شخص شرف الدین کے گھر پہنچے۔ اُس نے دروازہ کھولا کہ اسرائیلیوں نے اسے مار دیا۔ اس کا بڑا لڑکا چاہتا تھا کہ بندوق اُٹھائے، کہ اُسے بھی انھوں نے قتل کر دیا۔ چھوٹے لڑکے نے، جس کی عمر ۱۶ سال تھی اور جو "صور" کے مدرسہ جبل عامل میں طالب علم تھا، ہتھیار لیے اور ۴۵ منٹ تک اسرائیلیوں سے لڑتا رہا۔ اس دوران میں اس نے ۲ اسرائیلی کمانڈو مار دیے۔ اسرائیلی اس پر گولیاں برسا رہے تھے اور وہ گھر کے ایک گوشہ سے دوسرے گوشے میں منتقل ہو ہو کر ان کا مقابلہ کرتا رہا۔ یہاں تک کہ اسرائیلیوں نے ایک بہت بڑا راکٹ

پھینک کر پورے گھر کو تباہ کر دیا جس میں یہ جیالا بھی شہید ہوا۔

حال ہی میں ایک اور حادثہ جنوبی لبنان کے ایک سرحدی گاؤں "کفر قاعہ" میں ہوا۔ اسرائیلی کمانڈو اپنی عادت کے مطابق گاؤں میں داخل ہوئے اور گاؤں کی مرکزی گلی میں سے گاتے ہوئے گزر رہے تھے۔ چند مسلح لبنانیوں نے ان کا سامنا کیا اور فوری طور پر اسرائیلیوں کو اپنی گولی کا نشانہ بنایا۔ اسرائیلی افسر اور چند کمانڈو تو پہلے ہلے ہی میں مارے گئے۔ اب جنگ جو شروع ہوئی تو گھنٹوں جاری رہی۔ گاؤں کے سب لوگ تیار ہو کر اسرائیلیوں کے مقابلے میں نکل آئے۔ نتیجہ اس کا یہ نکلا کہ صبح دم اسرائیلی فوج پسپا ہونے پر مجبور ہو گئی۔ اسی طرح "کفر شوبا" کے لوگوں نے جس بہادری سے اسرائیلیوں کا مقابلہ کیا اس کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ اسرائیل نے اس گاؤں پر تین طرف سے حملہ کیا اور ۵ روز کی جنگ کے بعد اس قابل ہوئے کہ گاؤں کی حدود کے قریب پہنچ سکیں۔ لیکن اس گاؤں کے جان پر کھیلنے والے لوگوں نے اور کچھ فلسطینی فدائیوں نے جان توڑ کر مقابلہ کیا اور اسرائیلی پسپا ہونے پر مجبور ہو گئے۔ یہ گاؤں بالکل تباہ ہو چکا ہے لیکن اس نے ایسا شرف اور افتخار حاصل کیا ہے کہ اب اس کا نام جنوبی لبنان کے آسمان پر ستارے کی طرح چمکتا رہے گا۔

بعلبک میں دھماکے کے حادثے اور ۲۷ افراد کی شہادت کے بعد یاسر عرفات نے پہلی بار اپنے شدید تأثر کا اظہار کیا اور ان جان سے گزرنے والوں کو فلسطینی شہداء کی فہرست میں شمار کیا۔ انھوں نے ان کے بارے میں ایک تقریظ لکھی جن میں ان کی شہادت کا ذکر تھا۔ اس کے بعد یاسر عرفات نے سید موسیٰ الصدر کو مبارکباد کا پیغام بھیجا اور یہ کہا کہ ان لوگوں کی شہادت "حرکۃ المحرومین" کو ایک نئی زندگی دے گی۔ یہ حقیقت ہے کہ ان لوگوں کی شہادت کو اس تحریک کا آغاز سمجھنا چاہیے۔ یاد رہے کہ یہ لفظ میں کہہ رہا ہوں جس نے اپنے جسم و جان سے انقلاب کے مفہوم کو محسوس کیا۔ (جون ۱۹۷۵ء)

"حرکۃ المحرومین" اساسی طور پر اس بات پر تکیہ کرتی ہے کہ اپنے ارکان کو تربیت دے، ان کے طرزِ تفکر کو درست کرے اور انھیں آئیڈیالوجی سے آشنا کرے۔ چونکہ جنگ آزمائی تمام شیعوں کے لیے یکساں حیثیت رکھتی ہے اس لیے جب تک کوئی شخص اصولِ اسلام کا

Presented by Ziaraat.Com

منعقد نہ ہوا اور "حرکۃ المحرومین" کے منشور کو تسلیم نہ کرتا ہو، اس وقت تک اسے "حرکۃ المحرومین" اور تنظیم امل میں شمولیت کے لیے قبول نہیں کیا جاتا۔ اس تنظیم میں اولین انحصار تو اس بات پر ہے کہ ارکان کی فکری تربیت ہو اور آئیڈیالوجی سے آشنا ہوں۔ پھر انھیں منظم کیا جائے اور اس کے بعد فوجی کاموں کی تربیت دی جائے۔ امید کی جاتی ہے کہ مستقبل میں شیعوں کی اکثریت اسلامی فکر اور روحِ شہادت سے سرشار ہو کر ایک مرکز پر جمع ہو جائے گی اور عدالتِ اجتماعی کی راہ میں ظلم و ستم کو ختم کرنے اور اپنے غصب شدہ حقوق دوبارہ حاصل کرنے کے لیے جنگ آزما ہوگی۔

حادثۂ "زحلہ"

۱۹ جولائی ۱۹۷۵ء کو ایک فلسطینی فدائی "زحلہ" کے ایک قہوہ خانے میں کچھ عیسائیوں سے بحث کر رہا تھا کہ ان عیسائیوں سے اس کا جھگڑا ہو گیا اور مارا گیا۔ لبنان کی عدالت نے تحقیقات کرنے کے بعد دو افراد کو قتل کے الزام میں جیل بھیج دیا تاکہ ان پر مقدمہ چلایا جائے لیکن "زحلہ" کے عیسائیوں نے ہڑتال کر دی اور جیل پر حملہ کر کے ان قیدیوں کو آزاد کرا لیا۔ اس بات نے مسلمانوں کے غصّے کو بھڑکایا اور دونوں فرقوں کے مابین کشیدگی شروع ہو گئی۔ جو پہلے بیروت پہنچی اور اس کے بعد اس کا دائرہ طرابلس تک وسیع ہو گیا۔ ان جھگڑوں میں کتائب کے حملے خاص طور پر شیعوں پر ہوتے تھے۔ انھوں نے ایسے جرائم کیے جن کی نظیر نہیں ملتی اور ان میں سے ایک یہ ہے کہ کتائبی بے گناہ لوگوں کو پکڑ کر ان کے سر جدا کر دیتے تھے۔ دس دن کی مدّت میں ۲۰۰ سے زیادہ افراد کا سر کاٹا گیا۔ میں خود معجزانہ طور پر "کحالہ" میں اپنا سر بچا سکا۔

اس خانہ جنگی کے شروع ہونے کے بعد اس امر کا خطرہ پیدا ہوا کہ تمام محاذوں پر از سرِ نو لڑائی شروع نہ ہو جائے۔ ایک بار پھر فلسطینی مزاحمت کو دھمکیاں ملنا شروع ہوئیں۔ سوریا کے صدر حافظ الاسد نے یاسر عرفات اور رشید کرامی سے بات چیت کی اور کہا کہ ہم فرض کرتے ہیں کہ کتائب ہنگامہ کرنا چاہتے ہیں، لیکن ہم نہیں چاہتے کہ ایسا ہو۔ اس لیے ہمیں چاہیے کہ وہ کام نہ کریں جو کتائب کر رہے ہیں۔ یاسر عرفات اور رشید کرامی نے اس بات کو قبول کر لیا کہ جنگ کے شعلوں

کو خاموش کرنے کے لیے اپنی پوری کوششیں کام میں لائیں۔ رشید کرامی نے سید موسیٰ الصدر سے درخواست کی کہ وہ ٹیلی ویژن پر جا کر قوم سے خطاب کریں۔ کیونکہ وہی ایک ایسی شخصیت تھے جن میں لوگوں کے سامنے جانے کا حوصلہ اور قابلیت تھی کہ ان سے امن و امان سے رہنے کی اپیل کریں۔ یاسر عرفات اور رشید کرامی کی درخواست پر سید موسیٰ الصدر ٹیلی ویژن سٹیشن پر گئے اور اور وہاں سے انھوں نے ایک تقریر نشر کی۔ اس تقریر میں انھوں نے چند آیات قرآنِ مجید سے تلاوت کیں، کچھ حوالے انجیل کے دیے اور چند جملے نہج البلاغہ سے پڑھے اور کہا کہ مسلمان عیسائیت کے خلاف نہیں۔ ہم نے طویل مدّت تک عیسائیوں کے ساتھ صلح و آشتی سے زندگی بسر کی ہے۔ موجودہ حادثہ ایک بین الاقوامی سازش کا نتیجہ ہے جس کا مقصد فلسطینی مزاحمت کو ختم کرنا اور لبنان کو تباہ کرنا ہے اور ہم پر لازم آتا ہے کہ ہم اس سازش کو بہر صورت ناکام بنائیں۔ چونکہ اس وقت لبنان کی بقا ہمارے پیشِ نظر ہے اس لیے ضروری ہے کہ ہم ہر قسم کے چھوٹے چھوٹے مسائل کو نظر انداز کر دیں۔ پھر انھوں نے لوگوں سے درخواست کی کہ اگر آپ پر کوئی شخص گولی چلائے تو آپ جواب میں گولی نہ چلائیں اور صلح کو برقرار رکھیں تاکہ تخریب کار اور دشمن کے آلۂ کار لوگ پہچانے جا سکیں۔ سید موسیٰ الصدر کی تقریر نے قوم پر عجیب و غریب اثر کیا اور انھوں نے فیصلہ کیا کہ جنگ کو ختم کر دیں۔ آخر کار اس تمام خونریزی اور بغض و نفرت کے بعد جس میں ۷۰۰ آدمی مارے گئے تھے اور ۲۰،۰۰۰ زخمی ہوئے تھے، بے شمار گھر برباد ہو گئے تھے، ایک روز بعد از سرِ نو صلح کی فضا برقرار ہو گئی۔ شیعوں کی بہت بڑی تعداد اور "الشیاح" کے جنگ آزماؤں کا ایک گروہ "عین الرمانہ" گیا۔ وہاں عیسائیوں اور مسلمانوں نے ایک دوسرے کو خوش آمدید کہا، مل بیٹھ کر چائے اور کافی پی اور امن و امان سے واپس آ گئے۔ اسی طرح "عین الرمانہ" کے عیسائی بھی اس کے جواب میں "الشیاح" آئے اور تمام معاملات بطریقِ احسن سر انجام پائے۔ مسرّت و خوشی کی فضا پیدا ہو گئی۔ حکومت کے ریڈیو نے صلح و امن کے قائم ہو جانے کا اعلان کیا۔ مسلمان اور عیسائی آزادانہ طور پر ایک دوسرے سے ملنے لگے اور آثار پیدا ہوئے کہ امن و امان واقعی طور پر قائم ہو گیا ہے۔ لیکن بصد افسوس مختلف غیر ملکی طاقتوں کے زرخرید لوگ یہ نہیں چاہتے تھے کہ صلح برقرار رہے اور ایک بار پھر انھوں نے سازش کا سہارا لیا۔

Presented by Ziaraat.Com

یہ سازشیں بڑی طاقتور تھیں۔ جنگ بندی ہوتی تھی لیکن ایک ہفتے یا دو ہفتے کے بعد کسی اور بہانے سے کسی اور مقام پر جنگ شروع ہو جاتی۔ یہ خانہ جنگیاں اور جنگ بندیاں ہوتی رہیں، یہاں تک کہ کوئی ۱۷، ۱۸ مرتبہ یہ سلسلہ چلا۔ سازشیوں کی پالیسی یہ تھی کہ مسلمانوں اور عیسائیوں کو آپس میں لڑوایا جائے تاکہ وہ ایک دوسرے کو ماریں اور یوں ہر روز فلسطینی مزاحمت کو جنگ کے نزدیک کیا جائے تاکہ وہ بالآخر جنگ میں شریک ہونے پر مجبور ہو جائے[1]۔

---

[1] صلح کی کوششیں ناکام کروانے کی سازش پہلے تو اس لیے ہوتی تھی کہ کسی نہ کسی طرح فلسطینی مزاحمت کو جنگ میں دھکیلا جائے اور یوں اس کی قوت کو ختم کیا جائے۔ یہ سازشیں اب بھی جاری ہیں۔ ابھی حال ہی میں کافی گفت و شنید کے بعد رشید کرامی نے امین الجمیل کی صدارت کو قبول کرتے ہوئے قومی اتحاد کی وزارت بنائی اور امن و امان کی صورت پیدا ہوئی لیکن فوراً ہی شمالی لبنان میں فسادات شروع ہو گئے جن کا مقصد رشید کرامی کو ناکام کرنا ہے کیونکہ سابق صدر سلیمان فرنجیہ سے ان کا پرانا عناد چلا آ رہا ہے اور پھر یہ کہ ان کی ناکامی کے بعد خانہ جنگی عام ہو تاکہ لبنان کی تقسیم کے لیے زمین ہموار ہو۔

باب یازدہم

ابتدائے جنگ سے ایک سال بعد

جنگ کی ابتدا کے ایک سال بعد لبنان کی خانہ جنگی کی صورتِ حالات میں ایک بنیادی بحرانی تغیر واقع ہوا اور وہ تغیر یہ تھا کہ فلسطینی مزاحمت کو رسمی اور علانیہ طور پر جنگ میں شریک ہونا پڑا۔ ایک سال تک فلسطینی مزاحمت کے رضاکاروں نے علانیہ طور پر جنگ میں شرکت نہیں کی تھی۔ وہ خفیہ طور پر ہتھیار دیتے تھے اور خفیہ طور پر بعض کمانڈروں کو بائیں بازو کے مسلمانوں کے پاس بھیجتے تھے کہ وہ ان کی مدد کریں۔ لیکن علانیہ طور پر وہ شریکِ جنگ نہ تھے۔ کتائب کے پاس کوئی ایسی دلیل نہ تھی کہ وہ یہ ثابت کر سکیں کہ فلسطینی جنگ آزماؤں نے لبنان کی خانہ جنگی میں حصہ لیا ہے۔ لیکن جنگ کے ایک سال بعد وہ افسوسناک حالات پیدا ہوئے جن کا ہم ذکر کرنے والے ہیں اور ان کی بناء پر فلسطینی مزاحمت جنگ کی لپیٹ میں آ گئی اور یہ بات امریکی اور اسرائیلی پروگرام کے مطابق تھی جس کا مقصد فلسطینیوں کو جنگ کی آگ میں جھونکنا تھا۔ فلسطینی مزاحمت کیوں کر جنگ میں شریک ہوئی اس کا ذکر ہم ذیل کی سطور میں کرتے ہیں:

ایک سال کی جنگ آزمائی کے بعد مسلمانوں کے محاذ پر، جس میں بائیں بازو کی جماعتیں اور ہم سب شامل تھے، ایک قسم کی کمزوری اور شکست کا احساس پیدا ہو۔ (اس "ہم" سے مراد "حرکۃ المحرومین" کے رضاکار ہیں جو "الشیاح"، "نبعہ"، "کفر شیما" اور دیگر منطقوں میں لڑ رہے تھے) اس کے مقابلے میں کتائب کو ہر روز مسلسل کامیابیاں حاصل ہو رہی تھیں۔ مثال کے طور پر "حیِ غوارنہ" ایک شیعہ محلہ ہے جو عیسائی منطقے میں واقع ہے، اسے ۴ ہزار عیسائی لڑنے والوں نے محاصرے میں لے لیا۔ شدید لڑائی کے بعد انھوں نے اس علاقے پر قبضہ کر لیا اور بے شمار گھروں کو تباہ کر دیا۔ انھوں نے اس علاقے کے تمام مردوں کو جن کی تعداد

Presented by Ziaraat.Com

چار سو کو بھی گرفتار کر لیا اور بیروت کے مرکز میں لے گئے تاکہ انھیں قتل کر دیں۔ ایک شیعہ فوجی افسر کے وسیلے سے یہ خبر ٹیلیفون پر سید موسیٰ الصدر کو پہنچی اور انھیں بتایا کہ اگر آپ ذرا بھی خاموش رہے تو ۴ سو مسلمان گولی کا نشانہ بن جائیں گے۔ بیروت کے اخبار "النہار" نے ان چار سو افراد کی تصویر بھی چھاپی جس میں یہ لوگ ہٹلری دور کے قیدیوں کی یاد تازہ کر رہے تھے۔ ان کے ہاتھ سروں پر تھے اور وہ بیروت کے مرکز میں جنرل پوسٹ آفس کے سامنے قطار میں کھڑے تھے۔ ان کے مقابلے میں کتائبی کھڑے تھے جن کے ہاتھوں میں چھوٹی مشین گنیں تھیں اور بالکل تیار تھے کہ ان ۴ سو افراد کو گولی کا نشانہ بنادیں۔ سید موسیٰ الصدر نے پئیر الجمیل سے ٹیلیفون پر بات کی اور اسے دھمکی دی کہ اگر ان ۴ سو افراد کو قتل کر دیا تو ہم خاموش نہ بیٹھیں گے اور اسی وقت حکم دیا کہ "حرکۃ المحرومین" کے رضاکار اور "بعلبک" کے لوگ "زحلہ" کا محاصرہ کرلیں۔ "زحلہ" وادی "بقاع" میں پہاڑوں کے دامن میں ایک خوبصورت شہر ہے جو عیسائیوں کا ایک بہت بڑا مرکز ہے اور وہ اسے مقدس شمار کرتے ہیں۔ سید موسیٰ الصدر نے پئیر الجمیل سے کہا کہ اگر ان ۴ سو افراد کو رہا نہ کیا گیا تو ہم "زحلہ" پر قبضہ کرلیں گے اور ان کا انتقام لیں گے۔ اس دھمکی کی بناء پر ان لوگوں کی جان بخش ہوئی۔ ماسوا چند بائیں بازو کے لوگوں کے۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ وہاں پر کوئی ۲۴ کے قریب بائیں بازو کے رضاکار تھے جن میں ۶ یا ۷ افراد عیسائی کمیونسٹ تھے۔ ان کو تو نہ مارا گیا لیکن ان کمیونسٹوں کو جو شیعہ تھے قتل کر دیا گیا۔ یہ واقعہ ۱۱ دسمبر ۱۹۷۵ء کو رونما ہوا۔ اب تک "حی غوارنہ" کے سب مرد، عورتیں اور بچے مغربی بیروت کی مسجدوں اور مدرسوں میں، اور بعض سڑکوں کے کنارے زندگی گزار رہے ہیں۔

ایک دوسرا علاقہ جس کو کتائب نے اپنے قبضے میں لے لیا "سِبنِیۃ" تھا۔ یہاں کی اکثریت بھی شیعوں پر مشتمل تھی۔ کتائب نے اس محلے کا محاصرہ کر کے وہاں کے تمام لڑنے والوں کو قتل کر دیا اور باقی ماندہ لوگوں کو وہاں سے نکلنے پر مجبور کر دیا۔ اس کے بعد اس پورے محلے کو برباد کر دیا گیا۔

ان علاقوں کے بعد "تل الزعتر" پر حملہ ہوا۔ یہاں ایک فلسطینی کیمپ تھا اور اس کی آبادی ۳۵ ہزار نفوس پر مشتمل تھی جن میں سے ۴۰ فیصد فلسطینی اور ۶۰ فیصد شیعہ تھے۔ "تل الزعتر" دو ماہ تک کتائبیوں کے محاصرے میں رہا اور ہزاروں کتائبی رات دن اس علاقے پر گولہ باری کرتے

تھے۔ یہ علاقہ بیروت میں فلسطینیوں کا مضبوط ترین مرکز تھا۔ اس مرکز کا زیادہ تر حصہ زیر زمین تھا۔ یہاں تک کہ ہسپتال بھی زیر زمین تھا۔ اسے اسرائیل کے مقابلے کے لیے بنایا گیا تھا تاکہ اگر وہ حملہ کرے تو ہوائی جہاز بھی "تل الزعتر" کو نقصان نہ پہنچا سکے۔ دو ماہ تک بیروت کے دو علاقے محاصرے میں رہے، ایک "تل الزعتر"، دوسرے "برج حمود" کا محلہ بھی سارا شیعہ محلہ ہے اور یہاں کی آبادی ایک لاکھ ۸۰ ہزار کے قریب ہے۔ آبادی کے لحاظ سے یہ "تل الزعتر" سے کئی گنا بڑا علاقہ ہے۔ اس دو ماہ کے محاصرے میں "تل الزعتر" کے لوگوں کو کتائب نے نہ انھیں کھانا پہنچنے دیا، نہ اسلحہ نہ دوائیں۔

فلسطینی مزاحمت کی جنگ میں علانیہ شرکت

فلسطینی مزاحمت نے احتجاج کیا کہ "تل الزعتر" میں رہنے والے لوگ فلسطینی ہیں اور فلسطینی مزاحمت پر ان کی ذمہ داری ہے۔ انھیں نہ کھانے پینے کی چیزیں مل رہی ہیں اور نہ دوائیں۔ قریب ہے کہ وہ بھوک کی بناء پر مر جائیں۔ اس لیے انھوں نے کہا کہ اگر محاصرہ کرنے والے نے دوائیں اور کھانا پہنچانے کے لیے محاصرہ نہ ہٹایا تو فلسطینی مزاحمت ۲۴ گھنٹے کے بعد جنگ میں شریک ہو جائے گی اور طاقت کے زور سے محاصرے کو توڑ کر "تل الزعتر" کے لوگوں کو کھانا اور دوائیں پہنچائے گی۔

بہت کوشش کی گئی یہ جنگ نہ ہونے پائے اور محاصرہ اٹھا لیا جائے۔ یہاں تک کہ لبنانی فوج کے دو ٹرکوں نے "حازمیہ" کے رستے "تل الزعتر" تک آٹا پہنچانے کی کوشش کی لیکن کتائب نے بڑے غرور کے ساتھ فوجی ٹرکوں پر بھی گولیاں برسائیں اور اجازت نہ دی کہ آٹا "تل الزعتر" تک پہنچ پائے۔ یہ محاصرہ بدستور جاری رہا۔ ۲۴ گھنٹے کے الٹی میٹم کے بعد فلسطینی مزاحمت علانیہ طور پر جنگ میں اتری تاکہ "تل الزعتر" کا محاصرہ توڑا جائے۔ لبنان کے خانہ جنگی کے ڈیڑھ سال کے دوران میں یہ پہلا بحرانی مرحلہ تھا۔ اس وقت تک یہ خانہ جنگی لبنانیوں کے مابین تھی، لیکن اب یہ جنگ لبنانیوں اور فلسطینیوں کے مابین شروع ہوئی اور یہ بات فلسطینی مزاحمت کے لیے خطرے کا آغاز تھی۔ یہ اور بات ہے کہ اس وقت فلسطینی مزاحمت کے پاس

Presented by Ziaraat.Com

طاقت زیادہ تھی اور اس طاقت کی شہرت اس سے بھی زیادہ تھی۔ تمام لوگ حتیٰ کہ کتائب بھی اس بات سے خوفزدہ تھے کہ اگر فلسطینی مزاحمت جنگ میں شریک ہوگئی تو ایک دن میں کتائب کی زندگی کا خاتمہ کر دیں گے لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ جنگ کے باوجود فلسطینی مزاحمت اس قابل نہ ہوئی کہ "تل الزعتر" کے محاصرے کو توڑ دے اور یوں فلسطینی مزاحمت کو بہت بڑی جذباتی اور معنوی شکست حاصل ہوئی۔

پہلے دن فلسطینی مزاحمت کے ہزاروں جنگ آزماؤں نے "جسر الباشا" کے فلسطینی کیمپ سے حملہ کر کے اپنے آپ کو "حرش الثابت" تک پہنچا دیا جو "تل الزعتر" سے ۲۰۰ میٹر کے فاصلے پر ہے لیکن اس قابل نہ ہوئی کہ ۴ دن کی خونیں لڑائی کے بعد باقی کا فاصلہ طے کرے اور محاصرے کو ختم کرے۔ مجبوراً اسے پسپا ہونا پڑا۔ البتہ یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ زیادہ تر تخریب کاری ان لوگوں کی طرف سے عمل میں آئی جو بائیں بازو کی جماعتوں سے تعلق رکھتے تھے۔ بعض چیزیں جو میں نے اور میرے دوستوں نے خود مشاہدہ کی ہیں ان میں سے چند ایک یہ ہیں: جس دن یہ طے پایا تھا کہ فلسطینی مزاحمت کے دستے "حرش الثابت" کی راہ سے "تل الزعتر" پر حملہ کریں، اسی دن یہ فیصلہ بھی ہوا تھا کہ دیگر مسلح دستے "الشیاح" سے "حازمیہ" پر حملہ کریں اور "حازمیہ" کے رستے سے "تل الزعتر" کی سمت ایک نیا محاذ کھولیں۔ "تل الزعتر" اور "حازمیہ" کے درمیان ایک کلومیٹر سے زیادہ فاصلہ نہیں۔ قرار یہ پایا تھا کہ فلسطینی مزاحمت کے دستے "حرکۃ المحرومین" کے دستے اور بائیں بازو کی جماعتوں کے دستے صبح کے ۴ بجے "الشیاح" سے "حازمیہ" پر حملہ آور ہوں۔ اس زمانے میں سب سے بڑی قوت "صاعقہ" کے دستے تھے جو فلسطینی مزاحمت اور بائیں بازو کی جماعتوں کے ساتھ تعاون کرتے تھے لیکن صبح کے دو بجے کمیونسٹ پارٹی نے ۱۷ افراد کے ساتھ "الشیاح" سے "حازمیہ" پر حملہ شروع کیا۔ یہ حملہ ایسا تھا کہ نہ اس میں کوئی توپ تھی، نہ مارٹر اور نہ جنگی تیاری۔ یہ ۱۷ کے ۱۷ افراد مارے گئے یا گرفتار ہوگئے اور "تل الزعتر" پر حملہ ویسے کا ویسا رہ گیا۔ اس بنا پر "حازمیہ" کے محاذ پر بے کار کی ایک شکست حاصل ہوئی۔

بہرحال "تل الزعتر" کی لڑائی میں فلسطینی شکست کے بعد کتائب کا حوصلہ بڑا بلند ہوگیا۔ اگر پہلے وہ فلسطینیوں سے خوفزدہ تھے تو اب انھیں معلوم ہوگیا کہ یہ خوف بے بنیاد ہے۔ اس

دن کے بعد سے کتائبیوں نے مسلمانوں پر ایسے شدید حملے کیے جو اس سے پہلے کبھی نہ ہوئے تھے۔ ان حملوں میں سے ایک حملہ "نبعہ" کے فلسطینی کیمپ پر ہوا اور یہاں بھی کتائبیوں کو کامیابی حاصل ہوئی۔

مسلخ اور کرنتینا کا سقوط:

کتائب نے اب دو مسلمان محلوں پر حملہ کیا۔ یہ محلے 'مسلخ' اور 'کرنتینا' تھے اور کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ یہ کتائب کی دستبرد کا شکار ہوں گے۔ کتائب نے ان علاقوں پر قبضہ کر لیا اور وہاں قتلِ عام بپا کیا ایسا قتلِ عام جس کا تصور وحشی منگول بھی نہ کر سکتے تھے۔ کتائبی درندے لاشوں پر رقص کرتے، شیمپین پیتے اور گاتے اور غیر ملکی اخبار نویسوں سے تقاضا کرتے کہ ان کی تصویریں لیں اور دُنیا کے مختلف اخباروں میں نشر کریں تاکہ ان کی کامیابی کی خبر ساری دُنیا کو ہو جائے۔ انھوں نے گھروں کو زمین بوس کر دیا۔ وہ چند لوگ جو اس قتلِ عام سے بچ سکے وہ تھے جن کو ارمنیوں نے پناہ دی۔ یہ ارمنی "مسلخ" اور "کرنتینا" کے گرد و نواح میں ساکن ہیں انھوں نے بہت سی عورتوں اور بچّوں کو اپنے علاقے میں فرار ہو کر آجانے میں مدد دی۔ یہ لوگ آج بھی خانماں برباد اور بے آسرا ہیں۔ ان کے علاوہ جو کوئی بھی ان دو محلوں میں رہتا تھا وہ کتائب کے ہاتھوں مارا گیا۔ یہ قتلِ عام ایسا تھا کہ نیشاپور میں منگولوں کے ہاتھوں بپا ہونے والا قتلِ عام بھی اس کے سامنے ہیچ تھا۔

'مسلخ' اور 'کرنتینا' کی بربادی کے بعد کتائبیوں کے ہجوم نے 'برج حمود' کا رُخ کیا۔ اس محلے میں سبھی شیعہ آباد ہیں اور ان کی تعداد تقریباً ۱۷۰،۰۰۰ (ایک لاکھ ستر ہزار) ہے۔ اس محلے نے چار دن تک کتائب کی گولہ باری برداشت کی اور قریب تھا کہ وہ اسے بھی تسخیر کر لیں۔ اگر اسے تسخیر کر لیتے تو اس کا بھی وہی حشر ہوتا جو 'مسلخ' اور 'کرنتینا' کا ہوا تھا یا پھر 'تل الزعتر' کا۔ ایک اور علاقہ جو 'تل الزعتر' کے پاس تھا 'جسر الباشا' کہلاتا ہے۔ اس پر بھی شدید حملہ ہوا اور یہ بھی اپنی مزاحمت کے آخری دموں پر تھا۔ اس زمانے میں مسلمانوں کے حوصلے بے حد پست ہو چکے تھے اس سے قبل ان کی یہ حالت کبھی نہ ہوئی تھی۔ تمام مسلمان جنگ آزما راہِ فرار اختیار کر چکے

Presented by Ziaraat.Com

تھے۔ 'مسلخ' اور 'کرنتینا' کی بربادی پر لبنان کے وزیر اعظم رشید کرامی نے استعفیٰ دے دیا اور کہا کہ میں اس کشت و خون کو برداشت نہیں کر سکتا۔ یوں یہ اہم سیاسی عہدہ بھی مسلمانوں کے ہاتھوں سے چلا گیا۔ ہاں وحشی اور قاتل سلیمان فرنجیہ دندناتا رہا۔

مسلمان شکست کھا چکے تھے۔ فلسطینی مزاحمت شکست کھا چکی تھی اور انھیں سامنا تھا کتائب کی طاقت کا۔ 'مسلخ' اور 'کرنتینا' کی تسخیر کے نشے میں سرشار کتائبیوں نے 'الشباح' 'حی سلّم'، 'کفرشیما' اور اس قسم کے دوسرے علاقوں پر حملے کرنا شروع کیے جن میں شیعہ آباد تھے۔

بیروت کا محاصرہ :

اس موقع پر بیروت سے باہر جانے کے چار راستے تھے۔ ایک شمالی راستہ تھا جو 'طرابلس' کو جاتا تھا۔ یہ راستہ 'دورہ' سے ہو کر جاتا تھا اور چونکہ 'دورہ' کتائب کا گڑھ تھا اس لیے یہ راستہ بند تھا۔ دوسرا راستہ 'حازمیہ' سے نکلتا تھا یہ بھی بند پڑا تھا کیونکہ "حازمیہ" کتائب کے تسلط میں تھا۔ تیسرا راستہ جنوبی سمت سے ہو کر 'صیدا' کو جاتا تھا، یہ بھی استعمال میں نہیں آ رہا تھا کیونکہ 'دامور' سے ہو کر گزرتا تھا اور یہاں بھی کتائب کا مرکز تھا، صرف ایک راستہ کھلا تھا اور وہ 'عرمون' کا راستہ تھا۔ بیروت کے قریب ایک پہاڑی ہے جس کا نام 'خلدہ' ہے۔ یہ راستہ 'خلدہ' سے ہو کر 'عرمون' جاتا تھا۔ یہ نہایت تنگ اور دشوار گزار تھا لیکن صرف یہی ایک راستہ تھا جس سے کوئی بیروت سے باہر جا سکتا تھا۔ اب کتائب نے منصوبہ بنایا کہ اس راہ کو بھی اپنے قبضے میں لے لے۔ 'خلدہ' میں لبنانی فوج کے ۳۵۰ افراد کی آمد اور ان کی فلسطینیوں کے ساتھ لڑائی کی بناء پر یہ راستہ بھی بند ہو گیا۔ اس لڑائی میں لبنانی ہوائی جہازوں نے بھی کتائب کا ساتھ دیا اور فلسطینی فدائیوں کے مراکز کو بمباری کا نشانہ بنایا۔ اور ان کے ٹینکوں اور توپوں کو نقصان پہنچایا۔ اور اب 'عرمون' کی راہ بھی بند ہو گئی۔

اس طرح بیروت کا سارا شہر محاصرے میں آ گیا اور چار دن تک یہی کیفیت رہی۔ کوئی شخص نہ بیروت میں آ سکتا تھا اور نہ باہر جا سکتا تھا۔ ان چار دنوں میں بیروت سے پٹرول، مٹی کا تیل اور روٹی غائب تھی۔ ان دنوں میں جو حادثات ہوئے ان میں سے ایک حادثہ یہ تھا

کہ 'طریق الجدیدہ' پر جہاں سنی مسلمانوں کی اکثریت تھی ایک راکٹ گرایا گیا۔ جس سے ۴۷ افراد جاں بحق یا ہلاک ہوئے اور بے شمار زخمی ہوئے۔ یہ بیچارے نانبائی کی دکان پر قطار بنائے نان لے رہے تھے۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ یہ قطار کس قدر لمبی تھی کہ جس میں کھڑے لوگوں میں سے ۴۷ افراد موت کے منہ میں چلے گئے۔ تمام بیروت 'کتائب' کی گولہ باری کا نشانہ بنا ہوا تھا اور 'برج حمود'، 'جسر الباشا' اور 'تل الزعتر' ایسے محلوں پر جن میں شیعہ آباد تھے کتائب نے باقاعدہ حملہ کر رکھا تھا تاکہ اس پر قبضہ کر لیں۔ 'بیروت' محاصرے میں تھا۔ بیروت کے لوگ بھوک کی بناء پر، دواؤں کے ناپید ہونے کے سبب سے اور اسلحہ نہ ہونے کی بناء پر بے لڑے ہی شکست کھا رہے تھے۔ اس بناء پر کتائبیوں کے حوصلے بلند تھے اور مسلمان شکست خوردگی کی گہرائیوں میں گرے ہوئے۔ فلسطینی فدائی شکست کھا چکے تھے اور ان کے حوصلے پست ہو چکے تھے۔ مسلمان جنگ آزما گروہ در گروہ فرار کر رہے تھے اور انھیں ہر آن یہ خوف تھا کہ 'برج حمود' 'تل الزعتر' اور 'جسر الباشا' کے محلوں کا بھی وہی حشر نہ ہو جو 'مسلخ' اور 'کرنتینا' کے مقدر میں ہوا۔ غرض مسلمان ان ایام میں شکست خوردگی اور پست حوصلگی کی تاریکیوں میں گم تھے۔

عرمون کانفرنس :

اس قسم کے حالات میں عرمون کانفرنس منعقد ہوئی۔ (عرمون لبنان کے سنی مسلمانوں کے مذہبی رہنما مفتی حسن خالد کا محل سکونت ہے انھیں کے مکان میں یہ کانفرنس منعقد ہوئی اس لیے اس کا نام (قمة عرمون یا عرمون کانفرنس ہوا)۔ اس کانفرنس میں مسلمانوں کے تمام رہنما شریک ہوئے جن میں کمال جنبلاط، یاسر عرفات، رشید کرامی مفتی حسن خالد، سید موسیٰ الصدر، صائب سلام بھی موجود تھے تاکہ مسلمانوں کی بدبختی کے بارے میں غور و فکر کریں اور اس کا مداوا کرنے کے بارے میں سوچیں۔ یہ کانفرنس کئی دنوں تک جاری رہی اور اس کا سبب یہ تھا کہ اس کانفرنس کے دوران ہی میں لبنانی ہوائی جہاز اور کتائبی کمانڈو اسی علاقے ہی میں فلسطینی فدائیوں سے لڑ رہے تھے اور یہ مسلمان رہنما اس قابل نہ تھے کہ اس جگہ سے باہر جا سکتے اس لیے وہ یہیں رہے سوائے چند لوگوں کے جو 'جبل عامل' یا 'عرمون' کے علاقوں میں رہا کرتے تھے۔ اس کانفرنس کو مسلمانو

Presented by Ziaraat.Com

کی مصیبت کا علاج اس کے سوا اور کچھ نہ سوجھا کہ حکومتِ سوریا کا سہارا لیا جائے۔ ہم اس رائے سے متفق تھے کہ اگر سوریا مسلمانوں کی امداد کے لیے آگے نہ بڑھا تو بیروت کا سقوط اور وہاں کے تمام مسلمانوں کی موت یقینی ہے۔ میں یہ بات اس لیے کہہ رہا ہوں کیونکہ خود یاسر عرفات، کمال جنبلاط اور بائیں بازو کے تمام رہنما ہم نوا تھے کہ کتائب کا مقابلہ صرف اسی وقت ہو سکتا ہے جب سوریا کی فوجیں لبنان میں داخل ہو جائیں۔

اس بناء پر عرمون کانفرنس نے حکومتِ سوریا سے التجا کی کہ لبنان کے مسلمانوں کی حمایت کے لیے اپنی فوجیں لبنان میں داخل کر دے لیکن سوریا کی حکومت نے اس درخواست کو رد کر دیا اور کہا کہ ہمیں معلوم ہے کہ ہمارے خلاف سازش ہو رہی ہے تاکہ یوں سوریا کو لبنان میں بلوایا جائے اور اس کے بعد اسے زک پہنچائی جائے۔ یہی سبب ہے کہ بیروت کے محاصرے نے چار دن تک طول پکڑا اور پھر لوگوں کو یہ بھی معلوم تھا کہ حافظ الاسد علوی (نصیری) فرقے سے تعلق رکھتا ہے اور آقائے موسیٰ الصدر سے اس کے دوستانہ مراسم ہیں۔ عرمون کانفرنس کے شرکاء نے اس دوستی سے فائدہ اٹھایا۔ انھوں نے سید موسیٰ الصدر پر دباؤ ڈالا کہ وہ سوریا جائیں اور حافظ الاسد کو مسلمانوں کی حمایت میں لبنان کے معاملے میں کتائب کے خلاف دخل دینے پر آمادہ کریں۔

سید موسیٰ الصدر کانفرنس کے مقام کے گرد و نواح میں کتائب اور فلسطینی فدائیوں کے درمیان برستی گولیوں کے باوجود، کار لے کر پہاڑی راستوں سے سوریا گئے اور حافظ الاسد سے رابطہ پیدا کیا۔ انھوں نے سوریا کے صدر کے سامنے عرمون کانفرنس کی درخواست رکھی۔ حافظ الاسد نے سید موسیٰ الصدر کی درخواست قبول نہ کی اور اس کے لیے وہ دلیل پیش کی جو اس سے پہلے پیش کی گئی تھی کہ لبنان میں سوریا کی جانب سے فوجی مداخلت حکومت سوریا کے لیے خطرے کا باعث ہے۔ سید موسیٰ الصدر نے جواب میں کہا کہ میں صرف ایک بات کرنا چاہتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ اگر سوریا میدان میں نہ اترا تو بیروت کا سقوط واقع ہو گا اور ہم سب ختم ہو جائیں گے۔ اگر آپ اس بات کو پسند کرتے ہیں تو خوب، آپ کی مرضی لیکن اگر آپ یہ نہیں چاہتے کہ لبنان میں مسلمانوں کا قتلِ عام ہو اور ہم سب مر جائیں تو پھر آپ کو لبنان میں مداخلت کرنا لازم ہے۔

سوریا کی مداخلت :

حافظ الاسد نے سید موسیٰ الصدر کی بات مان لی اور دوسرے روز "جیش التحریر الفلسطینی" (آزادیٔ فلسطین کی فوج) جو سوریا کی نگرانی میں کام کرتی تھی اس کے ۱۲ ہزار جوان مسلمانوں کی مدافعت اور حمایت میں لبنان میں داخل ہو گئے۔

"جیش التحریر الفلسطینی" یوں تو فلسطینیوں کے نام سے ہے لیکن اس کی مختلف ونگیں تقریباً تمام عرب ممالک میں ہیں۔ اس کا ایک بریگیڈ مصر کی نگرانی میں تھا، ایک اردن میں تھا، ایک عراق میں تھا لیکن ان میں قوی ترین بریگیڈ سوریا میں تھا جس کے اخراجات سوریا کے ذمے تھے اور وہ احکام بھی سوریا کی حکومت سے حاصل کرتا تھا۔ یہ فلسطینی فوج اپنے اسلحے سمیت تین مقامات پر لبنان میں داخل ہوئی۔ اس کا ایک حصہ بڑی سرعت سے خلدہ پہنچ گیا جس نے بیروت کا محاصرہ توڑا۔ ایک اور حصہ 'زحلہ' پہنچا جس نے 'زحلہ' کے شمال میں ایک پل کو اڑا کر اس شہر کو محاصرے میں لے لیا اور تیسرے حصے نے 'زغرتا' پر حملہ کیا جو لبنان کے اس وقت کے صدر سلیمان فرنجیہ کا آبائی شہر تھا۔

ہم ان باتوں کا اس لیے ذکر کر رہے ہیں کیونکہ بائیں بازو کی جماعتیں اور دوسرے بہت سے لوگ حقائق کو نظر انداز کر رہے ہیں اور انھوں نے ان تمام امور کو فراموش کر دیا ہے۔ ان میں سے بہت سے حضرات کو یہ کہتے سنا گیا ہے کہ آخر سوریا نے لبنان میں مداخلت کیوں کی، اسے لبنان سے کیا غرض؟ اگر سوریا لبنان میں مداخلت نہ کرتا تو کیا ہوتا؟ میں نے اس مسئلے کا اس لیے ذکر کیا ہے کہ آپ اچھی طرح جان لیں کہ سوریا نے لبنان کے واقعات میں کیوں مداخلت کی اور کن حالات میں کی اور کن لوگوں کی درخواست پر یہ مداخلت کی۔ بعد ازاں میں تفصیل سے بیان کروں گا کہ ہوا کیا اور انھوں نے وہاں کیا کیا۔

دوسرے دن 'خلدہ' کے پاس سے گزرتے ہوئے میں نے دیکھا کہ فلسطینی فوج نے 'خلدہ' کے تمام اہم مواقع پر قبضہ کر لیا ہے۔ یہ معلوم نہ ہوا کہ یہ لوگ کس راستے سے اور کیونکر یہاں پہنچے

Presented by Ziaraat.Com

اور 'عرمون' کا راستہ کھولا تاکہ بیروت تک روٹی، پٹرول وغیرہ پہنچ پائیں اور ساتھ ہی بیروت کے
ہوائی اڈے کی حفاظت ہو سکے کہ وہ 'کتائب' کے قبضے میں نہ آجائے۔ 'کتائب' کا منصوبہ تھا
کہ 'کفرشیما' کی راہ سے ہوائی اڈے پر حملہ کریں اور اس پر تسلط حاصل کر لیں۔ بہرحال فلسطینی فوج
پہاڑی راستوں سے 'خلدہ' پہنچی تاکہ پہلے تو بیروت کا محاصرہ توڑا جائے (خوشی کی بات تھی کہ
بیروت صرف چار دن محاصرے میں رہا) اور پھر ہوائی اڈے کو 'کتائب' کے ہتھے چڑھنے سے بچایا جائے
'جیش التحریر' نے لبنان میں داخل ہو کر 'زحلہ' کا محاصرہ کر لیا اور 'زغرتا' پر زوردار حملہ
کیا۔ یہ شہر سلیمان فرنجیہ کی جائے ولادت اور ایک طرح سے اس کا پایۂ تخت ہے۔ وہاں ایک
ملیشیا بھی بنائی گئی تھی جس کا نام 'جیش التحریر الزغرتاوی' تھا سلیمان فرنجیہ کو کتائبیوں سے بھی
اطمینان نہ تھا اس لیے وہ ذاتی محلات اور قصرِ صدارت کی حفاظت کے لیے اس ملیشیا کو استعمال
کرتا تھا[1] اس شہر میں بڑے بڑے سربرآوردہ اور اربابِ اقتدار عیسائی اکٹھے ہو گئے تھے۔
یہاں زمین دوز اسلحہ ساز فیکٹریاں تھیں۔ اور ہر فوجی اہمیت کے موقع کی بڑی کڑی نگرانی کی
جاتی تھی۔ اس لحاظ سے اس شہر کی تسخیر بہت مشکل گردانی جاتی تھی۔ لبنان میں داخل ہو کر
'جیش التحریر الفلسطینی' نے پہلا اقدام یہ کیا کہ زغرتا پر حملہ کیا اور اس کے مرکز تک جا پہنچی۔
اس پیش قدمی میں اس فوج کے ۱۲۰ افسر اور جوان شہید ہوئے۔ یہ مذاق نہ تھا۔ جیش التحریر نے
بیروت کے محاصرے کو توڑنے اور 'زحلہ' کا محاصرہ کرنے کے ساتھ 'زغرتا' پر حملہ کیا ہی اس
نیت سے تھا کہ اس کو فتح کر کے بالکل برباد کر دیا جائے۔

جب عیسائیوں (کتائب اور فرنجیہ) نے حکومت سوریا کے ارادے کو بھانپا تو انھوں
نے سرِ تسلیم خم کر دیا اور جنگ بندی مان لی۔ 'کتائب' جو یہ کہتے تھے کہ ہم سب سے زیادہ طاقتور ہیں
اس لیے جنگ بندی قبول نہیں کرتے اور جنھوں نے اس گھمنڈ میں بیروت کو فتح کرنے کی کوشش
کی تھی، جب انھوں نے اپنے مقابل میں بڑی طاقت کو دیکھا اور یہ خدشہ پیدا ہوا کہ 'زحلہ' اور

[1] بعد ازاں جیش التحریر الزغرتاوی کو توڑ کر اس کے بجائے لواء المردہ قائم ہوئے جس کے معنی مردہ کا برگزیدہ
ہے اور مردہ مارونیوں کا تاریخی نام ہے۔ اس ملیشیا کا کتائب سے تصادم ہوتا رہتا ہے لیکن مسلمانوں کے خلاف
یہ سب گروہ اکٹھے ہو جاتے ہیں۔

'زغرتا' مفتوح ہو جائیں گے تب جا کر انھوں نے جنگ بندی قبول کر لی اور یوں ایک بار پھر
لبنان میں امن و امان قائم ہوا۔

فلسطین کی فوج آزادی کے لبنان میں داخل ہونے کے ایک دن بعد 'دامور' کا قصبہ
فتح ہوا۔ یہ خوبصورت قصبہ بیروت کے جنوب میں صیدا کے راستے پر واقع ہے اور اس وقت
کتائب اور کمیل شمعون کی پارٹی حزب الاحرار کا بہت بڑا اڈا تھا۔ اس شہر کو فلسطینی فدائیوں اور
دیگر جنگ آزماؤں نے جن کی تعداد کوئی چھ سات ہزار نفر تھی، فتح کیا۔ ایک چھوٹا سا پمفلٹ
"شہدائے شیعہ" کے نام سے شائع ہوا ہے جس میں ان شیعہ مجاہدین کے نام درج ہیں جنھوں نے
'دامور' اور اس کے بعد 'سعدیات' کی فتح میں شرکت کی اور شہید ہوئے[1]

سب سے پہلا گروہ جس نے 'سعدیات' میں شمعون کے محل اور 'دامور' پر حملہ کیا امور
کے "حرکۃ المحرومین" کے بیس ہزار جنگ آزماؤں پر مشتمل تھا جنھوں نے اللہ اکبر کے نعروں کے
ساتھ اس شیطانی مرکز پر حملہ کیا اور آر۔ پی۔ جی کی مدد سے اس محل کی چاردیواری میں سوراخ کیے اور
اور اس محل میں داخل ہو کر اسے فتح کیا۔ اللہ اکبر کے نعرے اس قدر پُرجوش تھے کہ کمیونسٹ پارٹی
کے رضاکار بھی جو بعد میں اس محل میں داخل ہوئے بڑے زور سے اللہ اکبر کے نعرے لگا رہے تھے۔

البتہ کمال جنبلاط نے 'دامور' اور 'سعدیات' پر حملے کی شدید مخالفت کی اور اپنے
'دُرزی' رضاکاروں کو پہاڑی مرکزوں سے روانہ کیا تاکہ وہ اس حملے کو روک سکیں لیکن یہ رضاکار
اس وقت وہاں پہنچے جب 'دامور' اور 'سعدیات' فتح ہو چکے تھے اس پر ان لوگوں نے لوٹ مار
پر اکتفا کی۔

بہرحال 'دامور' اور 'سعدیات' فتح ہو چکے تھے اور 'زحلہ' اور 'زغرتا' بھی فتح ہونے
والے تھے ان حالات میں سلیمان فرنجیہ اور کتائب نے جنگ بندی قبول کی جو تقریباً ڈیڑھ ماہ

[1] اس کتاب کے ایک باب میں آگے چل کر 'دامور' اور 'سعدیات' کی فتح کا ذکر ہے اور وہاں پر پیش
آنے والے فداکاری و شجاعت کے واقعات کا بیان ہے۔ پاکستانی اخباروں میں 'دامور' اور 'سعدیات'
کی فتح کا سہرا صرف فلسطینی فدائیوں کے سر بندھا تھا کیونکہ مغربی ذرائع ابلاغ نے یہی بیان کیا تھا اور ان کے
اس بیان کے پسِ پردہ ان کے اپنے مفادات وابستہ تھے۔

Presented by Ziaraat.Com

تک برقرار رہی۔ اس دوران میں 'النبعہ'، 'تل الزعتر' اور 'برج حمود' کے مناطق میں گھومتا پھرا ہوں۔ کتائب میں اس زمانے میں جرأت نہ تھی کہ کسی مسلمان کو ترچھی نگاہ سے دیکھ سکیں جس کا سبب جیش التحریر کا خوف اور 'زحلہ' اور 'زغرتا' کے سقوط کا خدشہ تھا۔

دستوری دستاویز:

جنگ بندی کے بعد حافظ الاسد نے فلسطینی مزاحمت سے خطاب کیا اور کہا کہ بتائیے آپ کیا چاہتے ہیں۔ لکھ دیجئے ہم اسے نافذ کریں گے۔ یہ الفاظ حافظ الاسد کی اس تقریر سے ہیں جو انھوں نے ۲۰ جون ۱۹۷۶ء کو خانہ جنگی کی ابتداء کے ڈیڑھ سال بعد کی اور اس سلسلے میں ان کی اہم ترین تقاریر میں سے ہے لیکن افسوس ہے کہ غیر ملکی اخبارات میں اس تقریر کے صرف وہی حصے شائع ہوئے جو حافظ الاسد کے خلاف جاتے تھے۔ اس تقریر میں انھوں نے کہا تھا کہ ہم فلسطینی مزاحمت کے سامنے یہ تجویز رکھتے ہیں کہ وہ لبنان کے بارے میں اپنے تمام مطالبات ضبطِ تحریر میں لے آئیں اور ہم اس بات کی ضمانت دیتے ہیں کہ وہ مطالبات پورے ہوں گے۔ یاسر عرفات اور فلسطینی تحریک کے وہ تمام رہنما جن کا اس تقریر میں ذکر ہے، مل بیٹھے اور انھوں نے سات نکات پر مبنی اپنے مطالبات پیش کیے جن میں اہم ترین حسبِ ذیل ہیں:

۱۔ فلسطینی مزاحمت فلسطینیوں کی واحد نمائندہ جماعت ہے۔

۲۔ فلسطینی کیمپوں کے اندر فلسطینیوں کو حق ہوگا کہ وہ اپنے دفاع کے لیے بھاری اسلحہ جس میں راکٹ، میزائل، ہوائی جہاز شکن توپیں، زمین سے زمین پر مار کرنے والے راکٹ وغیرہ شامل ہیں، رکھ سکیں۔

۳۔ فلسطینیوں کو حق ہوگا کہ اپنے کیمپوں سے ۲۵ میٹر کے فاصلے پر کمین گاہیں، سلامتی کوچے اور مورچے بنائیں تاکہ تمام ممکن حملوں کے موقع پر کیمپوں کا دفاع کر سکیں۔

۴۔ حکومتِ لبنان فلسطینیوں کو لبنان سے خارج کرنے کا منصوبہ ترک کردے اور لبنان میں ان کے وجود کو تسلیم کرلے۔

اسی طرح حافظ الاسد نے لبنانی مسلمانوں کے رہنماؤں سے بھی کہا کہ وہ بھی اپنے مطالبات ضبطِ تحریر میں لے آئیں۔ انھوں نے بھی فلسطینی لیڈروں کے مانند اپنے مطالبات سات نکات کی صورت میں تشکیل دیے۔ وہ مطالبات حسبِ ذیل ہیں:

۱۔ صدرِ مملکت قانون سے بالاتر نہ ہو اور اگر وہ کوئی خلاف ورزی کرے تو عدالت اس پر مقدمہ چلا سکے اور تنبیہ کر سکے (لبنان کا صدر بھی سابق شاہ ایران کے مانند قانون سے بالاتر حیثیت رکھتا تھا اور ہر قسم کی ذمہ داری سے مبرّا قرار دیا جاتا تھا)۔

۲۔ وزیرِ اعظم کو پارلیمنٹ منتخب کیا کرے نہ کہ صدرِ مملکت۔ اس کے اختیارات میں اضافہ کیا جائے اور صدرِ مملکت صرف دستوری سربراہ کی حیثیت رکھتا ہو۔

۳۔ مسلمان اور عیسائی ارکان پارلیمان کی تعداد برابر ہو (اس سے قبل عیسائی ارکان کی تعداد مسلمانوں سے زیادہ تھی اس لیے پارلیمان میں رائے انھیں کی چلتی تھی)۔

۴۔ سرکاری ملازمتوں میں فرقہ وارانہ امتیازات کو ختم کیا جائے یعنی ملازمت کے امیدوار سے اس کے مذہب کی اساس پر سلوک نہ کیا جائے۔ اس سے قبل تمام اہم عہدے عیسائیوں بالخصوص مارونیوں کو ملتے تھے اور صفائی اور مزدوری کا کام مسلمانوں کو دیا جاتا تھا۔ لہٰذا اس امتیازی سلوک کا ختم ہونا لازم ہے۔

۵۔ فوج میں شیعوں کی بھرتی کے بارے میں پابندیوں کو ختم کیا جائے جیسا کہ بیان ہو چکا ہے کہ اگر کوئی شیعہ فوج میں بھرتی ہونا چاہے تو اس کے مقابلے میں ایک عیسائی رضاکار کا آنا بھی لازم تھا۔ کیونکہ لبنان کے پا برہنہ، گرسنہ اور محتاج لوگوں کی اکثریت مسلمانوں پر مشتمل تھی اور یہ لوگ بھوک سے فرار کے لیے فوج کا رخ کرتے تھے۔ اگر فوج میں ان کے داخلے پر پابندی نہ ہوتی تو ان کی بہت بڑی تعداد بھرتی ہو جاتی۔ خصوصاً شیعہ۔ اس بات کی روک تھام کے لیے یہ قانون بنایا گیا تھا کہ ایک مسلمان کے مقابلے میں ایک عیسائی بھی بھرتی ہو۔ یہ بات مضحکہ خیز تھی اور اس کی بناء پر مسلمان مجبور تھے کہ بھرتی ہونے کے لیے کسی عیسائی کو رشوت

Presented by Ziaraat.Com

دے کر یا کوئی اور وعدہ کرکے فوج میں بھرتی ہونے پر آمادہ کریں تاکہ وہ فوج میں ملازم ہو پائیں اس لیے جدید نظام میں اس پابندی کو ختم کرنا لازم ہے ۔

۶ ۔ شہریت دینے کا مسئلہ حل ہو۔ اس کی اصل یہ ہے کہ بعلبک اور اس کے گرد و نواح میں تقریباً ۴۵ ہزار شیعہ ایسے تھے جن کے پاس شناختی کارڈ نہیں تھے کیونکہ فرانسیسی انتداب کے زمانے میں انھوں نے فرانسیسیوں کے پاس اپنے نام رجسٹر کروانے سے انکار کر دیا تھا۔ ہر چند کہ وہ مدت سے لبنان میں مقیم تھے تاہم وہ شناختی کارڈ سے محروم تھے ۔ حکومت اس امر کو پسند نہیں کرتی کہ یہ لوگ شناختی کارڈ حاصل کرلیں اور یوں شیعوں کی تعداد میں اضافہ ہو۔ لہٰذا اس تجویز کے مطابق ان تمام اشخاص کو جو لبنان میں سکونت پذیر ہیں لبنانی تسلیم کیا جائے اور انھیں شناختی کارڈ دیے جائیں۔[1]

۷ ۔ محرومین (شیعوں) کے مطالبات کو (جن کا ذکر آچکا ہے) منظور کیا جائے اور عدل اجتماعی کو بحال کیا جائے ۔

جیسا کہ آپ جانتے ہیں سید موسیٰ الصدر نے تین سال قبل (۱۹۷۳ء) لبنان میں عدلِ اجتماعی کو برقرار کرنے کے لیے حکومتِ لبنان کے سامنے ۲۵ مطالبات رکھے تھے جن میں لیطانی بند کی تعمیر، جنوبی لبنان میں آٹوبان (شاہراہ) کی تعمیر اور وہاں صنعتی اور زرعی منصوبوں کی تنفیذ وغیرہ شامل تھے ۔

---

[1] لبنانی نظام کی بوالعجبیوں میں سے ایک بات شناختی کارڈوں اور شہریت کا حصول ہے ۔ وہ لبنانی عیسائی جو ۵۰ ۔ ۶۰ سال قبل، لبنان ترک کرکے برازیل یا ارجنٹائن یا دوسرے ممالک کی شہریت حاصل کر چکے تھے ان کو شناختی کارڈ فوراً مل جاتا تھا لیکن مسلمان اس سے محروم تھے ۔ حتیٰ کہ اگر کوئی عیسائی لبنان میں آجائے جس کا کوئی دُور کا عزیز لبنانی ہو تو اسے شہریت اور شناختی کارڈ مل جاتے تھے لیکن وہ مسلمان جو لبنان میں رہتے تھے وہ اس سے محروم تھے ۔ لبنان میں شیعوں کے علاوہ کردوں کی بہت بڑی تعداد اس ظلم کا شکار ہے ۔ مترجم کی ایک ہم جماعت نورا کلابک (Nora Klobak) کو جو چیکوسلواکیہ سے آئی تھی تین ماہ کے بعد لبنانی جنسیت مل گئی تھی کیونکہ وہ ارمنی عیسائی تھی ۔ لیکن کردوں کو پچاس سال گزرنے پر بھی اس 'نعمت' سے محروم رکھا گیا ہے ۔

فلسطینیوں کے بارے میں یہ سات نکات اور لبنانیوں کے بارے میں سات نکات یعنی کُل چودہ نکات پر مشتمل نظامِ جدید کی تشکیل کی اس دستاویز کو دستوری دستاویز کا نام دیا گیا۔ یہ دستاویز کامل طور پر اپنے دَور کے حالات سے ہم آہنگ تھی۔ ہر چند یہ کوئی مثالی دستور نہ تھی۔ لیکن ماضی کے مقابلے میں یہ دستوری سفارشات مسلمانوں کے لیے جاذبِ توجہ تھیں۔ یہ دستور پہلے دن ہی سے تمام مسلمان رہنماؤں نے قبول کر لیا لیکن عیسائی اسے قبول کرنے پر آمادہ نہ تھے کیونکہ اس سے ان کی مراعات ان کے ہاتھ سے جاتی دکھائی دیتی تھیں ۔

سوریا کے وزیرِ خارجہ عبدالحلیم خدّام لبنان آئے اور انھوں نے وہاں کے عیسائیوں اور کتائب پر دباؤ ڈالا کہ وہ اس دستاویز میں موجود شرائط کو قبول کر لیں لیکن فرنجیہ اور کتائب نے صاف انکار کر دیا اور فلسطینیوں کے بارے میں کہا کہ ان کا کام فلسطین کو آزاد کرانا ہے لیکن لبنان کے حالات سے ان کا کوئی سروکار نہیں۔ حافظ الاسد ان پر دباؤ ڈال رہے تھے کہ ان چودہ نکات کو جوں کا توں تسلیم کیا جائے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کتائب اور فرنجیہ دونوں نے ان ساری شقوں کو مان لیا۔ خود فرنجیہ نے ریڈیو لبنان سے ایک سرکاری بیان میں انھیں قبول کرنے کا اعلان کیا۔ اب سوریا کے وزیرِ خارجہ عبدالحلیم خدّام نے لبنان میں کابینہ کی تشکیل کے لیے کام شروع کیا تاکہ نظامِ جدید کی اساس پر حکومت امن و امان برقرار رکھ سکے ۔

نظامِ جدید کے مطابق ۱۸ وزیر ہونا چاہییں تھے جن میں ۹ عیسائی اور ۹ مسلمان ہونا تھے عیسائیوں نے اپنے ۹ وزیر چُن لیے لیکن مسلمان اپنے ۹ وزراء کے بارے میں کسی متفق فیصلے پر نہ پہنچ پائے۔ مسلمانوں میں شخصی مفادات یا زیادہ سیاسی مراعات کی اساس پر اختلاف پیدا ہو گیا۔ یہاں اہلِ سنت اور شیعوں کا تناسب غور طلب ہے۔ لبنان میں اہلِ سنت کی تعداد پانچ لاکھ پچاس ہزار ہے جبکہ شیعوں کی تعداد دس لاکھ سے زاید ہے۔ یہ اعداد و شمار ۱۹۷۶ء سے تعلق رکھتے ہیں۔ ہر چند کہ کمال جنبلاط اور بائیں بازو کی جماعتوں نے تجویز پیش کی تھی کہ وزراء کی تعداد آبادی کی نسبت سے مقرر کی جائے تاہم جب انھوں نے دیکھا کہ شیعہ اپنی تعداد کے اعتبار سے وزراء اور ارکانِ پارلیمان کی اکثریت کے انتخاب پر قادر ہو جائیں گے تو انھوں نے دباؤ ڈالنا شروع کیا کہ اس تجویز پر عمل نہ ہو۔ سید موسیٰ الصدر نے اس مسئلے کے بارے میں اپنی رائے دیتے ہوئے کہا کہ ۹ وزراء میں سے

Presented by Ziaraat.Com

ایک ڈروزی ہو (جو کمال جنبلاط کا فرقہ ہے) باقی شیعوں اور سنیوں میں برابری ہو یعنی شیعہ اپنی اکثریت کے حق کو چھوڑتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود بیروت کے مسلمان عمائدین نے خدام پر دباؤ ڈالا کہ شیعہ وزراء کی تعداد ۳ ہو اور ۵ وزراء سنی ہوں۔ اس سے بڑھ کر افسوس ناک بات یہ تھی کہ ان تین تجویز شدہ شیعہ وزراء میں سے ایک محسن دلول[1] تھا جو کمال جنبلاط کا آلۂ کار اور حاشیہ بردار تھا اور شیعہ فرقے کے شدید ترین دشمنوں میں شمار ہوتا تھا کیونکہ اس کا کمیونسٹ ہونا اسی بات کا متقاضی تھا۔ اس شخص کو شیعہ نمائندہ قرار دیے جانے کے مسئلے پر سیاسی کشمکش شروع ہوئی[2]۔ شیعوں کے ایک دوسرے نمائندے کے طور پر عادل عُسیران[3] کا نام تجویز کیا جا رہا تھا جو ایک جاگیردار تھے اور ان تمام مطالبات کے خلاف تھے جو 'حرکت المحرومین' نے پیش کر رکھے تھے۔ شیعوں کے لیے اب ایک نام باقی رہ گیا تھا اور وہ نبیہ بری[4] تھے جن کا تعلق 'حرکۃ المحرومین' سے تھا۔ اس پر سید موسیٰ الصدر غصے میں آگئے اور کہنے لگے کہ ہمیں ایک نمائندہ بھی نہیں چاہیے ہمارا ہدف تو لبنان میں صلح صفائی کی فضا پیدا کرنا ہے آپ مسلمان نمائندوں کو آپس ہی میں بانٹ لیں لیکن یہ بات اجتماعی عدل کے خلاف ہے۔

---

[1] یہ صاحب اس سے قبل کامل الاسعد کے حاشیے میں شامل تھے اور اس گروہ کے سرخیل تھے جس نے شیعوں میں بیداری کی تحریک کی سرتوڑ مخالفت کی تھی۔ ان حضرت کا کام چڑھتے سورج کی پرستش تھا۔

[2] اس قسم کی صورت حالات ۱۹۴۶ء میں ہمارے ہاں پیدا ہوئی جب کانگریس مصر تھی کہ ابوالکلام آزاد کو مسلمانوں کے نمایندے کی حیثیت دی جائے اور قائد اعظم نے انکار کر دیا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ استعماری اور مفاد پرست طاقتیں ہر جگہ ان لوگوں کی پشت پناہی کرتی ہیں جو ان کے حاشیہ بردار ہوں تاکہ وہ ان گروہوں کے مفاد کو زک پہنچائیں جن کی نمائندگی کا انھیں دعویٰ ہو۔

[3] لبنان میں پارلیمنٹ کے سپیکر شیعہ ہوتے ہیں اور جب سے لبنانی پارلیمنٹ بنی ہے یا عادل عسیران سپیکر ہوتے ہیں یا کامل الاسعد۔ اور ان دونوں کا تعلق اس گروہ سے ہے جنھوں نے شیعوں کو پسماندہ رکھنے اور کچلنے میں بڑے کارہائے نمایاں سرانجام دیے ہیں۔

[4] یہ نبیہ بری آج کل امل ملیشیا کے رہنما ہیں اور لبنان میں استعمار کے خلاف جہاد میں ان کا بڑا حصہ ہے ۱۹۸۴ء میں ہونے والے معاہدے کے مطابق ان دنوں یہ لبنانی کابینہ میں شامل ہیں اور ایک نئی وزارت جنوبی لبنان کا قلمدان ان کے سپرد ہے۔

باوجودیکہ سید الصدر شیعوں کے حق سے دست بردار ہو گئے، دوسرے حضرات کسی فیصلے تک نہ پہنچ پائے۔ کمال جنبلاط کا منشا یہ تھا کہ نو کے نو نمائندے اس کے حسب خواہش اور اس کے حاشیہ بردار ہوں۔ اسی طرح صائب سلام اور رشید کرامی بھی یہ چاہتے تھے کہ زیادہ سے زیادہ نمائندے انھیں کے ہوں۔ مسلمان لیڈروں میں بیروت اور عرمون کانفرنس میں جو چیخ پکار ہوئی اس پر عبدالحلیم خدام ناراض ہو گئے اور کہنے لگے کہ میں یہاں اس لیے نہیں آیا کہ مختلف لیڈروں کے مفادات کی نگہداشت کروں میرا مقصد تو یہ ہے کہ مسلمانوں اور عیسائیوں میں صلح کی فضا پیدا کروں اس لیے میں بیروت سے جا رہا ہوں تاکہ آپ اپنے داخلی اختلافات کو خود حل کر لیں۔ اس کے بعد میں دوبارہ آجاؤں گا تاکہ آپ کے اور عیسائیوں کے مابین کوئی فیصلہ کرا سکوں۔ یوں عبدالحلیم خدام بیروت سے چلے گئے۔ ان کے جانے کے فوراً بعد بیروت میں دوبارہ فسادات شروع ہو گئے لیکن اس دوران میں کوئی ڈیڑھ ماہ لگ گیا تھا اور اپنی تمام تر کوششوں کے باوجود خدام اس قابل نہ ہوئے کہ لبنان میں کابینہ کی تشکیل کروا پائیں۔ کابینہ کی تشکیل میں ناکامی کا سبب عیسائی نہ تھے کیونکہ انھوں نے تو اپنے ۹ نمائندے چن رکھے تھے۔ اس کی ذمہ داری تو مسلمانوں پر اور بالخصوص کمال جنبلاط اور بائیں بازو کی جماعتوں پر عائد ہوتی تھی[1] اب دیکھنا یہ ہے کہ اب ہنگامے کیونکر شروع ہوئے۔

عراقیوں کی وساطت سے سازش اور بارِ دیگر خانہ جنگی :

جیسا کہ بیان ہوا ہے احساس یہ ہوتا تھا کہ کوئی سازش کام کر رہی ہے۔ اور کوشش یہ ہو رہی ہے کہ سوریا اور فلسطینی مزاحمت کو زک پہنچائی جائے۔ لیکن 'جیش التحریر' کے لبنان میں آ جانے سے سوریا کو کامیابیاں حاصل ہوئیں کہ اس نے لبنان میں امن قائم کروا دیا۔ لبنان کے لوگ، وہاں کے اخبارات اور سربرآوردہ شخصیتیں سوریا کی تعریف کرتی تھیں کہ اس نے ان کے ملک میں امن و امان قائم کروا دیا اور ان کی جان خلاصی کروائی۔ لیکن سوریا کی یہ عظیم کامیابی اس کے

---

[1] ستم ظریفی کی بات یہ ہے کہ تقریباً شرطوں کو ۱۹۸۴ء میں قبول کر لیا اور رشید کرامی کی سربراہی میں قومی وزارت تشکیل پائی۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ لبنان کے واقعات کو کسی توازن دینے میں کم و بیش آٹھ سال کی تاخیر ہوئی اور اس کا سبب جنبلاط اور ان ساتھیوں کی ضد کے سوا اور کوئی نہیں۔

Presented by Ziaraat.Com

دشمنوں کو ایک آنکھ نہ بھاتی تھی۔ اس لیے انھوں نے سازش کا جال بچھانا شروع کیا۔ ان سازشیوں میں سب سے آگے عراقی تھے۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ عراق اور سوریا کے درمیان بہت سے اختلافی مسائل ہیں۔ ان میں سرحدوں کا مسئلہ، دریائے فرات کے پانی کا مسئلہ اور کردوں کا مسئلہ بھی شامل ہیں۔ اب انھوں نے لبنان میں ان اختلافات کو ظاہر کیا[1]

یہ بات کہتے ہوئے مجھے افسوس ہوتا ہے کہ بیروت کے تمام اخبارات و رسائل کسی نہ کسی غیر ملکی حکومت کے وظیفہ خوار اور آلۂ کار ہیں۔ یہ حکومتیں ان اخبارات کو مالی امداد دیتی ہیں جس کے بغیر ان کا چلنا ممکن نہیں۔ دوسری تمام حکومتوں کے مقابلے میں عراق کے پروردہ اخبارات و رسائل کی تعداد لبنان میں سب سے زیادہ ہے۔ عراق کی حکومت پٹرول سے حاصل ہونے والے پیسے کے نشے میں سرشار اپنے مفادات کی حفاظت کے لیے اخبارات و مطبوعات کے وسیلے سے لبنان میں برسرِ پیکار ہے۔ بائیں بازو کے بڑے بڑے اخبارات میں 'المحرر'[2] بھی شمار ہوتا ہے جو حکومتِ عراق سے پیسہ حاصل کرتا ہے اور اس کا کلمہ پڑھتا ہے۔ اتفاق کی بات یہ ہے کہ اس اخبار کا مشہور ترین کالم نگار شیعہ تھا اور ہم اسے اچھی طرح پہچانتے تھے۔ انقلاب اسلامی ایران سے قبل جب عراق اور ایران میں تعلقات خراب تھے اس وقت وہ کم و بیش ہر روز ایک مضمون شاہِ سابق کے خلاف لکھتا تھا لیکن جب عراق نے شاہ سے صلح کر لی تو پھر اس اخبار میں شاہ کے خلاف ایک لفظ تک بھی شائع نہ ہوا۔ اس اخبار کو یہ حق نہ تھا کہ پیسہ لے کر عراق کے حق میں اور ایران کے خلاف کچھ لکھتا۔

---

[1] عراق اور سوریا میں ان اختلافات سے کہیں زیادہ قوی اختلاف بعث پارٹی کا دو حصوں میں بٹ جانا ہے۔ عراقی بعث میشل عفلق کی رہنمائی میں کام کرتی ہے جو بنیادی طور پر متعصب عیسائی اور اسلام دشمن ہے سوریا کی بعث پارٹی نے عفلق کے لیے سزائے موت کا حکم سنا رکھا ہے۔ وہ آج کل بغداد میں موجود ہے اور اپنے مغربی آقاؤں کے اشاروں پر مسلمانوں کو آپس میں لڑوا رہا ہے۔

[2] "المحرر" صدر عبد الجمال الناصر کی زندگی میں قومی عربی تحریک کا نقیب تھا، عبد الناصر کا کلمہ پڑھتا تھا اور عراق و شام دونوں کی بعثی روش پر نفرین کرتا تھا۔ اس اخبار نے ۱۹۶۷ء کی جنگ میں مصر اور اس کے بعد مصر سے خوب پیسہ حاصل کیا اور اس کے مالک اور ایڈیٹر لوگوں کے دیکھتے دیکھتے لکھ پتی بن گئے۔

اسی طرح ایک اور اخبار ہے جس کا نام 'بیروت' ہے یہ بھی عراق سے مال لیتا ہے اور اس کے حق میں مضامین شائع کرتا ہے۔ ان اخباروں نے حافظ الاسد اور سوریا کو گالیاں دے کر اپنا کام شروع کیا۔ ہم یہ باتیں سوریا کی مدافعت کے طور پر بیان نہیں کر رہے کیونکہ ہم سوریا کے مفادات کے وکیل نہیں۔ سوریا کی حکومت نے بہت سے ایسے کام کیے ہیں جو منفی حیثیت رکھتے ہیں اور ہم ان کے مخالف ہیں۔ لیکن اس وقت تو ہم اس بات کا تجزیہ کر رہے ہیں کہ دوبارہ خانہ جنگی کیونکر شروع ہوئی اور وہ کون لوگ ہیں جو اس کا باعث ہوئے۔ سوریا اور عراق کے درمیان اختلافات ہیں جن کا تعلق سرحدوں اور داخلی امور سے ہے لیکن وہ ان اختلافات کو لبنانی صورتِ حالات میں بھی کھینچ لاتے ہیں اور دوبارہ خانہ جنگی کا موجب بنتے ہیں اور ان سے فائدہ اٹھاتے ہیں تو امریکہ اور اسرائیل تینوں۔ ان کے ہم نوا۔

بہرحال عراقی مشینری ساری کی ساری حافظ الاسد اور سوریا کے پیچھے پڑ گئی اور وہ بھی کس وقت؟ جب پورے کا پورا لبنان اور خود فلسطین کی تحریک مزاحمت سوریا کی شکر گزار ہو رہی ہے کہ اس نے مسلمانوں کو عیسائیوں کی دستبرد سے نجات دلائی اور جنگ بندی پر عملدرآمد ہونے کا باعث ہوئی؛

آہستہ آہستہ خود کمال جنبلاط بھی اس ہنگامے میں شریک ہوتا گیا۔ اس نے دستوری دستاویز کا مسئلہ دوبارہ چھیڑ دیا حالانکہ وہ خود اس دستاویز کو قبول کرنے والوں میں سے تھا۔ کمال جنبلاط نے اعلان کیا کہ یہ دستور مناسب نہیں اور وہ اس لیے کہ اس میں لبنان کی صدارت کو عیسائیوں کے حوالے کر دیا گیا ہے ہم اسے قبول نہیں کرتے اور زیادہ حقوق چاہتے ہیں۔ اسی طرح بائیں بازو کی جماعتیں بھی کمال جنبلاط کے مانند صدارت والی شق کے پیچھے پڑ گئیں اور انھوں نے پہلے سوریا اور پھر آقائے موسیٰ الصدر کی بدگوئی شروع کر دی۔ انھوں نے یہ مطالبہ کیا کہ اس دستوری دستاویز کو منسوخ کر دیا جائے۔

لبنان میں ایک جماعت "الصاعقہ" نام کی ہے جس کا تعلق اور وابستگی سوریا سے ہے۔ اس کا لیڈر 'زہیر محسن' نام کا ایک شخص ہے جس میں کم عقلی اور غرور یکجا ہو گئے ہیں۔ یہ جماعت بھی 'الجبهة الشعبية'، 'القيادة العامة' اور دیگر فلسطینی محاذہائے آزادی کے مانند ایک فلسطینی تنظیم ہے جس کا میلان بائیں بازو کی طرف ہے۔ فتح کے بعد لبنان میں سب سے زیادہ باثر تنظیم ہے اور

Presented by Ziaraat.Com

سوریا کی حکومت اس کی مدد کرتی ہے۔ اس تنظیم کے کارکن کوئی اچھی شہرت کے مالک نہ تھے اور نہ ہیں۔ زہیر محسن[1] خود فلسطینی ہے لیکن وہ اپنے ذاتی مفادات کے پیشِ نظر بہت سی غلطیوں کا مرتکب ہوا ہے۔ ایک غلطی اس کی یہ تھی کہ جب 'المحرر' اور 'بیروت' نے سوریا کے خلاف محاذ قائم کر رکھا تھا اور حافظ الاسد کو بے نقط گالیاں دینا اپنا وطیرہ بنا رکھا تھا اس وقت زہیر محسن کی تنظیم 'الصاعقہ' کے رضاکاروں نے ان دونوں اخباروں کے دفتروں کو راکٹوں اور آر پی جی کا نشانہ بنایا۔ ان کی عمارتوں کو آگ لگا دی اور بہت سے اشخاص کو مار کر اپنے دل کی آگ کو ٹھنڈا کیا۔

یہ واقعہ لبنان میں مسلمانوں کے مابین باہمی تصادم کی ابتداء تھا جس میں عراقیوں اور سوریوں نے حصہ لیا اور یہ واقعہ عین اس وقت رونما ہوا جب عیسائیوں نے خاموشی اختیار کر لی اور مسلمانوں کی طرف بُری نیت سے دیکھنے کی جرأت بھی نہ کرتے تھے۔ محض اس بات سے کہ مسلمانوں میں باہمی اختلاف اس حد تک پہنچ گیا تھا کتائب نے آہستہ آہستہ سر اٹھانا شروع کیا۔ انھوں نے سوچا کہ اب مسلمانوں میں اختلاف رُونما ہو چکا ہے اس لیے لازم ہے کہ ہم اس سے فائدہ اٹھائیں۔ انھوں نے اپنی کارروائیوں کی ابتداء اس طریقے پر کی جسے عربی میں قنقص کہتے ہیں یعنی ماہر بندوق باز کمین گاہوں میں چھپ کر بیٹھ جاتے ہیں اور ہر چلتی پھرتی چیز کو گولیوں کا نشانہ بناتے ہیں تاکہ امن و امان کی صورتِ حال خراب ہو اور پھر میدانِ کارزار گرم ہو جائے۔ وہ لڑتے نہیں تھے لیکن گڑبڑ اور بدامنی ضرور پھیلاتے تھے۔ پہلے تو کتائب نے اکا دکا اشخاص کو گولیوں کا نشانہ بنایا اور پھر انھوں نے راہ چلتوں کو پکڑ کر گم کرنا شروع کیا۔ ایک آدھ مسلمان نوجوان کو غائب کر دیتے تاکہ لوگوں میں تشویش پھیلے اور دوبارہ خانہ جنگی شروع ہو۔

افسوسناک بات یہ ہوئی کہ فلسطینی مزاحمت کے بعض بائیں بازو کے ساتھ وابستہ افراد نے مثلاً جبهة التحرير العربية جو عراق کا طرف دار ہے، اسی داستان کو دہرانا شروع کر دیا۔ یہ وہی مسئلہ ہے جس کا ہم ذکر کر چکے ہیں۔ جب مزاحمت کے بائیں بازو کے افراد کسی منصوبے پر عمل کرنا شروع کر دیتے تو فتح کے لیڈر اگر اس کے مخالف بھی ہوتے تو خاموش رہتے کیونکہ فلسطینی مزاحمت کے

---

[1] زہیر محسن کو ۱۹۸۱ء میں جنوبی فرانس میں کسی نے قتل کر دیا اور اب تک اس کے قاتلوں کا سراغ نہیں ملا۔ قرائن سے پتا چلتا ہے کہ عراقی ایجنٹوں نے بیروت کے واقعات کا بدلہ لینے کے لیے اسے قتل کروا دیا کر دیا۔

بائیں بازو کے افراد کا 'فتح' کے ارکان پر بھی اثر و نفوذ تھا۔ یوں پوری کی پوری فلسطینی مزاحمت خواہی نخواہی اس میں شریک ہو جاتی۔

بہر حال اس بناء پر کہ فلسطینی مزاحمت "فتح" میں ایک فکری اور نظریاتی خلا تھا مارکسی میلانات رکھنے والے افراد اس سے فائدہ اٹھاتے اور اپنے خیالات و افکار کو پھیلا کر تمام نوجوان افراد اور طالب علموں کو اپنی جانب راغب کر لیتے۔ فلسطینی مزاحمت کے درجہ اوّل کے رہنماؤں میں صرف ایک شخص "ابو صالح" مارکسی ہے باقی سب مسلمان ہیں۔ دوسرے درجے کے رہنماؤں میں سب کے سب مارکسی ہیں۔ ان میں سے جس شخص نے ہمیں سب سے زیادہ نقصان پہنچایا، بُرا بھلا کہا، گالیاں دیں اور خیالات کو توڑ مروڑ کر پیش کیا وہ 'ماجد ابو شرار' ہے۔ یہ شخص پکا مارکسی ہے اور تمام فلسطینی مطبوعات اور نشر و اشاعت کا ذمہ دار ہے۔ فلسطینی خبر رساں ایجنسی "وفا" (وکالة فلسطين للأنباء) اور فلسطینی اخبار "فلسطين الثورة" اسی کی نگرانی میں کام کرتے ہیں۔ یہ وہ شخص ہے جو یاسر عرفات تک کو بُرا بھلا کہتا رہتا ہے۔ تو ظاہر ہے کہ ہمیں اور ہمارے دوستوں کو کیا کچھ نہ کہے گا۔ یہ وہ شخص ہے جو بہت بڑی حد تک سوریا کے ساتھ گڑبڑ کا باعث ہوا۔ اخباروں میں سوریا کو جو گالیاں پڑیں وہ سب اسی کا کیا دھرا تھا۔ یاسر عرفات نے کوئی ڈیڑھ ماہ پہلے اس کو اس کے کرتوتوں کی بناء پر معزول کر دیا تھا جس کی تفصیل ہم آگے چل کر بیان کریں گے لیکن اس نے بائیں بازو کے افراد کی مدد سے دوبارہ عمل دخل حاصل کر لیا اور اپنا کام جاری رکھا۔ تین دن قبل (۱۹۷۶ء) میں نے ایک اخبار میں پڑھا کہ یہ شخص فلسطینی مزاحمت کے نمائندہ کی حیثیت سے عرب ملکوں کے وزراء کی کانفرنس میں شریک ہوا ہے اور فلسطین کی ترجمانی کی ہے۔

خیر، فکری خلا کی بناء پر مارکسی عناصر نے دانشوروں، طالب علموں اور قیادت کے اعلیٰ درجوں میں نفوذ حاصل کر لیا اور ان کی اکثریت کو اپنے زیرِ اثر لے آئے۔ البتہ یہ بات میں اشارتاً کہتا چلوں کہ فلسطینی فدائی یعنی فلسطینی قوم مسلمان قوم ہے یعنی با ایمان ہیں۔ ہم کیمپوں میں ان کے ساتھ نماز پڑھتے ہیں۔ تمام فلسطینی مزاحمت میں یاسر عرفات سے زیادہ محبوب شخصیت اور کوئی نہیں۔ تمام فلسطینی مجاہدین پر یاسر عرفات کا اثر

Presented by Ziaraat.Com

ہے۔ لیکن بائیں بازو کے افراد یاسر عرفات کے مخالف ہیں۔ اس سے بھی خطرناک باتیں وہ ہیں جو میں اپنے کانوں سے بائیں بازو کے فلسطینی لیڈروں سے سن چکا ہوں اور وہ یہ کہ ہم یاسر عرفات کو معاف کر دیں گے یعنی قتل کر دیں گے۔ بائیں بازو کے ان لیڈروں نے یاسر عرفات کو ختم کرنا اپنا مقصد بنا رکھا ہے۔ جب کبھی وہ اس قابل ہوئے وہ اپنے ہمنواؤں کے ساتھ مل کر یاسر عرفات کا خاتمہ کر کے رہیں گے[1] ایک بہت بڑا خطرہ جو یہاں سے وجود میں آتا ہے وہ یہ ہے کہ فلسطینی مزاحمت کے مقابلے میں جو "جبهة الرفض" (RF JECTION FRO:NT) قائم ہوا ہے اور جس میں جورج حبش، نائف حواتمہ اور ان جیسے دوسرے لوگ شامل ہیں جن کا ذکر گزشتہ صفحات میں ہو چکا ہے، یہ بھی آزادی فلسطین کے لیے جنگ آزما تنظیم ہے اور فلسطینی مزاحمت "فتح" کی مخالف ہے۔ ان کے اپنے اپنے قائدین ہیں۔ جہاں کہیں نظری اختلاف پیدا ہوتا ہے 'جبهة الرفض'، فلسطینی مزاحمت کے بائیں بازو کے گروپ کا ہم آہنگ و ہم نوا ہو کر یاسر عرفات کے خلاف مورچہ قائم کر لیتا ہے۔ یہ بات خطرے کی اساس ہے۔ یعنی اگر 'جبهة الرفض' خود یاسر عرفات کی مخالفت کرنا چاہے تو یہ بات اس کے بس کا روگ نہیں لیکن خطرے کی بات یہ ہے کہ خود 'فتح' میں بائیں بازو کے لوگ 'جبهة الرفض' کے ہم نوا ہو کر یاسر عرفات یا ان کے افکار کی مخالفت کرتے ہیں دوسرے الفاظ میں ہمارے عقاید و افکار کی مخالفت کرتے ہیں۔

میں ایک بار پھر تکرار کر رہا ہوں اور یہ میرا تکیہ کلام ہے کہ فلسطینی مزاحمت میں فکری اور عقائدی خلاء کی بناء پر بائیں بازو کی جماعتوں نے غلط فائدہ اٹھایا ہے اور تمام نوجوان افراد اور دانشوروں کو اپنے فکری تسلط میں لے آئے ہیں۔ اسی بناء پر کبھی بھی

[1] یہ بات ڈاکٹر چمران نے ۱۹۷۶ء میں لکھی تھی بعد کے حالات نے ان کے ان خدشات کو ثابت کر دیا جن کا اظہار انھوں نے اپنے بیانات میں کیا ہے۔ لبنان میں فلسطینی تحریک کو جو نقصان پہنچا ہے اور طرابلس (لبنان) میں یاسر عرفات اور ان کے ساتھیوں پر جو کچھ بیتی ہے وہ اب تمام دنیا پر واضح ہے۔

بحران کے موقع پر جب آزادئ فلسطین کی راہ معین ہو رہی ہو، فلسطینی مزاحمت (فتح) کے اکثر افراد 'جبهة الرفض' کے ساتھ ہم آہنگ ہو جاتے ہیں یہاں تک کہ یاسر عرفات کی بھی مخالفت کرتے ہیں، یہ سب سے بڑا خطرہ ہے جو تحریک آزادئ فلسطین اور فلسطینی مزاحمت کو درپیش ہے۔

Presented by Ziaraat.Com

باب دوازدہم

خانہ جنگی کا دُوسرا دَور

جیسے کہ میں عرض کر چکا ہوں بائیں بازو کی جماعتوں اور سوریا کے مابین اختلافات کی بناء پر جن کو پہلی مرتبہ عراق نے ہوا دی اور 'الصاعقہ' نے 'المحرر' اور 'بیروت' کے دفاتر پر حملہ کیا تو جبہۃ الرفض اور بائیں بازو کی جماعتوں اور سوریا کے مابین جھگڑے بڑھ گئے۔ جب مسلمانوں میں اختلافات پیدا ہوئے اور وہ ایک دوسرے کے درپے ہو گئے تو 'کتائب' نے چھیڑ چھاڑ شروع کر دی اور عیسائیوں اور مسلمانوں میں ایک بار پھر جنگ شروع ہو گئی یعنی ڈیڑھ ماہ کے امن وسکون کے بعد پہلے سے کہیں زیادہ شدت سے لڑائی کا آغاز ہوا۔ اس موقع پر سید موسیٰ الصدر کا خیال تھا (ہم اس نکتہ پر تکیہ کرتے ہیں کیونکہ بہت سی مشکلات کا آغاز یہیں سے ہوا ہے) کہ سوریا اور فلسطینی مزاحمت کے مابین ہر قسم کا اختلاف شدید غداری کے مترادف ہے۔ اس لیے ہر قیمت پر سوریا اور فلسطین کے مابین اختلافات کو دُور کرنا لازم ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ شرق اوسط میں فلسطینی تحریک کی حمایت کرنے والی سب سے بڑی طاقت سوریا ہے۔ مصر یا اردن یا عراق یا سعودی عرب نہیں۔ اگر فلسطینی تحریک اس طاقت کو کھو بیٹھے تو یکہ و تنہا رہ جائے گی۔ لہٰذا سوریا کے ساتھ ان اختلافات کو ختم کرنا اور فلسطینی مقاومت کی سوریا کے خلاف محاذ آرائی کی روک تھام ہر صورت میں ہونا چاہیے۔

اس لیے جب ہم اس بحرانی مرحلے پر وارد ہوتے ہیں تو سید موسیٰ الصدر اپنا مؤقف اختیار کرتے ہیں تاکہ فلسطینی مقاومت اور سوریا کے مابین صلح کروائی جائے درآنحالیکہ تمام بائیں بازو کی جماعتیں، کمال جنبلاط اور 'جبہۃ الرفض' سوریا کے خلاف محاذ آرا تھے، حافظ الاسد کو گالیاں دیتے تھے اور سوریا کو ہدفِ تنقید بناتے تھے۔ مزید برآں خود فلسطینی مزاحمت میں سے بھی بعض گروہ

ان کے ہمنوا تھے۔ ان کا سرغنہ 'ماجد بوشرار' تھا جس کا ذکر آ چکا ہے اور جو سوریا کے خلاف بڑی شدت سے بدزبانی کا ثبوت دیتا تھا۔ یہی وہ موقع ہے جب لبنان کے پہاڑی علاقے میں لڑائیاں شروع ہوئیں۔

جبلِ لبنان میں لڑائیوں کا آغاز:

اب تک لڑائی کا مرکز بیروت تھا جہاں بالخصوص شیعہ آبادی کے علاقوں میں مسلمان اور عیسائی آپس میں برسرِ پیکار تھے۔ کمال جنبلاط اور بائیں بازو کی جماعتوں نے منصوبہ بنایا کہ لڑائی کا دائرہ وسیع کیا جائے اور لبنان کے پہاڑی مناطق کو بھی اس کی لپیٹ میں لایا جائے۔ ان علاقوں کو اصطلاحاً 'جبل لبنان' کہا جاتا ہے۔ حکومتِ سوریا اس توسیعِ جنگ کی شدت سے مخالفت کرتی تھی اور اس کی مخالفت اصولی اور اساسی تھی کیونکہ سوریا ہی کی وساطت سے لبنان میں امن برقرار ہوا تھا۔ حکومت سوریا کا موقف یہ تھا کہ ہم نے لبنان میں صلح وصفائی کروا دی، دستوری دستاویز تیار کروائی اور اس پر فریقین کی رضامندی حاصل کی۔ اس لیے ہم ہر قسم کی لڑائی کے مخالف ہیں چاہے وہ بیروت میں ہو یا جبل لبنان میں یا کہیں اور، لہٰذا ہم ان کوششوں کا سدِباب کریں گے جن کا مقصد پھر جنگ آزمائی ہو۔ لیکن بائیں بازو کی جماعتیں، کمال جنبلاط کی رہنمائی[1] میں، جبل لبنان میں جنگ کے آغاز کا باعث ہوئیں اور فلسطینی مزاحمت کے ایک حصے نے ان لڑائیوں میں شرکت کی جو ۱۹۷۶ء کے موسم گرما میں وقوع پذیر ہوئیں۔

جبل لبنان میں ہونے والی لڑائیوں میں سب سے بڑی اور مشہور لڑائی 'عینطورہ' میں ہوئی۔ یہ ایک پہاڑی قصبہ ہے جس پر دونوں فریقوں نے بار بار قبضہ کیا۔ اس لڑائی میں زیادہ تر جنگ آزما فلسطینی تھے۔ حکومت سوریا اس کی مخالف تھی کہ فلسطینی ان لڑائیوں میں

[1] کمال جنبلاط کی اپنی ایک جماعت تھی جس کا نام الحزب التقدمی الاشتراکی (ترقی پسند سوشلسٹ پارٹی) تھا۔ لیکن اس کے باوصف باقی تمام ان جماعتوں کا قائد تھا جن کا بائیں بازو سے تعلق تھا۔ ان میں لبنان کی کمیونسٹ پارٹی بعث پارٹی اور کمیونسٹ مزدور پارٹی (حزب العمل الشیوعی) بھی تھیں۔ ان تمام جماعتوں نے کمال جنبلاط کو اپنا لیڈر بنا رکھا تھا اس لیے جب جنبلاط کا ذکر ہوتا ہے تو اس سے صرف اس کی پارٹی مراد نہیں بلکہ بائیں بازو کی تمام جماعتیں مراد ہیں۔

Presented by Ziaraat.Com

شریک ہوں جو مسلمان علاقوں میں نہ ہوں۔ اس لیے سوریا نے فلسطینی مزاحمت کا محاصرہ کر لیا جس کا مطلب اسلحہ کا محاصرہ ہے یعنی اس وقت تک فلسطینی مزاحمت اور بائیں بازو کی جماعتیں اسلحہ، گولا بارود، خوراک وغیرہ سوریا سے حاصل کرتی تھیں۔ اس واقعے کے بعد سوریا نے اپنی سرحدیں بند کر دیں اور کہا کہ ہم اس معاملے میں تمہارے ہم نوا نہیں۔ اس بارے میں حافظ الاسد نے جو تقریر کی اس میں اس جانب واضح اشارے موجود ہیں۔

ایک سو چالیس سال کا بدلہ:

اب ایک قابلِ توجہ بات پر ذرا غور کر لیجئے کیونکہ یہ نہایت اہم ہے۔ لبنان میں کچھ مدت کے لیے امن و امان ہوا تو اس کے ذمہ دار تین افراد تھے، حافظ الاسد، سلیمان فرنجیہ اور یاسر عرفات۔ ان میں اصل کارفرما حافظ الاسد تھے جن کی وساطت سے صلح ہوئی تھی اور فریقین کے مابین لڑائیاں ختم ہوئی تھیں۔ جب بائیں بازو کی جماعتوں نے فلسطینیوں کے تعاون سے نئی لڑائیاں شروع کر دیں تو لبنان کے عیسائیوں نے سوریا کا دامن پکڑا اور اس سے کہا کہ تم نے صلح کی ضمانت دی تھی اور ہم نے جنگ بندی قبول کر لی تھی اس لیے اب تمہاری ذمہ داری ہے کہ تم ان لڑائیوں کی روک تھام کرو اور جنگ کو امن میں تبدیل کرو۔ سوریا نے اس سلسلے میں بے حد دباؤ ڈالا اور اس بارے طول طویل مذاکرات ہوئے۔[۱]

جنبلاط کو دمشق بلایا گیا اس نے دمشق میں حافظ الاسد سے بات چیت کی کمال جنبلاط نے حافظ الاسد سے کہا کہ ہم عیسائیوں سے ایک سو چالیس سال کا بدلہ لینا چاہتے ہیں کیونکہ عیسائیوں نے ایک سو چالیس برس تک ہم پر ظلم و ستم روا رکھا ہے اس لیے اب ہمیں اس کا انتقام لینا ہے حافظ الاسد کا موقف یہ تھا کہ یہ اچھی بات نہیں آپ جنگ شروع کر رہے ہیں اور ہم نے امن و امان کو بحال کروایا ہے۔ اور فریقین نے مصالحت کر لی ہے اب نئی خانہ جنگی ایک سازش ہے اور ہم اس سازش، اس نئی خانہ جنگی کے مخالف ہیں۔ جب کمال جنبلاط ایک سو چالیس سال کے انتقام کا ذکر کرتا، تو

[۱] یہی وہ دن ہیں جب پاکستانی اخباروں اور یہاں کے رومان پسند سیاسی مبصروں نے سوریا پر الزامات عاید کیے کہ وہ عیسائیوں کی حمایت میں مسلمانوں سے جنگ آزما ہے۔ حالانکہ سوریا صرف اس جنگ کو ختم کرانا چاہتا تھا اور فلسطینی انتہا پسندوں کو جو جارج "نائف حواتمہ" وغیرہ عیسائیوں کی سرکردگی میں درپے جنگ تھے اس کام سے روکنا چاہتا تھا۔

حافظ الاسد جواب دیتے کہ یہ بے عقلی کی بات ہے کہ تم محض انتقام کے لیے لبنان کو از سرِ نو جنگ کی آگ میں جھونکنا چاہتے ہو، ہم مسلمان ہیں اور اسلام ہمیں صلح و آشتی اور عدل و انصاف کی تلقین کرتا ہے نہ کہ نفرت و انتقام کی۔ اب تم ایک سو چالیس سال کا انتقام لینے کے لیے از سرِ نو جنگ کی آگ بھڑکانا چاہتے ہو اور ہم اس کے مخالف ہیں۔

یہاں ہم ایک اہم بات کی طرف اشارہ کرنا چاہتے ہیں۔ حافظ الاسد کے خلاف جو پراپیگنڈا لبنان میں ان دنوں جاری تھا اس میں ایک نکتہ یہ تھا کہ حافظ الاسد مسلمان نہیں علوی (نصیری) ہیں اور چونکہ علوی یا نصیری مسلمان نہیں[۱] اس لیے حافظ الاسد مسلمان نہیں کافر ہیں۔ اب حافظ الاسد کو گالیوں کے ساتھ کفر کے الزامات سے بھی نوازا جانے لگا۔ اور یہ کفر کا الزام دینے والے کون تھے؟ لبنان کی کمیونسٹ پارٹی اور عراقی بعث پارٹی جن کا خود نہ خدا پر ایمان نہ رسولؐ پر اور نہ کسی اور چیز پر۔

ایک ہفتہ قبل (۱۹۷۶ء) کی بات ہے کہ جنوبی لبنان کے ایک شہر میں جبہۃ التحریر العربیۃ کے ایک شخص سے جو عراق کا ہم نوا ہے شدید بحث ہوئی۔ یہ حضرت حافظ الاسد کو بے نقط سُنا رہے تھے اور کہتے تھے کہ وہ اصل میں مسلمان ہی نہیں اس سے لڑائی واجب ہے۔ میں نے اس سے پوچھا کہ کیا تم خود مسلمان ہو؟ اگر کوئی مسلمان حافظ الاسد کو کافر کہے تو شاید کوئی بات بھی ہو مگر تم تو خود مسلمان نہیں، تمہارا خدا پر ایمان ہی نہیں تم کیونکر حافظ الاسد کو مطعون کر سکتے ہو کہ وہ مسلمان نہیں، کافر ہے، علوی ہے وغیرہ وغیرہ۔ لیکن وہ پھر بھی یہی بات دہراتا تھا کہ علوی حضرت علی علیہ السلام کو خدا گردانتے ہیں لہٰذا کافر ہیں، یوں اصل مسئلے کو فلسفیانہ موشگافیوں

[۱] لطیفے کی بات یہ ہے کہ علویوں یا نصیریوں کی تکفیر میں شیعہ پیش پیش ہیں حالانکہ مترجم کا تجربہ یہ ہے کہ علوی ہر اعتبار سے فقہ جعفری کے پیروکار ہیں۔ اسمٰعیلیوں (آغا خانی گروہ) سے کہیں زیادہ پابندِ اسلام ہیں اور وہ اسے چھپاتے نہیں۔ ان لوگوں کے مطالبے پر طرابلس (لبنان) میں باقاعدہ شیعہ عدالت قائم ہوئی اور سید عبدالحسین شرف الدین اعلی اللہ مقامہ کے صاحبزادے سید عبداللہ شرف الدین وہاں کے قاضیٔ شرع مقرر ہوئے۔ ان حضرات کے بارے میں زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ غالی ہیں اور سچی بات تو یہ ہے کہ شیعہ فرقے کے حضرات علویوں سے کہیں زیادہ غلو سے کام لیتے ہیں لیکن انھیں کوئی کافر نہیں کہتا)۔

Presented by Ziaraat.Com

کی نظر کر دیتا تھا۔

اسی بنا پر پوری دنیائے عرب میں یہ بحث چھڑی یہاں تک کہ حافظ الاسد کو کہنا پڑا کہ میں مسلمان ہوں اور خدائے بزرگ پر ایمان رکھتا ہوں، انا اؤمن باللہ و الحمد للہ۔ (میں اللہ پر ایمان رکھتا ہوں اور خدا کا شکر ادا کرتا ہوں) یہ اس کے اپنے الفاظ ہیں۔ بعض لوگ اس پر تعجب کا اظہار کرتے ہیں کہ حافظ الاسد نے یہ کیسے کہہ دیا کہ میں مسلمان ہوں، میں خدا پر ایمان رکھتا ہوں حالانکہ اس کے خلاف اس قدر پراپیگنڈا کیا جا رہا ہے یہاں تک کہ کمیونسٹ بھی اس کے خلاف اس پراپیگنڈے میں شریک ہیں کہ یہ شخص مسلمان نہیں کافر ہے اس لیے اسے مارنا چاہیے۔

خیر، ۱۹۷۶ء میں لبنانی فوج دو حصوں میں بٹ گئی۔ ایک شخص احمد الخطیب نامی اس دوران میں اُبھرا۔ یہ شخص لبنانی فوج میں نچلے درجے کا افسر تھا اور فتح کا آلۂ کار۔ وہ تمام فتوحات جو احمد الخطیب کے کھاتے میں ڈال دی جاتی ہیں انھیں فتح نے سرانجام دیا ہے۔ وہ تمام فوجی چھاؤنیاں جن پر بظاہر احمد الخطیب نے قبضہ کیا ان کی فتح کے وقت نہ احمد الخطیب وہاں نہ اس کے آدمی بلکہ ان کو فلسطینی فدائیوں نے احمد الخطیب کے نام سے فتح کیا۔ ان کی فتح کے بعد یہ چھاؤنیاں احمد الخطیب کے حامی افسروں کے حوالے کر دی جاتیں اور مشہور یہ کر دیا جاتا کہ ان کو احمد الخطیب نے فتح کیا ہے۔ وہ بھی مہینے ڈیڑھ مہینے کے بعد وہاں کا معائنہ کرتا اور اپنے نام کے نعرے لگواتا۔ اب لبنانی فوج کی جو تقسیم ہوئی اس میں مسلمانوں کا حصہ احمد الخطیب کی ماتحتی میں تھا اور وہ دراصل فلسطینی مزاحمت ہی کا ایک حصہ بن گیا تھا وہی اسے اسلحہ فراہم کرتی تھی اور وہی پیسے۔ اس لیے یہ فوج بائیں بازو کی جماعتوں سے تعاون کرتی تھی۔ یوں 'جیش لبنان العربی' (لبنانی عرب فوج) کا ظہور ہوا اور اس کا کمانڈر احمد الخطیب مقرر ہوا جو دراصل لبنان کی بائیں بازو کی جماعتوں کا رکن بن گیا تھا انھیں کے نعرے استعمال کرتا تھا انھیں کا طریقۂ کار استعمال کرتا اور انھیں کا طرزِ عمل۔

لبنان کی عیسائی فوج نے بھی الگ سے اپنی تنظیم کی اور کرنل الطوان برکات اس کا کمانڈر ہوا۔ وہ عیسائی تنظیموں کو ٹینک، اسلحہ اور تجربہ کار افراد جو اس کے ماتحت تھے فراہم کرتا اور

یوں اس نے ان تنظیموں کو مضبوط کیا۔ جب ہم اس بات کا جائزہ لیتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ لبنانی فوج کی تقسیم بھی مسلمانوں کے نقصان کا باعث تھی۔ مسلمانوں کے حصے کی فوج کے افراد فرار کر چکے تھے، بکھر چکے تھے۔ تمام چھاؤنیاں برباد ہو چکی تھیں تمام سامان لُٹ چکا تھا اس کے مقابلے میں فوج کا عیسائی حصہ ساز و سامان کے لحاظ سے مضبوط تھا اس میں تنظیم بھی تھی اور عیسائی جماعتوں کی پشت پناہی بھی اسے حاصل تھی یوں عیسائی فوج وجود میں آئی جس کے مقابلے میں مسلمان فوج ہیچ تھی۔ یوں کہا جا سکتا ہے کہ اس زمانے میں فوج کی تقسیم اس لیے نہ ہوئی تھی کہ واقعاً کسی درد کا درماں ہو بلکہ اس لیے کہ بائیں بازو کی جماعتوں کی آلۂ کار ہو۔

سید موسیٰ الصدر سوریا اور فلسطینی مزاحمت کے مابین جھگڑے کے مخالف تھے انھوں نے فریقین میں مصالحت کروانے کے لیے سات بار سوریا کا سفر کیا اور بالآخر کامیاب ہوئے۔ انھوں نے حافظ الاسد اور یاسر عرفات کو یکجا کیا اور سات گھنٹے کی ایک میٹنگ میں ان کی صلح کروائی۔

ہم پھر یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ تحریک آزادیٔ فلسطین کی بہترین دوست سوریا کی حکومت ہے حالانکہ وہ آزادی جو فلسطینی فدائیوں کو لبنان میں حاصل ہے (تھی!) وہ انھیں سوریا میں میسر نہ تھی تو یہ کہنے کا مطلب کیا ہوا کہ سوریا فلسطینی مزاحمت کا بہترین دوست ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ لبنان میں فلسطینی فدائیوں کو ہر شے حاصل ہے[1] سنگین اسلحہ، مشین گنیں، مارٹر، راکٹ وغیرہ سبھی کچھ حاصل ہے اور پورے لبنان میں انھیں آزادی ہے کہ وہ اس اسلحہ کو لیے پھریں اس کے مقابلے میں ایک فلسطینی جنگ آزما کو سوریا میں یہ حق حاصل نہیں کہ وہ مسلح حالت میں کسی سڑک پر نکل آئے۔ اور اگر کوئی معمولی ہتھیار لے کر باہر آ جائے تو اسے فوراً گرفتار کر لیا جاتا ہے۔ کیمپ کے حدود میں یا محاذِ جنگ پر انھیں چیزیں میسر ہیں لیکن کیمپ سے باہر وہ ہتھیار لے کر نہیں نکل سکتے۔ جب کوئی فدائی اسرائیل کے ساتھ لڑنا چاہتا ہے تو سرحد پر لے جا کر ہتھیار اُس کے حوالے کر دیے جاتے ہیں۔ وہ جاتا ہے لڑتا ہے اور پھر

---

[1] یہ ماضی کی بات ہے کسی زمانے میں یہ صورتِ حالات موجود تھی لیکن فلسطینیوں کی باہمی چپقلش، عرب حکومتوں کی مفاد پرستی اور بین الاقوامی سازشوں کے نتیجے میں نقشہ بدل چکا ہے اور لبنان میں مقیم فلسطینیوں کی حالت اسرائیلی حکومت کے ماتحت رہنے والے فلسطینیوں سے کہیں بدتر ہے۔

Presented by Ziaraat.Com

واپس آکر اپنے ہتھیار جمع کروا دیتا ہے اور پھر اپنے کیمپ میں لوٹ آتا ہے اس بناء پر سوریا اور فلسطینی فدائیوں میں ایک طرح کی رنجش موجود رہتی ہے[1]۔ اس رنجش کو عربی میں زعل کہتے ہیں لیکن یہ خیانت نہیں۔ سوریا کی حکومت اپنی مصلحت کے پیشِ نظر یہ کہتی ہے کہ فلسطینیوں کا سوریا میں مسلح ہو کر سڑکوں میں اور بازاروں میں نکل آنا اچھا نہیں۔

انقلابی حکومت اور فوجی حکومت میں تضاد

جیسا کہ آپ جانتے ہیں شرقِ اوسط کے منطقے کی عرب حکومتیں انقلابی حکومتیں نہیں ہیں۔ یہ ایسی حکومتیں ہیں جن کی بہترین شکل ایک فوجی انقلاب کے ذریعے وجود میں آئی ہے اور آپ یہ خوب جانتے ہیں کہ انقلابی حکومت اور فوجی حکومت میں زمین آسمان کا فرق ہے ایک انقلابی حکومت میں مثلاً الجزائر میں لوگ سُوجھ بُوجھ کے مالک ہوتے ہیں۔ یہ ایسے لوگ ہیں جو جنگ کی آگ سے تپ کر نکلے ہیں اور پھر انھوں نے حکومت قائم ہے۔ اسی بناء پر ان لوگوں میں انقلابی سوجھ بوجھ موجود ہے۔ لیکن اس حکومت میں جو مثلاً مصر یا سوریا میں قائم ہے، دس، بارہ فوجی افسروں نے مل کر حکومت کا تختہ اُلٹ دیا اور اقتدار پر قبضہ کر لیا۔ لیکن ایسا نہیں ہوا کہ انھوں نے لوگوں میں کوئی بنیادی تبدیلی پیدا کی ہو۔ اس لیے ایسی حکومتوں کے زیرِ سایہ بسنے والے لوگ ویسے کے ویسے ہی رہتے ہیں، ان میں کسی قسم کی معنوی تبدیلی پیدا نہیں ہوتی۔ کچھ لوگ آئے اُنھوں نے حکومت پر قبضہ کر لیا۔ ممکن ہے کہ ان کا قائم کردہ نظامِ حکومت استعماری نہ ہو لیکن یہ بات طے شدہ ہے کہ یہ نظام ایک انقلابی نظام نہیں ہو سکتا۔ اس لحاظ سے جب دونوں قسم کی حکومتوں کا مقابلہ کیا جائے تو ان میں بڑا فرق

[1] لبنان میں صورتِ حالات اس کے برعکس تھی بیروت اور دوسرے شہروں اور قصبوں میں فلسطینی فدائی کُھلم کُھلا اپنے اسلحے کی نمائش کیا کرتے تھے اس کی بنا پر امن کی صورتِ حالات بگڑتی تھی بعض مفاد پرست فدائیوں کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرتے تھے۔ اور فدائیوں میں سے بھی بعض بے اصول عناصر اپنے مسلح ہونے سے ناجائز فائدہ اٹھاتے تھے اس سے لبنانیوں بالخصوص عیسائیوں کو شکایات پیدا ہوتی تھیں اور وہ یہ کہتے تھے کہ فلسطینی شہروں میں اسلحہ لیے کیوں پھر رہے ہیں یہ ایک سبب تھا جس کی بنا پر دوسرے اسباب کے ساتھ کتائب اور فلسطینیوں میں کشیدگی پیدا ہوئی۔

نظر آتا ہے۔ اسی لیے مصر یا سوریا کی حکومتیں فلسطینی انقلاب کے ساتھ ہم آہنگ نہیں ہو سکتیں۔ انقلابِ فلسطین عوامی انقلاب ہے۔ اس میں لوگ حکومت کرتے ہیں۔ ان کا شعور بہت بلند ہو چکا ہے۔ اب اگر انور السادات یہ چاہے کہ یاسر عرفات کے انداز میں عمل پیرا ہو تو اس کی حکومت لازماً ختم ہو کر رہ جائے گی[1]۔ اگر ایسا ہو کہ مصر کے لوگ فکری پختگی رکھتے ہوں اور ان کی کوئی رائے ہو تو وہ سادات کو چھٹی دے دیں۔ اسے نکال باہر کریں کیونکہ اس وقت وہ ایک انقلابی حکومت کے خواہاں ہوں گے، فوجی حکومت کے نہیں۔ دونوں قسم کی حکومتوں میں یہ تضاد ہمیشہ سے رہا ہے اور اب بھی ہے۔ اس لیے عربوں کی بڑی بڑی حکومتوں نے اس زمانے میں بھی جب انھوں نے فلسطینی مزاحمت کے ساتھ تعاون کا اعلان کیا تھا ہمیشہ یہ چاہا ہے کہ فلسطینی مزاحمت ان کے ہاتھوں میں کھیلے، ان کی آلۂ کار ہو تاکہ وہ اسے اس طرح چلائیں جیسے وہ چاہتی ہیں۔

اگر آپ کو یاد ہو تو ۱۹۶۲ء میں عرب حکومتوں نے احمد شقیری کی سرکردگی میں آزادیٔ فلسطین کی فوج تیار کی۔ یہ شخص بہت اچھا خطیب مقرر ہے اور قانون دان ہے لیکن اس کی اپنی رائے کوئی نہ تھی، نہ کوئی ارادہ تھا بلکہ سوریا اور مصر کی حکومتوں کے اشاروں پر کام کرتا تھا۔ وہ شقیری سے راضی تھے کیونکہ شقیری ان کا پروردہ تھا۔ لیکن وہ یاسر عرفات کے ساتھ اتفاق نہیں کر سکتے کیونکہ وہ ایک انقلابی رہنما ہے۔ ایک انقلابی شخص کی اقدار اور ایک آمرانہ حکومت کے مقاصد میں بڑا فرق ہے اس لیے یہ حکومتیں چاہتی ہیں کہ فلسطینی مزاحمت کی پٹائی کریں تاکہ وہ کمزور ہو جائے، کیونکہ فلسطینی مزاحمت کا طاقتور ہو جانا، سادات ایسے لوگوں کے لیے اور تمام عرب حکومتوں کے لیے خطرے کی گھنٹی ہے۔ وہ یہ چاہتے ہیں کہ اپنے مفادات کے لیے اس بات کو ترجیح دیں کہ فلسطینی مزاحمت کمزور ہو تاکہ وہ ان کے ملک میں لوگوں کے افکار پر تسلط نہ حاصل کر سکے۔

کرامہ کی لڑائی کے بعد عرب نوجوانوں نے فلسطینی مزاحمت کا رُخ کیا۔ تمام حکومتیں اس سے خوفزدہ ہوئیں۔ اُنھوں نے مصر میں ایک انقلابی تنظیم بنائی اور مصریوں سے کہا کہ جو شخص

[1] یہ باتیں شہید ڈاکٹر مصطفےٰ احمران نے انور السادات کے قتل سے قبل ۱۹۷۶ء میں جرمنی میں طلبہ کی انجمنِ اسلامی کے جلسہ میں کہی تھیں۔

Presented by Ziaraat.Com

انقلابِ فلسطین میں شامل ہونا چاہے اس تنظیم کا رکن بن جائے۔ انھیں اس بات کی اجازت نہ دی گئی کہ وہ یاسر عرفات کے ساتھ کسی قسم کا تعلق پیدا کریں۔ لوگوں سے کہا گیا کہ جو کوئی فلسطینی مزاحمت میں کام کرنا چاہے وہ ہماری انقلابی تنظیم میں شامل ہو جائے، وہ تنظیم جو ہم نے خود بنائی ہے۔ اس تنظیم نے چند ایک انقلابی کام بھی سرانجام دیے۔ مثلاً خلیج عقبہ میں سمندر کے اندر سے ایک اسرائیلی جنگی کشتی کو برباد کر دیا اور پھر اعلان کیا کہ مصر کی یہ انقلابی تنظیم یوں کام کرتی ہے اور وہ اس لیے کہ عوام کو اپنی طرف راغب کرے۔ لیکن یہ سب کچھ اس لیے تھا کہ عوام کو فلسطینی مزاحمت کے افکار سے بچایا جائے۔ افسوس سے یہ کہنا پڑتا ہے کہ ہماری اطلاعات کے مطابق ان تمام ملکوں میں جو ہمارے اردگرد ہیں مصر کے لوگ سب سے زیادہ پسماندہ ہیں۔ وہ انقلابی شعور اور ذہنی ترقی کے اعتبار سے پسماندہ ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ہمیں کیا، اسرائیل اور فلسطین کے مسئلے کا ہمارے ساتھ کیا تعلق۔ اس کے بعد بہت سی گڑبڑ اور بھی پیدا ہوگی۔ یوں یہ لوگ انقلابی شعور سے بالکل منحرف ہو چکے ہوئے ہیں۔ لیکن سوریا کے لوگ مصریوں کے مقابلے میں کہیں بہتر ہیں (اسرائیل کے ساتھ معاہدہ کر کے سادات نے جو سازش کی اس کے نتیجے میں مصر کے لوگ آہستہ آہستہ بیدار ہو رہے ہیں اور وہ انقلابی افکار کی طرف مائل ہیں۔ سادات پر جو حملہ ہوا ہے وہ اس انقلابی سوچ کے آغاز کی نشان دہی کرتا ہے)۔

بہرحال مصر میں یہ چھوٹی تنظیم جو بنائی گئی اس کا بنیادی مقصد لوگوں کو فلسطینی مزاحمت کی طرف راغب ہونے سے روکنا ہے تاکہ فلسطینی تحریک کمزور ہی رہے۔ ہم بے حد معذرت کے ساتھ ایک بات کہنا چاہتے ہیں، ۱۹۷۰ء میں جب عبدالناصر کی حکومت کے زمانے میں "سیاہ ستمبر" کے دن آئے اور ۸ روز تک فلسطینی مزاحمت کے ارکان کا قتلِ عام جاری رہا تو جمال عبدالناصر نے ایک لفظ تک نہیں کہا۔ ۸ روز کے بعد جب ۱۵ ہزار فلسطینی اور ۷ ہزار فدائی مارے گئے تو عبدالناصر میدان میں اترے اور کہا کہ ہم پر لازم ہے کہ صلح کی راہ پیدا کریں اور یوں اس نے فلسطینی مزاحمت کی حمایت کی۔ مگر یہ کیسی صلح تھی اور کیسی حمایت، جب اردن میں فلسطینی مزاحمت نابود ہو چکی تھی اور فدائیوں کو اردن سے نکال باہر کیا تھا اور اس ملک میں ان کا کچھ نہ بچا تھا۔ فلسطینی مزاحمت کو اپنی گزشتہ طاقت حاصل کرنے میں پھر ۵ سال لگے۔

بہرحال حکومتِ سوریا فلسطینیوں کو اس بات کی اجازت نہ دیتی تھی کہ وہ شہروں میں مسلح ہو کر نکلیں یا حکومتِ سوریا کی اطلاع و اجازت کے بغیر سرحدی کارروائیاں کریں۔ فلسطینی مزاحمت کے ایک بہت بڑے افسر نے یہ کہا ہے کہ سوریا کو ایسا کرنے کا حق حاصل ہے کہ ان فدائیوں کو یوں کنٹرول میں لائے اور وہ اس لیے کہ مزاحمت کے افسر اور جوان لبنان میں اپنے ہتھیاروں سے جس طرح غلط فائدہ حاصل کرتے ہیں، وہ اس قدر زیادہ ہے کہ سوریا کو یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ ان فدائیوں سے اسلحہ لے لے اور وہ شہر کی سڑکوں پہ غیر مسلح ہو کر نکلیں۔

ہم چاہتے ہیں کہ اس بات کا ایک نمونہ پیش کریں۔ اس وقت (۱۹۷۶ء) لبنان میں روٹی مشکل سے ملتی ہے۔ لوگ روٹی حاصل کرنے کے لیے لمبی لمبی قطاریں بناتے ہیں۔ ایک فلسطینی مسلح ہو کر پہنچتا ہے۔ قطار کو درہم برہم کر دیتا ہے، ایک ہوائی گولی بھی چلاتا ہے، زبردستی روٹی لیتا ہے اور چلا جاتا ہے۔ لبنان میں ہتھیاروں سے غلط فائدہ اُٹھانا بڑی شدت سے رواج پا چکا ہے۔ ہم ان میں سے بعض دردناک واقعات کا ذکر کریں گے، یہی سبب ہے کہ فلسطینی افسر بھی سوریا کے رویے کو درست سمجھتے ہیں۔

سوریا اور فلسطینی مزاحمت میں داخلی اختلافات موجود ہیں لیکن بائیں بازو کی جماعتوں نے ان سے غلط فائدہ اُٹھایا اور فلسطینی فدائیوں کو سوریا کے خلاف بھڑکایا اور پھر ان کے کندھے پر سوار ہو کر سوریا سے جنگ آزما ہوئے۔ انھی بائیں بازو والوں نے ان اختلافات کو جو بالکل داخلی اور جزوی ہیں بڑھا چڑھا کر غلط استعمال کیا۔ ان نعروں میں سے جو بائیں بازو کی جماعتیں اس وقت بلند کرتی تھیں، شریف ترین نعرہ یہ تھا کہ حافظ الاسد امریکہ اور اسرائیل کا پروردہ اور آلۂ کار ہے۔ جنوبی لبنان کے شہر صور میں جو سادہ ترین نعرہ لگتا تھا وہ یہ تھا کہ اسرائیل کے مقابلے میں سوری کو مارنا بہتر ہے، یا یہ کہ اسرائیل اگر جنوبی لبنان پر قبضہ کر لے وہ کہیں بہتر ہے کہ سوریا اس پر مسلط ہو۔ یعنی کمال جنبلاط کی بائیں بازو کی جماعتوں اور سوریا کے مخالف عراقیوں نے ان چھوٹے چھوٹے داخلی اختلافات سے غلط فائدہ اُٹھا کر فلسطینی مزاحمت کو سوریا کے خلاف لا کھڑا کیا اور دونوں کے مابین جنگ و جدل شروع کروا دیا۔

Presented by Ziaraat.Com

فلسطینی مزاحمت اور سوریا کے مابین جنگ کی روک تھام میں سیّد موسیٰ الصدر کا حصّہ:

اس چار ماہ کی مدت میں سیّد موسیٰ الصدر کی کوشش کا مقصد یہ تھا کہ سوریا اور فلسطین مزاحمت کے درمیان جنگ کی روک تھام ہو۔ انھوں نے سوریا کو یہ سمجھایا کہ فلسطینی مزاحمت پر ہتھیار نہ تانے کیونکہ ہمارے نزدیک یہ مقدس ہے۔ اگر تم نے فلسطینیوں کے خلاف جنگ آزمائی کو اختیار کیا تو ہم ان کے ساتھ ہوں گے اور تمھارے خلاف لڑیں گے اور اس سے قبل بھی ہم فلسطینیوں کے پہلو بہ پہلو اور دوش بدوش لڑ چکے ہیں ہم نے اشارہ کر دیا تھا کہ ہم ایسا کریں گے اور ہم نے ویسے ہی کر دکھایا۔ اسی طرح سید الصدر یاسر عرفات کو سمجھاتے تھے کہ اے ابو عمار! یہ بائیں بازو تجھ سے خیانت کر رہے ہیں۔ جس راہ پر تم چل رہے ہو وہ تمھیں غلط جگہ لے جائے گی۔ تم پر لازم ہے کہ اس کی پیش بندی کرو۔ تمھاری طرفدار طاقتوں میں سب سے بڑی طاقت سوریا ہے اگر تم نے سوریا کو ہاتھ سے گنوا دیا تو سوریا کے ساڑھے تین لاکھ جنگ آزما تمھارے دشمن بن جائیں گے اور یہ بات تمھارے فائدے کی نہیں۔ مختصر یہ کہ سیّد موسیٰ الصدر کا کام سوریا اور فلسطینی مزاحمت کے مابین صلح و صفائی کرانا تھا۔

اس سات گھنٹے کی میٹنگ میں جو یاسر عرفات اور حافظ الاسد کے مابین ہوئی سیّد موسیٰ الصدر بطور منصف بیٹھے۔ سیّد الصدر نے یاسر عرفات سے کہا "اے ابو عمّار! اپنا دردِ دل بیان کرو اور اپنی شکایات کا دفتر کھولو۔" یاسر عرفات نے جواب دیا کہ "مجھے کوئی شکایت نہیں۔" اس پر سیّد الصدر تھوڑے سے ناخوش ہوئے اور یاسر عرفات سے کہا کہ "آخر تم شرم کیوں کرتے ہو۔ حافظ الاسد سے دل کی بات کرو اور اپنی مشکلیں بتاؤ تاکہ وہ ان کا حل کرے۔" اس کے باوجود یاسر عرفات نے کہا کہ "مجھے کوئی شکایت نہیں۔ ہمارے اور سوریا کے درمیان کوئی اختلافی مسئلہ نہیں۔" یہ سُن کر سیّد موسیٰ الصدر غصّے میں آگئے کہ "اگر تم یہ بات کرتے ہو تو میں تم سے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ لبنان میں فلسطینی مزاحمت اس بات کی قائل ہے کہ حافظ الاسد امریکہ کا پٹھو ہے، اس کا پروردہ ہے۔" یاسر عرفات بولے: "استغفر اللہ! ہم ایسی باتیں نہیں کرتے اور نہ ہمارا یہ اعتقاد ہے۔" سیّد الصدر نے کہا کہ "آپ تو یہ باتیں نہیں کرتے لیکن فلسطینی مزاحمت کے افراد نہ صرف یہ کہ یہ باتیں کرتے

ہیں بلکہ لکھتے بھی ہیں۔" یاسر عرفات نے تعجب سے کہا: "لکھتے ہیں؟" سیّد موسیٰ الصدر نے جواب دیا کہ "ہاں! ہاں! لکھتے ہیں اور یہ لکھنے والا کون ہے، ماجد ابو شرار!" یاسر عرفات نے اسی بات پر ماجد ابو شرار کو معزول کر دیا اور تین دوسرے افراد کو بھی ان کی ذمہ داریوں سے سبکدوش کر دیا جو سوریا کے خلاف اس قسم کی دروغ بافیاں لکھتے تھے اور کہنے لگے: "استغفر اللہ! مجھے ان چیزوں کی خبر نہ تھی۔"

سیّد موسیٰ الصدر کا کام یہ تھا کہ یاسر عرفات سے اس سے دل کی بات اگلوائیں اور اسے کہیں کہ تم شکایات رکھتے ہو، اپنا دردِ دل بیان کرو اور ہم یہ کوشش کرتے ہیں کہ اس کا ازالہ کریں۔ کیونکہ سوریا اور فلسطینی مزاحمت کے درمیان محاذ آرائی امریکہ اور اسرائیل کے مفاد میں ہے۔ ان کشیدہ تعلقات سے سوائے امریکہ اور اسرائیل کے اور کوئی استفادہ نہیں کر سکتا بہرحال سیّد الصدر کی کوششوں سے یہ مسئلہ حل ہوا اور حافظ الاسد اور یاسر عرفات کے درمیان مصالحت ہوگئی۔ ان دونوں نے ایک مشترکہ بیان پر دستخط کیے جس کی ۷ شقیں تھیں۔ ان میں سے ایک کا تعلق لبنان کی مشکلات حل کرنے کے لیے سوریا کی دخل اندازی سے تھا۔

اب ادھر یاسر عرفات نے اس بیان پر دستخط اور ادھر بائیں بازو کے افراد — جبہۃ الرفض، کمال جنبلاط، ماجد ابو شرار اور فلسطینی مزاحمت کے بعض گروہوں نے صور، صیدا، بیروت اور ضہر البیدر میں سوریا کے خلاف اور لبنان میں سوریا کی دخل اندازی کے خلاف شدید مسلح مظاہرے شروع کیے جن سے یاسر عرفات نے اختلاف کیا تھا۔ صور میں انھوں نے حافظ الاسد کی تصویر کو جلایا اور نہایت غیر شریفانہ اور ناشائستہ نعرے بلند کیے۔ ایک نظم لکھی گئی جس میں یہ کہا گیا تھا کہ "اے اسد! تو شیرِ جولان نہیں بلکہ لبنانی خرگوش ہے"۔ حافظ الاسد کے کارٹون بنائے گئے جس میں ان کے بڑے بڑے کان بنائے گئے تھے، جس سے وہ خرگوش کے مشابہ نظر آتے تھے۔ حافظ الاسد کی تصویریں جلائی جا رہی تھیں۔ یعنی عین اس وقت جب یاسر عرفات دمشق میں اس بیان پر دستخط کر رہے تھے، اسی وقت صیدا، صور اور ضہر البیدر میں سوریا کے خلاف مظاہرے جاری تھے اور ان مظاہرات کی قیادت بائیں بازو کے افراد کر رہے تھے جن میں جنبلاط بھی شامل تھے اور فتح کے بائیں بازو کے ارکان بھی۔

Presented by Ziaraat.Com

مجھے یہ بات کہتے ہوئے افسوس ہوتا ہے کہ فتح کی تنظیم میں ہر شخص نے اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد بنا رکھی ہے اور ہر با اثر شخص نے اپنا ایک گروہ قائم کر رکھا ہے۔ یاسر عرفات ایک حکم دیتے ہیں لیکن جنوبی لبنان میں فتح کے کمانڈر ابو موسیٰ اور اس کے ساتھی اپنی من مانی کارروائیاں کرتے ہیں۔ یاسر عرفات لبنان میں سوریا کی مداخلت کے بیان پر دستخط کرتے ہیں تو اسی وقت کچھ لوگ اس بیان کے خلاف مظاہرے کرواتے ہیں۔ یہ بات افسوسناک ہے کہ فتح میں اس قسم کی صورتِ حالات موجود ہے۔ اسی لیے جبهة الرفض، کمال جنبلاط اور بائیں بازو کے افراد فلسطینی مزاحمت کے سر پر سوار ہیں اور اسے اپنی راہ پر چلاتے ہیں اور اس کے ذریعے سے وہ کام سرانجام دیتے ہیں جن کو سرانجام دینا تنہا ان کے بس کا روگ نہیں۔

ہنگامے پر ہنگامہ :

اب بیروت میں ہنگامے پر ہنگامہ ہونے لگا۔ ان ہنگاموں میں سے چند ایک کا ہم ذکر کریں گے۔

الصاعقہ کے چند رضاکار بیروت کے ہوائی اڈے سے شہر کی جانب آ رہے تھے۔ الصاعقہ کے بارے میں ہم بیان کر چکے ہیں کہ یہ سوریا کی طرفدار فلسطینی فدائیوں کی جماعت ہے ان لوگوں پر بورج حبش کی جماعت "الجبهة الشعبية" کے لوگوں نے بغیر کسی سبب کے، سڑک کے کنارے چھپے چھپے حملہ کر دیا اور ان پر اتنی گولیاں برسائیں کہ وہ سب کے سب مارے گئے۔ ان کا کوئی گناہ نہ تھا۔ نہ تو سوریا نے حملہ کیا تھا نہ سوریا کی فوج لبنان میں آئی۔ لیکن بغیر کسی سبب کے ان کو مار دیا گیا۔

اب یہ لوگ الصاعقہ کے ارکان تھے جو بڑی طاقتور تنظیم ہے۔ 'فتح' کے بعد الصاعقہ قوی ترین فلسطینی تنظیم ہے۔ جب انھوں نے اپنے ساتھیوں کے قتل کی خبر سُنی تو یہ آگ بگولا ہو گئے انھوں نے 'برج البراجنہ' میں جہاں 'الصاعقہ' کے ان افراد کو قتل کیا گیا تھا، 'الجبهة الشعبية' کے مرکز پر حملہ کر دیا۔ یہ جماعت 'الصاعقہ' - 'الجبهة الشعبية' کے مانند نہیں، ان کے پاس بھاری اسلحہ مثلاً مارٹر، راکٹ وغیرہ سبھی کچھ ہے۔ الصاعقہ کا حملہ بے حد وحشیانہ تھا۔ انھوں نے مخالفوں کے گھروں کو خاک میں ملا دیا۔ اس محلے میں موجود 'الجبهة الشعبية' کے افراد منتشر ہو گئے۔ ان میں ایک شخص

کسی مکان کی چھت پر جا کر الصاعقہ کے لوگوں پر گولیاں برساتا اور پھر الصاعقہ کے افراد راکٹ مار کر اس گھر ہی کو برباد کر دیتے اور اس گھر کے اندر موجود عورتیں اور بچے بھی موت کے منہ میں چلے جاتے۔ جب یہ عورتیں اور بچے مر جاتے تو کہنے والے یہ نہ کہتے کہ گڑبڑ کا اصلی سبب الجبهة الشعبية کے افراد ہیں جنھوں نے میدان میں لڑنے کے بجائے گھروں کی چھتوں سے گولیاں چلائیں اور الصاعقہ نے ان کے جواب میں راکٹ مارا بلکہ وہ تو الصاعقہ کو گالیاں دیتے اور کہتے کہ دیکھا الصاعقہ نے کیا کیا؟ ان عورتوں اور بچوں کو مار دیا[1]۔

ان لڑائیوں کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ جب کوئی فوجی گروہ توپوں، مارٹروں اور بندوقوں سے لیس شہر میں داخل ہوتا ہے تو گروہی رضاکار گھروں میں چھپ جاتے ہیں یا منتشر ہو جاتے ہیں اور پھر ایک کونے سے گولی چلاتے ہیں اور بھاگ جاتے ہیں۔ اور شہر میں داخل ہونے والی فوج اس گھر کو راکٹ مار کر تباہ کر دیتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو لڑتے ہیں یا زخمی ہوتے ہیں وہ لڑنے والے نہیں بلکہ وہ عورتیں اور بچے ہیں جو اس گھر میں موجود ہوتے ہیں۔ اس لیے برج البراجنہ میں جو شیعہ آبادی کا علاقہ ہے بہت سے لوگ موت سے ہمکنار ہوئے یا وہ زخمی ہوئے۔ اس لیے اس علاقہ کے بہت سے مکان برباد ہو گئے (اسی قسم کی ٹکنیک ایران کے اسلامی انقلاب کے مخالفوں نے ایرانی کردستان میں استعمال کی)۔

ایک اور واقعہ جو انھی ایام میں (۱۹۷۶ء) پیش آیا وہ یہ ہے کہ عرمون کانفرنس کی درخواست کے مطابق جس کا ذکر پہلے آ چکا ہے، سوریا کی فلسطینی فوجِ آزادی کے ۱۲ ہزار افراد لبنان میں داخل ہوئے۔ یہ افراد پورے لبنان میں پھیلے ہوئے تھے اور ان کا ایک حصہ طرابلس میں بھی تھا۔ عراق کی طرفدار جماعت جبهة التحرير العربية کے افراد نے دن دہاڑے بغیر کسی سبب کے جیش التحریر کے دس افراد کو پکڑ لیا اور ان کو مار دیا۔ انھوں نے سڑک کے بیچوں بیچ ان کے سر کاٹ دیے۔ اور مقصد یہ تھا کہ کوئی ہنگامہ ہو۔ حکومتِ سوریا نے بھی جیش التحریر کو احکام بھیج دیے اور اس کی فوجیں طرابلس میں وارد ہو گئیں۔ انھوں نے جبهة التحرير العربية کے مرکز کو بالکل تباہ کر دیا اور

---

[1] ان مرنے والوں میں تمام کے تمام شیعہ تھے کیونکہ الجبهة الشعبية کے لوگ تو صرف بھُس میں چنگاری ڈال کر تماشا دیکھنے کے قائل تھے۔

Presented by Ziaraat.Com

عراقی حزبِ بعث کے لیڈر الرافعی کے گھر کو بھی برباد کر دیا۔ بے شمار افراد مارے گئے اور ہنگامہ شروع ہو گیا۔

یاسر عرفات نے اس قرارداد پر دستخط کیے تھے ۔ کہ سوریا کی فوج لبنان میں رہے اور لبنان کی خانہ جنگی کو ختم کرائے، لیکن کچھ لوگ کونوں کھدروں سے ان پر حملے کرتے اور گڑبڑ پھیلاتے۔ بیروت کے علاقے صبرا میں سوریا کے دو افسر الجبھۃ الشعبیۃ کے ہاتھوں شہید ہو گئے۔ یہ دونوں افسر اس لیے آ رہے تھے کہ اپنے کام کے سلسلے میں یاسر عرفات سے بات چیت کریں۔ ان کا لبنان کی داخلہ خانہ جنگی سے کوئی تعلق نہ تھا۔ ان میں سے ایک افسر بہت بڑے عہدے پر تھا جس نے ۱۹۷۳ء کی لڑائی میں سوریا کا پرچم جولان کی پہاڑیوں پر نصب کیا تھا۔ دوسرے لفظوں میں وہ پہلا سوری کمانڈر تھا جس نے جولان کو فتح کیا۔ اسے سوریا والوں کی اصطلاح میں "نورِ چشم حافظ الاسد" کہا جاتا تھا اور سوریا کے لوگ اسے جولان کی جنگوں کے ہیرو کے طور پر یاد رکھتے تھے۔ یہ دونوں افسر ایک جیپ میں بیٹھ کر صبرا میں سے گزر رہے تھے، یا تو اس لیے کہ فلسطینی مزاحمت کے افسروں سے بات چیت کریں، یا بات چیت ختم کر کے لوٹ رہے تھے۔ الجبھۃ الشعبیۃ کے لوگوں نے بازوکا رائفل سے اس جیپ کو نشانہ بنایا اور اسے جلا کر خاک کر دیا اور یہ کام بغیر کسی سبب کے تھا۔

سوریا کی فوج لبنان میں:

اس قسم کے کام مسلسل ہو رہے تھے۔ اس لیے سوریا کی حکومت نے فیصلہ کیا کہ اپنی فوج لبنان میں بھیج دے تاکہ وہ بائیں بازو کے لوگوں کی سرکوبی کر کے ان تخریبی کارروائیوں کا سدِباب کر سکے۔ پس سوریا کی فوجیں لبنان میں داخل ہو گئیں جہاں پہلے ہی سے جیش التحریر کے ۱۲ ہزار افراد موجود تھے۔ لیکن یہ سب شہروں میں پھیلے ہوئے تھے اور اب بائیں بازو کی پارٹیوں کی حرکتوں کا سدِباب کرنے کے لیے کافی نہ تھے۔ لہٰذا مزید سوری فوج کی ضرورت تھی جو پہلی جون ۱۹۷۶ء کو لبنان میں داخل ہو گئی۔ ابھی تک فلسطینی مزاحمت (فتح) سے کوئی جھگڑا نہ تھا۔ اختلافات تھے تو الجبھۃ الشعبیۃ کے ساتھ یا عراق نواز جبھۃ التحریر العربیۃ کے ساتھ جو سوریا کے سپاہیوں کو

مارتے تھے اور گڑبڑ پھیلاتے تھے اور سوریا یہ چاہتا تھا کہ ان واقعات کا سدِباب کرے۔ سوریا کی فوجوں کا ایک حصہ "جزین" کے راستے صیدا میں داخل ہوا ۔ صیدا کے لوگوں نے سوری فوج کا پُرجوش استقبال کیا اور "جیش لبنان العربی"[1] کی ایک لینڈ روور سوری ٹینکوں کے سامنے آئی تاکہ ان کا استقبال کرے۔ انھوں نے سوری فوجوں کو دعوت دی کہ شہر کے مرکز میں آ جائیں۔ چھ ٹینک اور چار پانچ ٹرک جو سپاہیوں سے بھرے ہوئے تھے ان کی درخواست پر شہر میں آ گئے۔ سوری فوجوں کو قطعاً یہ خیال نہ تھا کہ فلسطینی مزاحمت یا بائیں بازو کی جماعتوں کے افراد یا کوئی اور شخص ان پر حملہ کرے گا۔

سوریا کے سپاہی ٹینکوں پر کھڑے تھے اور لوگوں کے جذبات کا جواب دے رہے تھے۔ یہ ٹینک لبنانی فوج کے لینڈ روور کے پیچھے پیچھے شہر کے وسط میں پہنچے۔ ان کا کمانڈر ٹینک سے نکل کر لوگوں سے ہاتھ ملا رہا تھا اور باتیں کر رہا تھا کہ ناگہاں کسی کمین گاہ سے سوریا کے ٹینکوں پر بازوکا رائفلوں سے حملہ کیا گیا اور دیکھتے ہی دیکھتے ۵۲ سوری فوجی ہلاک ہو گئے بغیر اس کے کہ انھوں نے کوئی گولی بھی چلائی ہو۔ سوریا کے ٹینک اور ٹرک برباد ہو گئے اور بڑی دردناک صورتِ حالات پیدا ہوئی۔ ایک ایک ٹینک پر کئی کئی بازوکا رائفلوں کا حملہ ہوا اور ان کے پُرزے اُڑ گئے۔ جن کے حصے شہر کے وسط میں دُور دُور تک پھیل گئے۔ ٹینکوں کا کمانڈر جو ٹینک سے باہر آ گیا ہوا تھا یہ دیکھ کر کہ لوگ ایک دوسرے کو مارنے پر تُل گئے ہیں، سخت پریشان ہوا اور اپنے سر پر گولی مار کر خودکشی کر لی۔ اس سے قبل وہ کہنے لگا کہ ہم لبنان اس لیے آئے ہیں کہ مسلمانوں کی حفاظت کریں، اس لیے نہیں آئے کہ مسلمانوں کو ماریں۔ یہ کس قسم کی جنگ ہے جو تم لوگوں نے ہمارے خلاف شروع کی ہے۔ اس کے بعد اُس نے خودکشی کر لی۔ یہ واقعہ ۷ جون ۱۹۷۶ء کو رُونما ہوا۔ یوں یہ ہنگامہ بپا ہو گیا۔ کس نے شروع کیا؟ بائیں بازو نے! یہ بائیں بازو کے گروہ کون سے تھے، یہ ہم بیان نہیں کر سکتے۔ لیکن یہ بات واضح ہے کہ صیدا میں بائیں بازو کو خاصی قوت حاصل تھی۔ سوریا کی غلطی یہ تھی کہ بغیر سوچے سمجھے

---

[1] لبنانی فوج کی تقسیم کے بعد مسلمانوں کی افری جو احمد الخطیب کی سرکردگی میں اور فتح کی نگرانی میں منظم ہوئی تھی اس کا نام "جیش لبنان العربی" تھا۔

Presented by Ziaraat.Com

اور رپورٹ بنگوائے ہوئے انھوں نے اپنے ٹینک اور ٹرک شہر کے وسط میں بھیج دیے۔ یا بغیر اطلاع کے شہر میں داخل ہو گئے۔ یہ درست نہ تھا۔ لیکن اس بات میں کوئی شک نہیں کہ نہایت ذلیل قسم کی سازش کو بھانپ لیا گیا تھا اور یہ لوگ اس کی سرکوبی کے لیے صیدا میں آئے تھے۔

لبنان سے باہر اس بات کا بڑا ذکر ہوتا ہے کہ سوریا نے حملہ کیا، لوگوں کو مارا اور مار رہا ہے لیکن صورتِ حالات اس کے بالکل برعکس ہے۔ سوریا کے سپاہی کھڑے تھے اور مار نہیں رہے تھے۔ اس کے بعد جو ہنگامے ہوئے ہیں اس میں بھی یہی کیفیت برقرار رہی۔

اس حادثے کے بعد حافظ الاسد نے ایک تقریر میں کہا کہ سوریا کے کسی سپاہی کو گولی چلانے کا حق نہیں، سوائے اس صورت میں جب وہ مجبور ہو جائے، یا وہ اپنی جان کی حفاظت کر رہا ہو۔ یہ سوریا نہ تھا جو لوگوں کو مار رہا تھا، بلکہ بائیں بازو کے لوگ اور فلسطینی مزاحمت کے بعض افراد سوریا والوں پر حملہ کر رہے تھے۔ البتہ یہ ہوا کہ جب سوریا کے ٹینک صیدا میں برباد ہو گئے تو انھوں نے غصے میں آکر الٹی میٹم دے دیا اور اپنی فوج "عین الحلوۃ" کے کیمپ کے ارد گرد بھیج دی جو صیدا کے قریب میں واقع ہے اور صیدا کے نزدیک "بلالیہ" میں مورچہ بندی کر لی، جنگی مورچہ بندی۔ وہ لوگ جنھیں جنگ سے کچھ واقفیت حاصل ہے وہ جانتے ہیں کہ جب لڑائی ہوتی ہے تو ٹینک شہر میں داخل نہیں ہوتے بلکہ وہ پہلے گولہ باری کرتے ہیں اور پھر شہر میں داخل ہوتے ہیں۔ سوریا کے ٹینک اس لیے صیدا میں داخل ہو گئے کہ انھیں لڑائی کی بالکل توقع ہی نہ تھی۔ انھوں نے مورچہ بندی اس وقت کی جب ان کے ٹینک برباد ہوئے اور افراد مارے گئے۔ انھوں نے خندقیں کھود کر اپنے آپ کو اس لیے مستحکم کر لیا کہ اگر جنگ کا حکم ملے تو صیدا کو بائیں بازو کی جماعتوں کو ان کے ہم نوا فلسطینیوں سمیت ختم کر دیں۔

یوں اس دردناک واقعے کے بعد خطرناک صورتِ حالات پیدا ہو گئی۔ خطرہ یہ پیدا ہوا کہ اگر سوریا، بائیں بازو والوں پر یا ان کے فلسطینی ہمنواؤں پر حملہ کر دے تو فلسطینی مزاحمت کا خاتمہ ہو جائے گا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جس صورتِ حالات کی روک تھام کے لیے سید موسیٰ الصدر نے ۴ ماہ تک کوشش کی، اسے سازش اور خیانت نے پیدا کر کے چھوڑا، اور بڑی بے رحمانہ اور غیر انسانی شکل میں حالات کو بگاڑا۔

فلسطینی مزاحمت — ایک مقدس شعلہ

سید موسیٰ الصدر نے اسی رات اپنا مشہور بیان صادر کیا جس میں انھوں نے سوریا اور فلسطینی مزاحمت کی باہمی جنگ کی شدید مذمت کی اور یہ مطالبہ کیا کہ سوری فوج لبنان سے واپس چلی جائے۔ (کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ سید موسیٰ الصدر نے فلسطینی مزاحمت کے خلاف مؤقف اختیار کیا[1]۔ میں یہ بات اس لیے کہ رہا ہوں کہ شاید اس سے قبل آپ نے سنی ہو۔) اس بیان میں سید موسیٰ الصدر نے کہا کہ فلسطینی مزاحمت ایک مقدس شعلہ ہے۔ ہم پر لازم ہے کہ اس شعلے کو اپنے دل میں، اپنی رُوح میں، اور اپنے وجود میں روشن رکھیں اور اس کی حفاظت کریں۔ اس طرح انھوں نے یہ بھی کہا کہ سوریا کی فوج جنگی مناطق سے دُور ہو جائے تاکہ فلسطینیوں کو یہ بھروسہ ہو کہ ان کا وجود خطرے میں نہیں۔ انھوں نے مطالبہ کیا کہ سوری فوج پیچھے چلی جائے۔

"حرکتِ محرومین" کے رضا کار فلسطینی مزاحمت کے ساتھ تعاون کے لیے جنوب سے صیدا کی طرف روانہ ہو گئے اور انھوں نے سوریا کے مورچوں کے سامنے صف آرائی کر لی — "حرکتِ محرومین" کی بہت بڑی گاڑی جس پر بڑی مشین گن نصب تھی صیدا اور بلالیہ گئی اور سوریا کی فوجوں سے ۲۰۰ میٹر کے فاصلے پر پوزیشن لے لی۔

میں ایک بات کہنا چاہتا ہوں جو بڑی دردناک ہے لیکن وہ ایسی چیز ہے جو میں نے خود محسوس کی ہے نہ یہ کہ صرف اخباروں میں پڑھی ہو۔ یہ کمانڈر جن میں فتح کے کچھ کمانڈر بھی شریک تھے اور جن سے ہم مکمل تعاون کرتے ہیں، وہ ہر رات ہمارے جوانوں کو سوریا کی فوجوں کے مقابل بھیجتے اور وہ سوری فوجوں پر گولیاں برساتے۔ جب تک سوری فوجیں بلالیہ میں تھیں، ہمارے نوجوان

---

[1] اس قسم کی غلط فہمی پاکستان میں بہت زیادہ ہے۔ لوگ جورج حبش اور نائف حواتمہ کی جماعتوں ہی کو فلسطینی مزاحمت گردانتے ہیں اور اس کا سبب اطلاعات کی کمی اور فلسطینی بائیں بازو کا پروپیگنڈا ہے اس کے ساتھ ہی ان کی وہ سرگرمیاں ہیں جو لوگوں کا دل ضرور خوش کرتی ہیں چاہے ان کا فائدہ کچھ نہ ہو۔ مثلاً ہوائی جہازوں پر قبضہ وغیرہ جن کی بنا پر لیلیٰ خالد پاکستان میں ایک رومانوی ہیروئن کے طور پر مشہور ہوئی۔

Presented by Ziaraat.Com

ہر رات سوریا والوں پر گولیاں برسانے۔ لیکن اس تمام مدت میں سوریا والوں کی طرف سے مسلمانوں پر اور بائیں بازو کے لڑنے والوں پر ایک گولی بھی نہ چلائی گئی۔ یعنی وہ تمام پروپیگنڈا کہ سوریا نے مارا اور صیدا کو تباہ کر دیا، بالکل بے بنیاد ہے۔ یہ بات میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ اگر سوریا والے جوابی حملہ کرتے تو ہمارے نوجوان، جو صفِ اوّل میں تھے، سارے کے سارے مر جاتے۔ یہ بات اور ہے کہ ہمارے نوجوانوں کو آگے کیوں بھیجا جاتا۔ اس کا ایک سبب یہ تھا کہ ہمارے نوجوان لڑتے خوب تھے۔ اور اس کا دوسرا سبب بھی تھا اور وہ معنوی سبب تھا اور وہ یہ کہ وہ گاڑی جس پر ”حرکۃ المحرومین“ کے الفاظ لکھے تھے اور ”امل“ کا نام تھا، اس سے یہ معلوم ہو جائے کہ سید موسیٰ الصدر اور امل کی گاڑی ہے۔ ۲۰۰ میٹر کے فاصلے سے سوری فوجیں ’حرکۃ المحرومین‘ کا نشان پڑھ سکتی تھیں اور جان سکتی تھیں کہ ہم ان کے خلاف جنگ آزما ہیں۔ یہ حرکت ایک قسم کی اشتعال انگیزی تھی جو سوریا کے فوجیوں اور شیعوں میں پیدا کی جا رہی تھی۔ لیکن جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں، سوریوں کو یہ حکم نہیں تھا کہ وہ کسی پر گولی چلائیں، سوائے اس وقت جب انھیں جان کا خطرہ ہو۔ جس وقت وہ ”صیدا“ سے پیچھے ہٹ کر ”جزین“ جا رہے تھے میں نے دیکھا کہ ایک ہمارا دوست جو ”فتح“ میں کام کرتا ہے، مشہور جنگجو ہے اور ہمارے مدرسے میں استاد ہے، محاذ کی طرف جا رہا ہے۔ میں نے اس سے پوچھا، ”کہاں جا رہے ہو؟“ کہنے لگا، ”سوریا والوں کے پیچھے۔“ میں نے پوچھا کہ ”تمھارا پروگرام کیا ہے؟“ کہنے لگا، ”میں چاہتا ہوں کہ ان کے پیچھے جاؤں اور ان کو ماروں۔“ میں نے کہا کہ ”بہت بری بات ہے۔ سوری فوجیں پسپا ہو گئی ہیں اور ہو رہی ہیں۔ وہ ’بقاع‘ چلی گئی ہیں۔ ’صیدا‘ اور ان علاقوں سے جن کے متعلق طے ہوا تھا وہ وہاں سے چلی جائیں گی، وہاں سے وہ فیصلے کے مطابق چلی گئی ہیں۔ اب تمھارے پاس کیا سبب ہے کہ تم ان کے پیچھے پیچھے جاؤ اور پہاڑی کمین گاہوں پہ بیٹھ کر ان پر گولیاں برساؤ۔“ لیکن یہ لوگ گئے اور انھوں نے سوریا والوں پر کمین گاہوں سے حملہ کیا لیکن سوریا والوں نے اس کا کوئی جواب نہ دیا لیکن باہر کے ملکوں میں اس بات کا پروپیگنڈا کیا گیا کہ سوریا والوں نے مارا اور کشت و خون کیا۔ میں یہ بات اس لیے نہیں کہہ رہا کہ سوریا کی مدافعت کروں، بلکہ اس لیے کہ حقیقت کا اظہار ہو، حقیقت جو پروپیگنڈے کے بالکل برعکس تھی۔ یہ لوگ سوریا والوں پر

اس لیے حملہ کرتے تھے کہ سوریا والے غصے میں آ کر حملہ کر دیں اور سب کو ناپید کر دیں۔ کس کو برباد کریں؟ فلسطینی مزاحمت کو! یہ بات کس کے مفاد میں ہو گی؟ اسرائیل اور امریکہ کے۔ دوسرے لفظوں میں میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ لبنان کے اندر مختلف طاقتیں مسلمانوں میں، اور حتیٰ فلسطینی مزاحمت میں بھی کچھ لوگ یہ چاہتے ہیں کہ فلسطینی مزاحمت ناپید ہو جائے۔ یہ لوگ اشتعال انگیزی سے کام لیتے تھے، جنگ کی آگ بھڑکاتے تھے، تاکہ سوریا حملے کرے اور فلسطینی مزاحمت کو برباد کر دے۔

سید موسیٰ الصدر کہتے تھے کہ ہمارا موقف یہ ہے کہ اگر فلسطینی مزاحمت پر حملہ ہوا تو ہم اس کی حمایت میں فلسطینیوں کے دوش بدوش لڑیں گے لیکن اس اثناء میں ہمیں چاہیے کہ اس سازش کو ناکام بنائیں۔ سوریا اور فلسطینی مزاحمت میں کسی قسم کی چپقلش بہت بڑی خیانت ہے اور ہم پر واجب ہے کہ اس خیانت کو کامیاب ہونے سے روکیں۔

تقریباً دس روز قبل (۱۹۷۶ء) یاسر عرفات بیرونی ممالک کے ایک طویل سفر کے بعد سید موسیٰ الصدر سے ملنے آئے۔ ان کے ساتھ ان کے خاص محافظ ابوحسن سلامہ تھے جو یاسر عرفات کے بیٹوں کی مانند ہیں۔ یاسر عرفات نے سید موسیٰ الصدر سے کہا کہ ہم یہ چاہتے ہیں کہ آپ دوبارہ سوریا جائیں اور ہماری ان سے صلح کروا دیں کیونکہ ہمیں یہ اطمینان ہے کہ ہمارا بہترین دوست سوریا ہی ہے۔ جبکہ باقی تمام عرب ممالک ہمیں مارنے پر تلے ہوئے ہیں۔ اس سلسلے میں یاسر عرفات نے ایک بڑی اہم چیز بیان کی اور کہا ”جس دن سے سوریا کے ساتھ ہماری گڑبڑ ہوئی ہے اس دن سے روس کی حکومت نے ہمیں بے شمار اسلحہ دینا شروع کر دیا ہے حالانکہ اس سے قبل ہم اسلحہ مانگتے تھے لیکن ہمیں اسلحہ ملتا نہیں تھا اور آج یہ کیفیت ہے کہ اسلحے کا ایک سیلاب ہے جو ہماری طرف رواں ہے۔“ یہ بات ہم نے بھی ملاحظہ کی تھی۔ جنوبی لبنان میں ایسے مدرسے ہیں جو اسلحے سے پُر ہیں۔ یہاں تک کہ سڑکوں پر بھی انھوں نے اسلحے کے صندوق رکھ چھوڑے ہیں کیونکہ ان کے پاس جگہ نہیں کہ اسے اندر رکھیں۔ روس کی طرف سے جہاز کے جہاز اسلحے کے بھرے ہوئے آتے ہیں۔ یاسر عرفات نے اس بات کو سمجھ لیا تھا۔ وہ سید موسیٰ الصدر سے کہنے لگے کہ مجھے اس بات کا خدشہ ہے کہ یہ اسلحہ ہمیں اس لیے نہیں دیا جا رہا کہ ہم اسرائیل سے لڑیں

Presented by Ziaraat.Com

بلکہ اس لیے کہ ہم اسے سوریا کے خلاف استعمال کریں۔ میں اسی لیے آیا ہوں کہ آپ سے درخواست کروں کہ آپ دوبارہ سوریا جائیں اور ہماری ان سے صلح کروا دیں۔ سیّد موسیٰ الصدر نے جواب دیا کہ "میں چھے سات بار سوریا گیا ہوں اور میں نے فریقین میں صلح کروائی ہے لیکن آپ کے اخبار آپ کے نوجوان، آپ کے ماجد ابوشرار مجھے اور حرکت المحرومین کو گالیاں دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم سوریا کے پروردہ ہیں۔ اس لیے آپ مجھ سے کیسے توقع کرتے ہیں"۔ یہ بات چیت ان دنوں میں ہو رہی تھی جب بیروت میں پٹرول ناپید تھا۔ جب یاسر عرفات نے سیّد موسیٰ الصدر پر زور دے کر انھیں سوریا جانے پر آمادہ کر لیا تو انھوں نے اپنی کار اور اپنے مسلح گارڈ ان کے حوالے کیے تاکہ وہ انھیں سوریا کی سرحد تک لے جائیں۔ سیّد صدر سوریا گئے، حافظ الاسد سے بات چیت کی اور ایک نئی صلح کی داغ بیل ڈالی۔

پوچ نعرے اور داخلی تخریب :

صورتِ حالات یہ تھی کہ فلسطینی مزاحمت کے لوگ بھی یہ نعرے لگاتے تھے کہ جو شخص سوریا کے خلاف لڑتا نہیں وہ فلسطینی مزاحمت سے غدّاری کا مرتکب ہے۔ "الشیاح" میں کمیونسٹ پارٹی اور بائیں بازو کی دوسری پارٹیوں کے افراد ہمارے نوجوانوں کے پاس گئے اور ان سے کہنے لگے کہ تم ہمارے عقیدے کے ہو یا نہیں۔ انھوں نے جواب دیا "نہیں"، ہم تو فتح کے ہم عقیدہ ہیں۔ اس پر ہمارے رضاکاروں سے کہا گیا کہ تم لوگ کتائبی ہو۔ اس لیے لازم ہے کہ تمھیں مار دیا جائے اور تمھارا اسلحہ لے لیا جائے۔ کیا طرفہ عجیب بات ہے کہ ہمارے نوجوانوں کو جنھوں نے کتائب کے مقابلے میں اپنے آپ کو فلسطینی مزاحمت کی سپر بنا دیا تھا، ان سے یہ کہا جائے کہ وہ کتائبی ہیں۔ "الشیاح" میں "حرکۃ المحرومین" کے کمانڈر غصّے میں آگئے اور انھوں نے اپنے آدمیوں کو جمع کر لیا اور جواب میں کہا کہ بہت اچھا! جو شخص یہ چاہتا ہے کہ آئے اور ہم سے لڑے، وہ اگر مرد ہے تو جرأت کرے۔ یہ کہہ کر انھوں نے پوزیشنیں سنبھال لیں اور قریب تھا کہ جنگ شروع ہو جائے۔ لیکن پھر انھوں نے اس بات کو دیکھا کہ کتائب کے مقابلے میں لڑنے والا کوئی نہیں اور وہ اس بات پر قادر ہیں کہ جب چاہیں الشیاح میں گھس آئیں اور سب کو

قتل کر دیں کیونکہ یہی حرکۃ المحرومین کے رضاکار تھے جو کتائب کے مقابلے میں ڈٹے ہوئے تھے ورنہ بائیں بازو کی جماعتیں تو نعرے لگانے، الزام تراشنے، جھوٹ بولنے اور چوری کرنے کے سوا اور کچھ نہ کرتی تھیں اور اگر حرکۃ المحرومین کے لوگ بھی کتائب کے مقابلے سے ہٹ جائیں تو پھر فلسطینی مزاحمت کا دفاع کرنے والا کوئی نہ رہے گا۔ یہ دیکھ کر فتح کے انچارج اپنی جگہ سے اُٹھے اور ہمارے کمانڈر کے پاس آکر انھوں نے معذرت کی اور ان سے درخواست کی کہ حرکۃ المحرومین کے رضاکار کتائب کے مقابل مورچوں میں دوبارہ چلے جائیں اور ان کا مقابلہ کریں۔ اس پر ہمارے رضاکار اپنے مورچوں پر واپس چلے گئے۔ بہر حال اس قسم کے نعرے بڑی تیزی سے رواج پا رہے تھے کہ جو شخص ہمارا ہم عقیدہ نہیں، وہ کتائب کا ساتھی ہے، لہٰذا اسے ختم کر دینا چاہیے۔[1]

۱۹۷۶ء کے آخری ۲ مہینوں میں بہت سی مشکلات پیدا ہو گئیں اور ان سب کی بنیاد بائیں بازو کی جماعتوں کی دروغ بافی اور تہمت تراشی پر تھی۔ جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں، زیادہ افسوسناک بات یہ تھی کہ فتح کے بھی کچھ لوگ بائیں بازو والوں کے ہمنوا تھے اور ان سے تعاون کرتے تھے۔ میں ان میں سے بعض باتوں کا ذکر کروں گا تاکہ آپ دیکھ سکیں کہ بائیں بازو کی جماعتیں لبنان میں کیا کچھ کر چکی ہیں اور کیا کچھ کر رہی ہیں اور ان سے کتنے بُرے نتائج پیدا ہوئے ہیں۔

اس وقت پورے جنوبی لبنان میں پٹرول اور آٹے کی تقسیم فلسطینی مزاحمت کے ہاتھوں میں ہے۔ یہاں آپ کی اطلاع کے لیے یہ کہتا چلوں کہ صیدا کے نزدیک زہرانی[2] میں جو پٹرول کا سب

---

[1] ان نعروں کا آغاز دراصل جمال عبدالناصر کے دورِ حکومت میں صوت العربیہ ریڈیو کے احمد سعید نے کیا تھا۔ وہ ہر اس شخص کو جو جمال عبدالناصر کو اپنا لیڈر نہ مانتا، غدّار کے لقب سے نوازتا۔ ایک ہی شخص صبح کے وقت غدّار ہوتا اور دوپہر کو محبِ وطن۔ اس قسم کے نعرے بعد ازاں عربوں کی عادت میں شامل ہو گئے۔ اور اب تک ہیں۔

[2] زہرانی صیدا کے جنوب میں چند کلومیٹر کے فاصلے پر ایک بندرگاہ ہے جو ٹرانس اریبین پائپ لائن کمپنی (Trans-Arabian Pipe-Line) کے اختیار میں ہے۔ یہاں پر وہ پائپ لائن ختم ہوتی ہے جو سعودی عرب میں طریف کے مقام سے سعودی پٹرول لاتی ہے اور یہ پٹرول زہرانی سے جہازوں کے ذریعے دوسرے ممالک کو جاتا ہے۔ کہنے کو یہ بندرگاہ لبنانی ہے لیکن درحقیقت وہ امریکیوں کا اڈا ہے۔ لبنان کی داخلی جنگوں کے دوران میں اس بندرگاہ کو جنوبی لبنان کے عیسائیوں کے لیے اسلحہ بھیجنے کے لیے بھی استعمال کیا جاتا رہا ہے۔ یہاں پٹرول کے بہت بڑے ذخیرے ہیں جہاں سے لبنان کے دوسرے شہروں کو پٹرول سپلائی ہوتا ہے۔ جیسا کہ

Presented by Ziaraat.Com

بڑا مرکز ہے، آگ لگا دی گئی تھی۔ یہ آگ کس نے لگائی تھی، اس وقت معلوم نہ ہوا۔ البتہ پروپیگنڈا یہ کیا گیا کہ سوریا نے آگ لگائی ہے، یا سوریا نے اس پر گولہ باری کی ہے۔ بعد میں آنے والی اطلاعات سے یہ پتا چلا کہ آگ خود بائیں بازو کی جماعتوں نے لگائی تھی لیکن آگ لگانے سے قبل تقریباً دس لاکھ لٹر پٹرول وہاں سے نکال لیا گیا تھا تاکہ اسے بلیک مارکیٹ میں بیچا جائے۔ اس زمانے میں پٹرول کا ایک گیلن جنوبی لبنان میں ۱۵۰ لیرے میں (کوئی ۵۰۰ روپے) ملتا تھا جبکہ اس کی اصل قیمت تقریباً ۷ روپے تھی۔ اس طریقے سے بے شمار لوگ لکھ پتی بن گئے۔

کسی کو یہ حق نہیں کہ وہ لبنان میں آٹا درآمد کرے۔ یہ کام صرف فلسطینی مزاحمت کر سکتی ہے۔ یہ لوگ صرف ان کو آٹا دیتے تھے جنھوں نے ان کی پارٹی میں رکنیت حاصل کی ہو۔ اگر کسی نے یہ رکنیت حاصل نہیں کی تو اسے آٹا لینے کا حق حاصل نہ تھا۔ اکثر یہ دیکھا گیا کہ ایک عام شخص آٹا لینے گیا تو اسے کہا گیا کہ تم تو سید موسیٰ الصدر کے آدمی ہو، جاؤ اسی سے آٹا لو۔ اور وہ بے چارہ آٹا خریدنے سے محروم رہتا۔ آپ یہ پوچھ سکتے ہیں کہ آخر سید موسیٰ الصدر یا حرکۃ المحرومین آٹا درآمد کیوں نہیں کرتے تھے؟ تو سنیے۔ صور کے ایک تاجر نے ترکی سے آٹے کا ایک جہاز صور میں درآمد کیا۔ الجبہۃ الشعبیۃ اور کمیونسٹ پارٹی نے فتح کی مدد سے اس جہاز پر قبضہ کر لیا اور آٹے کی ایک بوری بھی اس تاجر تک نہ پہنچنے پائی۔ یعنی ایک طرف تو جنوبی لبنان کے شیعوں سے، جو ان کی پارٹی میں شامل نہیں، یہ کہا جاتا ہے کہ جاؤ سید موسیٰ الصدر سے آٹا لو۔ اور دوسری طرف جب ہم خود آٹا درآمد کرتے ہیں تو اس آٹے پر یوں قبضہ کر لیا جاتا ہے۔ اس قسم کے بے شمار واقعات ہیں۔ میں ان سب کا بیان نہیں کرنا چاہتا۔ صرف نمونے کے طور پر چند ایک کا ذکر کر رہا ہوں۔

صیدا میں ایک صاحبِ ثروت شخص تھا جو وزارتِ اقتصاد میں کام کرتا تھا۔ اس کے پاس آٹے کا ذخیرہ تھا۔ وہ اپنے علاقے میں تمام لڑنے والوں کو روٹی سپلائی کرتا تھا، صرف حرکۃ المحرومین کو نہیں، بلکہ تمام لڑنے والوں کو جن میں فتح اور کمیونسٹ پارٹی کے ارکان بھی شامل تھے۔ صیدا میں فتح کا کمانڈر اس شخص کے پاس گیا کہ یہ سارا آٹا ہمیں دے دو۔ اس نے کہا کہ کس بناء پر یہ آٹا آپ کو دے دوں (چونکہ یہ شخص صیدا کے تمام نانبائیوں کو آٹا سپلائی کرتا تھا اور وہ روٹیاں پکا کر لوگوں میں بانٹتے تھے) فتح کے کمانڈر نے جواب دیا کہ آٹا کافی مقدار میں نہیں اس لیے صرف فتح کو اس سے فائدہ حاصل کرنا چاہیے۔ اس شخص نے جواب دیا ایسا نہیں ہوگا۔ چونکہ وہ شخص بڑے اثر و رسوخ کا مالک تھا۔ فتح کے کمانڈر نے کہا کہ اگر تم نے آٹا نہ دیا تو تمھاری شہرت کو بڑا نقصان پہنچے گا اور تمھارے حق میں یہ بہت بری بات ہوگی۔ یعنی اسے یہ دھمکی دی گئی کہ ہم زور سے آٹا لے لیں گے اور پیسے بھی نہیں دیں گے۔ اس شخص نے راتوں رات سارا آٹا مختلف دیہات میں بانٹ دیا اور خود وہاں سے بھاگ گیا۔

اسی بناء پر جنوبی لبنان کی بے شمار آبادی بھوکی ہے۔ ان کے پاس روٹی نہیں ہے۔ ان کے پاس پٹرول نہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ لوگوں میں تمام پارٹیوں، حتیٰ کہ فتح کے خلاف ایک شدید ردِ عمل پیدا ہو چکا ہے۔ ۱۰، ۱۵ دن (۱۹۷۶ء) کی بات ہے کہ ایک شخص اپنے بیوی بچوں سمیت ایک کار میں بیروت سے صور جا رہا تھا کہ اس کا پٹرول ختم ہونے کو ہوا۔ صور نزدیک تھا۔ وہ ایک پٹرول پمپ پر رکا جو فلسطینیوں کے کنٹرول میں تھا۔ اس شخص نے ایک لٹر پٹرول طلب کیا تاکہ صور پہنچ سکے۔ اسے کہا گیا کہ تمہیں پٹرول لینے کا حق نہیں کیونکہ یہ پٹرول فلسطینی مزاحمت کی ملکیت ہے۔ اس نے ان سے بڑی بحث کی اور کہا کہ میرے بیوی بچے یہاں ہیں۔ مجھے ایک لٹر سے زیادہ پٹرول نہیں چاہیے۔ آپ جتنے پیسے لینا چاہتے ہیں لے لیں۔ اس نے بڑی منت سماجت کی لیکن انھوں نے اسے پٹرول نہ دیا اور کہا کہ یہ پٹرول صرف فلسطینی جماعتوں کے لیے ہے، عام لوگوں کے لیے نہیں۔ یہ شخص خود ایک پارٹی کا رکن تھا۔ اس نے پارٹی کا کارڈ پیش کیا اور کہا کہ میں بھی جنگ آزماؤں میں شامل ہوں اور صرف ایک لٹر پٹرول چاہتا ہوں۔ جھگڑا بڑھ گیا اور پٹرول کے مالک نے اس شخص کو اس کے بیوی بچوں کے سامنے بیچ سڑک کے گولی مار دی۔ ایک بوڑھا جو یہ سارا تماشا دیکھ رہا تھا اس نے مجھ سے یہ داستان بیان کی اور کہا کہ میں نے خود دیکھا ہے کہ اس پٹرول پمپ سے فلسطینی ٹریکٹروں پر کنستروں میں پٹرول لے جاتے ہیں اور بلیک مارکیٹ میں ۱۵۰ لیرہ فی گیلن کے حساب سے فروخت کرتے ہیں لیکن اگر کسی کو ایک لٹر پٹرول کی ضرورت ہو تو اسے جان سے مار دیتے ہیں۔

صور کے نزدیک ایک قصبہ ہے "قانا الجلیل" جہاں کچھ مدت کے لیے حضرت عیسیٰ علیہ السلام

Presented by Ziaraat.Com

بھی رہے ہیں۔ کوئی دو ہفتے کی بات ہے کہ ایک کھلاڑی کو پکڑ لیا گیا اور قتل کر دیا گیا۔ اسے قتل کیسے کیا گیا اور کیوں کیا گیا، اس کا میں ذکر کروں گا۔ یہ شخص "قانا" کے والی بال کے کھلاڑیوں میں مشہور تھا۔ یہ ہمارے مدرسے میں بھی آتا تھا اور ہمارے لڑکوں کے ساتھ والی بال کھیلا کرتا تھا۔ وہ ہمارے اساتذہ اور لڑکوں کا ایک قسم کا ساتھی بن گیا تھا اور وہ اسے بہت چاہتے تھے۔ یہ کھلاڑی "قانا" میں اپنی بہن یا اپنی منگیتر کے ساتھ چہل قدمی کر رہا تھا کہ ایک فلسطینی آیا۔ اسے وہ لڑکی پسند آگئی اور وہ چاہتا تھا کہ وہ لڑکی اس سے چھین لے۔ اس جوان نے اسے روکا اور جھگڑا شروع ہوگیا۔ یہ جوان فلسطینی کے مقابلے میں طاقتور تھا۔ اس نے اسے چند گھونسے مارے اور بھگا دیا۔ یہ فلسطینی سیدھا "قانا" میں "فتح" کے مرکز میں گیا اور اپنے ساتھ ایک ہلکی توپ اور پچیس مسلح افراد لے آیا۔ انھوں نے اس نوجوان کو پکڑا اور قصبے کے وسط میں ایک دیوار کے ساتھ کھڑا کر کے توپ دم کر دیا اور اس قصبے کے لوگوں میں اتنی جرأت نہ تھی کہ اُف تک بھی کر سکتے۔[1]

اب گندم، آٹے اور روٹی کے بارے میں سنیں۔ جیش لبنان العربی جو لبنانی فوج کا وہ حصّہ ہے جس کے سارے افراد مسلمان ہیں اور اس کا کمانڈر احمد الخطیب۔ یہ فوج اور احمد الخطیب دونوں "فتح" کے مرہونِ منت ہیں۔ اس کا سارا بجٹ فتح والے برداشت کرتے ہیں۔ احمد الخطیب خود بھی فتح کا رکن ہے۔ اصل میں فتح ہی نے اسے اکسایا تھا کہ وہ لبنانی فوج سے ٹوٹ کر ایک الگ فوج بنا لے۔ اس کے باوجود احمد الخطیب کی فوج اور فلسطینی مزاحمت کے درمیان اختلافات ہیں جن کی بنیاد لبنانی اور فلسطینی ہونا ہے۔ احمد الخطیب کی فوج نے ۴ روز قبل (۱۹۷۶ء) آٹے کا ایک جہاز صور کی بندرگاہ میں درآمد کیا۔ اس لیے کہ یہ لوگ چاہتے تھے کہ آٹا درآمد کر کے سستے داموں سب کو دیں خصوصاً لبنانیوں کو۔ جبکہ فلسطینی مزاحمت آٹا درآمد کر کے نہایت گراں قیمت پر فروخت کرتی تھی۔ فلسطینیوں نے انھیں اجازت نہ دی کہ وہ آٹا لائیں۔ اس کے نتیجے میں جھگڑا شروع ہوا، دونوں طرف سے گولیاں چلیں۔ فلسطینی مزاحمت کے پاس طاقت زیادہ تھی۔ انھوں نے ایک میزائل مار کر جہاز کو سمندر میں غرق کر دیا۔ آٹا اور جہاز دونوں سمندر کی نذر ہو گئے۔ اس جہاز کا کچھ

---

[1] یہ صورتِ حال ۱۹۷۶ء کی ہے۔ فلسطینی مزاحمت کے ارکان کا یہ غرور و تکبر اور یہ لاقانونیت ان اسباب میں سے ایک ہے جنھوں نے لبنان میں فلسطینی مزاحمت کو نقصان پہنچایا۔

حصّہ اب بھی صور کی بندرگاہ میں نظر آرہا ہے۔

جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں جنوبی لبنان کے شہر صور میں ایک مدرسہ ہے جس کا نام مدرسہ جبل عامل ہے۔ اس مدرسے میں ۳۲۰ طالب علم مفت پڑھتے ہیں اور وہیں رہتے ہیں۔ یہ صنعتی مدرسہ ہے اور اس کے طالب علم اکثر و بیشتر جنوبی لبنان کے یتیم بچے ہیں۔ خصوصاً ان دیہات سے جن پر اسرائیل نے حملہ کر کے ان کے ماں باپ کو قتل کر دیا۔ یہ جنوبی لبنان کے آفت زدہ بچے ہیں۔ کچھ مدت قبل (۱۹۷۶ء) فلسطینیوں کی تنظیم "القیادۃ العامہ" نے جو الجبھۃ الشعبیۃ کا حصہ تھی اور اب احمد جبریل کی سرکردگی میں الگ ہو چکی ہے، اس مدرسے پر حملہ کر دیا۔ مدرسے کے چوکیدار ابو علی کو قتل کر دیا اور ایک نوجوان کے پاؤں کو گولیاں مار کر اُڑا دیا۔ ان ۶۰ حملہ آوروں نے مدرسے کے طالب علموں کے ساتھ آدھ گھنٹے تک لڑائی کی جن کی تعداد صرف ۶ تھی اور عمریں ۱۴ اور ۱۵ سال کے درمیان تھیں اور ان کے ساتھ ایک نگران استاد تھا۔ ان لڑکوں نے آدھ گھنٹے تک ان کے ساتھ جنگ کی، ان کے ۴ آدمیوں کو مار دیا اور ۶ کو زخمی کر دیا۔ لیکن آدھ گھنٹے کے بعد بھی وہ اس قابل نہ ہوئے کہ مدرسے میں گھس سکیں۔ البتہ ہمارا چوکیدار شہید ہو گیا اور ایک لڑکا اپنا پاؤں گنوا بیٹھا۔ لیکن مدرسے کے لیے یہ بات باعثِ افتخار ہوئی۔ جب ان حملہ آوروں نے شکست کھالی اور مدرسے میں داخل نہ ہو سکے تو انھوں نے دُور سے اس مدرسے پر مارٹر چلائے اور اسے خاصہ نقصان پہنچایا۔

ایک اور حملہ جو جنوب میں سیّد موسیٰ الصدر کے قائم کردہ مدارس پر ہوا وہ معہد الدراسات الاسلامیہ صور پر تھا۔ یہ دینی علوم کا مدرسہ ہے۔ جس وقت یہ حملہ ہوا اس وقت وہاں کوئی مسلح فرد موجود نہ تھا۔ وہاں ہمارے صنعتی مدرسے کا ایک طالب علم نماز پڑھ رہا تھا اور کچھ طالب علم سمندر میں نہا رہے تھے۔ حملہ آوروں نے جو کچھ ملا چوری کر لیا اور ایک لڑکے کو چہرے پر گولی مار کر مجروح کر دیا۔ دوسرے کے پاؤں پر گولی لگی لیکن وہ زیادہ زخمی نہ ہوا۔

اب اسی قسم کا ایک نمونہ بیروت سے پیش کرتا ہوں۔ تین سال قبل (۱۹۷۳ء) اسرائیل نے بیروت پر حملہ کیا اور ابو یوسف نجار، کمال ناصر اور کمال عدوان کو شہید کر دیا (یہ تینوں حضرات یاسر عرفات کے طرز کے بڑے اہم فلسطینی رہنماؤں میں شمار ہوتے تھے)۔ ان کے علاوہ انھوں نے ۲ شیعہ افراد کو بھی شہید کیا۔ یہ دونوں افراد "ناصر" خاندان سے تھے۔ ان میں

Presented by Ziaraat.Com

سے ایک "اوزاعی"[1] میں رہتا تھا اور دوسرا "برج البراجنۃ" میں۔ یہ دونوں افراد اسلحہ سازی کی ایک فیکٹری کے مالک تھے اور "فتح" کو اسلحہ مہیا کرتے تھے یعنی وہ فتح کا جزو تھے اور ان کی مدد کرتے تھے۔ ان کی اہمیت اس قدر زیادہ تھی کہ اسرائیلی فوجی ان کے گھروں میں گئے، ان کو قتل کر دیا اور گھروں کو برباد کر دیا۔ ان دونوں کی اہمیت فلسطینی مزاحمت کے لیے ابویوسف نجار اور کمال ناصر سے کم نہ تھی۔ ان کا ایک بڑا بھائی ابوطالب نام کا تھا جو برج البراجنۃ کی میونسپلٹی کا صدر تھا۔ برج البراجنۃ بیروت کا بہت بڑا شیعہ علاقہ ہے۔ یہ ابوطالب بھی فلسطینی مزاحمت کا بہت بڑا حمایتی تھا۔ اس کے پاس اپنے مسلح کارکن تھے۔ ۱۹۷۶ء میں فتح نے ابوطالب ناصر کے مکان پر حملہ کر کے اسے برباد کر دیا۔ جب میں سوریا کے ہوائی اڈے پر پہنچا تو میری ابوطالب ناصر سے ملاقات ہوئی جو لبنان سے بھاگ کر وہاں پہنچا تھا۔ اس حملے کا سبب یہ نکلا کہ ابوطالب ناصر کی برج البراجنۃ میں کچھ زمین تھی جس کی مٹی بڑی اچھی تھی۔ وہ اس مٹی کو اینٹیں اور دوسری چیزیں بنانے کے لیے فروخت کرتے تھے۔ فتح کے کچھ لوگ اس کے پاس آئے اور کہا کہ وہ مٹی اپنے تصرف میں لانا چاہتے ہیں۔ ابوطالب اثر و رسوخ والا آدمی تھا، اس نے اس کی اجازت نہ دی اور کہا یہ مٹی تو میری ملکیت ہے، آپ کس طرح اس پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں۔ چونکہ اس نے مٹی پر تصرف کرنے کی اجازت نہ دی، اس لیے اس کے گھر کو برباد کر دیا گیا اور اسے فرار ہونے پر مجبور کیا۔

یہاں تک کہ بیروت میں سید موسیٰ الصدر کے اپنے مکان پر بھی حملہ کیا گیا اور حملہ آوروں نے ۴ چوکیداروں سے ان کے ہتھیار چھین لیے اور انھیں بہت بے عزت کیا۔ اس کا سبب یہ تھا کہ یاسر عرفات کی غیر موجودگی میں فتح کے ۲ کمانڈر ابوصالح اور ابوایاد سید موسیٰ الصدر سے ملنے آئے۔ میں بھی اس وقت موجود تھا۔ جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں ابوصالح کمیونسٹ ہے اور آقائے صدر کا شدید مخالف۔ آقائے صدر کو بے شمار تکلیفیں پہنچانے اور ان کو برا بھلا کہنے میں ابوصالح کا بڑا ہاتھ ہے۔ یہ دونوں سید الصدر کے پاس آئے۔ ابوایاد نے جو یاسر عرفات کے

---

[1] بیروت کے قریب صیدا جانے والی سڑک پر واقع ہے۔ یہاں پہلی صدی ہجری کے ایک مشہور فقیہ اور عالم امام اوزاعی کا مزار ہے ان کے نام سے یہ محلہ یاد کیا جاتا ہے۔ بیروت سے صیدا جانے کے لیے اگر ہوائی اڈے کا رستہ اختیار کیا جائے تو اس محلے سے ہو کر گزرنا پڑتا ہے۔

بعد سب سے بڑا رہنما ہے، سید موسیٰ صدر سے کہا کہ میں جانتا ہوں کہ آپ ابوصالح سے ناخوش ہیں، اس لیے میں اسے لے آیا ہوں کہ آپ اسے سرزنش کریں۔ آقائے الصدر نے کہا کہ سرزنش کی کوئی ضرورت نہیں، خصوصاً اس وحشت ناک اور دردناک زمانے میں۔ اس کے بعد ان دونوں نے سید الصدر سے درخواست کی کہ وہ سوریا جائیں اور حافظ الاسد سے صلح کی بات کریں (یہ وہی بات چیت ہے جو بعد میں یاسر عرفات نے سید صدر پر زور دے کر کروائی) سید موسیٰ الصدر نے قبول کر لیا اور کہا کہ میں ضرور جاؤں گا اور اپنی کوشش کر دیکھوں گا۔ لیکن جانے سے قبل ابوایاد اور ابوصالح سے بات چیت کی اور کہا کہ میں ۶، ۷ بار گیا ہوں اور جب کبھی میں سوریا گیا ہوں، آپ نے اور آپ کے پروپیگنڈا کرنے والوں نے مجھے برا بھلا کہا کہ میں سوریا کا ایجنٹ ہوں۔ اس کے باوجود میں گیا۔ اب اگر آپ یہ چاہتے ہیں کہ میں سوریا جاؤں تو اپنے اخبار میں ایک بیان نشر کیجیے جس میں یہ کہیے کہ فتح کی مرکزی قیادت نے سید موسیٰ الصدر سے سوریا جانے کی درخواست کی ہے اور ہماری درخواست پر وہ سوریا جا رہے ہیں۔ تاکہ لوگ جان لیں اور گمراہ نہ ہوں۔ انھوں نے اسے قبول کر لیا اور آقائے صدر کی موجودگی میں انھوں نے ایک بڑا نفیس بیان تحریر کیا جس میں یہ کہا گیا تھا کہ ہم پر لازم ہے کہ بعض اسباب کی بنا پر ہم سوریا سے صلح کر لیں، اور سید موسیٰ الصدر ہی وہ واحد شخص ہیں جو یہ صلح کروا سکتے ہیں۔ اس لیے ہم نے ان سے درخواست کی ہے کہ وہ اس سلسلے میں اپنی کوششیں بروئے کار لائیں اور اب وہ ہماری درخواست پر سوریا جا رہے ہیں۔ انھوں نے یہ بیان لکھا اور سید الصدر سوریا جانے کی تیاری کرنے لگے۔

اس بیان کو فلسطین کے دفترِ اطلاعات میں بھیجا گیا کہ اسے اخباروں اور ریڈیو پر نشر کیا جائے اس کام کے انچارج ابوشرار نے یہ بیان پھاڑ دیا اور اس کی جگہ ایک اور بیان لکھ دیا جس میں سید الصدر کو برا بھلا کہا گیا تھا۔ لکھا گیا تھا کہ ابوایاد اور ابوصالح سید صدر سے ملنے گئے اور انھیں مجبور کیا تھا کہ وہ اپنے موقف کو واضح کریں ورنہ یہ سمجھا جائے گا کہ وہ سوریا کے ایجنٹ ہیں۔ ابوصالح اور ابوایاد اس لیے گئے تھے تاکہ سید الصدر کو مجبور کریں کہ وہ اپنی پوزیشن واضح کریں ورنہ ان کے خلاف شدید کارروائی کی جائے گی۔ یہ کام انسانیت اور شرافت دونوں سے بعید تھا، اتنا بعید کہ آپ اس کا اندازہ نہیں کر سکتے۔ یہ ماجد ابوشرار جس کو یاسر عرفات نے ڈیڑھ ماہ قبل معزول کر دیا تھا اب پھر

Presented by Ziaraat.Com

اتنا تصرف حاصل کر لیتا ہے کہ اس قسم کی خبر یُوں نشر کرے۔ سید الصدر ابھی سوریا سے واپس نہیں آئے تھے انھیں یہ خبر نہ تھی کہ لبنان میں کیا ہو گزری ہے۔ اس اثناء میں ان کے گھر پر حملہ کیا گیا اور ۱۵۰ افراد نے ان کے گھر کا محاصرہ کر لیا۔ یہ لوگ سب کے سب فتح سے تعلق رکھتے تھے۔ یہ بات مسلّم ہے کہ اس حملے اور ماجد ابو شرار کے نشر کردہ بیان میں گہرا ربط تھا۔ انھوں نے حملہ کیا، یہ کہنے کے لیے کہ سید موسیٰ الصدر سوریا کے ایجنٹ ہیں تاکہ انھیں بے عزت کریں۔

یہاں میں ایک بات بیان کرنا چاہتا ہوں جس کا بیان کرنا بہت تکلیف دہ چیز ہے۔ جب بعلبک کے لوگوں کو سید الصدر کے مکان پر حملے کی خبر ملی تو انھوں نے طے کر لیا کہ اپنے علاقے میں رہنے والے سب فلسطینیوں کو قتل کر دیں۔ اگر ایسا ہوتا تو جنوبی لبنان میں فلسطینی شیعوں کو قتل کر دیتے کیونکہ وہ وہاں زیادہ طاقتور ہیں اور اس کا نتیجہ یہ نکلتا کہ امریکہ یا اسرائیل یا کوئی اور حکومت شیعوں کے خون کا بدلہ لینے کے بہانے سے لبنان میں در آتی اور فلسطینی مزاحمت کا صفایا کر دیتی۔ سید الصدر کو اس سازش کا پُورا شعُور تھا۔ اپنی تمام ناراضیوں کے باوجود، انھوں نے کہا کہ میں یہ نہیں چاہتا کہ تاریخ ایک ہزار سال بعد بھی اس کا ذکر کرے کہ ہمارے ہاتھ فلسطینیوں کے خون سے آلُودہ ہیں۔ میں اس امر کی اجازت نہیں دے سکتا کہ میری بناء پر فلسطینیوں پر حملہ ہوا۔ انھوں نے اپنے معتمد افراد کو تاکیدی خط لکھ کر بعلبک بھیجا جن میں یہ کہا گیا تھا کہ کسی شخص کو یہ اجازت نہیں کہ فلسطینیوں پر حملہ کرے اور انھیں بے عزت کرے، یہاں تک کہ ان کی نکسیر تک پھُوٹنے کا سبب بھی ہو۔ یوں بڑی مشکل سے فلسطینیوں پر بعلبکوں کے حملے کا سدِ باب ہوا۔

بہر حال ایک بات کہنا لازم ہے کہ جنوبی لبنان اور بعلبک کے عوام فلسطینیوں سے خوش نہیں اور ہمارا سب سے مشکل کام یہ ہے کہ ہم لوگوں سے کہیں کہ ہم اور سید الصدر، حرکۃ المحرومین، حرکۃ الامل اور شیعہ سب کے سب فلسطینی مزاحمت کے ساتھ ہیں اور یہ مزاحمت ہمارے لیے ایک مقدّس شعلہ ہے۔ وہ لوگ جو سازش کر رہے ہیں وہ کمال جنبلاط اور بائیں بازو کے لوگ ہیں۔ یہ لوگ فلسطینی مزاحمت اور فلسطین سے خیانت کر رہے ہیں اور ہمارا فرض ہے کہ فلسطینی تحریک کی حمایت کریں۔

اس وقت جنوبی لبنان اور بعلبک میں ہمارا مؤقف یہی ہے لیکن ہمارے کارکن اور عوام ہم پر اور سید موسیٰ الصدر پر اعتراض کرتے ہیں کہ کیا سبب ہے کہ تم تکلیفیں برداشت کرو، اپنا گھر خراب کرو اور ان لوگوں کی حمایت کرو جو تمہارے فرقے کے لوگوں کے ساتھ ایسا سلوک کرتے ہیں۔

جنوبی لبنان کے لوگوں کے لیے اسرائیلی ترغیبات:

اسرائیل نے جنوبی لبنان میں ۳ ڈسپنسریاں کھولی ہوئی ہیں۔ ان میں سے ایک ڈسپنسری کو میں نے خود دیکھا ہے۔ یہ ڈسپنسری اس سڑک پر واقع ہے جو اسرائیل کی سرحد کے بالکل ساتھ ساتھ جاتی ہے۔ میں نے دیکھا کہ مرد اور عورتیں ایک لمبی قطار میں اسرائیلی سرحد پر واقع جنگلے کے پیچھے کھڑے تھے اور اس بات کے منتظر تھے کہ وہ جنگلا کھُلے اور وہ اسرائیلی سرحد میں داخل ہو کر اس مفت کی ڈسپنسری سے فائدہ اُٹھا سکیں۔ اسرائیلی سپاہی لبنان کی سرحد کے اندر تھے۔ مجھے یہ دیکھ کر وحشت سی ہوئی کہ اگر اس وقت وہ ہماری گاڑی کو روکیں اور ہم سے شناختی کارڈ طلب کریں تو ہماری شامت ہی آجائے۔ لیکن میں نے دیکھا کہ انھیں لبنانیوں سے کوئی سروکار نہ تھا۔ وہ تو اپنا پروپیگنڈا کرنے میں مشغول تھے۔ انھوں نے ۳ ڈسپنسریاں کھول رکھی ہیں، حالانکہ جنوبی لبنان میں کچھ دوسرے ہیں جو لبنانیوں کو قتل کرتے ہیں، انھیں تنگ کرتے ہیں، انھیں پٹرول اور گندم تک نہیں خریدنے دیتے۔ اسرائیل نے ان لبنانیوں کے لیے اپنی سرحدیں کھول رکھی ہیں ان کیلئے ڈسپنسریاں بنائی ہیں، انھیں آٹا دیتے ہیں، پانی دیتے ہیں، ان مقامات پر جہاں پینے کا پانی میسّر نہیں وہاں پانی اسرائیل کی طرف سے سپلائی ہوتا ہے[1]۔ اسرائیلیوں نے سرحد کے ساتھ

---

[1] لبنان کے فرقہ وارانہ اور ظالمانہ نظام کی ایک نشانی یہ ہے کہ اس ملک میں جہاں بیروت اور جبل لبنان کے علاقوں پر ساری دولت صرف ہوتی ہے اور جہاں ہالی ڈے کارڈ نیا کے مرکز تک پہنچنے کے لیے آسانی پیدا کرنے کے لیے تقریباً ۲۰ لاکھ ڈالر کے خرچ سے کیبل ریلوے بنائی گئی ہے اور جہاں یورپ اور عرب ملکوں کے امیر لوگوں کی میزبانی کے لیے کروڑوں روپے سے تفریح گاہیں بنائی گئی ہیں اور جہاں کے لوگ اس بات پر فخر محسوس کرتے ہیں کہ بیروت کا شہر مشرق کا پیرس ہے وہاں اسی ملک میں جنوبی لبنان بدنصیبی کا شکار ہے اور جہاں کے لوگ آج بھی (صور، وغیرہ کو چھوڑ کر) بارش کا پانی گڑھوں میں جمع کر لیتے ہیں اور سارا سال اسی کو استعمال کرتے ہیں۔ خود بھی پیتے ہیں اور جانوروں کو بھی یہی پلاتے ہیں اور دوسرے کاموں کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ حالانکہ اسی علاقے سے لبنان کا سب سے بڑا دریا گزرتا ہے۔ (مترجم)

Presented by Ziaraat.Com

اپنے ہوائی اڈے لبنانیوں کے لیے کھول دیے گئے ہیں تاکہ جو شخص سفر کرنا چاہے وہ ان کے ہوائی اڈوں سے سفر کی سہولتیں حاصل کرے۔ اس کے مقابلے میں بائیں بازو کی جماعتیں اور "فتح" کے بعض لوگ اپنی جہالت کی بناء پر ایسی کارروائیاں کرتے ہیں جن کی بناء پر لبنانیوں کو اپنے خلاف کر لیتے ہیں اور جب ہم انھیں نصیحت کے طور پر یہ کہتے ہیں کہ اسرائیل کے مقابلے میں، جو تمھیں اس قدر نقصان پہنچا رہے ہیں، لبنانیوں کو اپنے خلاف نہ کرو تاکہ اردن کا "ستمبر سیاہ" کا تلخ تجربہ دوبارہ برداشت نہ کرنا پڑے تو وہ لوگ بڑے غرور و تکبر سے، جو ان کی عادت بن چکا ہے، یہ خیال کرتے ہیں کہ ہم یہ نصیحت خوف کی بنیاد پر کر رہے ہیں۔

تقریباً ڈیڑھ ماہ قبل "یونیسکو" کے کانفرنس ہال میں ایک جلسہ منعقد ہوا جس میں ایک ہزار سے زائد افراد شریک تھے یہ جلسہ "حرکۃ المحرومین" کے ان شہداء کی برسی پر منعقد ہوا تھا جو گزشتہ ڈیڑھ سال میں جام شہادت پی چکے ہیں اس جلسے میں یاسر عرفات بھی موجود تھے۔ اس میں سید موسیٰ صدر نے ایک بے مثال تقریر کی۔ اس میں انھوں نے بائیں بازو کی جماعتوں کو ہدفِ تنقید بنایا یاسر عرفات کو، کہ ان کے سامنے بیٹھے تھے، خطاب کرتے ہوئے سیّد موسیٰ الصدر نے کہا: "اے برادرِ عزیز! یہ بائیں بازو کی جماعتیں تمہارے نام پر اور انقلابِ فلسطین کے نام پر تجارت کر رہی ہیں، یہ تمہارا استحصال کر رہے ہیں۔ یہ جنوبی لبنان اور لبنانیوں کو تمہارے خلاف اکسا رہے ہیں اور یہ بات تمہارے فائدے کی نہیں۔ اگر ہم لوگ فلسطینی مزاحمت کی تحریک کی مدافعت کرتے ہیں تو ایک اصول کی خاطر جس پر ہمارا ایمان ہے، نہ کسی ذاتی مفاد پر اور تجارت پیشگی کے نکتۂ نظر سے۔" کچھ دیر بعد انھوں نے کہا چند سال پہلے جب فلسطینی مزاحمت نے مسلح جدّ و جہد کی راہ اختیار کی ہم لوگ آپ کے دوش بدوش لڑ رہے ہیں۔ اب بھی ہم آپ کے ساتھ ہیں اور تمام محاذوں پر آپ کے ساتھ تعاون کر رہے ہیں ان شاء اللہ جب تک آپ القدس پہنچیں گے، ہم آپ کے ہمنوا رہیں گے۔ آپ کے ساتھ مل کر جنگ کریں گے اور آپ کی ہمراہی میں القدس میں داخل ہوں گے۔" یہ باتیں کرتے ہوئے انھوں نے ضمناً کہا: "القدس کو شرم آئے گی کہ ملحد اور کافر اور وہ لوگ جو خدا پر ایمان ہی نہیں رکھتے اپنے قدم القدس کی سرزمین پر رکھیں۔ یہ ہمارا کام ہے اور اسی قسم کی قربانی ہمیں سے وجود میں آئے گی۔" پھر کہا: "میرا عمامہ، میری عبا اور میرا منبر انقلابِ فلسطین پر اور اس انقلاب تک پہنچانے والی راہ پر قربان ہوں۔ ہم آخر دم تک اس راہ کی مدافعت کریں گے۔"

یہ تقریر سیّد موسیٰ الصدر نے یونیسکو کے کانفرنس ہال میں کی اور اس میں اس حد تک فلسطینی مزاحمت کی تحریک کی حمایت کی۔

لیکن افسوسناک بات یہ ہے کہ بائیں بازو کی جماعتوں نے، خصوصاً ماجد ابوشرار اور جنوبی لبنان کے فلسطینی کمانڈر ابوموسیٰ[1] اور ان کے حاشیہ بردار لوگوں نے اس کے جواب میں سیّد موسیٰ الصدر کو گالیاں دیں، ان پر بڑے رکیک حملے کیے، ان کے عمامے کو، ان کی عبا کو، ان کے منبر کو اور تمام شیعوں کو گالیاں دیں اور ایسے توہین آمیز کلمات کہے جو کسی نے نہ سنے تھے۔

جب میں جنوبی لبنان میں بعض فلسطینی افسروں سے بات کرتا تھا اور انھیں نصیحت کرتا تھا تو وہ یہ کہتے تھے کہ یہ شخص غیر ملکی ہے، اسرائیل کا جاسوس ہے، اس کی بات پر کان نہ دھرو، یہ ان لوگوں میں سے ہے جن کا نام قتل کیے جانے والوں کی فہرست میں ہے، اس کا صفایا ہونا چاہیے۔ میرا صفایا تو خیر آسان ہے، ان کے بڑے بڑے افسر تو یہ بھی کہتے ہیں کہ ہم یاسر عرفات کو بھی ٹھکانے لگا دیں گے۔ گویا ٹھکانے لگانا اور انسانوں کو مارنا، مچھر کو مارنا ہے۔ مگر وہ علی الاعلان کہتے ہیں کہ ہم ان کو ٹھکانے لگا کر رہیں گے۔

بائیں بازو کی طاقتوں کا تسلط:

جنوبی لبنان میں صورتِ حالات کی یہ کیفیت ہو چکی ہے۔ (۱۹۷۶ء) غلط قسم کے پروپیگنڈے کو پھیلایا گیا اور اس کے نتیجے میں بائیں بازو کے لوگوں کو یہ گمان ہو گیا کہ وہ کامیاب

---

[1] یہ وہی ابوموسیٰ ہے جس نے یاسر عرفات کی کمر میں خنجر بھونکا ہے اور ان کے خلاف بغاوت کروائی اور انھیں لبنان کے شہر طرابلس میں محاصرے میں لے لیا اور ان کو مجبور ہو کر وہاں سے نکلنے کے لیے اپنے ازلی دشمن امریکہ سے ضمانت حاصل کرنا پڑی کہ وہ اور ان کے ساتھی حفاظت سے طرابلس خالی کر سکیں گے۔ یہ ابوموسیٰ فرد بھی ہے اور ایک علامت بھی۔ یہ علامت تیسری دنیا کے ملکوں کے پسے ہوئے عوام کی حصولِ آزادی کی تحریکوں میں مجاہدوں کا روپ دھار کر شامل ہونے والے سیاسی موقع پرستوں پر دلالت کرتی ہے جو دوسروں کے اشاروں پر ان تحریکوں کو اپنے رستے سے ہٹانے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ وہ ابوموسیٰ ہوں یا مسعود رجوی، ان کا کام ان تحریکوں کو اپنے راستے سے ہٹانا اور ان میں فساد برپا کرنا ہے۔ (مترجم)

Presented by Ziaraat.Com

ہوگئے ہیں اور میدان ان کے ہاتھ میں ہے۔ لہٰذا انھوں نے لوگوں کا تیا پانچا کرنا شروع کر دیا، نہ صرف ہمارے دوستوں کا بلکہ خود یاسر عرفات کا۔ چونکہ یہ جھوٹ کا پروپیگنڈا اتنا پھیلا ہوا تھا کہ دُنیا نے اس پر یقین کر لیا اور دنیا کے پاس اس پروپیگنڈے پر یقین کرنے کے لیے اسباب تھے۔ امریکہ اور اسرائیل چاہتے تھے کہ سوریا کی پٹائی کریں۔ اس لیے ماجد ابو شرار جس قسم کی دروغ بافیوں سے کام لیتا، امریکی اور اسرائیلی ذرائع ابلاغ اسے تمام دُنیا میں نشر کرتے۔ ہمارے ایک دوست کہتے تھے کہ یہ بات قابلِ غور ہے کہ جرمنی کی حکومت جس کا سلوک فلسطینیوں سے اچھا نہیں اور جو انھیں اپنے ملک سے خارج کر دیتی ہے، وہ حکومت انھیں اس بات کی اجازت دیتی ہے کہ سوریا کے خلاف مظاہرے کریں۔ اسی بنا پر ان ذرائع ابلاغ نے ان جھوٹی داستانوں کو بڑھا چڑھا کر دُنیا میں پھیلایا اور افسوسناک بات یہ ہے کہ ان دروغ بافیوں نے خود انھیں بھی اس گمان میں مبتلا کر دیا کہ وہ کامیاب ہوگئے اور قصہ پاک ہوا۔ (یہ تقریر جرمنی کے طلبہ کی انجمنِ اسلامی کے سامنے ۱۹۷۶ء میں کی گئی)۔

جس طرح سویٹ روس میں انقلاب کے بعد مسلمانوں کو ٹھکانے لگایا گیا اور جس طرح چین میں مسلمانوں کا صفایا کیا گیا، یا جس طرح پچھلے دنوں میں ایران میں منافقین نے کچھ طاقت حاصل کر کے دوسروں کو ٹھکانے لگانا شروع کر دیا تھا، لبنان کی بائیں بازو کی جماعتوں نے بھی طاقت حاصل کرتے ہی اپنے مخالفوں کا صفایا کرنا شروع کر دیا۔ ہمارے بہت سے دوستوں کو انھوں نے ٹھکانے لگایا۔ "الصاعقہ" کے بہت سے افراد کو ختم کر دیا۔ سید موسیٰ الصدر کے مکان پر حملہ کیا گیا اور جب یہ بات کھلی کہ سید موسیٰ الصدر، یاسر عرفات کی درخواست پر سوریا گئے تھے تو ان لوگوں نے کہنا شروع کیا کہ یاسر عرفات اور ابو جہاد کو بھی ٹھکانے لگا دیا جائے۔

میں آپ کے سامنے ایک بات بیان کرتا ہوں جو ہمارے لیے باعثِ فخر بھی ہے اور اس کے ساتھ دردناک بھی۔ جنوبی لبنان کے فلسطینی کمانڈروں میں سے ایک کمانڈر نے جو یاسر عرفات کے طرفدار ہیں، ہمارے ملیشیا کے دس بہترین نوجوانوں کو جبل لبنان بھجوایا تاکہ وہ ابو جہاد کی حفاظت کر سکیں۔ یہ کمانڈر کہتے تھے کہ "فتح" کے اندر اختلافات کی بناء پر ہمارے لیے ممکن نہیں کہ ہم "فتح" کے ارکان کے بارے میں اطمینان کا اظہار کر سکیں۔ چونکہ ہو سکتا ہے کہ جس شخص کو

ہم محافظ مقرر کریں وہ ابو صالح کا طرفدار ہو اور حفاظت کرنے کی بجائے یاسر عرفات کو ٹھکانے لگا دے۔ صرف "حرکۃ المحرومین" اور "امل" کے جوان ہیں جن پر ہم بھروسا کرتے ہیں اور بھروسا کر سکتے ہیں۔

میں سید موسیٰ الصدر کی طرف سے ابو جہاد سے ملنے کے لیے جبل لبنان گئے اور میں نے ان سے کہا: "اے ابو جہاد! اگر اس مقدس راہ میں اور مسلمانوں کے دفاع کے لیے آپ جنوبی لبنان سے ۵ سو جنگ آزما طلب کریں تو کل ہی یہ جوان آپ کی خدمت میں حاضر ہو جائیں گے۔" ابو جہاد خوش ہوئے اور انھوں نے شکریہ ادا کیا اور اس شکریے میں ان کے قلب و روح کی آمیزش موجود تھی۔ بہرحال ان تمام حضرات کے لیے خطرہ موجود ہے اور جد و جہد کی داستان اس بات پر ختم ہوتی ہے کہ آیا وہ لوگ کامیاب ہوں گے جن کی پشت پناہی رُوس کر رہا ہے یا دوسرے لوگ۔

اس بناء پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ داخلی جنگ ایک سازش ہے جو امریکہ اور اسرائیل فلسطینی مزاحمت کی تحریک کو ختم کرنے اور سوریا کو مزہ چکھانے کے لیے پروان چڑھا رہے ہیں۔ یہ کام وہ اپنے ان ایجنٹوں سے لے رہے ہیں جو فلسطینیوں کی صفوں میں شامل ہیں، مسلمانوں کو مسلمانوں کے خلاف لڑوا کر لے رہے ہیں۔ اپنی فوجیں بھیجے بغیر وہ اب تک تو کامیاب ہوئے ہیں۔ ان کا منصوبہ بڑی دقتِ نظر سے تیار کیا گیا ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ سوریا اور فلسطینی فدائیوں کو آپس میں لڑوا دیا جائے اور جب سوریا کی حکومت کا پانسہ اُلٹ دیا جائے تو پھر طے شدہ پروگرام کے مطابق سوریا کو سُنی، نصیری اور دُرزی علاقوں میں تقسیم کر دیا جائے تاکہ شرقِ اوسط میں کوئی ایسی طاقت باقی نہ رہے جو اسرائیل کے منہ آسکے۔

ہم یہ جانتے ہیں کہ کتائب کے لوگ تو پہلے ہی سے امریکہ اور اسرائیل کے پٹھو ہیں۔ لیکن بائیں بازو کے لوگ مسلمانوں کی صفوں میں رہ کر اس سازش میں شریک ہوتے ہیں اور اندر سے دھماکہ کرتے ہیں۔ یہ وہ تجربہ ہے کہ ہم مسلمانوں نے مختلف مقامات پر حاصل کیا۔ اور ہم یہ دیکھتے ہیں کہ جنوبی لبنان، بلکہ پورے لبنان میں، اور فلسطینی مزاحمت کی صفوں میں اس سازش کے اثرات ظاہر ہو رہے ہیں۔ اس وقت ہمارا موقف یہ ہے کہ اس قسم کی سازشوں اور خیانتوں کے مقابلے میں فلسطینی مزاحمت کا دفاع کریں۔

Presented by Ziaraat.Com

بائیں بازو کی جماعتیں کیا چاہتی ہیں؟

بائیں بازو والے دو گروہوں پر مشتمل ہیں: ایک گروہ بائیں بازو کی ان جماعتوں سے تشکیل پاتا ہے جو کمال جنبلاط کو اپنا رہبر تسلیم کرتی ہیں۔ کمال جنبلاط لبنان کے دُرزیوں[1] سے تعلق رکھتے ہیں، لبنانی پارلیمنٹ کے رکن ہیں اور اس سے قبل کئی بار وزیر بھی رہ چکے ہیں۔ وہ لبنان کے نظامِ حکومت سے تعاون کرتے رہے ہیں، وہاں کے بہت بڑے جاگیردار اور کروڑپتیوں میں شامل ہیں۔ ان کی اپنی پارٹی کا نام "الحزب التقدمی الانشتراکی" (Progressive Socialist Party) ہے۔ بائیں بازو کا گروہ لبنان کی کمیونسٹ پارٹی ہے جس کے سربراہ جورج حاوی ہیں جو مذہب کے اعتبار سے عیسائی ہیں اور عقیدے کے اعتبار سے روس کے ساتھ ہیں۔ پچھلے جھگڑوں میں رُوس کے ناخوش ہونے کی بناء پر لبنان کی کمیونسٹ پارٹی بھی ناخوشی کا اظہار کرتی رہی ہے۔ اس طرح اس گروہ میں "حزب العمل الشیوعی" (Communist Labour Party) ہے جو خالص مارکسی جماعت ہے۔ اسی طرح اس میں "حزب البعث" کی عراقی شاخ بھی شامل ہے جو اصولی طور پر "فتح" اور یاسر عرفات کے خلاف ہے۔ بائیں بازو کی جماعتوں کا دوسرا گروہ "الجبهة الرفض" (Rejection Front) کے نام سے مشہور ہے۔ اس گروہ میں جورج حبش کی جماعت "الجبهة الشعبية"، نائف حواتمہ کی جماعت "الجبهة الشعبية الديموقراطية" احمد جبریل کی جماعت "القيادة العامة"، اور عراق کی سرپرستی میں کام کرنے والی جماعت "جبهة التحرير العربية" شامل ہیں۔

یہ دونوں گروہ اصولی طور پر فلسطین کی تحریکِ آزادی کے مخالف ہیں اور گزشتہ واقعات کے دوران میں ان کا تضاد واضح ہو گیا۔ بائیں بازو کے یہ گروہ خود اس قابل نہیں کہ کتائب کا مقابلہ کر سکیں، لہٰذا یہ بھُس میں چنگاری ڈال کر خود تماشا دیکھتے ہیں، لوگوں کے جذبات کو بھڑکا کر جنگ کی آگ روشن کرتے ہیں تاکہ ہر قسم کے طریقے سے فلسطینی مزاحمت (فتح) کو شریکِ معرکہ کریں۔ جہاں تک

[1] لبنان کے دُرزی دو بڑے گروہوں پر مشتمل ہیں، ایک گروہ کے سربراہ جنبلاط خاندان کے لوگ ہیں اور دوسرا گروہ ارسلان قبیلے کی قیادت میں ہے۔ اسی قبیلے کے امیر مجید ارسلان ایک مدت تک لبنان کے وزیرِ دفاع رہے۔ ان دونوں گروہوں کی آپس میں خاندانی چپقلش بھی ہے۔

"فتح" کا تعلق ہے اس میں یہ کس بل ہے کہ کتائب[1] سے لڑ سکے، لیکن اس کے سر پر اسرائیلی حملے کے خطرے کی تلوار لٹکتی رہتی ہے اور "فتح" کے رہبروں کی نگاہوں میں اردن میں ہونے والے ۱۹۷۰ء کے واقعات ہمیشہ تازہ رہتے ہیں، خصوصاً اس بناء پر کہ لبنان وہ آخری اڈہ ہے جہاں فلسطینی مزاحمت کچھ کر سکتی ہے۔ اور اگر لبنان میں اس کا خاتمہ ہو جائے تو پھر یہ بات بعید از قیاس ہے کہ مزاحمت دوبارہ اپنے پاؤں پر کھڑی ہو سکے۔ بیشتر عرب ممالک بھی اس بات کے خواہاں ہیں کہ "فتح" کو زک پہنچائی جائے، یا کم از کم اس کے رہبروں کی تادیب ہو۔ یہ حکومتیں اصولی طور پر یہ چاہتی ہیں کہ "فتح" کمزور رہے اور ان کی فرمانبردار، ان کے ہاتھ میں کھیلے اور ان کے اشاروں پر کام کرے۔ لیکن "فتح" کے رہنماؤں کی آزادیٔ رائے انھیں ناراض کرتی ہے۔

کسنجر، سادات مذاکرات کے دوران میں فلسطینی مزاحمت اور یاسر عرفات نے ان کی کھُلم کھُلا مخالفت کی۔ سادات نے قاہرہ میں فلسطینی مزاحمت کے ریڈیو سٹیشن "صوتِ فلسطین" کو بند کر دیا۔ اس کے باوجود بائیں بازو کی جماعتیں یاسر عرفات کو بُرا بھلا کہتی رہیں کہ وہ سازش میں شریک ہے اور دائیں بازو سے تعلق رکھتا ہے اور سادات کو ویسا ہدفِ تنقید نہیں بناتا جیسا بنانے کا حق ہے اور حالت یہ ہے کہ کچھ دیر کے بعد کمال جنبلاط نے سادات کے اس اقدام کو قبول کر لیا جس کے مطابق اس نے سینا کا علاقہ دوبارہ حاصل کر لیا تھا۔ اس وقت بائیں بازو کی ساری جماعتیں بالکل خاموش رہیں اور اعتراض کا ایک لفظ بھی اپنی زبانوں پر نہ لائیں۔

دُوسرا اہم نکتہ یہ ہے کہ اس خانہ جنگی کے دوران میں کمال جنبلاط سب کو اکساتے رہے اور دعوتِ جنگ دیتے رہے لیکن انھوں نے اپنے ملیشیا، خصوصاً دُرزیوں کو، جن کے پاس دس ہزار مسلح افراد موجود ہیں، نیز دُرزیوں کے علاقوں کو جنگ کی لپیٹ میں نہ آنے دیا اور یہ خون ریزی فقط اُن علاقوں میں ہوتی رہی جہاں شیعہ آباد تھے۔ کمال جنبلاط نے سرکاری طور پر اعلان کیا تھا کہ کتائب کی طاقت کو ختم کرنے کے لیے وہ یہ چاہتے ہیں کہ جنگ صرف چند منطقوں تک محدود رہے۔ اس لیے یہ تصادم صرف "الشیاح" اور "برج حمود" ایسے شیعہ مناطق ہی میں محدود

[1] یہ بات ۱۹۷۶ء میں کہی گئی تھی۔ اب فتح کو لبنان میں رہنے ہی نہیں دیا گیا، وہ کتائب سے لڑے گی کیا اور یہ سب بائیں بازو کی جماعتوں کی کارروائیوں کا نتیجہ ہے۔

Presented by Ziaraat.Com

رہے۔ شیعہ جانیں فدا کرتے تھے اور بائیں بازو کی جماعتیں اس سے فائدہ حاصل کرتی تھیں اور یہ کوشش کرتی تھیں کہ فلسطینی مزاحمت کو جنگ کی لپیٹ میں لے آئیں اور اسے ناپید ہونے کے خطرے سے دوچار کریں۔ یہاں ایک اور بات کا اضافہ کیا جا سکتا ہے کہ جب کمال جنبلاط کا لڑکا ولید جنبلاط کتائب نے اغوا کر لیا تو اس نے فوراً کمیل شمعون سے دوستی کر لی۔ حالانکہ ۱۹۵۸ء کے بعد سے جب کمیل شمعون نے امریکی بیڑہ لبنان میں بلوا لیا تھا، کمال جنبلاط اس کا جانی دشمن تھا۔ کمیل شمعون سے اس دوستی کے آدھ گھنٹے بعد کمال جنبلاط کا لڑکا برآمد کرا لیا گیا۔ حالانکہ سینکڑوں مسلمان سنی اور شیعہ کتائب کی قید میں تھے۔ لیکن کمال جنبلاط کو ان کے بارے میں کوئی پروا نہ تھی۔

مارکسی جماعتیں کوشش کرتی ہیں کہ ظلم و استعمار اور امپیریالیزم کے ساتھ لڑائی میں اپنے آپ کو نمونے کے طور پر پیش کریں اور اس کام کے لیے وہ بڑے شدید پروپگنڈے سے کام لیتی ہیں۔ وہ یہ چاہتی ہیں کہ لوگ ہر کام کو ان کے خیالات و افکار کی روشنی میں جانچیں اور ہر اقدام کی درستی کا معیار انھی کے افکار و خیالات ہوں۔ ان کی خواہش یہ ہے کہ لوگ ان کے پرستار ہوں اور وطن دوستی اور ظلم کے ساتھ جنگ میں انھی کو اپنا مرجع تسلیم کریں، اور یہ کہ جو شخص ان کے ساتھ اتفاق نہ کرے یا ان کے ساتھ نہ ملے وہ غیر ملکی ایجنٹ، غدار، بورژوا اور امپیریالیزم کا طرفدار ٹھہرایا جائے۔ ان کا یہ دعویٰ اس حد تک پہنچ چکا ہے کہ جب یاسر عرفات یا فلسطینی مزاحمت ان کی مخالفت کرے تو انھیں غدار اور خائن اور دائیں بازو والا قرار دیا جاتا ہے۔ "فتح" کے رہبر یاسر عرفات تو خائن اور بورژوا گردانے جاتے ہیں اور کمال جنبلاط ایسے کروڑ پتی جاگیردار اور لبنانی سیاستدان، جن کا کام سیاسی جوڑ توڑ کے سوا اور کچھ نہیں، مجاہد، ترقی پسند اور انقلابی ٹھہرائے جاتے ہیں۔

بائیں بازو کی جماعتیں سب سے زیادہ اس بات کی خواہاں ہیں کہ جنوبی لبنان میں ایک کمیونسٹ حکومت وجود میں آ جائے، ان کی یہ خواہش اسرائیل اور کتائب کے مفادات سے مطابقت رکھتی ہے۔ وہ یہ چاہتے ہیں کہ یہ خانہ جنگی زیادہ طول پکڑے۔

لبنان کی تقسیم :

یوں سازش برسرِ کار رہی۔ ایک طرف اسرائیل اور کتائب اور دوسری طرف بائیں بازو کی جماعتیں جنگ کی طلبگار تھیں۔ آپ شاید پوچھنا چاہیں کہ یہ بائیں بازو کی جماعتیں یہ کمیونسٹ جنگ کیوں چاہتے تھے؟ اس کے اسباب میں بیان کر چکا ہوں ان میں ایک اور بات کا اضافہ کر لیجیے۔ عیسائیوں نے منصوبہ تیار کر رکھا تھا کہ لبنان کی تقسیم ہو جائے اور شمالی لبنان کے اس علاقے میں جہاں عیسائی آباد ہیں ایک مارونی حکومت قائم ہو جس کی اساس اسرائیل کے مانند نسلی برتری پر ہو[1]۔ اسرائیل کو اس بات سے بے حد فائدہ حاصل ہوتا ہے۔ اگر اس منطقے میں نسلی برتری کی بنیاد پر اسرائیل جیسی کوئی حکومت وجود میں آ جائے یا کوئی ایسا فکری ڈھانچہ بن جائے جس کی بنیاد ہی نسلی برتری کے تصورات پر ہو۔ اسرائیل کی ساختہ پرداختہ لبنانی حکومت اسی فلسفے کی بنیاد پر تمام مسلمانوں کو لبنان سے نکالنا چاہتی ہے۔ "رأس النبعہ" اور "تل الزعتر" کی وحشیانہ بربادی، جس کا ذکر اس کتاب میں ایک اور مقام پر موجود ہے، اسی مقصد کے حصول کے لیے تھی۔

کمیونسٹ بھی اس بات کے خواہاں تھے کہ 'کمال جنبلاط' کی سربراہی میں جنوبی لبنان میں ایک کمیونسٹ حکومت بن جائے سوویٹ روس ان کی پشت پناہی کر رہا تھا اور اس کی للچائی ہوئی نظریں جنوبی لبنان کی دو بندرگاہوں 'حمود' اور 'صیدا' پر تھیں۔ کمیونسٹوں کا خیال تھا کہ اگر لبنان تقسیم ہو جائے اور عیسائی اس کے شمالی حصے پر تسلط حاصل کر لیں تو وہ جنوبی لبنان میں جہاں یہ بہت بڑی تعداد میں ہیں، فلسطینیوں کی مدد سے یا روس کے سیاسی تعاون سے بائیں بازو کی ایک حکومت بنا سکیں گے۔ اس لیے اپنے مراعات اور مفادات کی بنا پر جنگ میں وسعت پیدا کرنا چاہتے تھے۔

ہمیں یہ کہنا پڑتا ہے کہ مسلمانوں کے لیڈروں کی اکثریت اس تصادم اور خانہ جنگی کی مخالف

---

[1] اس بات کا ذکر ہو چکا ہے کہ مارونی عیسائی اپنے آپ کو عرب نہیں کہتے اور نہ گردانتے ہیں۔ یہ لوگ بنو امیہ کی حکومت کے ابتدائی دور میں لبنان آئے تھے۔ ان کا اصلی وطن مشرقی ترکی ہے۔ یہ اپنے آپ کو عربوں سے کہیں برتر سمجھتے ہیں اور لبنان کو اپنا آبائی ورثہ گردانتے ہیں۔ مشہور امریکی مؤرخ فلپ حتی بھی لبنانی مارونی ہے اسی لیے وہ بنو امیہ کی حمایت اور تعریف و توصیف میں اپنی تمام طاقت صَرف کرتا ہے۔

Presented by Ziaraat.Com

تھی۔ اہلِ سنت کے رہبر اور لبنان کے مفتی شیخ حسن خالد جنگ کے شدید مخالفوں میں سے تھے۔ اسی طرح دُرزیوں کے دینی سربراہ یعنی 'شیخ العقل' بھی جنگ کے خلاف تھے لیکن بائیں بازو کی جماعتوں کے خلاف آواز بلند کرنے کا دم خم کسی میں نہ تھا۔ اس لیے سب کے سب خاموش تھے لیکن مردِ حق سید موسیٰ الصدر بڑی شجاعت و استقامت اور بغیر کسی خوف کے ایک جانب دائیں بازو والوں اور دوسری جانب بائیں بازو والوں کے مقابلے میں آواز بلند کرتے تھے اور لبنان کی تقسیم کی نہایت شدت سے مخالفت کرتے تھے۔

جیسا کہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں بیروت میں یونیسکو کی بلڈنگ میں 'امل' کے شہداء کی برسی کے موقع پر ایک جلسہ ہوا تھا جس میں سید موسیٰ الصدر نے لبنان کی تقسیم اور بائیں بازو والوں کے منصوبے کی مذمت کی تھی اور کہا تھا یہ لبنان کے خلاف ایک بہت بڑی سازش ہے اور یہ کسی صورت بھی دائیں یا بائیں بازو والوں کو یہ اجازت نہیں دے سکتے کہ وہ لبنان کو منقسم کر دیں۔

دائیں بازو والوں نے یعنی کتائب نے اپنے علاقے میں ایک داخلی حکومت بنالی تھی۔ بائیں بازو کے لیڈر کمال جنبلاط نے بھی ایک بہت بڑے جلسے میں مسلمان علاقوں کے لیے ایک داخلی حکومت کا اعلان کیا۔ ایک فوج تشکیل دی جس کا نام قومی فوج رکھا گیا اور پولیس بھی ترتیب دی جسے "الامن الشعبی" کہا گیا۔ مختلف لوگوں کو کارخانوں، سرکاری محکموں، بندرگاہوں اور سڑکوں وغیرہ کا انچارج بنا دیا گیا۔ مختصر یہ کہ جنوبی لبنان میں ایک باقاعدہ حکومت تشکیل دے دی گئی اور یوں کچھ مدت کے لیے کمال جنبلاط اور ان کے ساتھیوں نے یہ تصور کیا کہ کامیاب ہو گئے ہیں اور ان کی حکومت واقعی وجود میں آگئی ہے۔ اس مدت میں بائیں بازو کی جماعتوں کی جانب سے مخالف عنصر کو ٹھکانے لگانے کے علاوہ ایسے مجرمانہ اعمال ظاہر ہوے جن کے بیان سے شرم آتی ہے۔ نمونے کے طور پر ہم چند مثالیں پیش کرتے ہیں۔

رمضان کا مہینہ تھا۔ جنوبی لبنان کے شہر نبطیہ کے قریب ایک گاؤں "دیبہ زہرانی" میں ۲۷ کے قریب مسلمان نوجوان نماز پڑھنے کے لیے مسجد میں گئے اور وہاں نماز جماعت ادا کی۔ بائیں بازو کے افراد نے مسجد کا محاصرہ کر لیا، ان نوجوانوں کو پکڑا، مارا پیٹا اور ان میں سے چھ افراد کو شدید زخمی کر دیا اور ان کو چند دن کے لیے قید کر دیا۔ خود میں نے "فتح" کے افراد کی مدد سے دوڑ دھوپ کر کے

ان بے گناہ نوجوانوں کو قید و بند سے چھڑایا۔ ان کا جرم صرف یہ تھا کہ انھوں نے مسجد میں نمازِ جماعت ادا کی تھی۔ اسی طرح نبطیہ کے نزدیک ایک اور گاؤں میں ایک مسجد تھی جس میں لاؤڈ سپیکر لگا ہوا تھا جس پر اذان بلند ہوتی تھی۔ وہاں کی کمیونسٹ پارٹی نے امام مسجد سے کہا کہ اس اذان میں جب اَشْهَدُ اَنْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کہا جاتا ہے تو گویا ہمیں چڑایا جاتا ہے اور ہمارے عقیدے کو زد پہنچائی جاتی ہے، اس لیے اس لاؤڈ سپیکر کو بند کر دیا جائے۔ یہ کہ کر انھوں نے لاؤڈ سپیکر کو کاٹ دیا۔ امام مسجد نے بطورِ احتجاج مسجد میں جانا بند کر دیا۔ بہرحال اس مدت کے دوران میں چوری، لوٹ مار، عورتوں کی بے حرمتی اور اس قسم کے بہت سے واقعات عام ہو گئے جن کے بیان سے شرم آتی ہے یعنی وہی ٹھکانے لگانے کا کام جو بائیں بازو کے تسلط حاصل کرنے کے بعد عام طور پر شروع ہو جاتا ہے۔ میں صرف یہی کہوں گا کہ چار سال کے بعد انھی بداعمالیوں کی بناء پر بائیں بازو کی جماعتیں جنوبی لبنان میں شکست کھا گئیں اور اپنی آئیڈیالوجی کے لحاظ سے ناپید ہو گئیں۔ اب آپ جس گاؤں میں قدم رکھیے، جس شخص سے بات کیجیے، آپ کو اس کا احساس ہو گا کہ لوگ بائیں بازو کے لوگوں سے بیزار ہیں اور ان سے متنفر ہو چکے ہیں، اور اس کا سبب یہی بداعمالیاں ہیں اور ٹھکانے لگانے کا کام ہے۔ آخر ایک دن آ پہنچا جب انھوں نے "امل" کے فدائیوں کو بھی ٹھکانے لگانے کا کام شروع کیا۔ "امل" وہ تنہا جماعت تھی جو ان لوگوں کے مقابلے میں ثابت قدمی سے کھڑی تھی اور کلمۂ حق کو بلند آواز سے لوگوں تک پہنچاتی تھی اور کسی صورت بھی ہتھیار ڈالنے پر تیار نہ تھی۔ اسی بناء پر "امل" کے فدائی ان کے بغض و کینہ کا ہدف بنے ہوے تھے۔ جہاں کہیں یہ فدائی انھیں ملتے، یہ جماعتیں انھیں تنگ کرتیں، مارتی پیٹتیں، یہاں تک کہ ان میں سے کچھ کو قتل بھی کر دیا گیا۔ جنوبی لبنان میں تنظیمِ امل کی مرکزی کمیٹی کے چھے ارکان موجود تھے۔ ان میں سے چار افراد خانہ جنگی کے دوسرے دور میں بائیں بازو کے ہاتھوں شدید مجروح ہوے۔

مختصر یہ کہ خانہ جنگی کا پہلا مرحلہ اس وقت تک تھا جب سوریا کی فوجیں لبنان میں آگئیں، عیسائیوں نے شکست تسلیم کر لی اور دو ماہ امن و امان سے گزرے۔ اس کے بعد سازشوں کی بناء پر دوبارہ خانہ جنگی شروع ہو گئی جسے جنگِ جبل کہا جاتا ہے جس میں بائیں بازو کے لوگوں نے لبنان کے پہاڑی علاقوں میں لڑائی شروع کر دی، حالانکہ لبنان میں امن و امان ہو چکا تھا اور تین بااثر شخصیتوں نے یعنی سوریا کے صدر حافظ الاسد نے، فلسطینی مزاحمت کے سربراہ یاسر عرفات نے، اور لبنان

Presented by Ziaraat.Com

کے صدر سلیمان فرنجیہ نے لبنان میں صلح کی ضمانت دی تھی اور نیا دستور زیرِ تدوین تھا۔ لیکن بائیں بازو اور دائیں بازو کی فرقہ پرست جماعتوں نے جنگ کی آگ دوبارہ بھڑکا دی تاکہ شمالی لبنان میں عیسائیوں کی اور جنوبی لبنان میں بائیں بازو کی جماعتوں کی حکومت تشکیل پا سکے۔ میں اس کا ذکر کر چکا ہوں کہ کس طرح یہ حکومت وجود میں آئی اور کس طرح سے انھوں نے فوج اور پولیس کی تنظیم کی۔ لیکن اس تقسیم میں آدھا حصّہ دائیں بازو اور امریکی۔ اسرائیلی گروہ کے لوگوں کو ملا اور آدھا حصّہ کمیونسٹوں کو، شیعوں کے پاس کچھ نہ رہا کیونکہ وہ تمام علاقہ جس میں بائیں بازو کے لوگ اپنی حکومت قائم کیے ہوئے تھے شیعہ علاقہ تھا۔ جنوبی لبنان دراصل شیعہ اکثریت کا علاقہ ہے لیکن فوجی طاقت کی بدولت زور فلسطینیوں کا اور بائیں بازو کے لوگوں کا چلتا تھا۔ دوسرے لفظوں میں بائیں بازو والے یہ چاہتے تھے کہ اسے ایک ایسی ریاست میں تبدیل کر دیں جس پر رُوس کا تسلط ہو۔ ظاہر ہے کہ ہم اس سازش کو کامیاب ہونے کی اجازت نہیں دے سکتے تھے۔ سیّد موسیٰ الصدر ان لوگوں کے مقابل کھڑے ہو گئے اور ایک زبردست کشمکش شروع ہو گئی۔ سیّد الصدر نے کمال جنبلاط کے خوب لتّے لیے اور ان لوگوں کو خوب لتاڑا جو لبنان کو تقسیم کرنا چاہتے تھے۔ انھوں نے ان کو غدار قرار دیا اور کہا کہ "تم لوگ اسرائیل کے پروگرام پر عمل کر رہے ہو۔ تم یہ چاہتے ہو کہ نئے اسرائیل وجود میں آ جائیں لیکن ہم تمھیں اس کی اجازت نہیں دے سکتے۔" بہرحال سخت جنگ شروع ہو گئی۔ ایک طرف یہیں دائیں بازو والے پِٹتے تھے اور دوسری طرف بائیں بازو والے کیونکہ دونوں کا اپنا مفاد اسی سے وابستہ تھا۔

خانہ جنگی کا یہ دوسرا دَور تاریخِ لبنان کا خطرناک ترین دَور تھا کیونکہ سوریا اور فلسطینی مزاحمت کے مابین جھگڑے کے علاوہ کتائب نے مسلمانوں کی داخلی کشمکش سے فائدہ اُٹھایا اور مسلمانوں کے ان مناطق کو، جو ان کے علاقے میں تھے، شدید ترین کشت و خون کے بعد اور طویل محاصروں کے بعد وہ اپنے تصرف میں لے آئے۔ اس دوران میں انھوں نے کھلم کھلا قتلِ عام اور دردناک جرائم کا ارتکاب کیا۔ ان علاقوں میں اہم ترین علاقے "راس النبعہ" اور "تل الزعتر" کے تھے۔

بابِ سیزدہم

رأس النبعہ کا سقوط

"رأس النبعہ" شمالی بیروت میں ایک شیعہ علاقہ تھا جس میں کوئی دو لاکھ ستر ہزار اشخاص بستے تھے۔ اس علاقے کے سب لوگ شیعہ تھے۔ جنوبی لبنان اور "بعلبک" کے وہ لوگ جو بیروت جاتے تھے وہ عیسائیوں کے علاقے میں کام کرتے تھے، اپنے علاقے سے دور ہونے کے باعث وہ غریب علاقوں میں، جیسے تہران کی کچھ آبادیاں ہیں، جمع ہو گئے تھے اور یوں "راس النبعہ" کا محلہ وجود میں آیا تھا۔ یہ بہت چھوٹا سا علاقہ تھا لیکن دو لاکھ ستر ہزار کی آبادی اس کے اندر سمائی ہوئی تھی۔ اس محلے میں چند بڑی بڑی کئی منزلہ عمارتیں تھیں جس میں ہر منزل میں کوئی دس چھوٹے چھوٹے فلیٹ تھے جن کے ہر کمرے میں اوسطاً بارہ اشخاص رہتے تھے۔ اس سے آپ اس غربت و فلاکت کا تصور کر سکتے ہیں جو بارہ افراد کو ایک کمرے میں رہنے پر مجبور کرتی ہے۔ گلیوں کوچوں میں اس قدر بھیڑ ہوتی تھی کہ اگر آپ یہ چاہتے کہ چہل قدمی کریں تو آپ کے لیے آسانی سے گزرنا ممکن نہ تھا۔ چند سال پہلے میں نے ایک مضمون لکھا تھا جس میں مَیں نے کہا تھا کہ "راس النبعہ" شیعوں کا چین ہے۔ آپ یہ جانتے ہیں کہ چین کی آبادی کوئی ایک ہزار ملین (ایک ارب) کے قریب ہے۔ جو کوئی "راس النبعہ" میں آتا اس کے ذہن میں چین کا تصور آتا، بے حد آبادی جس نے ایک چھوٹے سے علاقے کو بالکل پُر کر رکھا تھا۔ بے شمار بچّے، بڑے، چھوٹے گھومتے پھرتے تھے۔ ہر شیعہ گھر میں دس سے پندرہ بچّے ہوتے تھے۔ ان کے ہاں بچّوں کی زیادتی مشہور ہے اور شاید دُنیا میں اس کی مثال کم ہے۔ اس قسم کا محلہ بیروت کے عیسائی منطقے کے بالکل وسط میں واقع ہے۔ بیروت شہر کے دو حصّے ہیں: ایک مسلمانوں کا، ایک عیسائیوں کا۔ چونکہ بیروت کی بڑی بڑی فیکٹریاں عیسائی چلاتے ہیں اس لیے قدرتی طور پر شیعوں کا یہ بہت بڑا کیمپ یعنی "راس النبعہ"

Presented by Ziaraat.Com

عیسائی علاقے کے وسط میں آگیا تھا کیونکہ یہ لوگ چاہتے تھے کہ عیسائیوں کی فیکٹریوں میں کام کریں۔ ان لوگوں کو رہنے کے لیے یہی "نبعہ" کا علاقہ ملا تھا اور یوں اس علاقے کی آبادی دو لاکھ ستّر ہزار نفوس پر مشتمل ہوگئی تھی۔

"تل الزعتر" فلسطینیوں کا علاقہ تھا اور اس کا دفاع فلسطینیوں ہی کی ذمہ داری تھی اس لیے فلسطینی مزاحمت اس علاقے کی مدافعت کی باقاعدہ ذمہ دار تھی لیکن "راس النبعہ" کے علاقے میں دو لاکھ ستر ہزار شیعہ بستے تھے۔ یہ وہ علاقہ تھا جس میں سیّد موسیٰ الصدر اور "حرکۃ المحرومین" اور تنظیم "امل" کا سکہ چلتا تھا۔ جب جنگ شروع ہوئی تو "نبعہ" کا علاقہ کتائب کے محاصرے میں آگیا اور یہ بڑا شدید محاصرہ تھا۔ تصور کیجیے کہ دو لاکھ ستّر ہزار افراد کھانے پینے کی چیزوں سے محروم تھے اور بیکار تھے اور اس چھوٹے سے علاقے میں دن رات دشمن کے مارٹروں کی گولہ باری ہوتی رہتی تھی۔ میں نے اس علاقے میں گزرتے ہوئے خود دیکھا ہے کہ جب کوئی گولہ گرتا تھا تو کم از کم چھے افراد موت کی آغوش میں چلے جاتے تھے۔ جب کوئی گولہ گرتا تو اس کے ٹکڑے چاروں طرف منتشر ہو جاتے جن سے کم از کم چھے افراد زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھتے اور بہت سے زخمی ہو جاتے۔ میں آپ کی اطلاع کے لیے عرض کر دوں کہ دو لاکھ ستر ہزار کی آبادی کے اس علاقے میں ایک بھی ہسپتال یا ڈسپنسری نہ تھی۔ وہ لوگ جو گولہ باری سے زخمی ہو جاتے وہ خون کے بہ جانے سے مر جاتے کیونکہ یہ محلہ محاصرے میں تھا اور انھیں ہسپتال میں لے جانا ممکن نہ تھا لہٰذا ہسپتال کے بغیر اور ڈاکٹر کے بغیر ان کو کوئی طبی امداد نہ مل سکتی۔ ان کا خون بہتا رہتا اور بالآخر وہ موت کی آغوش میں سو جاتے۔ لبنان کی حکومت کے جرائم میں سے ایک جرم یہ ہے کہ دو لاکھ ستر ہزار افراد کے لیے کوئی ہسپتال یا ڈسپنسری نہ تھی[1]۔ چونکہ یہ محلہ خالص شیعہ علاقہ ہے اس لیے ہمیں اس کے بارے میں سب سے زیادہ تشویش تھی اور سیّد موسیٰ صدر اسے شیعوں کا فلسطین کہتے تھے۔ ہمارے دوست، ہمارے رضاکار اور ہمارے عوام وہاں رہتے تھے۔ کمال جنبلاط کا، ہمارے سنی بھائیوں کا، ہمارے فلسطینی دوستوں کا اور دوسرے حضرات کا اس علاقے سے کوئی فکری یا خونی یا مذہبی رابطہ نہ تھا لیکن ہمارے دل اور ہماری روحیں "نبعہ" میں تھیں۔ اس علاقے

[1] یہاں ڈاکٹر مصطفیٰ چمران کی ایک تقریر کی اساس پر جو انھوں نے قلہک کی بڑی مسجد میں ۵ ستمبر ۱۹۸۰ء کو کی تھی اور ایک خط کے مطابق جو انھوں نے ۱۹۷۰ء میں ایران کو لکھا تھا، تیار کیا گیا تھا۔

میں جب کوئی شیعہ زمین پر گرتا، گویا ہمارے دل میں ایک کچوکا لگتا۔ یہاں جب کسی لڑکی کی بے عزتی ہوتی تو ہمیں یوں معلوم ہوتا کہ ہماری اپنی بیٹیوں اور بہنوں کی بے عزتی ہوئی ہے۔ اب حالت یہ تھی کہ مسلمان سب کے سب مل کر اس محلے کے اندر سے عیسائیوں پر گولیاں چلاتے تھے تاکہ عیسائی "نبعہ" پر گولہ باری کریں، تاکہ عیسائیوں کی گولہ باری "تل الزعتر" کے کیمپ کو اپنا نشانہ نہ بنائے، تاکہ خدانخواستہ کوئی فلسطینی نہ مارا جائے۔ بلکہ اس گولہ باری کا نشانہ "راس النبعہ" کا علاقہ بنے اور شیعہ مارے جائیں۔ یہاں شیعوں کو اس طرح قربان کیا جا رہا تھا جس طرح کسی کے صدقے میں قربانی کے جانور ذبح کیے جاتے ہیں اور یہ کام اتنی سختی اور بے رحمی سے انجام پاتا تھا گویا تاریخ نے یہ بات شیعوں کے مقدر میں لکھی ہو کہ شیعہ دوسروں کو بچانے کے لیے سپر بنیں۔ گویا ان کی زندگی بے اہمیت ہے، اس کی قدر و قیمت کچھ نہیں، اگر وہ مر جائے تو کوئی بات نہیں۔

بہرحال "نبعہ" کی ذمہ داری ہم پر تھی، شیعوں کی ذمہ داری ہمارے سر تھی اور لازم تھا کہ ہم ان بدنصیب لوگوں کے درد کا مداوا کریں۔ جنگ کے ابتدائی مہینے تھے کہ ہمیں "نبعہ" کے کشت و خون کی خبر ملی۔ اس علاقے کے بدنصیب لوگ بھوک کے مارے وہاں سے بھاگ کر ارمنیوں کے علاقے میں پناہ لیتے۔ ارمنی اس جنگ میں غیر جانبدار تھے اس لیے ان کی طرف سے مسلمانوں کے لیے کوئی خطرہ نہ تھا۔ یہ بدنصیب مسلمان، یہ غربت زدہ اور بے کس شیعہ ارمنیوں کو ڈھونڈ نکالتے اور ان سے کہتے کہ ہمیں نجات دلاؤ اور اس محاصرے سے باہر نکالو۔ ارمنیوں کی اکثریت تجارت پیشہ تھی اور پیسہ کمانا ان کا کام تھا۔ انھیں ایک اچھا کاروبار ہاتھ آگیا۔ وہ ایک شیعہ سے ڈیڑھ سو یا دو سو لیرے (پانچ سو سے سات سو روپے تک) لیتے تاکہ اسے محاصرے کے علاقے سے باہر نکال لیں۔ اس طریقے سے شیعہ ارمنیوں کے علاقے سے ہو کر باہر نکل جاتے۔ بیروت کو "راس النبعہ" سے ملانے والا ایک مشہور پل ہے۔ دائیں بازو کے بے شرف اشخاص نے اس پل پر ایک رکاوٹ کھڑی کر رکھی تھی۔ یہ کام کرنے والوں میں "حراس الارز"[1] کا گروہ بھی شامل تھا جو اپنے سینے پر بہت بڑی

[1] "حراس الارز" کے لفظی معانی "ارز کے محافظ" ہیں۔ "ارز" دیودار کی نسل کا ایک درخت ہے جو کسی زمانے میں لبنان میں بے حد دستیاب ہوتا تھا اور اب بھی اس کے بعض جنگل لبنان کے پہاڑوں میں موجود ہیں۔ یہ درخت لبنان کا قومی نشان ہیں۔ "حراس الارز" نہایت متعصب عیسائیوں کی جماعت ہے اور مسلمان دشمنی میں وہ کتائب سے بھی بڑھ کر ہے۔

Presented by Ziaraat.Com

صلیب لٹکاتے ہیں اور اپنے آپ کو صلیبیوں کی اولاد گردانتے ہیں۔ یہ لوگ ٹیکسیوں کو روک لیتے، ان کی سواریوں کو پیدل کر دیتے، جو کوئی مسلمان ان کے ہاتھ آتا وہ اس کا سر جدا کر دیتے اور اس کے سر اور لاش کو پُل پر سے دریا میں پھینک دیتے۔ اس پُل کے نیچے ان بے گناہ شیعہ نوجوانوں کے سروں اور سر بریدہ لاشوں کا ایک ٹیلہ سا بن گیا تھا۔ میں نے اس ٹیلے کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ ٹیکسیوں میں جو عورتیں اور بچے ہوتے انھیں اجازت دے دیتے کہ وہ بیروت چلے جائیں۔ تصور کیجیے کہ دو لاکھ ستر ہزار کی آبادی جو اس منطقے میں تھی گھٹتے گھٹتے دس ہزار تک پہنچ گئی تھی۔ یہ فلاکت زدہ اور بے سہارا لوگ اس طرح کتائب کے ہاتھوں مارے گئے کہ ان کے پاس فرار کی کوئی راہ نہ تھی۔

راس النبعہ میں میری آمد:

جس زمانے میں "نبعہ" کا منطقہ پوری طرح محاصرے میں تھا اور اس محاصرے کو چند ماہ گزر چکے تھے سید موسیٰ الصدر نے مجھ سے کہا کہ میں اپنے آپ کو محاصرے کے حلقے کے اندر پہنچا دوں اور ہم "نبعہ" میں تنظیم کا دفتر کھولیں تاکہ ہم "نبعہ" کے سقوط کا سدِّ باب کر سکیں۔ یہ اور بات ہے کہ اگر دشمن مجھے پہچان لیتے تو میرے ٹکڑے ٹکڑے کر دیتے۔ لبنان کی فوج سے ایک بکتر بند گاڑی منگوائی گئی، اس میں تین، چار لبنانیوں کو بٹھایا گیا، ان کے درمیان میں بھی بیٹھ گیا۔ ہم بھی معمولی کسانوں! مزدوروں کے روپ میں پھٹے پرانے کپڑوں میں اس گاڑی میں داخل ہو گئے، اگرچہ ہمارے کپڑے اکثر ہی ایسے رہتے تھے۔ ہماری گاڑی چلی اور مسلمانوں کے منطقے سے نکل کر جسر الباشا کے علاقے میں داخل ہوئی، جس میں زیادہ تر فلسطینی رہتے تھے۔ زمین پر بے شمار لاشیں پڑی تھیں اور وہاں کوئی پرندہ بھی پر نہیں مار سکتا تھا۔ مجھے یہ محسوس ہوتا تھا کہ ہر گوشے سے اور ہر کونے سے کوئی مشین گن تیار ہے جو ہر راستہ چلنے والے کو گولی کا نشانہ بناتی ہے۔ اس بکتر بند گاڑی کے اندر چھوٹی چھوٹی کھڑکیاں تھیں جنھیں کھڑکیاں کہنا بھی ممکن نہ تھا کیونکہ ان کی اونچائی ۲ انچ سے بھی زیادہ نہ تھی۔ ان کو ہم نے کھول رکھا تھا اور باہر دیکھ رہے تھے۔ اس بکتر بند گاڑی کو دو اشخاص چلا رہے تھے، ایک شیعہ تھا اور ایک عیسائی۔ ایک نے گاڑی کے پچھلے حصے میں مشین گن سنبھال رکھی تھی اور دوسرا گاڑی کو چلا رہا تھا۔ ہم اس علاقے سے گزرے جہاں چاروں طرف لاشیں پڑی تھیں اور عیسائیوں کے علاقے میں داخل ہوئے۔

انھوں نے راستے کے درمیان میں ایک گاڑی کھڑی کر دی تھی اور یوں راستے کو بند کر رکھا تھا۔ بکتر بند گاڑی آگے بڑھی اور سڑک کے درمیان اس کار کے پاس پہنچ کر رُک گئی، اس کا انجن اتفاقاً بند ہو گیا اور دوبارہ سٹارٹ نہیں ہوتا تھا۔ آخر ڈرائیور اور اس کے مددگار نے بڑی مشکل سے انجن سٹارٹ کیا، گاڑی کو کچھ پیچھے لے گئے اور پھر بائیں طرف موڑ کر آگے لے گئے۔ پندرہ یا بیس میٹر کا فاصلہ طے کیا ہوگا کہ کتائب نے بکتر بند گاڑی پر حملہ کر دیا۔ تقریباً بیس، تیس آدمی بکتر بند گاڑی کے چاروں طرف سے حملہ آور ہوئے۔ میں جس طرف نظر اٹھاتا تھا میں یہ دیکھتا تھا کہ کتائبیوں نے ہمارا محاصرہ کر رکھا تھا۔ ان میں سے ایک نے چاہا کہ گاڑی کا دروازہ کھولے لیکن میں نے اندر سے اس کے ہینڈل کو پوری طرح قابو میں کر لیا کہ وہ پوری کوشش کے باوجود دروازہ نہ کھول سکا۔ اس نے خیال کیا کہ شاید دروازہ اندر سے مقفل ہے۔ اُس نے کھڑکی کے شیشے سے اندر نگاہ کی۔ میں نے اپنے آپ کو ایک طرف کر لیا۔ وہ کسی کو نہ دیکھ پایا اُس نے خیال کیا کہ بکتر بند گاڑی کے اندر کوئی نہیں۔ اگر انھیں پتا چل جاتا کہ گاڑی کے اندر ہم موجود ہیں تو گاڑی کے اندر ہی ہمارا سر تن سے جُدا کر دیا جاتا۔ اب انھوں نے ڈرائیور سے پوچھا کہ وہ کس کام پر جا رہا ہے۔ چونکہ وہ لبنانی فوج سے متعلق تھا اور لبنانی فوج اس زمانے میں عیسائیوں کے لیے بڑی مقدس چیز تھی۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ ہماری تکا بوٹی کر دیتے۔ ڈرائیور نے انھیں بتایا کہ مجھے فلاں علاقے میں جانا ہے اور اس کے علاوہ مجھے کوئی کام نہیں۔ وہ چاہتے تھے کہ گاڑی پر نصب مشین گن کو زبردستی لے لیں لیکن ڈرائیور نے بڑی فریاد کی اور کہا کہ میں عیسائی ہوں اور اگر مشین گن کے بغیر واپس گیا تو میرے ساتھ بے حد بُرا سلوک ہوگا، خدا کے لیے مجھ پر رحم کرو۔ اس کی یہ فریادیں آدھ گھنٹے تک جاری رہیں اور بڑی منت سماجت کے بعد انھوں نے اسے چھوڑا اور اُس نے بکتر بند گاڑی آگے بڑھائی یہاں تک کہ ہم "نبعہ" کے علاقے میں داخل ہو گئے۔ ہمارے گرد و پیش میں ایک ہولناک منظر تھا۔ ہمارے ایک جانب کوئی ڈیڑھ، دو کلومیٹر کے فاصلے پر "تل الزعتر" تھا اور جنوب کی جانب "نبعہ" کا علاقہ تھا۔ بکتر بند گاڑی آگے بڑھ رہی تھی اور عیسائیوں اور مسلمانوں کے مابین گولیوں کا تبادلہ جاری تھا۔ ایک جگہ پہنچ کر ڈرائیور نے کہا کہ اب میں اس سے آگے نہیں جا سکتا لہٰذا جو شخص چاہتا ہو وہ گاڑی سے اُتر جائے۔ ہمارے لیے سب سے بڑا خطرہ یہ تھا کہ کتائب یا عیسائی یہ جان لیں کہ اس گاڑی میں کچھ مسلمان پوشیدہ ہیں۔

Presented by Ziaraat.Com

بکتر بند گاڑی سڑک کے درمیان کھڑی تھی، "نبعہ" کی آبادی کوئی تین سو میٹر کے فاصلے پر تھی۔ ہمارے ساتھ جو لوگ تھے وہ مسلسل سگریٹ پی رہے تھے، ان کی ذہنی کیفیت ان کے چہروں سے عیاں تھی۔ خوف نے ان پر تسلط پایا ہوا تھا۔ میں نے ان سے کہا کہ بکتر بند گاڑی آگے نہیں جا سکتی۔ اگر ہم نے اُترنے میں دیر کی تو کتائبی ہمارے نزدیک ہو جائیں گے اور یہیں پکڑ کر ہمارے ٹکڑے ٹکڑے کر دیں گے۔ اس لیے بہتر ہے کہ ہم گاڑی سے اُتر جائیں اور جوں توں کر کے خود کو "نبعہ" کے علاقے میں پہنچا دیں۔ وہ مانتے نہیں تھے، بلکہ ڈرائیور پر زور ڈال رہے تھے کہ انھیں آبادی سے اور نزدیک کر دے۔ بہرحال میں نے فیصلہ کیا کہ اکیلا ہی بکتر بند گاڑی سے نکل پڑوں اور خود کو "نبعہ" پہنچا دوں۔ میں نے اپنی سانس روکی، گاڑی کا دروازہ کھولا اور بڑی تیزی سے اپنے آپ کو زمین پر گرا دیا اور تقریباً دس، بارہ میٹر تک لڑھکتا ہوا چلا گیا۔ دونوں طرف سے گولیوں کی ایک بوچھاڑ میری طرف آئی۔ چونکہ دونوں طرف کے لوگ یہ نہیں جانتے تھے کہ میں کون ہوں یا کیا ہوں میں نے فوراً اپنے آپ کو ایک مٹی کے ٹیلے کے پیچھے چھپا لیا۔ باقیوں نے بھی جب یہ دیکھا کہ گاڑی آگے نہیں جائے گی اور بات ہاتھ سے نکلتی جا رہی ہے تو وہ بھی ایک ایک کر کے میرے پیچھے آ گئے۔ ہم دس، بارہ میٹر کا فاصلہ طے کرتے تھے کہ ہم پر گولیاں برسنا شروع ہو جاتی تھیں۔ یوں آہستہ آہستہ ہم نے اپنے آپ کو اس محلے کے پہلے مکان تک پہنچا دیا۔ وہاں ایک تنگ سی گلی تھی، ہم اس گلی میں ہو لیے۔ مسلمانوں نے اپنا پہلا مورچہ اسی گلی کے درمیان میں بنایا ہوا تھا۔ انھوں نے یہ سمجھا کہ ہم کتائب سے تعلق رکھتے ہیں اور ہم نے اس علاقے پر حملہ کیا ہے اس لیے انھوں نے ہم پر گولیاں برسانا شروع کر دیں۔ ہم نے اپنے آپ کو پھر زمین پر ڈال دیا اور آگے رینگنا شروع کر دیا اور حالت یہ تھی کہ دونوں طرف سے گولیاں ہماری طرف آ رہی تھیں۔ خوش قسمتی سے ہمارے ساتھیوں میں سے ایک شخص "نبعہ" کا رہنے والا تھا۔ اُس نے ان لوگوں کو جو یہاں مورچہ بند تھے پہچان لیا اور بلند آواز سے اپنے ایک دوست کو پکارا: "حسن! حسن! یہ میں ہوں۔" یہ کہ کر اُس نے اپنا نام بتایا اور کہا کہ ہم مسلمان ہیں، کتائبی نہیں۔ جب انھوں نے یہ جانا تو حکم دیا کہ کھڑے ہو جاؤ اور اپنے آپ کو مورچے کے قریب لاؤ۔ ہم نے حکم کی تعمیل کی۔ اس دوران میں ہمارے ایک ساتھی کو کتائب کی گولی لگی اور وہ شہید ہو گیا۔ بہرحال ہم نے اپنے آپ کو مورچے میں پہنچایا۔ ہماری تلاشی لی گئی، باز پرس ہوئی۔

انھوں نے یقین کر لیا کہ ہم مسلمان ہیں اور اسی لیے ان کے علاقے میں آئے ہیں۔

"نبعہ" کے محاصرے میں:

میں تین دن تک اس محصور علاقے میں رہا۔ اس مدت میں ایک لقمہ تک بھی میرے منہ میں نہ گیا۔ کوئی لمحہ ایسا نہ تھا کہ میں اپنے آنسوؤں پر قابو پا سکتا۔ دشمن کے مارٹروں کے گولے مسلسل اس علاقے پر برس رہے تھے اور ہر گولے کے ساتھ پانچ چھے افراد شہید ہو جاتے اور بہت سے زخمی۔ ان زخمیوں میں سے بھی چند ایک، کچھ دن زندگی اور موت کے درمیان جد و جہد کرتے ہوئے اپنے شہید ساتھیوں سے جا ملتے۔ دشتِ کربلا کا سا منظر تھا۔ اس علاقے کے وسط میں ایک چھوٹا سا امام باڑہ تھا جو مسجد کا کام بھی دیتا تھا۔ ایک بزرگ سید محمد حسین فضل اللہ اس میں امامت کے فرائض انجام دیتے تھے۔ یہ مشہور امام باڑہ تھا اور سید محمد حسین فضل اللہ سے میری پرانی شناسائی تھی۔ میں اس امام باڑے میں گیا۔ اس کے نیچے ایک کمرہ تھا۔ تمام زخمیوں کو اس کمرے میں لے آتے تھے گویا وہ ایک قتل گاہ تھا۔ اسی میں سب کو سلاتے تھے۔ ان زخمیوں کی چیخ پکار آسمان تک پہنچتی تھی۔ نہ کوئی ڈاکٹر نہ نرس اور نہ کوئی دوا تھی جو ان مظلوموں کو سکون دیتی۔ اس کمرے کے ساتھ ایک اور کمرہ تھا۔ جب کوئی شخص موت سے ہمکنار ہو جاتا تو اس کی لاش اس کمرے میں رکھ دی جاتی۔ بالکل قتل گاہ کا منظر تھا۔ قطار در قطار لاشیں پڑی تھیں۔ کچھ دیر ہم اس امام باڑے کی سیڑھیوں پر کھڑے رہے۔ ہمارے سامنے گروہ در گروہ زخمیوں یا لاشوں کو لاتے تھے اور گروہ در گروہ لاشوں کو باہر لے جاتے تھے۔ زخمیوں میں سے کچھ روتے تھے، کچھ چیختے چلاتے تھے مگر کسی میں یہ تاب، یہ مجال نہ تھی کہ وہاں سو سکے، کچھ کھا سکے، جی سکے۔ یہ ایک عجیب و غریب داستان ہے۔ تین راتیں میں نے اس امام باڑے میں بسر کیں۔ مارٹر کے گولے لگاتار اس امام باڑے کی طرف آ رہے تھے جن کی بنا پر ساری بلڈنگ برباد ہو رہی تھی، تمام شیشے ٹوٹ گئے تھے، تمام منارے سرنگوں ہو چکے تھے۔ اس امام باڑے کی کوئی سات منزلیں تھیں۔ جب گولے گرتے تو یہ عمارت لرزہ براندام ہو جاتی، گویا زلزلہ سا آ گیا ہے۔

میں نے اس پورے علاقے کی گشت کی، جنگ کے مختلف محاذوں کو دیکھا، یہاں کے محروم و فقیر شیعوں کی زندگی دیکھی۔ مجھے یہ کہتے ہوئے افسوس ہوتا ہے کہ یہ بے بس اور نادار لوگ مدتوں سے بیکار

Presented by Ziaraat.Com

تھے، ان کے پاس پیسہ نہ تھا، کام نہ تھا، جینے کا کوئی چارہ نہ تھا۔ بائیں بازو کی جماعتیں ان کو اس شرط پر آٹا، روٹیاں اور پیسے دیتی تھیں کہ وہ ان جماعتوں میں اپنے نام لکھوائیں۔ اس سے بھی بدتر بات یہ تھی کہ بعض ایسے خاندان تھے جو اپنا پیٹ بھرنے کے لیے اپنی جوان لڑکیاں ان پارٹیوں کے ہاتھ بیچ دیتے تھے۔ جن لوگوں کا تعلق بعث پارٹی سے تھا انھیں پارٹی کی طرف سے پیسے بھی ملتے تھے، آٹا بھی ملتا تھا اور کھجوریں بھی۔ لیکن جن کا کسی پارٹی سے کوئی تعلق نہ تھا ان کی مدد کرنے والا کوئی نہ تھا۔ اس بناء پر یہ نادار اور بدنصیب شیعہ بامرِ مجبوری اپنے آپ کو ان پارٹیوں کے ہاتھ بیچ دیتے تھے اور یہ بات بڑی دردناک تھی۔

"نبعہ" میں تین دن قیام کے بعد میں نے فیصلہ کیا کہ واپس جاؤں اور اس بدنصیب علاقے کے لوگوں کے لیے کوئی بنیادی کام کروں۔ واپس جانے کے لیے کوئی بکتر بند گاڑی نہ تھی۔ اس لیے سوال پیدا ہوا کہ کیا کیا جائے۔ ہم نے ارمنیوں سے رابطہ پیدا کیا، وہی ارمنی جو پیسے لے کر شیعوں کو بیروت پہنچاتے تھے۔ لیکن ان کی اکثریت یا قید ہو جاتی تھی یا ماری جاتی تھی۔ "نبعہ" آتے ہوئے میں نے ایک فرانسیسی پاسپورٹ اپنے ساتھ رکھ لیا تھا۔ وہاں ایک فرانسیسی تھا جس کی شکل مجھ سے بہت ملتی تھی۔ میں ایک ارمنی گاڑی میں سوار ہوا، میرے ساتھ تین ارمنی تھے اور یوں ہم کتائب کے علاقے میں پہنچے۔ مجھے یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ لبنانی فوج کا ایک افسر جس کے کندھے پر دو پھول لگے ہوئے تھے، وہ کتائب کے گروہ میں کام کر رہا تھا اور آنے جانے والوں کے پاسپورٹ چیک کرتا تھا۔ ڈرائیور نے کہا کہ ہم ارمنی ہیں۔ جب میری باری آئی تو میں نے فرانسیسی میں باتیں کرنا شروع کیں۔ اس نے میرا پاسپورٹ کھولا اور عربی میں کہا کہ یہ تم تو نہیں ہو۔ میں نے بھی فرانسیسی میں خوب خوب سنائیں۔ آخر وہ غصے میں آگیا اور میرے پاسپورٹ کو میرے سر پر دے مارا اور کہا کہ جاؤ اور ہماری خلاصی ہوئی۔ اگر اُسے پتہ چل جاتا کہ میں شیعہ ہوں اور خصوصاً یہ کہ کس کام کے لیے جا رہا ہوں تو وہ میری تکا بوٹی کر دیتے۔

"نبعہ" میں ہسپتال کی بنیاد:

بیروت پہنچ کر میں سید موسیٰ الصدر کی خدمت میں پہنچا اور انھیں یہ ساری دردناک داستان سنائی اور کہا کہ سب سے پہلے وہاں ایک ہسپتال کا بندوبست ہونا چاہیے کیونکہ دو لاکھ ستر ہزار کی آبادی

مارے مردوں کی گولہ باری کے تلے جان دے رہی ہے اور ان کے لیے ہسپتال کوئی نہیں۔ اب ہم نے سوچا کہ کریں کیا۔ کون ہوگا جو اپنے آپ کو "نبعہ" پہنچا سکے اور کون ڈاکٹر اس بات کے لیے تیار ہوگا کہ اپنی جان کو خطرے میں ڈالے اور "نبعہ" میں کام کرے۔ سید موسیٰ الصدر نے فرانس میں اپنے ایک دوست سے رابطہ پیدا کیا۔ اس نے فرانس میں موجود ایک خیراتی کام کرنے والی کمیٹی سے رابطہ پیدا کیا، جس کا نام "سان لیمت" (SANS LIMITE) ہے۔ یہ جماعت بہت سے ڈاکٹروں پر مشتمل ہے جو جغرافیائی سرحدوں کا خیال نہیں کرتے اور ایسے ملکوں میں کام کرنے کے لیے تیار ہیں جہاں ظلم و ستم کی حکمرانی ہو۔ انھوں نے اس درخواست کو قبول کر لیا۔ چار فرانسیسی ڈاکٹر اور تین نرسیں لبنان روانہ ہوگئیں۔ مختلف جگہوں سے چندہ جمع کر کے ہسپتال کے لیے سامان مہیا کیا گیا۔ اس فرانسیسی گروہ کا [illegible] ڈاکٹر ژاں تھا۔ یہ ڈاکٹر قربانی کے جذبے سے سرشار اور انسانی نقطۂ نظر سے بے نظیر تھا۔ اُس نے اس بات پر اصرار کیا کہ وہ خود "نبعہ" جا کر حالات دیکھنا چاہتا ہے تاکہ وہ ہسپتال قائم کرنے کے بارے میں رائے دے سکے۔ آخر کار ہم "نبعہ" گئے اور پہلے کی طرح ارمنی بن کر اور ارمنیوں کی گاڑی میں۔ وہ بہرحال غیر ملکی تھا۔ راستے میں کتائب کو پتا چل گیا کہ وہ ڈاکٹر ہے اور ایک ہسپتال قائم کرنے کے لیے "نبعہ" جا رہا ہے۔ انھوں نے کار پر گولیوں کی بوچھاڑ کر دی اور کار کے ہر کونے میں چھید ڈال دیے۔ لیکن خوش قسمتی سے اسے کوئی گزند نہ پہنچی اور وہ "نبعہ" پہنچ گیا۔

"نبعہ" پہنچنے کے بعد ۴۸ گھنٹے تک وہ بالکل نہ سویا، نہ پانی پیا، نہ روٹی کا ایک ٹکڑا منہ میں لیا۔ آستینیں اُلٹے ہوئے وہ زخمیوں اور مُردوں کے درمیان گشت کر رہا تھا اور زخمیوں کی مرہم پٹی شروع کر دی۔ ۴۸ گھنٹے کی اس کد و کاوش کے بعد وہ بے ہوش ہو کر زمین پر گر پڑا۔ ظاہر ہے کہ ایک ڈاکٹر زخمیوں کے اس سیلاب میں کہاں تک برداشت کرتا۔ وہ بے ہوش ہی تھا کہ میں نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ اسے اٹھائیں اور یوں ایک بار پھر ارمنیوں کی مدد سے ہم نے اسے بیروت پہنچایا۔ بیروت پہنچنے کے بعد اس نے ایک بڑا زوردار تار فرانس بھیجا اور اپنے دوستوں سے مدد طلب کی اور کہا کہ وہ جو کچھ ان کے پاس ہے، لبنان اور "نبعہ" کے لیے ارسال کریں بہرحال چار ڈاکٹر اور تین فرانسیسی نرسیں "نبعہ" آنے کے لیے تیار ہوگئیں۔ ہم نے بھی "تنظیم امل" کی دس لڑکیوں کو اس کام پر مامور کیا کہ وہ

Presented by Ziaraat.Com

بھی ان کے ساتھ "نبعہ" پہنچیں اور ان کی مدد کریں۔ "نبعہ" میں ہم نے ایک مکان کرائے پر لیا۔ اس کی تین منزلیں تھیں۔ پہلی منزل میں دو کمروں میں ہم نے آپریشن کرنے کے انتظامات کیے۔ دوسری منزل میں ۲۴ پلنگ رکھے اور تیسری منزل میں ڈسپنسری بنائی۔ ڈاکٹر بھی اسی تیسری منزل میں رہتے تھے۔ انھوں نے مارٹروں کی گولہ باری اور دھماکوں کے درمیان کام کرنا شروع کر دیا۔ جب کبھی میں وہاں پہنچا، میں نے دیکھا کہ ان میں سے ہر ایک کے سامنے جراحی کی میز پر ایک زخمی بیہوش پڑا ہے اور ایک ڈاکٹر اس کا آپریشن کر رہا ہے۔ انتظار کے کمرے میں چاروں طرف لوگ کرسیوں پر یا زمین پر بیٹھے ہوتے اور ان کے جسموں سے خون بہ رہا ہوتا۔ یہ زخمی جو اس کمرے میں انتظار کرتے تھے۔ ان میں سے اکثر بیٹھ بھی نہ سکتے تھے۔ وہ زمین پر لیٹے ہوتے، تڑپتے، ان کے جسموں سے خون رواں ہوتا اور کمرے میں گویا خون کی ایک نہر جاری نظر آتی۔ یہ چاروں ڈاکٹر ۲۴ گھنٹے کام کرتے۔ وہ باری باری کام کرتے۔ بارہ، بارہ گھنٹے کی ڈیوٹی ہوتی اور ہر باری میں دو ڈاکٹر اپنے کام میں مشغول رہتے۔ مختصر یہ کہ ہسپتال کے کھلنے کے ڈیڑھ ماہ کے اندر اندر ۲۷۰۰ آپریشن ہوئے۔ اگر وہ آپریشن نہ ہوتے تو ان زخمیوں کی اکثریت موت کے منہ میں چلی جاتی۔ ڈیڑھ ماہ کی مدت میں ۲۷۰۰ آپریشن! لیکن سچی بات یہ ہے کہ پہلا آپریشن ایک حاملہ عورت پر کیا گیا جس کا پیٹ چاک کیا گیا اور ایک لڑکی پیدا ہوئی۔ اس لڑکی کا نام "امل" (امید) رکھا گیا جو خود اس فلاکت زدہ علاقے کے لوگوں کے لیے ایک بشارت تھی۔ یہ ڈاکٹر مسلسل کام کرتے۔ جب کبھی میں اس ہسپتال میں جاتا میں دیکھتا کہ یہ زخمیوں کو اپنے ہاتھوں پر اٹھائے ہسپتال میں لا رہے ہوتے، یا لاشوں کو باہر رکھ رہے ہوتے یا زخمیوں کو نکال کر ان کے گھروں میں پہنچا رہے ہوتے۔ میں تمام خطرات کے باوجود ہفتہ میں ایک بار "نبعہ" پہنچتا تاکہ اس کام کو جاری رکھوں۔ میں کوشش کرتا کہ دشمن کے مقابلے میں لوگوں کی استقامت اور ثابت قدمی کو بڑھاؤں۔

تنظیم "امل" کا بہترین مجاہد ابوعلی نامی ایک شخص تھا جو مصر کے کیمپوں میں چھاپہ مار جنگ کی تربیت لے چکا تھا اور لبنانی فوج میں کام کرتا تھا۔ یہ بعلبک کا رہنے والا تھا اور لبنان کے چھاپہ ماروں میں اسے بڑی حیثیت حاصل تھی۔ میں اس جوان کو لے کر "نبعہ" پہنچا تاکہ وہ وہاں کے نوجوانوں کو چھاپہ مار جنگ کی تربیت دے سکے۔ اس کے ساتھ ہی ہم نے اس علاقے میں تنظیم "امل"

کا دفتر کھولا اور اپنا کام شروع کر دیا۔ لوگوں کے گروہ امام باڑے میں آتے اور ہماری میٹنگوں میں شرکت کرتے۔ ہم انھیں وہاں تنظیمی اُمور سے آشنا کراتے۔ ان میں لڑکے، لڑکیاں، عورت، مرد، جوان، بوڑھے سبھی ہوتے۔ ابوعلی امام باڑے کے عقب میں ایک چھوٹے سے باغ میں انھیں چھاپہ مار جنگ کی تربیت دیتا۔ ہم نے ارمنیوں کے ذریعے سے اسلحے کے تیس یونٹ "نبعہ" میں درآمد کیے جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں یہ ارمنی تجارت کرتے تھے، پیسے لیتے تھے اور لوگوں کو سمگل کرتے تھے، پیسے لے کر آٹا، سبزیاں اور دیگر اشیاء "نبعہ" میں لے آتے تھے۔ ہم اپنا اسلحہ اور ذخیرۂ جنگ، گولے وغیرہ سبزیوں میں یا آٹے کی بوریوں میں رکھ دیتے اور وہ "نبعہ" میں پہنچا دیتے۔ اس کے عوض میں وہ پیسے کھرے کرتے۔ اس اثناء میں "امل" کے تیس رضا کار تربیت حاصل کر چکے تھے۔ ان کے کمانڈر "امل" کے بڑے مجاہدین میں شمار ہوتے تھے۔ ان میں سے ایک شخص حسین قشاقش تھا۔ یہ شخص بے حد باایمان اور لبنانی فوج کے کمانڈوز سے تعلق رکھتا تھا۔ فوج سے بھاگ کر وہ تنظیم "امل" سے آ ملا تھا۔ ایک نہایت خطرناک منطقے کی کمان اس کے پاس تھی۔ کچھ اور مجاہدین بھی تھے جن کی اکثریت لبنانی فوج کے کمانڈوز میں سے تھی۔ ہم نے انھیں مختلف منطقوں کی ذمہ داری دے دی تھی تاکہ وہ اس علاقے کا دفاع کریں اور لڑیں۔ اسی طرح ارمنیوں کے وسیلے سے آٹا، کھجوریں اور دیگر ضروریاتِ زندگی وارد کرنا شروع کیں اور ان لوگوں کی مدد کرنا شروع کی جن کے پاس کھانے پینے کے لیے کچھ نہ تھا۔ اس علاقے کے ایک عالم اور امامِ جماعت سید محمد حسین فضل اللہ کے وسیلے سے ان کی شناخت ہوتی تھی۔ ہم انھیں پیسے اور روٹیاں بھی دیتے تھے۔ یوں ہم نے "نبعہ" میں تنظیمی کام شروع کیا اور ان تمام مشکلات اور خطرات کے باوجود اور فقر و ناداری کے درمیان جبکہ دشمن نے ہمارا مکمل محاصرہ کیا ہوا تھا۔ "نبعہ" کے خطرناک ترین مورچے "امل" کے مجاہدوں کے سپرد تھے۔ ان میں سب سے خطرناک اور بڑا محاذ پلازا سینما کی عمارت تھی۔ پلازا سینما ایک کونے منطقے کے سرے پر واقع تھا اور دو طرف سے عیسائیوں کے علاقوں کے سامنے تھا۔ یہ سینما ویران ہو چکا تھا اور ہمارے مجاہدوں نے اس کی بلڈنگ کے دونوں طرف مورچے بنا رکھے تھے۔ ان کے اور کتائبیوں کے درمیان شاید چند گز کا فاصلہ تھا۔ ہم ان مورچوں کے سوراخوں میں سے اور ریت کی بوریوں کے درمیان سے کتائبیوں کو دیکھ سکتے تھے۔ اس منطقے میں ایک لمحے کی غفلت بھی موت کے مترادف تھی جس کے بعد

Presented by Ziaraat.Com

کوئی چارۂ کار نہ تھا۔ جب رات بیت جاتی تو شب خون کی کارروائیاں شروع ہو جاتیں، یعنی کتائبیوں کا کوئی ایک آدھ گروہ "نبعہ" پر حملہ کرتا یا شیعوں کا ایک گروہ ان کے علاقے میں گھس کر ان کے مورچوں اور سلامت کوچوں کو برباد کر دیتا۔ اس بنا پر یہاں برابر ڈیوٹیاں دی جاتیں تاکہ دشمن نزدیک نہ پہنچ پائے۔ اس طرح ایک اور بڑا خطرناک نقطہ تھا جس کا نام "کیمپ طراد" تھا اس کی ذمہ داری بھی "امل" کے مجاہدین کے سپرد تھی۔

"نبعہ" کا منطقہ ایک مثلث کی شکل میں تھا۔ اس مثلث کے قاعدے کے پاس ارمنی رہتے تھے۔ چونکہ ارمنی غیر جانبدار تھے اس لیے مسلمانوں کو اس طرف سے خطرہ نہ تھا لیکن اس مثلث کے دو اضلاع دشمن کے روبرو تھے اور ان کے سرے پر پلاز اسینما واقع تھا جو تنظیم "امل" کے مجاہدین کے قبضے میں تھا اور نہایت خطرناک موقع تھا۔ میں نے اس خطرناک مورچے اور وہاں پیش آنے والے متوقع خطرات کے بارے میں اپنے خیالات قلمبند کر دیے ہیں۔ اسی قسم کا ایک اور خطرناک نقطہ "کیمپ طراد" تھا۔ لیکن یہاں پر فتح کا بھی ایک مورچہ تھا، کمیونسٹ پارٹی کا بھی ایک مورچہ تھا۔ "حزب قومی سوری" (National Liberal Party) کا بھی ایک مورچہ تھا اور دوسری جماعتوں نے بھی مناطق تقسیم کر کے اپنے اپنے مورچے بنا رکھے تھے اور دشمن کے مقابلے میں مدافعت کرتے تھے۔

ہسپتال سے ڈاکٹروں کو دیس نکالا :

یہاں تک تو مسئلے کا بیان تھا۔ اب میں چاہتا ہوں کہ آپ کے لیے ایک سانحہ بیان کروں تاکہ آپ جان سکیں کہ 'نبعہ' میں کیا ہو گزرا۔ محاصرے کو چند ماہ ہو چکے تھے کہ کمیونسٹ 'نبعہ' میں ڈاکٹروں کے پاس گئے اور ان سے کہا کہ آپ لوگ سید موسیٰ الصدر کے لیے کیوں کام کرتے ہیں؟ انھوں نے کہا کہ ہم کسی شخصیت کے لیے کام نہیں کرتے بلکہ ہم تو محروموں اور زخمیوں کی امداد کرتے ہیں۔ کمیونسٹوں نے جواباً کہا کہ سید موسیٰ الصدر آپ کے کام سے استفادہ کرتے ہیں اور آپ لوگ ان کی شہرت کا سبب ہو رہے ہیں۔ آپ کے کام کی بنا پر شیعہ یہ دیکھتے ہیں کہ یہ شخص ان کے لیے مثبت کام سرانجام دے رہا ہے۔ ڈاکٹروں نے کہا کہ آخر آپ چاہتے کیا ہیں؟ کمیونسٹوں نے کہا کہ آپ لوگ 'نبعہ' سے چلے جائیں۔ اُنھوں نے پوچھا کہ کیا آپ لوگوں کا کوئی ہسپتال ہے۔ اگر ہے تو ہم وہاں کام کرنے کے لیے تیار ہیں۔ ہم نہ سید موسیٰ الصدر کو جانتے ہیں اور نہ کمیونسٹ پارٹی کو، ہم آپ کی بھی خدمت کریں گے۔ کمیونسٹوں نے کہا کہ ہمارے پاس کچھ نہیں لیکن آپ کو چاہیے کہ 'نبعہ' سے چلے جائیں ورنہ آپ مارے جائیں گے۔

یہ وہ باتیں ہیں جو اس فرانسیسی ڈاکٹر نے بعد میں سید موسیٰ الصدر سے کہیں اور میں خود اُن کے مترجم کے فرائض سرانجام دے رہا تھا۔ بہرحال بائیں بازو کی جماعتوں کے دباؤ پر یہ ڈاکٹر اور نرسیں 'نبعہ' چھوڑنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ اب آپ تصور فرمائیے اور اس انسان دوستی کو ملاحظہ کیجیے۔ اس دشمنی، اس کینے اور اس بغض کا اندازہ لگائیے۔ وہ ایک ہسپتال جو 'نبعہ' کے زخمیوں کو مدد دینے پر قادر تھا، انھیں امید کی جھلک دکھاتا تھا، ان کے درد کا مداوا کرتا تھا۔ اس کے ڈاکٹروں کو ان لوگوں نے یوں چلے جانے پر مجبور کر دیا بلکہ انھیں 'نبعہ' سے نکال دیا اور وہ واپس فرانس چلے گئے اور وہ لوگ جو دشمن کے مارٹروں کے گولوں کا نشانہ بن کر زخمی ہو جاتے تھے انھوں نے پہلے کے مانند پھر بے علاج مرنا شروع کر دیا۔ ان حالات میں لوگوں نے بھاگنا شروع کر دیا اور جن ایام میں 'نبعہ' کا سقوط ہوا اور اس پر کتائب نے قبضہ کر لیا اس وقت وہاں کی ۲۷۰،۰۰۰ کی آبادی میں سے صرف پانچ ہزار باقی رہ گئے تھے۔

'نبعہ' کے سانحے کی تفصیل :

لیکن یہ دردناک باتیں، بائیں بازو کی انتہا پسند لبنانی جماعتوں اور فلسطینی مزاحمت کے جبهة الرفض کے لیے کوئی وقعت و اہمیت نہیں رکھتی تھیں۔ کمال جنبلاط مُردوں کی تجارت کرتا تھا جس قدر زیادہ خونریزی ہو اسی قدر اُس کا فائدہ تھا۔ اسی لیے اس کا دل نہ جلتا تھا اور 'نبعہ' کی بربادی سے اسے کوئی باک نہ تھا۔ لیکن میں نے پکا ارادہ کر رکھا تھا کہ گولیوں کی بوچھاڑ اور گولوں کے دھماکوں نیز کتائبیوں کی کمین گاہوں کے باوجود جو ہر لحظہ میرے سامنے موت کا منظر پیش کرتی تھیں 'نبعہ' جاؤں اور بار بار جاؤں۔ جب میں 'نبعہ' جانے کا ارادہ کرتا، مجھے خیال ہوتا کہ ۹۵ فیصد حالات میں موت یقینی ہے۔ لیکن اس کے باوجود میں جاتا کہ 'نبعہ' کے لوگوں کو منظم کر سکوں،

Presented by Ziaraat.Com

ہسپتال کو درست کروں، لوگوں کے لیے آٹا، چاول اور دیگر ضروریاتِ زندگی کا انتظام کروں، ان کے درد کا مداوا کروں، ان کے ساتھ زندگی بسر کروں، ان کے ساتھ خالی پیٹ سوؤں اور ان کے ساتھ خطرناک ترین مورچوں میں جاؤں۔ مَیں مسجد میں اجتماعات منعقد کرتا، "حرکۃ المحرومین" کے مجاہدوں اور دیگر ارکان سے بات چیت کرتا اور اس اثنا میں 'نبعہ' کا علاقہ اور وہ مسجد گولہ باری کی بنا پر لرزتے رہتے۔ رات کو مَیں امام باڑے میں سوتا جو ہر آن گولہ باری کی زد میں ہوتا، ہر آن اس کا کوئی نہ کوئی حصّہ گر جاتا اور کوئی نہ کوئی بے گناہ جان سے گزر جاتا۔

فلسطینی مزاحمت اور بائیں بازو کی جماعتیں پیسے اور غذائی مواد کے اعتبار سے بڑی امیر تھیں لیکن وہ اس پیسے اور غذا کو صرف اپنے ارکان کو دیتی تھیں۔ جب غذا کو ترستے ہوئے شیعہ ان کے دفتر میں جاتے اور اپنی بھوک کا اظہار کرتے تو ان سے کہا جاتا کہ تم سید موسیٰ الصدر کے حامی ہو، انھیں مذاق کیا جاتا اور کہا جاتا، جاؤ اپنے لیڈر کے پاس، اس سے خوراک حاصل کرو — ہم محتاج بھی تھے اور فقر کے مارے ہوئے بھی۔ ہمارے پاس جو اسلحہ تھا وہ آخری وقت تک ۱۹ قطعات سے زیادہ نہ تھا۔ درآں حالیکہ فلسطینی مزاحمت اور بائیں بازو کی جماعتوں کے پاس بے شمار ہلکے اور بھاری ہتھیار تھے۔ بائیں بازو کی جماعتیں ہمیشہ بڑے تمسخر کے ساتھ سید موسیٰ صدر کی ذات پر حملہ کرتے اور کہتے کہ کئی سال پہلے انھوں نے "السلاح زینۃ الرجال" (اسلحہ مردوں کی زینت ہے) کا نعرہ دیا تھا، اب اس کے پاس خود اسلحہ کیوں نہیں ہے؟ اب کیوں نہیں لڑتا؟ لیکن بائیں بازو کی جماعتوں کو یہ علم تھا کہ 'حرکۃ المحرومین' کے جوان اس اسلحہ کی کمی کے باوجود 'نبعہ' کی سب سے بڑی طاقت ہیں کیونکہ وہ ایمان کی قوت سے لڑتے تھے اور موت سے نہیں ڈرتے تھے۔

"تل الزعتر" سقوط کی حالت میں تھا لیکن "تل الزعتر" کی یہ شکست فلسطینی مزاحمت اور بائیں بازو کی جماعتوں کے لیے پروپیگنڈے کے نکتۂ نظر سے ناقابلِ برداشت بات تھی۔ کیونکہ انھوں نے اس قدر جھوٹا پروپیگنڈا کیا تھا کہ لوگوں کو یقین ہو گیا تھا کہ "تل الزعتر" فلسطینی مزاحمت کا ایسا قلعہ ہے جس کو فتح کرنا ممکن نہیں لیکن آخری دنوں میں یہ طے شدہ بات تھی کہ یہ قلعہ فتح ہو کر رہے گا لہٰذا انھوں نے منصوبہ بنایا کہ سب سے پہلے شیعوں کا منطقہ 'نبعہ' کتائبیوں کے ہاتھ

تسخیر ہو تاکہ لوگوں کی توجہ "نبعہ" کی طرف مرکوز ہو جائے اور "تل الزعتر" کی شکست زیادہ شہرت نہ پا سکے۔ "نبعہ" میں دو لاکھ ستر ہزار کی آبادی تھی اور "تل الزعتر" کے مقابلے میں یہ آبادی بیس ہزار زیادہ تھی۔ علاوہ ازیں "نبعہ" کو "شیعوں کا فلسطین" اور "سید موسیٰ الصدر کا فلسطین" کہا جاتا تھا۔ لہٰذا لازم ہے کہ "تل الزعتر" کی شکست سے پہلے "نبعہ" کی شکست واقع ہو۔ یوں "نبعہ" کی شکست کے لیے ریشہ دوانیاں شروع ہو گئیں۔ بائیں بازو کی جماعتوں نے کتائب کے ساتھ چھیڑ چھاڑ شروع کر دی۔ کتائب نے باوجود اس کے کہ انھوں نے سوریا کے ساتھ یہ وعدہ کیا تھا کہ "نبعہ" کے ساتھ کسی قسم کی زیادتی نہ کریں گے، مجبور ہو کر "نبعہ" پر از سرِ نو حملے شروع کر دیے۔ "نبعہ" کی دو لاکھ ستر ہزار کی آبادی میں سے صرف پانچ ہزار نفوس باقی رہ گئے تھے۔ جس "نبعہ" میں صرف ساٹھ لڑنے والے رہ گئے ہوں اس کا کتائب کے مقابلے میں ختم ہو جانا لازمی امر تھا۔

بائیں بازو کی پارٹیوں کی چھیڑ خانیاں شروع ہوئیں اور کتائب نے بھی حملہ کر دیا۔ "حرکتِ امل" کے جوانوں نے بڑی بے جگری سے مقابلہ کرنا شروع کر دیا۔ بائیں بازو والوں نے دیکھا کہ 'حرکتِ امل' کے جوان کس بہادری سے مقابلہ کر رہے ہیں تو انھیں یہ خیال گزرا کہ ہو سکتا ہے 'حرکتِ امل' کے جوانوں کی بہادری "نبعہ" کی تقدیر بدل دے لہٰذا انھوں نے عقب سے ان جوانوں پر حملہ کر دیا۔ 'نبعہ' کے سقوط سے دو ہفتے قبل جب "حرکتِ امل" کے تیرہ جوان کیمپ طراد کے مورچے میں کتائب کا مردانہ وار مقابلہ کر رہے تھے، ان پر پشت کی جانب سے بائیں بازو کی جماعتوں کا حملہ ہوا۔ ان تیرہ افراد کا اسلحہ چھین لیا گیا، ان کو بڑی شدت سے مارا پیٹا گیا اور زخمی کر دیا گیا۔ ان تیرہ مجاہدوں کے کمانڈر عبدالکریم سعید کو بندوق کے کندوں سے اس قدر مارا گیا کہ وہ بالکل بے ہوش ہو گیا۔ میں نے پندرہ دن بعد جب اسے دیکھا تو اس کا سر سوجا ہوا تھا، اس کا رنگ سیاہ پڑ چکا تھا اور وہ بڑی مشکل سے اپنی آنکھیں کھولتا تھا۔ غرض یہ کہ ان تیرہ کے تیرہ افراد کو پکڑ لیا گیا اور قید میں ڈال دیا گیا تاکہ ان پر سوریا کے جاسوس ہونے کی تہمت میں مقدمہ چلایا جائے۔ اس کے ایک دن بعد "کیمپ طراد" کا مشہور مورچہ کتائب کے ہاتھوں تسخیر ہو گیا کیونکہ وہاں کوئی نہ تھا جو اس کا دفاع کرتا...... کیا بائیں بازو کی یہ جماعتیں کتائب کے ساتھ ملی ہوئی تھیں؟

"نبعہ" کا سب سے مشہور اور خطرناک مورچہ پلازا سینما تھا۔ یہاں اس قدر کشت و خون ہوا تھا

Presented by Ziaraat.Com

اور اس قدر گولہ باری ہوئی تھی کہ اس مورچے کے اردگرد وحشت برستی تھی اور جو شخص وہاں جاتا تھا وہ وہاں پہنچ کر خوف سے لرزہ براندام ہو جاتا تھا۔ کیمپ طراد کی طرح بائیں بازو کی جماعتوں نے یہاں بھی پیچھے کی طرف سے حملہ کیا اور ہمارے نوجوانوں پر گولیوں کی بارش شروع کر دی۔ معجزانہ طور پر ہمارے نوجوانوں نے مکانوں اور دیواروں کے ملبے میں سے اپنے آپ کو بچایا اور اس مورچے پر بھی ایک دن بعد کتائب نے قبضہ کر لیا۔

لیکن یہ خیانتیں اور یہ جرائم شاید کافی نہ تھے۔ سازش کی کوشش یہ تھی کہ خیانت پوری ہو۔ "نبعہ" کو "تل الزعتر" سے پہلے شکست کھانا چاہیے۔ خیانت کاروں کی خواہش تھی کہ سید موسیٰ الصدر اور شیعوں کی توہین مکمل ہو۔ لہٰذا بائیں بازو کی جماعتوں نے ارمنیوں پر حملہ کر دیا۔ اس وقت تک ارمنی غیر جانبدار تھے۔ کوئی مسلح عیسائی یا مسلح مسلمان ان کے علاقے میں وارد نہ ہو سکتا تھا۔ وہ گویا "نبعہ" کی پشت کی حفاظت کر رہے تھے۔ تمام خوراک، دوائیں اور اسلحہ ارمنیوں کے علاقے سے "نبعہ" میں وارد ہوتا تھا۔ ان کے تعلقات ہمارے ساتھ اور سید موسیٰ الصدر کے ساتھ خراب نہ ہوئے تھے۔ اس لیے سازش کا ہدف یہ تھا کہ "نبعہ" کی ایک طرف سے حفاظت کرنے والی یہ غیر جانبدار دیوار گر جائے۔

بائیں بازو کی فلسطینی جماعتوں میں سے ایک جماعت "الجبهة الشعبية الديموقراطية" (جمہوری عوامی محاذ) تھی جو جورج حبش کی جماعت "الجبهة الشعبية" سے الگ ہوئی تھی۔ اس کا سربراہ جیسا کہ ذکر ہو چکا ہے ایک عیسائی نائف حواتمہ تھا اور "نبعہ" میں اس جماعت کی شاخ کا سربراہ ریزی نام کا ایک مارونی عیسائی تھا جیسا کہ ایک بھائی "حدث" کے علاقے میں جو بیروت کے قریب ہے، کتائب کا سربراہ تھا۔ "الجبهة الديموقراطية" کے افراد نے ارمنیوں کو تنگ کرنا شروع کیا، ان کے علاقے پر سات حملوں میں چونتیس ارمنیوں کو مار دیا اور آخر میں اس سازش کو مکمل کرنے کے لیے چار ارمنی لڑکیوں کو سرِ بازار بے عزت کیا گیا۔ ارمنیوں نے ان حملوں کے دوران میں یاسر عرفات جنبلاط اور مسلمانوں کے دیگر صاحبِ اثر لوگوں سے رابطہ پیدا کیا اور شکایت کی لیکن انھیں کوئی مثبت جواب نہ ملا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ غصے میں آ گئے اور انھوں نے فیصلہ کیا کہ وہ کتائب کے دوش بدوش کھڑے ہو کر مسلمانوں سے لڑیں۔

"نبعہ" کا سقوط اور بائیں بازو کی جماعتوں کی غداری:

کتائب والے ارمنیوں کے علاقے سے "نبعہ" میں داخل ہوئے۔ چونکہ 'کیمپ طراد' اور 'پلاز اسینما' کے مورچے گر چکے تھے اس لیے 'نبعہ' کا پورا علاقہ کتائب کی دستبرد میں آگیا۔ یہ واقعہ ۶۔ اگست ۱۹۷۶ء کو ہوا۔ انھوں نے تمام 'نبعہ' کو جلا ڈالا اور بہت سے لوگوں کو مار دیا۔ ارمنیوں نے اپنی ارمنی لڑکیوں کی بے عزتی کا بدلہ لینے کے لیے بے گناہ شیعہ لڑکیوں کو اس طرح بے عزت کیا کہ ایک شیعہ نوجوان نے رو رو کر بتایا کہ ارمنیوں نے ایک شیعہ لڑکی پر حملہ کیا۔ اُس لڑکی نے اپنے آپ کو ان کے سپرد نہ کیا اور اس بلڈنگ کی تیسری منزل پر چلی گئی اور جب دیکھا کہ اور کوئی راہ باقی نہیں رہی تو اُس نے وہاں سے سڑک پر چھلانگ لگا دی اور یوں اپنی جان دے دی۔ ایک اور لڑکی بھاگ کر ایک بڑی الماری میں گھس گئی اور وہاں اُس نے اپنے آپ پر پٹرول یا مٹی کا تیل ڈال کر خود کو جلا ڈالا تاکہ ارمنیوں کے ہاتھوں بے عزت نہ ہو۔

'نبعہ' کی تسخیر سے قبل بائیں بازو کے لیڈر اور ان کے ارکان ارمنیوں کے کلب میں کتائب سے ملے اور ان کے سامنے ہتھیار ڈال دیے اور 'نبعہ' کی بربادی سے ۲۴ گھنٹے پہلے صحیح و سلامت بچ نکلے۔ ان کا کمانڈر رمزی نہایت بے غیرتی کے ساتھ اپنے بھائی کے پاس جو حدث میں کتائب کا کمانڈر تھا چلا گیا اور ابھی تک نہایت ڈھٹائی سے بے غیرتی کی زندگی بسر کر رہا ہے۔ یہاں تک کہ 'نبعہ' میں فتح کے سربراہ کیپٹن ابو زید نے ارمنیوں کو ۴۰ ہزار لیرے (تقریباً ایک لاکھ بیس ہزار روپے) دیے اور یوں جان بچا کر نکل آیا۔ لیکن ہمارے جوانوں نے..... حرکتِ امل کے جوانوں نے آخر دم تک دادِ شجاعت دی، شہیدوں کی قربانی دی اور جب محاصرہ بے حد تنگ ہو گیا تو انھوں نے اپنے آپ کو امام باڑے میں محصور کر لیا اور گمان غالب یہ ہے کہ سب کے سب شہید ہو گئے۔

۶ اگست ۱۹۷۶ء کو جب 'نبعہ' برباد ہوا، حرکتِ امل کے دلاور آخر دم تک لڑتے رہے جب چاروں طرف سے گھر گئے تو انھوں نے اپنے آپ کو امام باڑے میں پہنچا دیا کیونکہ یہ ان کا روحانی گھر تھا اس کی امام حسین علیہ السلام سے نسبت تھی۔ یہ چند نفر خزاں زدہ پتوں کے مانند ارمنیوں اور کتائبیوں کے طوفانِ انتقام کے سامنے ہوئے اور زمین پر گر گئے۔ یہ ارمنی اس بات کا شعور نہ

Presented by Ziaraat.Com

رکھتے تھے کہ جمہوری عوامی محاذ (الجبهۃ الشعبیۃ الدیموقراطیۃ) کے لوگ کون ہیں اور حرکت 'امل' کے کارکن کون۔ انھیں تو بس انتقام لینا تھا اور وہ لے رہے تھے۔ 'امل' کے شہداء میں چار افراد اس کے سربراہوں میں سے تھے ان میں ایک امل کا کمانڈر حسین قشاقش تھا جس کا ذکر آچکا ہے ایک اور 'کُریک' تھا جو مختلف امور کا انچارج تھا۔ ایک محمد فقیہ تھا جو فکری تربیت کا انچارج تھا اور ایک اس علاقے میں اطلاعات کا سربراہ تھا سلیمان قعیق تھا یہ چاروں شہید ہو گئے اور باقیماندہ افراد بھی یا قید ہو گئے یا شہید لیکن بے غیرت رمزی اور اس جیسے دوسرے لوگ ابھی زندہ ہیں اور بے غیرتی کے سانس لے رہے ہیں۔[1]

یہ باتیں جو میں بیان کر رہا ہوں میری نہیں بلکہ 'نبعہ' میں 'فتح' کے سربراہ کیپٹن ابوزید کی ہیں جس سے میری شناسائی ہے اور وہ آج (۵ ستمبر ۱۹۸۰ء) بھی بیروت میں رہ رہا ہے۔ اُس نے 'نبعہ' سے نکل بھاگنے کے بعد ایک پریس کانفرنس میں بیان کیا کہ ارمنیوں کے ساتھ تصادم کا باعث "الجبهۃ الشعبیۃ الدیموقراطیۃ" (جمہوری عوامی محاذ) تھا اور جب ارمنیوں نے اپنا علاقہ کتائب کے لیے کھول دیا تو 'نبعہ' کا سقوط عمل میں آیا کیونکہ اب اس کا دفاع کرنے والا کوئی نہ تھا۔ اس بیان میں کیپٹن ابوزید نے کہا:

" 'نبعہ' کے سقوط سے ۴۸ گھنٹے پہلے اس علاقے میں ۱۲ جماعتوں نے اپنے آپ کو کتائب کے حوالے کر دیا تھا اور اپنا اسلحہ ان کے سپرد کر کے خود صحیح و سالم اس علاقے سے باہر نکل آئے تھے۔"

بائیں بازو کی تمام جماعتوں نے جو اس سازش میں شریک تھیں اس سے ۲۴ گھنٹے قبل، ارمنیوں کے کلب میں کتائب کے سربراہ پیئر جمیل کے لڑکے 'بشیر الجمیل'[2] سے ملاقات کی تھی۔ اس ملاقات

---

[1] یہ داستان صرف لبنان سے ہی تعلق نہیں رکھتی ہے بلکہ دنیا کے اکثر مناطق میں انقلاب کا نام لینے والے لیڈر یونہی عوام کو موت کے گھاٹ اُترواتے ہیں اور خود اپنی جانیں بچا لیتے ہیں۔

[2] یہ وہ بشیر الجمیل ہے جو لبنان کے موجودہ صدر اور اپنے بھائی امین الجمیل سے پہلے لبنان کا صدر منتخب ہوا تھا لیکن بعض دل جلوں نے اس کے حلف اُٹھانے سے پہلے ہی اسے موت کے گھاٹ اُتار دیا اور یہ صدارت کی حسرت لیے راہیٔ ملکِ عدم ہوا۔ موجودہ لبنانی صدر امین الجمیل اس بشیر الجمیل کے مقابلے میں فرشتہ ہے۔ اس بشیر الجمیل کی اسلام دشمنی اور مسلمان کشی کی مثال کم از کم موجودہ تاریخِ عالم میں نہیں ملتی۔

کی تھی۔ اس ملاقات کی تصویر موجود ہے۔ اُنھوں نے اپنا اسلحہ اپنے دشمنوں کے حوالے کیا اور خود جان بچا کر نکل آئے۔ صرف دو جماعتیں ایسی تھیں جنھوں نے کتائب کے حضور آنے کا شرف حاصل نہ کیا۔ ایک 'فتح' اور دوسری 'امل'۔ 'فتح' کے کمانڈر کیپٹن ابوزید نے ارمنیوں کو جیسا کہ بیان ہو چکا ہے ۵۰ ہزار لیرے رشوت دی اور انھوں نے اسے چھپا کر 'نبعہ' سے بیروت پہنچایا۔ یوں اُس نے جان بچائی لیکن 'امل' کے جوان آخر دم تک لڑتے رہے اور سب کے سب شہید ہو گئے۔

کتائب کے جرائم:

'نبعہ' کے سقوط کے بعد کتائب اور ارمنیوں نے دستِ انتقام بڑھایا اور اس انداز میں اپنے انتقام کی پیاس بجھائی کہ ہر شخص کو لرزہ براندام کر دیا۔ جو چیزیں میں نے خود دیکھی ہیں اگر ان کا بیان پیش کروں تو آپ خون کے آنسو رو دیں۔ مکانوں کے گوشوں میں ان لوگوں کی جلی ہوئی لاشیں پڑی تھیں جن کو کتائب نے پٹرول ڈال کر زندہ جلا دیا تھا۔ اس قسم کے جرائم کا میں نے پہلے بھی مختصراً ذکر کیا۔ میں نے خود دیکھا اور خدا میرا گواہ ہے کہ 'نبعہ' کی ایک بڑی مسجد جو شیخ محمد فرادُ کے نام سے مشہور ہے اس کی دیواروں پر جناب سیدہ علیہا السلام اور جناب زینب علیہا السلام کے بارے میں نہایت رکیک کلمات لکھے ہوئے تھے جن کا تصور کر کے میں خود کانپ کانپ اُٹھتا ہوں اور مجھ میں طاقت نہیں کہ انھیں بیان کروں۔

یہ چیزیں میں نے خود دیکھی ہیں لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان کی ذمہ داری کن پر عائد ہوتی ہے۔ وہ کون لوگ تھے جنھوں نے ان کے ساتھ سازش کی اور اب تک زندہ ہیں اور 'امل' کے جیالے نوجوانوں نے اپنی تمام ناداریوں کے باوصف آخر دم تک لڑائی کی اور ایک ایک نے جان فدا کی۔ دشمنوں نے نبعہ کے پورے علاقے کو جلا دیا اور اسے ویران کر دیا۔ اس واقعے کے چند ماہ بعد جب میں اپنے بعض دوستوں کو نبعہ دکھانے لے گیا اور ان سے کہا کہ یہاں نبعہ ہے تو ان میں سے ایک شخص زار و قطار رو رہا تھا۔ اس نے اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیے تھے اور کہتا تھا کہ میں ان چیزوں کو نہیں دیکھ سکتا۔ کیوں کر جرأت ہو سکتی ہے کہ ان بدنصیب لوگوں پر گزر جانے والی اس قیامت کو دیکھا جائے۔ شہداء کی لاشیں سڑکوں پر منتشر پڑی تھیں۔ تمام مکان اور دکانیں جل چکی تھیں۔

Presented by Ziaraat.Com

بڑی بڑی بلڈنگیں ملبے کا ڈھیر ہو چکی تھیں۔ یہ ظلم و ستم 'نبعہ' کے بدنصیب باشندوں، مردوں اور عورتوں پر روا رکھے گئے تھے۔

تہمت تراشی اور دروغ بافی ؛

یہ باتیں تو میں کر چکا۔ اب میں چاہتا ہوں کہ ایک اور حقیقت کا آپ کے سامنے بیان کروں جو کہیں زیادہ دردناک ہے، اور وہ یہ کہ کمال جنبلاط نے بڑی بے شرمی سے یہ بیان داغا کہ سید موسیٰ الصدر نے نبعہ کو کتائب کے حوالے کر دیا ہے۔ خود انھوں نے سازش کی، خود جرم کیے، کتائب کے ساتھ ملی بھگت کی اور نبعہ کی تباہی کا بندوبست کیا اور اس کے بعد الزام شیعوں پر دھرا کہ انھوں نے نبعہ کو کتائب کے حوالے کر دیا۔ کمال جنبلاط اور ان کے ساتھیوں نے اس بنا پر یہ قاعدہ بنایا کہ پورے لبنان میں جہاں کہیں سید موسیٰ الصدر یا تنظیم 'امل' کے حمایتی ملیں انھیں قتل کر دیا جائے ان کا صفایا کر دیا جائے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ پورے لبنان میں شیعوں کے کشت و خون کا ایک سیلاب آ گیا۔ اس کشت و خون کی داستان پہلے سے کہیں زیادہ دردناک تھی۔ ان ہیچ مقدار لوگوں نے، ان معاویہ صفت لوگوں نے، ان ابوسفیان کے ساتھیوں نے ان جرائم کا ارتکاب کیا اور پھر سید موسیٰ الصدر اور 'امل' کے لڑنے والوں کو ملزم گردانا کہ انھوں نے اس علاقے کو دشمن کے حوالے کر دیا ہے۔ ان لوگوں کو تہمت کا نشانہ بنایا جو سب کے سب اس علاقے کا دفاع کرتے ہوئے منزلِ شہادت پر پہنچے۔ لیکن یہ کمینے اور بے شرف لوگ جو ابھی تک زندہ ہیں یہ کہتے پھرتے ہیں کہ نبعہ کو 'امل' والوں نے دشمن کے حوالے کیا۔ فاعتبروا یا اولی الابصار۔

لیبیا کی حکومت لبنان میں ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے متعدد شعبے رکھتی ہے۔ اس نے عربی زبان میں یہ کہنا شروع کیا طَائِفَۃُ الْغَدْرِ وَالْخِیَانَۃ سَلَّمَتِ النَّبْعَۃ یعنی "غدر و خیانت کے فرقے والوں نے نبعہ کو دشمن کے حوالے کر دیا۔" اگر کوئی یہ چاہتا ہو کہ سید موسیٰ الصدر کے غائب ہو جانے کا سبب تلاش کرے، اسے چاہیے کہ چند سال قبل کے ان روشن اور واضح نمونوں پر نظر کرے اور یہ دیکھے کہ انھوں نے کس طرح جرائم کا ارتکاب کیا ہے۔ میں ان مجرموں کو کبھی نہیں بخش سکتا۔ اگر انھوں نے اپنی پوری تاریخ میں کوئی بھی جرم نہ کیا ہو تو بھی یہ ایک جرم جو انھوں نے کیا ہے وہ کافی ہے کہ میں انھیں

یزید اور بنو امیہ کے دیگر سازشیوں سے بھی بدتر اور حقیر تر شمار کروں۔ یہ دلخراش داستانیں لبنان میں ان پٹھوؤں کے وسیلے سے وجود میں آئیں۔

سچی بات تو یہ ہے کہ شیعوں کی حالت پر ان کا دل نہیں کڑھتا۔ اصل میں نبعہ ہم سے متعلق تھا۔ یہاں کے رہنے والے سب کے سب شیعہ تھے۔ ایک فلسطینی عیسائی کا دل جو روس یا امریکہ کا وظیفہ خوار ہو ان شیعوں پر کیسے کڑھے گا۔ اسی لیے تو انھوں نے ملی بھگت کی اور سازشوں کا جال پھیلا کر ان تمام شیعوں کو قربان کر دیا۔ میرے پاس اس قدر دلائل ہیں کہ اگر کسی عدالت میں پیش کروں تو سب کے سب قبول ہوں۔ فتح کے ایک کمانڈر (کیپٹن ابو زید) نے خود گواہی دی ہے کہ خیانت کرنے والا کون تھا اور نبعہ کو برباد کرانے میں کس کا ہاتھ ہے۔ اس پر بھی یہ لوگ سید موسیٰ الصدر اور تنظیم 'امل' پر تہمت لگاتے ہیں کہ انھوں نے یہ علاقہ کتائب کے حوالے کر دیا۔ لعنت ہو اس پیشہ وری پر! لعنت ہو اس لیڈری پر!

نبعہ میں لڑنے والوں میں سے ایک شخص نبعہ سے نکل کر ہم تک پہنچا۔ یہ ان جاں سپاروں میں سے تھا جو نبعہ کے سقوط کے آخری لمحات تک وہاں لڑتا رہا۔ وہ اس ہسپتال میں پہنچا جس کا میں نے ذکر کیا ہے کہ سید محمد حسین فضل اللہ کے امام باڑے میں کھولا گیا تھا۔ اُس نے جنگی لباس اُتار دیا اور سفید لباس پہن کر ایک "میل نرس" (Male Nurse) — کے رُوپ میں اپنے آپ کو مریضوں میں چھپا لیا۔ وہ اس بات کا عینی شاہد ہے کہ اس کے ساتھی کس طرح مٹی میں ملتے رہے۔ آخر کار کتائب کے لوگ اس ہسپتال میں گھس آئے اور چودہ مریضوں کو اس جوان سمیت گرفتار کر کے سن الفیل[1] میں لے گئے جو نبعہ کے قریب ہے۔ ان چودہ کے چودہ مریضوں کو ایک دیوار کے ساتھ کھڑا کر دیا گیا اور مشین گنوں کی گولیوں کی بوچھاڑ سے انھیں شہید کر دیا گیا۔ لیکن اس جوان کو جو نیہ میں، جو کتائب کا بہت بڑا مرکز ہے لے گئے جہاں اسے چار دن تک قید رکھا گیا۔ ان چار دنوں میں اس پر مقدمہ چلایا گیا۔ وہ جوان یہ کہتا تھا کہ میں نرس ہوں، میں نے لڑائی میں حصہ نہیں لیا۔ تفتیشی افسر نے جو اس سے سوال کر رہا تھا مسکراتے ہوئے اس سے پوچھا کہ کیا تم فلاں دن، فلاں وقت

---

[1] "سن الفیل" مشرقی بیروت کا خالص عیسائی محلہ ہے جو بیروت کے مرکز تک پھیلا ہوا ہے۔ یہ محلہ دوسرے محلوں کے مقابلے میں اونچائی پر واقع ہے۔ اس علاقے میں امن کی حالت میں بھی کوئی مسلمان نہیں رہتا تھا۔ کتائب نے یہاں اپنے مورچے قائم کر رکھے تھے اور یہیں سے نبعہ پر گولہ باری ہوا کرتی تھی۔

Presented by Ziaraat.Com

ہیں فلاں فلاں مورچہ پر اس قسم کے ہتھیار لیے موجود نہیں تھے اور کیا تم اس سے اگلے روز وہاں سے فلاں مقام پر منتقل نہ ہوئے تھے؟ اس جوان نے اس تفتیشی افسر کو غور سے دیکھا اور پہچان لیا کہ وہ فتح کے رضاکاروں میں شامل تھا لیکن کتائب کے لیے جاسوسی کرتا تھا اس لیے یہ سب کچھ جانتا تھا۔ اس کے بعد اس نے اس جوان سے کہا کہ ہم سے جھوٹ نہ بولو کیونکہ ہم تمھیں خوب پہچانتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ اُوپر سے حکم آگیا ہے کہ اب لبنانیوں کو نہ مارا جائے، جو مر چکے ہیں وہ کافی ہیں۔ چونکہ تم لبنانی ہو اس لیے ہم تمھیں رہا کر رہے ہیں، اس لیے تمھیں جھوٹ بولنے کی ضرورت نہیں۔ اس پر اسے رہا کر دیا گیا۔ وہ چاہتا تھا کہ وہ مسلمانوں کے علاقے میں پہنچ جائے اور راستے میں اپنے آپ سے کہتا تھا کہ اگر وہ مسلمانوں کے علاقے میں پہنچ گیا تو کمیونسٹوں اور بائیں بازو والوں کو جہاں کہیں پائے گا ان کی تکابوٹی کر دے گا تاکہ اپنے شہید ہونے والے جوانوں کا انتقام لے سکے۔ لیکن جب وہ مسلمانوں کے منطقے میں داخل ہوا تو بائیں بازو کی جماعتوں نے اسے دھر لیا۔ وہ چاہتے تھے کہ اس کا صفایا کر دیں، کیونکہ وہ شیعہ ہے اور 'امل' سے تعلق رکھتا ہے۔ اس سے اس پر جنون کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔ وہ حیران تھا کہ آخر یہ قصّہ کیا ہے کہ دشمنوں نے سازش کی اور امل کے جوانوں کو قتل کروایا۔ آخر اس سازش میں کون کون لوگ شریک ہیں۔ بیروت کا مغربی حصّہ جو خالص مسلمان آبادی ہے حقیقت میں بالکل اُجڑ چکا ہے۔ یہاں بھی بائیں بازو کے لوگ اسے قتل کرنا چاہتے تھے۔ وہ اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھا۔ وہ چیخیں مارتا تھا اور زار و قطار روتا تھا کہ آخر وہ کسی نہ کسی طریقے سے مجھ تک پہنچ جائے جب وہ میرے پاس پہنچا تو میں نے اسے تسلی دی اور اسے اس کے گاؤں میں پہنچا دیا جہاں وہ کئی مہینے تک بیمار رہا۔

"نبعہ" کی بربادی کے بعد،

یہ ہے نبعہ کی دردناک سرگزشت۔ جب ہمارے لڑنے والے شہید ہو رہے تھے اور بائیں بازو کی پارٹیوں کے افراد اور ان کے انچارج صحیح و سالم بچ نکلے اور رجز خوانی کرتے پھرتے تھے۔ یہ بیان تھا نبعہ میں ہونے والی جنگ کا اور اس میں ہونے والی سازشوں کا۔ البتہ اس جنگ کے بعد بائیں بازو کی جماعتوں کا نہایت شرمناک پروپیگنڈا شروع ہو گیا جو پہلے کے مقابلے میں کہیں زیادہ

زہرناک اور مجرمانہ تھا۔ ریڈیو میں، ٹیلیویژن میں، اخباروں میں، رسالوں میں، جہاں کہیں بائیں بازو والوں کا عمل دخل تھا، یہی کہا گیا کہ سیّد موسیٰ الصدر نے نبعہ کو دشمنوں کے حوالے کر دیا۔ دروغ بافیوں تہمت تراشیوں اور گالیوں کا ایک طوفان شروع ہو گیا جسے یاد کر کے انسان کا سر شرم سے جھک جائے۔

آقائے صدر کی مادرِ محترم کے بارے میں نہایت بےہودہ گفتگو کی جاتی اور کہا جاتا کہ وہ دراصل یہودی ہیں۔ خود سیّد موسیٰ الصدر کو اسرائیلی افسر بتایا جاتا اور کہا جاتا کہ ان کا اصلی نام 'موشہ' ہے ریڈیو پر شیعوں کو گالیاں دی جاتیں۔ جو شیعہ ان کے ہتھے چڑھ جاتا اس کی توہین کی جاتی اور اسے مارا پیٹا جاتا۔ ان جماعتوں کے فلسفیوں نے اپنے قلم تیز کر لیے اور لکھنا شروع کیا کہ شیعہ اُصولی طور پر غدار اور جاسوس ہیں اور ان سب باتوں سے بڑھ کر وہ فرمان تھا جو بائیں بازو کی جماعتوں نے جاری کیا تھا اور جس کے مطابق 'حرکت المحرومین' اور 'تنظیم امل' کے تمام افراد کا صفایا لازم تھا۔ 'حرکت المحرومین' کے ارکان اور ان کے کارکنوں کی فہرستیں نشر کر دی گئیں۔ ہر سڑک میں، ہر گلی میں کاروں کو روک لیا جاتا اور ان میں سے 'حرکت المحرومین' کے جوانوں کو اُتار لیا جاتا۔ ان کے گھروں پر حملہ کر کے انھیں گرفتار کر لیا جاتا جن میں سے بہت سوں کو مار دیا گیا اور بہت بڑی تعداد کو مار پیٹ کر زندانی بنا دیا گیا۔ 'حرکت المحرومین' اور 'تنظیم امل' کے بہت سے افراد اور عام شیعہ فرار ہونے پر مجبور ہو گئے۔ کمال جنبلاط اور اس کے حواریوں نے جشن منایا کہ وہ کامیاب ہو گئے ہیں۔ اب وہ انتقام لے رہے تھے۔ جس طرح روزِ عاشور امام حسین علیہ السلام اور ان کے رفقا کے سروں کو نیزوں پر بلند کر کے یزیدی فوج نے خوشی کے نعرے بلند کیے تھے اور رجز خوانی کی تھی، اسی طرح لبنان کی پوری فضا ان لوگوں کی رجز خوانیوں، تہمت تراشیوں اور دروغ بافیوں سے مسموم ہو چکی تھی۔ ان کے ریڈیو 'حرکت المحرومین' کے ذمّہ دار افراد کے نام مسلسل نشر کر رہے تھے اور ان میں سے جو ان کے قابو آجاتا اُسے ریڈیو پر لا کر بولنے پر مجبور کیا جاتا۔ ہر روز 'حرکت المحرومین' کے مختلف مرکزوں کے سقوط کی جھوٹی خبریں نشر کی جاتیں۔

لیکن ہمارے پائے ثبات میں لغزش نہ آئی۔ ہم نے ایسی استقامت کا ثبوت دیا کہ تاریخ میں اس کی نظیر نہیں ملتی۔ جب الشیاح کے مرکز کو بائیں بازو کے لوگوں نے محاصرے میں لے لیا اور ان کے ستر لڑنے والوں نے بھاری اسلحے کے ساتھ حملہ کرنے کی تیاری کی، اس وقت مرکز میں باقی رہ جانے والے

Presented by Ziaraat.Com

صرف سات افراد نے جن کے دل ایمان کی دولت سے سرشار تھے، اس مرکز میں دھماکے سے پھٹنے والا مواد رکھ دیا اور مرکز کی بالکونی پر ایک بھاری توپ رکھ دی اور ان سے کہا کہ ہم آخری وقت تک لڑیں گے اور ہتھیار ڈالنے کی بجائے اس مرکز کو بھی اُڑا دیں گے اور خود کو بھی ختم کر لیں گے۔ یہ مرکز تین دن محاصرے میں رہا اور تین دن تک ریڈیو اور اخباروں سے سرد جنگ جاری رہی۔ ہر آن ریڈیو سے اعلان ہوتا کہ مرکز پر قبضہ کر لیا گیا ہے اور اس کے سب افراد مارے گئے ہیں۔ کبھی کبھی اس مرکز کے انچارج کو نام لے کر بلایا جاتا اور ان جوانوں کے حوصلوں کو پست کرنے کی کوشش کی جاتی لیکن یہ 'جماعتیے' تو غارتگری اور لوٹ مار کے لیے آئے تھے۔ ان میں قربانی دینے کی طاقت نہ تھی - انھیں مرکز الشیاح پر حملہ کرنے کی جرأت نہ ہوئی۔ یہ بات درست ہے کہ 'حرکت المحرومین' کے بعض مراکز پر قبضہ کر لیا گیا لیکن بڑے بڑے مراکز مرنے مارنے پر تلے ہوئے تھے اور ان جماعتیوں کے حملوں کو رد کرتے رہے۔ جبلِ عامل کے صنعتی مدرسے پر، جس کا میں پرنسپل تھا، حملہ کیا گیا۔ تقریباً سو افراد نے جن میں بائیں بازو کے لبنانی اور انتہا پسند فلسطینی شامل تھے، بھاری اسلحے کے ساتھ حملہ کیا۔ انھوں نے مدرسے کے چوکیدار کو مار دیا اور ایک شخص کے پاؤں توڑ دیے۔ لیکن مدرسے کے نوعمر لڑکوں نے بندوقوں کے ساتھ جنگ لڑی اور ان جماعتیوں کو پسپا ہونے پر مجبور کر دیا اور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ان کے چہروں پر کالک مل دی -

سیّد الصدر کے بعد، جن کی حیثیت بہت بلند تھی، میرا نام ان لوگوں کی فہرستِ سیاہ میں سب سے اُوپر تھا اور میں ان کے بغض و کینہ کا بڑی شدّت سے ہدف بنا ہوا تھا۔ مجھ پر تہمتوں کی بارشیں ہوا کرتی تھیں۔ ان تہمتوں میں سادہ ترین تہمتیں یہ تھیں کہ میں اسرائیل کا جاسوس ہوں، سابق شاہِ ایران کا ایجنٹ ہوں اور امریکہ کا پروردہ ہوں۔ میرے دوست خبریں لاتے تھے کہ مختلف مقامات پر مجھے پکڑنے کے لیے کمین گاہیں بنا دی گئی ہیں۔ جن لوگوں کو یہ جماعتیے پکڑ کر لے جاتے وہ چھوٹنے کے بعد خبر لاتے کہ یہ سب جماعتیں اسی چکر میں ہیں کہ کسی طرح مجھے گرفتار کیا جائے۔ وہ مجھے خبردار کرتے کہ اگر میں گرفتار ہو گیا تو میرا بُرا حشر ہوگا۔ لیکن میں تو اس بات کا ذمّہ دار تھا کہ ہر جگہ پہنچوں، ہر شخص کی ڈھارس بندھاؤں، ہر شخص کو ہمّت دلاؤں، انھیں استقامت کا سبق دوں اور اپنے آپ کو فداکاری کی علامت بنا کر پیش کروں۔ اس لیے میں ہر جگہ گھومتا رہتا۔ شیاح سے برج البراجنہ

اور وہاں سے کسی اور علاقے میں اور پھر بیروت سے جنوبی لبنان میں صور اور اس کے گرد و نواح کے دیگر قریوں اور قصبوں میں جاتا لیکن خدا کے فضل سے ہر بار اپنی سوجھ اور تدبیر سے ان کمین گاہوں سے بچ نکلتا۔ میرا تکیہ صرف خدا پر تھا۔

میں بڑی صاف بات کرنا چاہتا ہوں کہ میں لبنان کے شہروں اور قصبوں میں پُرامن زندگی بسر نہ کر سکتا تھا چونکہ وہاں ۷۵ کے قریب مختلف تنظیمیں بائیں بازو سے متعلق تھیں اور کسی کو یہ معلوم نہ تھا کہ کون کس وقت مجھے اپنا ہدف بنائے گا۔ مجھے ایک لمحے کے لیے بھی یہ اطمینان نہ تھا کہ زندہ رہوں گا۔ تصوّر کیجیے کہ ہمارے لیے محفوظ ترین جگہ اسرائیل کے ساتھ ملتا ہوا سرحدی علاقہ تھا چونکہ وہاں بائیں بازو کا کوئی وجود نہ تھا اور انھیں یہ جرأت نہ تھی کہ وہاں آتے۔ وہاں ہمارے سامنے صرف ایک دشمن تھا اور وہ اسرائیل تھا۔ اس لیے ہمیں اطمینان تھا کہ پیچھے سے ہم پر کوئی حملہ نہ کرے گا اور اگر اسرائیل نے ہم پر حملہ کر دیا تو مردانہ وار اس کے مقابل آئیں گے، لڑیں گے اور شہادت پائیں گے۔ ہمیں سب سے زیادہ نقصان اس وقت پہنچتا تھا جب کوئی شخص پیچھے سے ہم پر حملہ آور ہوتا تھا۔ کار پر سفر کرتے ہوئے ہم پر گولیوں کی بارش ہو جاتی۔ ہمارے بہت سے لڑنے والے انھیں حملوں میں شہید ہوئے۔ یہ کس قدر افسوس کا مقام ہے -

ایک بار یاسر عرفات کی موجودگی میں مجھے سخت غصّہ آگیا اور میں نے شدید تلخ کلامی سے کام لیا۔ اس وقت ان کے ساتھ ابو حسن، ابو ولید اور فلسطینی مزاحمت کی مرکزی کمیٹی کے بعض ارکان بھی موجود تھے۔ میں نے یاسر عرفات سے کہا کہ آپ کیوں کر اجازت دیتے ہیں کہ بائیں بازو کے ریڈیو اور اخبار حتیٰ کہ فلسطینی مزاحمت کا رسالہ "فلسطین الثورۃ" بھی سیّد موسیٰ الصدر کو گالیاں دیں، جھوٹے الزام لگائیں، تہمتیں تراشیں اور ہمارے جوانوں کے قتل کا حکم صادر کریں۔ میں نے یاسر عرفات سے پُوچھا کہ آپ ایسی رذالتوں کا گندگیوں کا سدِّباب کیوں نہیں کرتے۔ آپ خاموش کیوں ہیں کیونکہ "اَلسَّاكِتُ عَلَى الْحَقِّ شَيْطَانٌ أَخْرَس" یعنی سچائی کے مقابلے میں خاموش رہنے والا گونگا شیطان ہے۔ ان باتوں کے جواب میں یاسر عرفات نے نہایت کرب سے یہ بات کہی کہ "جو لوگ آپ کو گالیاں دیتے ہیں وہ مجھے اس سے زیادہ گالیاں دیتے ہیں، مجھے بھی جاسوس کہتے ہیں، مجھ پر بھی غدّاری کی تہمت لگاتے ہیں اور میں ...

Presented by Ziaraat.Com

اِس کے بعد انھوں نے اپنی میز کے نیچے اخبارات و رسائل کے ایک پلندے کی طرف اشارہ کیا جو یاسر عرفات کے خلاف دروغ بافیوں سے پُر تھے۔ میں نے ان سے کہا کہ بائیں بازو کی لبنانی جماعتوں اور انتہا پسند فلسطینی تنظیموں کے حملوں سے مجھے کوئی گلہ نہیں لیکن "فلسطین الثورۃ" میں شائع ہونے والے مواد کے خلاف شکایت ضرور ہے کیونکہ یہ پرچہ فلسطینی مقاومت کا ترجمان ہے جو "اسد ابو شرار" ایسے کمیونسٹ کے زیرِ ادارت شائع ہوتا ہے اور بائیں بازو کے دیگر اخبارات کے مانند ہمارے خلاف دشنام طرازیوں سے پُر ہوتا ہے۔ یاسر عرفات کہنے لگے، "اے برادرِ عزیز! فلسطینی مزاحمت میں یہ تضادات موجود ہیں۔ ابھی کل ہی کی بات ہے کہ "فتح" کے ایک افسر نے 'فتح' ہی کے ایک دوسرے افسر کو قتل کر دیا اور ہم کچھ بھی نہ کر پائے۔" میں نے کہا کہ یہ کمیونسٹ فلسطینی تنظیم مزاحمت کے اسلحے سے لیس ہو کر اس کے سر پر سوار ہیں اور اسی تنظیم کی تقدیس کا سہارا لے کر ہمیں اپنے ظلم و ستم کا نشانہ بناتے ہیں۔ یہ بات تاریخ کی سب سے بڑی ناانصافی ہے۔ یاسر عرفات میری ہر بات کو قبول کرتے جا رہے ہیں یہاں تک کہ فلسطینی مزاحمت نمبر ۲ لیڈر ابو جہاد نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ "آپ پر ہر حملہ ہمارے دل میں چھرا گھونپنے کے مترادف ہے۔"

لیکن فلسطینی تحریکِ آزادی "فتح" کے یہ رہنما بائیں بازو کے بُنے ہوئے جال میں گرفتار تھے اور ہر چند کہ دل سے اُن کی اِن حرکات کے مخالف تھے تاہم کھلم کھلا ان کی مخالفت میں کوئی اقدام نہیں کر سکتے تھے۔ اور وہ فلسطینی مزاحمت کا سہارا لے کر اپنے پُرانے دشمنوں کو نیست و نابود کرنے میں مشغول ہیں۔

انہیں بائیں بازو کی جماعتوں نے سازش کا جال اب جنوبی لبنان تک پھیلا دیا ہے اور ان کی خواہش ہے کہ اس منطقے کو بھی شیعوں کے لیے جہنم بنا دیں۔ وہ شیعہ قصبوں اور گاؤوں مثلاً "بنت جبیل"، "طیری"، "کونین"، "حاریص"، "رشان"، "باطر"، "محدل زون" وغیرہ سے اسرائیل کی جانب ایک آدھ گولا یا راکٹ پھینک دیتے ہیں اور ان کے جواب میں وہ ان قصبوں کو گولا باری کا نشانہ بناتا ہے اور ہر روز بے شمار بے گناہ موت کے گھاٹ اُتر جاتے ہیں۔ جنوبی لبنان کے شیعہ گروہ در گروہ اس اسرائیلی گولا باری کی زد سے نکلنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ یہ سازشی اور خیانت کار بائیں بازو والے

چاہتے ہیں کہ اسرائیل جنوبی لبنان میں داخل ہو جائے[1]۔ تاکہ ان کے خیال کے مطابق عربوں اور اسرائیل میں کھلم کھلا لڑائی شروع ہو جائے اور اس کی قیمت جنوبی لبنان کے شیعہ ادا کریں، ان کے افراد مارے جائیں، ان کے گھر برباد ہو جائیں اور اس کے باوجود انھیں خائن، غدار، جاسوس، کافر، رافضی اور دُم دار کے القابات سے نوازا جائے۔ یہ ہے تاریخ کا سب سے بڑا جرم اور ستم ظریفی۔

شیعیانِ علیؑ و حسینؑ :

یہ بات فراموش نہ کیجیے کہ میں یہ باتیں کر رہا ہوں اور میں آزاد فکری کا قائل ہوں، مدت دراز تک غیر ممالک میں زندگی بسر کر چکا ہوں اور ہمیشہ اتحاد بین المسلمین کا قائل رہا ہوں اور اب بھی ہوں۔ میں نے تفرقہ بین المسلمین کو ہمیشہ استعماری سازش گردانا ہے۔ یہاں تک کہ فلسطینی مزاحمت کی خاطر میں نے سالہا سال سے امریکہ میں سکونت ترک کر رکھی ہے اور اپنے آپ کو اس گرداب بلا میں ڈالا ہے۔ میں نے اس راہ پر چلنے کے لیے اپنے آپ کو بھی فراموش کر رکھا ہے۔ میں اب بھی شیعوں میں سُنیوں کی طرفداری کرتا ہوں، میں مسلمان اُمت کی وحدت کا حمایتی ہوں اور فلسطینی مزاحمت کی حمایت کرنے میں کسی بات سے نہیں جھجکتا..... تو یہ باتیں مجھ ایسا شخص کر رہا ہے جس کا سابقہ ریکارڈ اس قسم کا ہے۔

کبھی میں یہ دیکھتا ہوں کہ شیعہ ہونا جرم ہے اور شیعوں میں احساسِ کمتری پایا جاتا ہے۔ غیر شیعہ ان کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں گویا وہ انسانی سطح سے کہیں نیچے ہیں۔ کبھی میں یہ دیکھتا ہوں کہ اہلِ سنّت کے سب سے بڑے عالم اور دانشور ڈاکٹر صبحی صالح[2] جو مفتی لبنان کے معاون

---

[1] شہید مصطفیٰ چمران نے یہ کتنی سچی بات کہی اور زمانے نے اسے ثابت کر دیا۔ ان نام نہاد ترقی پسند اور انقلابی محاذوں کی حرکتوں نے اسرائیل کو بالآخر جنوبی لبنان میں داخل ہونے کی دعوت دی۔ بین الاقوامی اور بین الاحزابی گٹھ جوڑ کے تحت اسرائیلی فوجیں بیروت سے واپس ہو گئیں لیکن جنوبی لبنان ابھی تک ان کے ظلم و ستم کا نشانہ بن رہا ہے۔

[2] ڈاکٹر صبحی صالح کا شمار ان علماء اہل سنّت میں سے ہوتا ہے جو اہلِ فکر و دانش ہیں اور غیر متعصب کہلاتے ہیں اس سے کچھ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ جو متعصب ہوں گے ان کا کیا عالم ہو گا۔

Presented by Ziaraat.Com

ہیں یونیورسٹی کے پروفیسر ہیں اور سربرآوردہ اہلِ علم و فضل میں سے ہیں اپنی درسی کتاب میں تحریر فرماتے ہیں کہ "عبداللہ بن سبا[1] کے آنے سے قبل شیعوں کا کوئی وجود ہی نہ تھا اور وہ یہودی تھا .... یوں اس ڈھٹائی سے شیعوں کی اہانت کی جاتی ہے اور اہلِ سیاست اس تاریخی پس منظر اور احساسِ کمتری سے استفادہ کر کے شیعوں پر تسلط حاصل کرنا چاہتے ہیں اسی طرح بائیں بازو کی جماعتیں اور فلسطینی مزاحمت کے انتہاپسند کارکن نہایت بے رحمی کے ساتھ یہ چاہتے ہیں کہ شیعہ تنظیم کو بدنام کریں یہاں تک کہا جاتا ہے کہ شیعہ تنظیم امل اور خود شیعہ اسرائیل سے زیادہ خطرناک ہیں اور میں پھر بھی دیکھتا ہوں کہ شیعہ اپنی جانیں فدا کر رہے ہیں، ان کے گھر برباد ہو رہے ہیں، جنگ کی اولین صفوں میں وہ قربانیاں دے رہے ہیں اور اس کے باوجود انہیں بے حد ناانصافی سے تہمتوں اور الزاموں اور نفرتوں کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ یہ سب باتیں میری برداشت سے باہر ہیں۔

میں اس ظلم و ستم کو دیکھتا ہوں جو چودہ سو سال سے شیعوں پر روا رکھا جا رہا ہے اور میں امویوں اور ان کے حاشیہ برداروں کو دیکھتا ہوں کہ کیسی کیسی دروغ بافیوں اور تہمت تراشیوں سے کام لیتے ہیں اور کیسے کیسے جرائم کا ارتکاب کرتے ہیں۔ میرا دل شیعوں کی حالت پر جلتا ہے۔ میں کڑھتا ہوں، مجھے دکھ ہوتا ہے۔ میں اس ظلم و ناانصافی کو برداشت نہیں کر سکتا اور چونکہ مجھ میں کوئی مرکب نقص اور احساسِ کمتری نہیں کہ میں نے آزاد زندگی بسر کی ہے اس لیے ان باتوں سے وحشت نہیں ہوتی،

---

[1] عبداللہ بن سبا کی غیر افاقی داستان پاکستان میں بھی رائج ہے حالانکہ ہمارے زمانے میں سنی اور شیعہ دونوں فرقوں کے علماء نے اس داستان کی دھجیاں اڑا دی ہیں۔ سید مرتضیٰ عسکری، عبداللہ سبیتی اور سید عبدالحسین شرف الدین کی تحقیقات نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ اس نام کا کوئی شخص دنیا میں پیدا ہی نہیں ہوا اور یہ سارا قصہ سیف تمیمی نے گھڑا اور طبری نے اسے من و عن قبول کر لیا اور طبری کی سند پر باقیوں نے قبول کر لیا اور اس کے پس پردہ شیعوں کو بدنام کرنے کا جذبہ کارفرما تھا۔ اس داستان کو قبول کرنے والے یہ نہیں سوچتے کہ اس کے ذریعے سے ازواجِ رسولؐ اور اصحابِ رسولؐ دونوں کی اہانت ہوتی ہے۔ اور ان میں عبداللہ بن عباسؓ، عبداللہ بن مسعودؓ، عمار یاسرؓ، زبیر بن العوامؓ، ام المومنین عائشہؓ جیسی ہستیاں بھی شامل ہیں گویا یہ سب عبداللہ بن سبا کے آلۂ کار بن گئے اور گویا عربوں نے روایتی تعصب اور احساسِ تفاخر کے باوجود ایک یہودی، اور یہودی بھی ایسا جس کے حسب نسب کا کوئی سراغ نہیں ملتا، اپنا رہنما تسلیم کر لیا جب کہ جید اصحابِ رسولؐ اور کھرے حسب و نسب کے عرب ان کے درمیان موجود تھے۔

اس لیے میں ان دشمنوں کے مقابل کھڑا ہو جاتا ہوں اور بڑی بہادری اور احساسِ فخر سے کہتا ہوں کہ میں شیعۂ علیؑ و حسینؑ ہوں۔ پھر میں دیکھتا ہوں کہ میری یہ بات شیعوں کے دلوں اور روحوں کو گرما دیتی ہے اور وہ پروانہ وار میرے گرد جمع ہو جاتے ہیں۔

علیؑ و حسینؑ کی باتیں ان کی دردناک تاریخ کو ان کے سامنے دہراتی ہیں اور ماضی کے ان ثقافتی رشتوں کو استوار کرتی ہیں۔ علیؑ و حسینؑ کا نام ان کو ایک روحِ تازہ سے سرشار کرتا ہے انہیں نئی زندگی بخشتا ہے ان میں شجاعت کی صفت پیدا کرتا ہے۔ ان کو احساسِ تفاخر سے آشنا کرتا ہے۔ اور ذلت و موت کی حالت سے باہر لے آتا ہے۔ ان کو حیوانیت اور کفر کے مرحلے سے نکال کر انسانیت اور مسلمانی کی منزل پر لے آتا ہے۔

یہ ہے شیعوں کی تاریخ کا ایک حصہ۔ شیعوں کی مصیبتوں، ان پر وارد ہونے والے ظلم و ستم، ان پر ٹوٹنے والی قیامتوں، ان کی اہانتوں، ان کی نفسیاتی الجھنوں، غربت و فقر، جہالت، مرض، پراگندہ خاطری، شکست کے احساس، ذلت کے شعور، ان پر گرنے والے غموں کے پہاڑوں، انھیں ڈبونے والے مصیبتوں اور آزمائشوں کے سمندروں کا بیان۔ ان کی تاریخ ظلم و ستم کو برداشت کرنے کی تاریخ ہے۔

ہم نے شیعوں کی جو سب سے بڑی خدمت کی ہے اور کر رہے ہیں وہ یہ ہے کہ علیؑ و حسینؑ کے پرچم پُرافتخار کو کندھوں پر اٹھائے ہوئے ہیں اور وہ نعرہ جو چودہ سو سال سے سینوں میں مقید تھا اسے مجرموں کے سر پر بم کی طرح مارتے ہیں۔ یزیدیوں کے ظلم و ستم کے مرکزوں کو لرزہ براندام کرتے ہیں ان لوگوں کے ڈھول کا پول کھولتے ہیں اور برسرِ عام رسوا کرتے ہیں جو اپنے آپ کو اپنے زعم میں اجتماعی انصاف کا ٹھیکیدار گردانتے ہیں اور اپنے آپ کو بائیں بازو سے تعبیر کرتے ہیں۔ زندگی اور موت کے میدانوں میں ایمان کی قوت اور شہادت کے جذبے سے پیش قدمی کرتے ہیں۔ اور اپنے خون آلودہ کفنوں کو اپنے تاریخی پیغام کی حفاظت و پشتیبانی کے کام لاتے ہیں تاکہ ہم اپنے انسانی فریضے کو ادا کریں اور الوہی اقدار کو زندہ کریں اور دنیا کو دکھائیں کہ علیؑ اور حسینؑ کی راہ پر یوں چلا کرتے ہیں۔

Presented by Ziaraat.Com

"نبعہ" شہید کی زیارت[1] :

اے میرے پیارے دوست، تُو نے اپنی آنکھیں بند کیوں کر لی ہیں؟ میں تو تجھے "نبعہ" دکھانے کے لیے لایا ہوں تاکہ تُو ان بربادیوں کو، آتش زدگیوں کو، اس لُوٹ کو، ان خونریزیوں کو، اس ظلم وستم کو اور ان جرائم کو خود دیکھ سکے جو شیعوں پر رَوا رکھے گئے ہیں!!

"نہیں، نہیں، مجھ میں یہ طاقت نہیں، دم خم نہیں کہ میں دردناک اور غم انگیز منظر کو دیکھ سکوں۔ بس بس، جو کچھ میں دیکھ چکا ہوں وہ میرے لیے کافی ہے۔ میں لرزہ براندام ہوں، میرا دل جل رہا ہے اب میں ان بدنصیبوں اور جرائم کا شکار لوگوں کی آبادی کو اور نہیں دیکھ سکتا۔"

اگر رونا چاہتے ہو، اشک فشانی کرنا چاہتے ہو، ضرور کرو۔ تمھیں آزادی ہے۔ خوب آنسو بہاؤ اور ان کو 'نبعہ' کے شہیدوں کے خون میں ملا دو تاکہ شیعوں کی تاریخ کا ایک نیا باب شروع ہو سکے۔

اگر چاہتے ہو آہیں بھرو، اپنے دلِ سوزاں کو تسکین دو تو تمھیں آزادی ہے۔ ضرور آہیں بھرو تاکہ تمھاری آہیں اُن ماؤں اور عورتوں کی آہوں میں مِل جائیں جن کے دل داغ داغ ہیں اور یوں مجرموں کی بیخ وبن کو جلا دیں۔

اگر فریاد کرنا چاہتے ہو تاکہ تمھارے درد سے بھرے سینے کو ذرا آرام ملے، تمھارے غصّے کا دباؤ کم ہو اور تمھارے گلے میں رُکے ہوئے انتقام کے جذبے کو تسکین ملے تو تم فریاد بلند کر سکتے ہو تاکہ تمھاری فریاد ان شیعہ نوجوانوں کی فریاد سے ہم آغوش ہو جائے جو اپنی جان پر کھیل گئے اور پھر یہ ملی جلی فریادیں ظلم وستم کے محلوں کے ستونوں کو لرزا دیں۔

اے میرے عزیز دوست! تاریخ کے ان جرائم اور ان غم انگیز مناظر کا مشاہدہ بہت بڑا درسِ عبرت ہے، وقت کے گزرنے کے ساتھ ساتھ ان دردناک اور الم انگیز مناظر کی یاد دلوں سے محو ہوتی جائے گی اور بہت کم لوگ ان جرائم وظلم وستم کے اعمال کو مانیں گے اور ان المیوں سے پیدا ہونے والا گداز صرف میرے اور تیرے دلوں میں باقی رہ جائے گا۔

اے میرے دوست! تُو کہ بہت دُور سے آیا ہے کہ حقائق کو اپنی آنکھوں سے دیکھ سکے اور

---

[1] یہ تحریر اس دوست سے ایک خطاب ہے جس کے ساتھ میں اس ظلم کے شکار علاقے کو دیکھنے گیا تھا۔

ستم زدہ اور مظلوم شیعوں سے ہمدردی کر سکے، اپنی آنکھیں کھول اور جس قدر ممکن ہو ان بکھری ہوئی حقیقتوں کو دیکھ اور اپنے دوستوں کے لیے درد وغم کی ایک دُنیا، اور ظلم وستم کی ایک سرگزشت سوغات کے طور پر لے جا۔

یہ دیکھ! یہ کیا ہے؟ یہ جلی ہوئی لاش ہے۔ یہ سیاہ راکھ اس کی پاش پاش کھوپڑی کی نشانی ہے۔ یہ اس کے ہاتھ ہیں.... یہ پاؤں ہیں۔ اس بدنصیب اور بے نوا کو مجرموں نے اس کے کمرے ہی میں قتل کیا، اس کی لاش کے ٹکڑے کیے اور پھر اس پر پٹرول ڈال کر اسے جلا ڈالا۔

اے میرے مہربان دوست! یہ 'ابومحمد' کا گھر ہے۔ 'ابومحمد' ایک غیرت مند اور عزّت دار شخص تھا، اس کے خاندان کے افراد متعدد تھے۔ وہ 'حرکت المحرومین' اجتماعی خدمات کا ذمّہ دار تھا۔ میں نے کئی راتیں اس گھر میں گزاری ہیں۔

اور یہ 'شیخ فرحات' کی مسجد ہے جب میں 'نبعہ' میں آیا اور کسی کو نہ جانتا تھا تو سیدھا اسی مسجد میں آیا تھا۔ یہاں نماز پڑھنے کے بعد میں سوچ میں پڑ گیا تھا کہ کام کا آغاز کہاں سے کروں، کس سے باتیں کروں کہ یکدم میری نگاہ ایک شخص پر پڑی جو غور سے مجھے دیکھ رہا تھا گویا وہ پہچان تو چکا ہے لیکن اسے یقین نہیں آ رہا کہ وہ میں ہوں۔ اور بات بھی درست تھی کیونکر ممکن تھا کہ میں آگ اور خون کے محاصرے کو توڑ کر 'نبعہ' میں وارد ہو سکوں۔ وہ چاہتا تھا کہ مجھے خوش آمدید کہے لیکن وہ یہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ وہ بعد میں دھوکے کی زد میں آئے۔ وہ جلدی سے ہراسانی کے عالم میں گیا اور چند اور اشخاص کے ہمراہ واپس آیا۔ انھوں نے مجھے پہچان لیا، مجھ سے بغلگیر ہوئے۔ میرا ماتھا چُوما اور میرے سلامت وارد ہونے پر اللہ کا شکر ادا کیا۔ وہ بڑے تعجب سے پوچھتے تھے کہ میں کیونکر اور کس معجزے کی بنا پر 'نبعہ' پہنچ سکا۔

یہ میرا پہلا اڈا تھا۔ یہیں اوپر کی منزل کے ایک کمرے میں تقریریں کرتا تھا اور رضاکاروں کو سبق پڑھاتا تھا اب اس مسجد کو ذرا دیکھ! کیا دلخراش منظر پیش کر رہی ہے۔

یہ دیکھ! یہاں حرکت المحرومین اور تنظیم امل کا ہسپتال تھا۔ یہاں ہزاروں افراد کا علاج ہوا کرتا تھا۔ اس کی اوپر کی منزل میں ڈاکٹر رہا کرتے تھے آج یہ کھنڈر بن چکا ہے۔

اور یہ دیکھ، یہ "شریف" کا گھر ہے۔ میں اس گھر کو کبھی نہیں بھولوں گا۔ ایک دن یہ صبح سویرے

Presented by Ziaraat.Com

میرے ساتھ آملا۔ ہم ہر جگہ گئے۔ تمام مورچوں کی گردش کی بعض جگہ میں نے تقریریں بھی کیں اور نصف شب کے قریب ہم واپس ہوے۔ 'شریف' کو معلوم تھا کہ صبح سے ہم نے کچھ نہیں کھایا اور سچی بات تو یہ ہے کہ ہم تھک کر چُور ہو چکے تھے اور بھُوکے بھی تھے۔ اُس نے اپنا ہاتھ جیب میں ڈالا وہاں سے اُس نے پانچ قرش (تقریباً پندرہ پیسے) نکالے اور کہا، ڈاکٹر صاحب! یہ میرا کل سرمایہ ہے، اگر میں نے آپ کو شام کے کھانے کی دعوت نہیں دی تو اس کا سبب یہی ہے کہ میرے پاس ہے ہی کچھ نہیں"..... میں یہ سُن کر لرز اُٹھا، بے حد متأثر ہوا اور میں نے اس سے کہا کہ آج میں تمھارے ہی گھر میں سوؤں گا۔

ہم اس کے گھر پہنچے۔ اس کی بیوی سخت ناراض ہوئی اور اس سے کہا "تم نے ہمیں بتایا کیوں نہیں کہ کہاں ہو ہم یہاں پریشان ہو رہے ہیں، اس کا سات سال کا بیٹا جاگ اُٹھا اور باپ سے کہنے لگا" اباجان! اباجان! آپ کہاں چلے گئے تھے ہمیں بتائے بغیر؟ آپنے ہمیں کیوں نہیں بتایا کہ آپ کہاں ہیں"۔ وہ ایک طرف تو اپنا چہرہ باپ سے دوسری جانب پھرا رہا تھا اور اس کے ساتھ ہی باپ سے لپٹا بھی جا رہا تھا اس وقت 'شریف' کا بوڑھا باپ جاگا۔ اس نے ہمیں خوش آمدید کہی اور ہمارے پاس آبیٹھا۔ ہمیں دُعا دی۔ رات ہم بھُوکے ہی سوے۔ حالت یہ تھی کہ سوتے وقت میری آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ آج میں نے نہایت خوبصورت اور نہایت معرفت آگیں بھُوک کا تجربہ کیا تھا۔

ہاں اور یہاں امام باڑہ تھا۔ یہاں بھی میں نے کئی راتیں بسر کی تھیں۔ ہر آن اس بات کا خدشہ ہوتا تھا کہ کسی لمحے بھی توپ کا گولا ہمیں اپنا نشانہ بنالے گا۔ گولا باری سے امام باڑے کے در و دیوار لرزتے تھے اور ہر آن اس کی عمارت کا کوئی نہ کوئی حصہ زمین بوس ہو جاتا۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ ہر گولا میرے کمرے کے کسی گوشے ہی میں پھٹ رہا ہے۔

جی ہاں! یہی 'نبعہ' کا شہید محلہ ہے۔!!

باب چہاردہم

تل زعتر کا سقُوط

ضدِ انقلاب عناصر ایران کی انقلابی شخصیتوں کے خلاف کیچڑ اُچھالنے ہر ذلیل سے ذلیل حربہ استعمال کرتے ہیں یہاں تک وہ ان پاکیزہ چیزوں سے کھیلنے سے بھی گریز نہیں کرتے جو لوگوں کے نزدیک بے حد مقدس ہیں۔ وہ فلسطینی مزاحمت اور اس کے مقدس اغراض کو بھی پلید مقاصد کے لیے استعمال کرتے ہیں تاکہ عوام کے پاکیزہ جذبات کو بھڑکا کر انھیں ذلیل مقاصد کے لیے استعمال کریں۔

ایران میں اسلامی حکومت کے خلاف کام کرنے والے منافقین نے یہ افواہیں پھیلائی ہیں کہ تنظیم 'امل' یا ڈاکٹر چمران نے 'تل زعتر' کو کتائب کے حوالے کر دیا۔ یوں افواہیں پھیلا کر وہ اپنے گمان میں اپنی مکارانہ چالوں سے اپنے مقابل کو شکست دینے پر قادر ہو پائیں گے لیکن خداوندِ بزرگ و برتر ان کی چالوں کو بیکار کر دیتا ہے (اس واقعہ کی تفصیل ایران میں ۱۳۵۸ شمسی مطابق ۱۹۷۹ء میں لکھی گئی)۔

تل زعتر کی حیثیت:

"تل زعتر" بیروت کے نواح میں ایک فلسطینی کیمپ تھا جو بھاری اور ہلکے اسلحہ اور لڑنے والوں کی تعداد کے اعتبار سے بے نظیر تھا۔ یہاں تک کہ اسے قلعۃ الصمود (ناقابلِ فتح قلعہ) کہا جاتا تھا۔ تمام فلسطینی اس پر فخر کرتے تھے۔

فلسطینیوں کے تمام کیمپوں میں، داخلی معاملات خود فلسطینیوں کے ہاتھ میں تھے یہاں تک کہ لبنانی پولیس اور کانسٹیبلری کو ان کیمپوں میں داخل ہونے کا حق نہ تھا۔ داخلی امن و امان، عدالتی امور، پہرہ داری وغیرہ کے تمام کام صرف فلسطینیوں کی وساطت سے طے پاتے تھے:

Presented by Ziaraat.Com

اس بناء پر کیا یہ ممکن ہے کہ "تل الزعتر" کی حفاظت کا کام ڈاکٹر چمران یا 'امل' کو سونپا گیا ہو۔ یا تنظیم 'امل' کو جو لبنانی جماعت ہے، تل الزعتر کی حفاظت کا ذمہ دار قرار دیا گیا ہو؟ کیا فلسطینی سو رہے تھے کہ ایک شخص یا جماعت باہر سے آکر پُورے کا پُورا کیمپ دشمن کے حوالے کر دے؟ میں اس وقت جنوبی لبنان میں "تل الزعتر" سے اسّی کلومیٹر کے فاصلے پر تھا اس لیے یہ بات کیونکر ممکن تھی کہ "تل الزعتر" ایسے مضبوط قلعے کو دشمن کے حوالے کر دوں۔ اگر کوئی شخص یہ کہے کہ تنظیم 'امل' نے "تل الزعتر" دشمن کے حوالے کر دیا تو یہ بات اُسی وقت ممکن ہے اگر 'امل' نے باہر سے اس پر حملہ کیا ہو یا اس کے کسی حصّے کی حفاظت اس کے سپرد ہو اور اُس نے اس فریضے کے ادا کرنے میں کوتاہی کی ہو یا خیانت کی ہو؟ ظاہر ہے کہ ان دونوں صورتوں میں سے کوئی بھی صورت نہ تھی بلکہ ایسا ہونا محال تھا کہ فلسطینی اپنے کیمپ اور وہ بھی تل زعتر ایسے مضبُوط قلعے کی حفاظت کا کام ایک غیر فلسطینی جماعت کے سپرد کر دیں تو پھر یہ بات کس منطق سے مانی جائے کہ 'امل' نے اس کیمپ پر حملہ کیے بغیر یا اس کی حفاظت کی ذمہ داری قبول کیے بغیر، اس مضبوط قلعے سے دُور رہ کر اسے دشمن کو سونپ دیا ہو؟ اور اگر بفرضِ محال ایسا ہوا بھی ہو تو فلسطینی رہنماؤں یا ان کے سرکاری اخبارات نے گزشتہ سالوں میں اس کے بارے میں کوئی بات کیوں نہ کی؟ آج انقلاب کے مخالف 'ماں سے زیادہ مہربان' کے مصداق بن رہے ہیں اور اس قسم کے مضحکہ خیز الزامات دُہرا رہے ہیں۔ کیا یہ ممکن ہے کہ ڈاکٹر چمران یا تنظیم 'امل' نے تل الزعتر کتائب کے حوالے کر دیا ہو اور اس کے باوجود یاسر عرفات اور 'فتح' کے لوگ اس دردناک واقعے کو بھلا دیں اور ڈاکٹر چمران یا 'امل' کے ساتھ تعاون کریں۔

"تل زعتر" کا حادثہ 'نبعہ' کے سانحے کے مانند دردناک تھا۔ "تل زعتر" میں تیس ہزار اشخاص رہتے تھے ان میں تقریباً سولہ ہزار شیعہ لبنانی[1] تھے اور چودہ ہزار فلسطینی۔ دُنیا تل زعتر کو فلسطینی

[1] یاد رہے کہ وہ لبنانی جو فلسطین میں آباد تھے اور انھیں اسرائیلی تعدیوں کی بنا پر اپنا گھر بار چھوڑنا پڑا تھا وہ بھی فلسطینی کیمپوں میں رہتے ہیں۔ فلسطین کے شمالی حصّے کے دیہات جو لبنان کی سرحد کے قریب تھے ان میں کافی لبنانی شیعہ بھی رہتے تھے پھر لبنان کے چودہ گاؤں جو لبنانی زمینداروں (کاظم الخلیل، کامل الاسعد اور صائب سلام کے مانند) نے یہودیوں کے ہاتھ بیچ دیے تھے اور ان کی آبادی کو مجبوراً اپنے علاقے سے نکلنا پڑا۔ یہ سب شیعہ تھے اور فلسطینیوں کے ساتھ کیمپوں میں زندگی گزارتے تھے۔

آبادی پر مشتمل گردانتی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہاں بھی اکثریت شیعوں کی تھی۔ اس لیے اس حادثے میں اس کشت و خون اور غارت گری کی بنا پر شیعوں کو اتنا ہی نقصان برداشت کرنا پڑا جتنا فلسطینیوں کو۔ اگر آپ تل زعتر سے واقف ہوں تو جانتے ہوں گے کہ اس کیمپ کے دو حصّے ہیں۔ ایک حصّہ فلسطینی آبادی پر مشتمل تھا جو بیرک نما مکانوں میں رہتے تھے دوسرے حصّے میں شیعہ آباد تھے یہاں کے مکان پکّے تھے اور اسے 'راس دکوانہ' کہا جاتا تھا۔ جنگ شروع ہوتے ہی فلسطینیوں نے اپنا علاقہ چھوڑ دیا اور شیعہ علاقے میں آگئے۔ اس کا سبب یہ تھا کہ اس علاقے میں نہ خانے تھے پناہ گاہیں تھیں اور شیعوں کے پکّے مکانوں سے یہ ممکن تھا کہ مارونیوں اور کتائب کے خلاف جنگ کی جا سکے لیکن فلسطینیوں کی جھونپڑیاں اور بارکیں کتائب کی گولا باری کی تاب نہ لا سکتی تھیں۔ اس بنا پر ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اس علاقے میں بھی جنگ کا میدان شیعہ منطقے ہی میں گرم ہوا۔ شیعہ مرد و زن، بوڑھے اور بچّے اور ان کے رضاکار سب کے سب معرضِ خطر میں تھے۔ مختصراً یہ کہ "تل زعتر" بھی قربان ہوا اور 'نبعہ' کے مانند سازش کی قربان گاہ کی نذر ہوا۔ یعنی ممکن تھا کہ "تل زعتر" کا سقوط نہ ہو لیکن کچھ لوگ تھے جو یہ چاہتے تھے کہ "تل زعتر" برباد ہو اور اسے امیرِ شام کے مانند حضرت عثمانؓ کا کُرتہ بنا کر استعمال کریں اپنے پراپیگنڈے کو تیز کریں اور دیگر مسائل کو ہوا دیں۔

تل زعتر کا سقوط کیونکر ہوا؟

لبنان کی خانہ جنگی تین مرحلوں میں منقسم ہے[1]۔ "تل زعتر" اور 'نبعہ' اس خانہ جنگی کے دوسرے مرحلے میں مسلمانوں کے باہمی اختلافات کی بنا پر دشمن کے ہاتھ آئے۔

خانہ جنگی کے پہلے مرحلے میں، دشمن کی فوجوں نے کئی بار "تل زعتر" کا محاصرہ کیا لیکن ہر بار

[1] یہ اس وقت کی بات ہے جب ڈاکٹر چمران ابھی اس دُنیا میں موجود تھے لیکن ان کی شہادت کے بعد لبنان کی خانہ جنگی کئی اور مراحل سے گزری ہے۔ ان میں اسرائیلی فوج کا حملہ اور یاسر عرفات نیز فلسطینی فدائیوں کا بیروت سے نکلنا اور پھر یاسر عرفات کا طرابلس میں ابوموسیٰ کی سازش کا شکار ہونا اور وہاں سے فلسطینیوں کا انخلا اور پھر موجودہ حالات میں بیروت میں امل اور کتائب کی براہِ راست لڑائی اور شوف کی پہاڑیوں پر دروز ملیشیا کی جنگ آزمائی سبھی کچھ شامل ہے۔

Presented by Ziaraat.Com

سوریا کا بھاری توپ خانہ کتائب کی پوزیشنوں کی خبر لیتا رہا اور ان کی فوجوں کی پٹائی کرتا رہا اور یوں 'تل زعتر' پر براہِ راست حملے کا سدِ باب ہوتا رہا۔

لیکن خانہ جنگی کے دوسرے مرحلے میں، سوریا اور فلسطینی مزاحمت میں اختلافات رونما ہونے پر عرب حکومتوں نے دمشق میں ایک کانفرنس کی اور سوریا سے مطالبہ کیا کہ وہ اپنی فوجیں بیروت سے نکال لے اور فلسطینی مناطق سے دُور ہو جائے کہ ان دونوں کے مابین تصادم کی صورت پیدا نہ ہو۔ اس بنا پر سوریا کی فوجیں بیروت سے ہٹ گئیں اور 'بحمدون' اور 'صوفر' کی پہاڑیوں میں چلی گئیں جو بیروت کے مشرق میں ۳۵ کلومیٹر کے فاصلے پر ہیں اور جبلِ لبنان کا حصّہ ہیں۔ لیبیا کے وزیرِ اعظم جلود بھی اس کانفرنس میں موجود تھے انھوں نے بھی سوریا پر دباؤ ڈالا کہ وہ اپنی فوجیں میدانِ جنگ سے ہٹا لے۔ بائیں بازو کی جماعتیں تو اس بات کی خواہاں تھیں کہ سوریا کی فوجیں لبنان کی حدود ہی سے باہر نکل جائیں۔ ۲۳ جون ۱۹۷۶ء کو سوریا کی فوجیں بیروت سے چلی گئیں اور اسی دن کتائب نے موقع غنیمت جانا اور 'تل زعتر' پر حملہ کر دیا۔ ان کا بھاری توپخانہ ایک منٹ میں اوسطاً تین گولے 'تل زعتر' پر پھینک رہا تھا۔ کتائب کے ٹینک اور بکتر بند گاڑیاں بھی اس محاصرے میں شامل تھیں۔ یہاں تک کہ اسرائیلی ساخت کے زمین سے زمین پر مار کرنے والے راکٹ بھی اسرائیلی افسروں کی نگرانی میں 'تل زعتر' پر بارش کی طرح برس رہے تھے۔

سوریا کی فوجوں کے بیروت سے چلے جانے سے پہلے کبھی کتائب 'تل زعتر' پر حملہ کرتے تو سوریا کا بھاری توپخانہ انھیں پسپا کر دیتا تھا۔ کتائب کے توپخانے کو خاموش کر دیا کرتا تھا اور یوں 'تل زعتر' کا دفاع عمل میں آیا کرتا تھا۔ لیکن سوریا کی فوجوں کے چلے جانے کے بعد، اب یہ بھاری توپخانہ 'تل زعتر' کا دفاع نہ کر سکتا تھا اس لیے اب کتائب کو موقع مل گیا تھا کہ وہ 'تل زعتر' کو اپنے توپخانے کا نشانہ بنائیں اور اس کے بعد اس کا محاصرہ مکمل کر لیں۔

جب 'تل زعتر' کے سقوط کا خطرہ پیدا ہوا تو مزاحمت (فتح) نے فیصلہ کیا کہ مونتہ وِردی کے راستے جو 'تل زعتر' کے عقب میں واقع ہے، اس محاصرے کو توڑا جائے اور یوں 'تل زعتر' کو نجات دی جائے۔ انھوں نے 'تنظیم' امل' سے بھی تعاون کی درخواست کی۔ ہم نے اپنے بارہ آزمودہ کار جنگجوؤں کو 'فتح' کے فدائیوں کے ساتھ کیا۔ وہ ایک مدت تک 'مونتہ وِردی' میں لڑتے رہے ان میں سے چھ نفر شدید زخمی ہوئے اور ہسپتال پہنچ گئے۔ ان نوجوانوں نے اس لڑائی میں جو بہادری کے جوہر دکھائے وہ لبنان کی خانہ جنگی کے عظیم کارناموں میں شمار ہوتے ہیں۔ یہ لڑائی رونگٹے کھڑے کر دیتی تھی لیکن تمام تر کوشش کے باوجود محاصرہ نہ ٹوٹ سکا۔

سقوط کی داستان :

جنگ کے شروع ہونے کے ایک ہفتے بعد یعنی ۳۰ جون ۱۹۷۶ء کو کتائب نے 'جسر الباشا' کے کیمپ پر قبضہ کر لیا۔ یہ کیمپ 'تل زعتر' کے قریب واقع تھا۔ کتائب نے تین گھنٹے کی مدت میں اس کیمپ پر کوئی تین ہزار راکٹ برسائے تھے۔

اسی اثنا میں دشمن نے 'تل میر' پر حملہ کیا اور اس پر قبضہ کر لیا۔ 'تل میر' 'تل زعتر' کے قریب اور اس سے بلندی پر واقع تھا۔ کتائب کے بندوقچی اس بلندی پر بیٹھے تل زعتر میں ہر حرکت کرتی چیز کو اپنا نشانہ بناتے رہے۔ کسی شخص میں یہ قدرت نہ تھی کہ اس کیمپ اور اس علاقے میں چل پھر سکے۔

تل زعتر کا پانی بند ہو چکا تھا۔ لڑنے والے رضا کار پانی لینے کے لیے اس علاقے سے باہر ایک چشمے پر جاتے اور اس کوشش میں اکثر مارے جاتے۔ وہاں مشہور ہو چکا تھا کہ مٹھی بھر پانی مٹھی بھر خون سے زیادہ قیمتی ہے۔ اسی طرح اس علاقے میں روٹی اور کھانے پینے کی اشیاء بھی نایاب تھیں۔ فدائیوں کے پاس ایک گودام میں مسور موجود تھے اسی سے یہ اپنی بھوک مٹاتے۔

ان کا اسلحہ اور ذخیرہ بھی تقریباً ختم ہو چکا تھا اور کوئی شخص باہر سے کمک بھی نہیں پہنچا سکتا تھا۔ لڑنے والوں کی تعداد بھی روز بروز کم ہوتی جا رہی تھی۔ آخری دنوں میں صرف ۵۰۰ فلسطینی جنگجو باقی رہ گئے تھے۔ آخر ۵۲ روز کی مزاحمت اور جان توڑ دفاع کے بعد جس میں دشمن نے ۷۰ حملے کیے۔ ۱۲ اگست ۱۹۷۶ء کو تل زعتر کا کیمپ دشمن کے قبضے میں چلا گیا۔

اس سے دو دن پہلے یعنی ۱۰ جولائی ۱۹۷۶ء کو تل زعتر کی فلسطینی تنظیموں نے بین الاقوامی صلیبِ احمر کے ذریعے سے کتائب سے رابطہ پیدا کیا اور ہتھیار ڈالنے پر آمادگی ظاہر کی لیکن اس کا کوئی خاطر خواہ جواب نہ ملا۔

Presented by Ziaraat.Com

فلسطینی فدائیوں نے بدھ ۱۱ اگست ۱۹۷۶ء کی رات 'منصوریہ' کے قریبی علاقے پر حملہ کیا اور کوشش کی کہ محاصرہ توڑ کر تل زعتر سے نکل جائیں لیکن کتائب کی جانب سے شدید مزاحمت کی بنا پر تل زعتر میں واپس آگئے۔

جمعرات ۱۲ اگست ۱۹۷۶ء کو نصف شب کے قریب ایک متفقہ فیصلے کے مطابق ۵۰۰ کے ۵۰۰ فلسطینی فدائی دشمن کے محاصرے کو توڑنے پر قادر ہو گئے اور انھوں نے "تل زعتر" کے شمال مشرق میں 'مونت وردہ' کی پہاڑیوں میں پناہ لی۔ وہ چار دن تک ان پہاڑیوں میں پیادہ پا چلتے رہے کہ بیروت پہنچ جائیں۔ اس کوشش میں جو مقابلے ہوئے ان میں پانچ سو فلسطینی فدائیوں میں سے تین سو افراد شہید ہو گئے۔

فلسطینی فدائیوں کے چلے جانے کے بعد 'تل زعتر' عملی طور پر بلا دفاع رہ گیا تھا وہاں صرف عورتیں، بچے، بوڑھے اور وہ لوگ رہ گئے تھے جو لڑ نہ سکتے تھے اور انھیں اس بات کا علم نہ تھا کہ ان کے علاقے میں اب کوئی فدائی باقی نہیں رہا۔

ایک دن بعد یعنی جمعہ ۱۳ اگست ۱۹۷۶ء کو دشمن کی فوجوں نے 'تل زعتر' پر عام حملہ کیا اور دفاع کی عدم موجودگی میں انھوں نے وہ قتلِ عام کیا کہ معاشرے کے مختلف طبقوں اور شخصیتوں نے اس پر اعتراضات کیے آخر کار کتائب کے رہنماؤں نے عام دباؤ کے پیشِ نظر اس قتلِ عام کو بند کیا۔ اس علاقے میں باقی رہ جانے والے بارہ ہزار افراد کو صلیبِ احمر اور فوج کی گاڑیاں بیروت لے گئیں۔

یوں 'تل زعتر' کی بربادی عمل میں آئی۔

باب پانزدہم

خانہ جنگی کے دوران میں شیعوں کا مؤقف

خانہ جنگی کا دوسرا دور اس وقت شروع ہوا جب مسلمان بکھر چکے تھے اور ایک دوسرے کو مارنے میں مصروف تھے۔ دشمن نے اس موقع اور اس صورتِ حالات سے فائدہ اٹھایا اور مسلمانوں کو شکست دی۔ اُنھوں نے مسلمانوں کے دو بڑے مرکزوں یعنی 'تل زعتر' اور 'نبعہ' کو برباد کر دیا۔

خانہ جنگی کا یہ دور ایک صیہونی سازش تھا جو مسلمانوں کے ہاتھوں مکمل ہوئی۔ اگر کسی شخص نے اس برادر کشی کی تلخ حقیقت کو صحیح معنوں میں دیکھا اور اس داخلی اختلاف کے خلاف آواز بلند کی تو وہ صرف سید موسیٰ الصدر تھے جنھوں نے بے نظیر مؤقف اختیار کیا۔ یہ مؤقف صرف شیعانِ علیؑ یا وہ اشخاص اختیار کر سکتے تھے جو شہادت کو قبول کرنے پر دل و جان سے آمادہ ہوں۔

لبنان کی بائیں بازو کی جماعتیں سوریا کے صدر حافظ الاسد کو اسرائیلی ایجنٹ گردانتی تھیں اور ایک سوری سپاہی کو قتل کرنا اسرائیلی کو مارنے سے بہتر قرار دیتی تھیں۔ یہاں تک کہ انھوں نے ہر اس سوری سپاہی کی ٹانگیں جو اُن کے ہاتھ آیا، کاروں سے باندھ کر انھیں سڑکوں پر گھسیٹا کہ اُس کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے۔

لیکن سید موسیٰ الصدر کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ سوریا اور فلسطینی مزاحمت کے مابین ہر قسم کا تصادم بہت بڑی خیانت ہے۔ اس لیے ہر ممکن طریقے سے اس تصادم کا سدِّباب ہونا لازم ہے۔

جب بائیں بازو کی جماعتیں اور کمال جنبلاط بظاہر انقلاب کی حمایت میں سوریا کے خلاف اشتعال انگیز نعرے بلند کرتے تھے اور کہتے تھے کہ جو شخص سوریا کے خلاف جنگ نہ کرے وہ غدار ہے۔ اس وقت سید موسیٰ الصدر کا نعرہ یہ تھا کہ جو شخص اس جنگ کی آگ کو بھڑکائے اور اس تصادم کو ہوا دے وہ غدار ہے۔

Presented by Ziaraat.Com

بائیں بازو والوں سے تصادم ؛

اس بنا پر بائیں بازو کی جماعتوں اور تنظیمُ امل ' کے مابین بہت سے تصادم ہوئے انھوں نے مدرسہ جبلِ عامل پر حملہ کر دیا۔ اس کا میں ذکر کر چکا ہوں اسی طرح دوسرے قصبوں اور دیہات میں انھوں نے تصادم کی راہ اختیار کی اور تنظیم امل کے کارکنوں کا صفایا کرنے کی کوششیں کیں۔ ان میں سے بعض کا ذکر میں کر چکا ہوں اس وقت بطور نمونہ چند ایک کا مزید بیان کرتا ہوں۔

اصل میں بائیں بازو کے تنظیمُ امل ' کے کارکنوں پر حملے بہت پہلے شروع ہو چکے تھے حالانکہ 'حرکت المحرومین' اور 'حرکۃ الامل' کا 'فتح' کی تنظیم سے بہت گہرا تعاون اور رابطہ تھا۔ اور 'فتح' کی اعلیٰ قیادت ہمیشہ سید موسیٰ الصدر سے مدد حاصل کیا کرتی تھی جو فلسطینی مزاحمت کی مکمل حمایت کرتے تھے۔ پھر یہ بھی تھا کہ بائیں بازو کی وہ جماعتیں جو کتائب سے جنگ آزما تھیں تنظیمِ امل' ان سے مکمل تعاون کرتی تھی اور تقریباً ایک سال تک وہ 'فتح' کے ساتھ مل کر بائیں بازو والوں کے جلسوں اور کانفرنسوں میں شریک ہوتی تھی۔ ہم بائیں بازو والوں کی تمام عداوتوں اور دشمنیوں کو دیکھتے تھے اور خاموش رہتے تھے گویا ہم نے کچھ دیکھا ہی نہیں تاکہ مسلمانوں کی صفوں میں انتشار واقع نہ ہو اور لوگ یہ نہ کہیں کہ شیعوں نے گڑبڑ کی۔ یہاں تک کہ وہ دن آیا جب بائیں بازو والوں نے کمال جنبلاط کی راہنمائی میں جنوبی لبنان میں مقامی حکومت کی بنا ڈالی جو خود ان کے قول کے مطابق لبنان کی آزاد شدہ سرزمین پر قومی حکومت تھی۔ یہ بات بذاتِ خود لبنان کی تقسیم کے مترادف تھی[1]

انتہا پسند عیسائیوں نے اپنے طور پر ایک مقامی حکومت بنا ڈالی۔ بائیں بازو کے انتہا پسند گروہوں نے انھیں عیسائیوں کی تقلید کی تھی گویا دونوں میں اس معاملے میں اتفاقِ رائے تھا اور وہ ایک ہی گھاٹ سے پانی پیتے تھے اور تقسیمِ لبنان کے لیے راہ ہموار کر رہے تھے۔ لبنان کی تقسیم کی صورت میں شمالی لبنان میں ایک نیا اسرائیل وجود میں آجاتا جس کی پشت پناہی تمام دنیائے عیسائیت کرتی اور جنوبی لبنان میں رُوس کے زیرِ سایہ بائیں بازو کی ایک حکومت تشکیل پاتی جو

[1] لبنان کے حالات کے تجزیے میں اس کا تفصیلی ذکر ہو چکا ہے۔

استعماری نقطۂ نظر سے شمالی لبنان کی مارونی حکومت کے مشابہ ہوتی۔ اس بات کا امکان بھی تھا کہ اسرائیل لبنان پر حملہ کر کے جنوبی لبنان پر قبضہ کر لے اور یوں جنوبی لوگ لبنان کے لوگ یا اسرائیل کے تسلط میں آجاتے یا روس کے۔ اسی بنا پر سیّد موسیٰ الصدر تقسیم لبنان کے مخالف تھے لیکن ان کے تمام اعتراضات صدا بصحرا ثابت ہوئے اس پر انھوں نے حکم دیا کہ حرکت المحرومین کا نمایندہ بائیں بازو کے جلسوں میں شرکت نہ کرے۔ یہ آغاز تھا سیّد موسیٰ الصدر پر بائیں بازو والوں کے حملوں کا اور الزام تراشیوں کا (اور یہ واقعہ سوریا کی فوجوں کی امداد، 'نبعہ' کے سقوط سے پہلے کا ہے)۔

فلسطینی مزاحمت 'فتح' بھی لبنان کی تقسیم کی مخالفت کرتی تھی کیونکہ اس صورت میں اسرائیل جنوبی لبنان پر حملہ کر کے فلسطینی مزاحمت کو ختم کر دیتا۔ اسی لیے فتح نے بھی سیّد موسیٰ الصدر کے مانند تقسیمِ لبنان کی تجویز پر اعتراض کیا لیکن ان کی بات بھی کسی نے نہ سُنی۔ یہاں تک کہ لبنان کی عرب فوج نے بھی جو احمد الخطیب کی کمان میں بنی تھی، بائیں بازو کی مقامی حکومت پر اعتراض کیا لیکن اس کا بھی کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ کمال جنبلاط نے اپنے طور پر ایک مقامی فوج بنا ڈالی تھی اور شہری آبادی کے لیے ایک عوامی پولیس تشکیل دی تھی جس کا کام لوگوں پر رعب ڈالنا، لُوٹ مار کرنا اور بے عزتی کرنا تھا۔ پُورے ملک کے انتظام کے لیے ایک 'مکتب سیاسی' POLITICAL SCHOOL بنا لیا گیا تھا جس میں بائیں بازو کی پارٹیوں کے نمائندے شریک تھے۔ یہ مکتب سیاسی یا پولیٹکل بیورو اپنی سمجھ بوجھ کے مطابق قانون بناتا اور ان کو نافذ کرتا۔ اب ہوا یہ کہ پٹرول، بجلی، روٹی، پانی، سڑکیں، ٹیلیفون اور اسی نوع کی دیگر اشیاء جنبلاط اور سیاسی پارٹیوں کے ہاتھ میں آگئیں۔ جو شخص ان بائیں بازو والوں کا ہم نوا نہ ہوتا وہ روٹی نہ لے سکتا، اسے پٹرول نہ ملتا وہ شہری حقوق سے محروم ہوتا۔ یکبارگی پٹرول کی قیمت ساڑھے سات لیرے (تقریباً ۲۴ روپے) سے بڑھ کر ۱۵۰ یا ۲۰۰ لیرے تک جا پہنچی۔ روٹی بالکل نایاب ہو گئی تھی۔ امن و امان غائب ہو چکا تھا۔ عوام کی ناموس بڑی آسانی سے لُوٹی جاتی اور انسانی جان کی اہمیت مکھی سے زیادہ نہ تھی۔ لوگوں کا مال و متاع پارٹی کے ارکان کے لیے مباح ہو چکا تھا۔ ایک ایسا جہنم وجود میں آ چکا تھا جس کی مثال تاریخ میں نہ ملتی تھی۔

Presented by Ziaraat.Com

کامیاب ہو چکے ہیں اور اس خیال میں مگن تھے کہ اب بات ختم ہو چکی ہے اس لیے اب انھوں نے اپنے مخالفین کا صفایا کرنے کی ٹھان لی - ان بائیں بازو والوں کے حساب میں مخالفین صرف سیّد موسیٰ الصدر اور حرکت المحرومین کے ارکان تھے - 'حرکت المحرومین' یا 'تنظیم 'امل' کا کوئی نوجوان اگر سڑک پر دکھائی دیتا تو گولی کا نشانہ بن جاتا - رات کے وقت 'حرکت المحرومین' کے ارکان کے گھروں پر حملے ہوتے، انھیں پکڑ کر مارا پیٹا جاتا اور قید خانے میں بھیج دیا جاتا اور ان کا مال و اسباب لُوٹ لیا جاتا۔ 'حرکت المحرومین' کے کارکن البتہ روپوش ہو گئے کیونکہ ان کا قتل لازمی امر تھا۔ یہ لُوٹ مار اور پکڑ دھکڑ کی بات ان سیدھے سادے لوگوں سے تعلق رکھتی ہے جو 'حرکت المحرومین' کے طرفدار تھے 'ربیر زہرانی' میں رمضان کے ایام میں کوئی ۲۵- افراد نماز ادا کر کے مسجد سے لَوٹ رہے تھے کہ 'عوامی پولیس' کے افراد نے جن کی اکثریت کمیونسٹ تھی ان کو پکڑ کر خوب مارا پیٹا اور پھر قید خانے میں ڈال دیا۔ ان میں سے ۶- افراد کئی دن تک ہسپتال میں پڑے رہے - اسی طرح 'نبطیہ' کے قریب 'زبدین' میں کمیونسٹوں نے چند جوانوں پر حملہ کر کے ان میں سے پانچ کو گرفتار کر لیا اور مار مار کر ادھ مؤا کر دیا۔ اور پھر قید میں ڈال دیا۔ ان کا جرم صرف یہ تھا کہ وہ نماز پڑھتے تھے۔ 'نبطیہ' کے شہر میں جو بائیں بازو والوں کا بہت بڑا مرکز تھا مومنین پر بار بار حملے ہوئے - ہر شخص جو مسجد میں جاتا تھا ان کی نگاہ میں مشکوک تھا وہ گرفتار کر لیا جاتا اور خوب زدوکوب کا شکار ہونے کے بعد قید خانے میں ڈال دیا جاتا - اگر میں ان بائیں بازو والوں کی زیادتیوں کی مثالیں بیان کرنا شروع کر دوں تو میرے لیے لازم ہوگا کہ میں اس خانہ جنگی کے پورے ایک سال کے واقعات از سرِ نو بیان کروں جن میں ہونے والے جرائم و شنائع کی داستان تاریخ میں اپنی مثال نہیں رکھتی -

افسوس کی بات یہ ہے کہ 'فتح' میں شامل بائیں بازو کے رجحانات رکھنے والے لوگ بھی ان پارٹیوں سے تعاون کرتے تھے اور ان پارٹیوں کے افراد فلسطینی مزاحمت کے اسلحے اور اس کے پاکیزہ مقاصد سے غلط فائدہ اٹھاتے تھے اور لوگوں کو اپنے تعصبات کا نشانہ بناتے تھے - اگر یہ بائیں بازو کی جماعتیں الگ ہوتیں اور فلسطینی مزاحمت (فتح) مداخلت نہ کرتی تو چند ہی دنوں میں ہمارے نوجوان انھیں سیدھا کر دیتے - ہر گاؤں میں اگر دو کمیونسٹ تھے تو ان کے مقابلے میں حرکت المحرومین اور تنظیم 'امل' کے کم از کم پچاس سرگرم کارکن بھی موجود تھے، لیکن سید موسیٰ الصدر نے حکم دے رکھا

تھا کہ فلسطینی مزاحمت پر تلوار نہ اٹھائی جائے مگر یہ بائیں بازو کی پارٹیاں اس حکم سے فائدہ اُٹھا کر 'مزاحمت' کے اسلحے سے ہمیں مارتی تھیں اور ہمیں لازم تھا کہ ہم خاموش رہیں، صبر کریں - ہمارے نوجوان موت کے گھاٹ اُتر جاتے تھے اور ہم اپنے ہتھیار استعمال نہ کرتے تھے -

الضار کے قصبے پر حملہ :

'الضار' کا قصبہ 'نبطیہ' کے منطقے میں واقع ہے اور کمیونسٹ کا بہت بڑا گڑھ تھا - وہاں کم از کم ۷۰ مسلح افراد ہر وقت موجود رہتے تھے - ہمارے پاس صرف ۱۴ عدد چھوٹی مشین گنیں تھیں - ہمارے جوانوں نے ایک طویل مدت تک کمیونسٹ پارٹی اور اس کے ہمنواؤں کے سیاسی، فوجی اور نفسیاتی دباؤ کا مقابلہ کیا - آخرکار 'نبطیہ' میں 'فتح' کے انچارج 'سعید' نے جو کمیونسٹ تھا 'الضار' میں 'تنظیم 'امل' کے انچارج کو بُلا بھیجا۔

چونکہ ہمارے اور 'فتح' کے مابین تعاون کا رشتہ تھا اس لیے 'تنظیم 'امل' کا انچارج 'نبطیہ' گیا تاکہ 'سعید' سے ملے - لیکن یہ دھوکا تھا اور مقصد یہ تھا کہ اسے 'نبطیہ' میں روک لیں اور واپس 'الضار' نہ جانے دیں - اسی اثنا میں ۲۰۰- افراد نے جن کا تعلق کمیونسٹ پارٹی اور دوسری انتہاپسند جماعتوں سے تھا 'الضار' پر حملہ کر دیا - ہمارے نوجوانوں نے ان کا مقابلہ کیا اور ان کے تین افراد کو مار گرایا لیکن حملہ آوروں نے اس مکان کو جس میں 'تنظیم 'امل' کے نوجوان موجود تھے ۷۵ ملی میٹر کی توپ آر- پی جی کی مدد سے اُڑا دیا اور 'دوشکا' کی مدد سے ہمارے نوجوانوں کی مدافعت کو درہم برہم کر دیا - ان نوجوانوں نے 'الضار' سے نکل کر ایک نزدیکی قصبے 'خرائب' میں پناہ لی - حملہ آوروں نے 'امل' کے نوجوانوں کے گھروں کو برباد کر دیا - اسی لیے 'تنظیم 'امل' کے انچارج کے گھر کو لُوٹنے اور دو ٹرک اپنے قبضے میں کرنے کے بعد 'تنظیم 'امل' کے انچارج کے ۷۵ سالہ بوڑھے باپ کو پکڑ لیا، اور خوب زدوکوب کیا، وہ تو اُسے گولی سے اُڑانے لگے تھے لیکن گھر کی عورتوں اور بچوں نے اپنے آپ کو اس پر گرا دیا اور یوں اسے موت کے منہ میں جانے سے بچایا - یہ بُوڑھا بےچارہ اپنے زخمی سر کو لیے کئی دن تک ہسپتال میں پڑا رہا - اسی طرح حملہ آوروں نے ایک اور شخص 'طاہر' کے گھر پر جبکہ وہ موجود نہ تھا ان ظالموں نے اس کی بیوی کو اس کے ۱۲ بچوں کے سامنے مار ڈالا، گاؤں کا

Presented by Ziaraat.Com

مختار المصری، سراسیمہ ہو کر بازار میں گیا اور وہاں صدائے احتجاج بلند کی۔ لیکن اسے بھی گولیوں سے بھون ڈالا گیا۔ اس کی عبا میں آٹھ سوراخ ہوئے تھے۔ لیکن اتفاق اور معجزہ تھا کہ اس کے باوجود زندہ رہا۔ حملہ آوروں نے تین افراد کو گرفتار کر لیا اور شہر سے چلے گئے۔ اس کے بعد انھوں نے 'انصار' کے امام باڑے میں بائیں بازو کی جماعتوں کے ساتھ مل کر میٹنگ کی اور ایک بیان جاری کیا جس میں مطالبہ کیا گیا تھا کہ:

۱۔ حرکت المحرومین کے افراد سید موسیٰ الصدر سے قطع تعلق کر لیں اور ان کے خلاف بیان دیں۔

۲۔ اپنا تمام اسلحہ حملہ آوروں کے حوالے کر دیں۔

۳۔ بائیں بازو کے ساتھ مل کر جبل لبنان کے علاقے میں سوریا کے خلاف لڑیں۔

اور اگر ان باتوں کو نہ مانا گیا تو ان کے پورے کے پورے خاندانوں کو تباہ کر دیا جائے گا۔

یہ عجیب و غریب الٹی میٹم ہمیں ملا۔ میں نے خرائب کے قصبے میں تنظیم امل کے عہدے داروں سے ملاقات کی تاکہ الٹی میٹم کا جواب تیار کیا جائے یہاں مختلف قسم کی رائیں ظاہر کی گئی تھیں لیکن ہر شخص خوف وہراس کا شکار تھا یہاں تک کہ کچھ سید موسیٰ الصدر کے خلاف بیان لکھنے پر بھی آمادہ ہو گئے تھے۔

ایسے لمحے حساس لمحے جن میں آیندہ کی تاریخ کا رخ معین ہو جاتا ہے مختلف زمانوں میں اور مختلف مواقع پر تمام لوگوں کی زندگیوں میں آتے ہیں۔ اور اس وقت فیصلے تک پہنچنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ لیکن اس لمحے میں ایک بات انسان کی مدد کرتی ہے اور وہ زندگی سے کھیل جانا اور ہر قسم کی قربانی کے لیے تیار رہنا ہے۔ اس خوف وہراس و تردد کے مرحلے میں دوستوں کے لیے میرا جواب بڑا واضح اور صریح تھا اور وہ یہ کہ امام حسین علیہ السلام کے پیغام کو اپنا کر منزل شہادت تک پہنچنا لازم ہے اس بات کو ہر شخص نے قبول کر لیا۔ فوری طور پر ایسے گروہ تیار ہوئے جو جان پر کھیل کر انصار کے قصبے پر حملہ کرنے پر تل گئے۔ نہایت جلدی تنظیم امل کے بہترین فداکاروں کو دو ٹرکوں میں جانے کیلئے تیار کیا۔ انہوں نے تاریکی شب سے فائدہ اٹھا پورے قصبے کا ایک چکر لگا یا وہ لوگ اندازہ نہ کر سکے کہ ہمارے نوجوانوں کی تعداد کتنی ہے۔ اس لیے وہ ڈر کے مارے قصبے سے فرار کر گئے۔ اس پر میں امل کے عہدے داروں کے ہمراہ اسی آدھی رات کو ابو موسیٰ کی تلاش میں نکلا جو اس وقت جنوبی

لبنان میں فتح کا کمانڈر تھا۔ ہم جب اس کے پاس پہنچے تو وہ فتح کے دوسرے افسروں کے ہمراہ میٹنگ میں تھا۔ ہم نے اسے بتایا کہ انصار پہ حملہ ہوا اور ہمیں الٹی میٹم ملا ہے اس وقت پتا چلا کہ اسے سب باتوں کا علم تھا اور تمام کام اس کی مرضی سے ہوا ہے۔ اس نے بڑی بے مروتی اور ڈھٹائی سے کہا کہ "اگر زندہ رہنا چاہتے ہو تو تمہیں سید موسیٰ الصدر کے خلاف بیان جاری کرنا ہوگا اور بائیں بازو کی پارٹیوں کے ساتھ تعاون کرنا ہوگا۔"

ذرا تصور تو فرمایئے کہ یہ ابو موسیٰ جنوبی لبنان میں تمام فلسطینی فوجی گروہوں کا کمانڈر تھا۔ فلسطینی مزاحمت سب سے قوی تنظیم تھی اور تمام جنوبی لبنان میں اس کے مرکز موجود تھے علاوہ ازیں بائیں بازو کی تمام پارٹیوں اور ان فوجی دستوں کی کمان بھی اسی ابو موسیٰ کے سپرد تھی۔ اس اعتبار سے وہ جنوبی لبنان کا سب سے طاقتور کمانڈر تھا۔ پھر یہ ابو موسیٰ 'ابو صالح' کا نمائندہ بھی تھا جو خود کمیونسٹ تھا اور فتح کی مرکزی کمیٹی کا رکن تھا۔ یہ ابو موسیٰ اپنی تمام تر طاقت اور اثر ونفوذ کے باوجود اس بات کا خواہاں تھا کہ سید موسیٰ الصدر کو زک پہنچائے اور حرکت المحرومین کے نوجوانوں کو ان سے الگ کروا دے اور اس کے خیال میں جو لوگ بھی اپنے پاؤں پر کھڑے ہیں انہیں نیست و نابود کر دے۔ یہ وہی ابو موسیٰ تھا جس نے صور کے شہر اسید موسیٰ الصدر کے مرکز میں ان کے عمامے اور عبا کے بارے میں ناشائستہ کلمات کہے تھے اور ان پر ذاتی حملوں کا راستہ کھولا تھا۔

میں ان دنوں یہ خیال کرتا تھا کہ زندگی کے آخری لمحات گزار رہا ہوں اس لیے میں نے یہ پسند نہ کیا کہ مغرور کمانڈر کے سامنے خاموش ہو جاؤں۔ لہٰذا بڑی شدید اور غیر متوقع بات چیت شروع ہو گئی۔ اسے اس بات پر حیرت ہو رہی تھی کہ اس قدر دباؤ اور خطرات کے باوجود میں اس سے اس قدر تیز کلامی سے کام لے رہا تھا میں نے نہایت سختی سے اس سے دریافت کیا "تم اپنے لیڈروں یاسر عرفات اور ابو جہاد کے احکام کی خلاف ورزی کرنے کی جرأت کیسے کرتے ہو؟" اور خصوصاً اس صورت میں کہ یاسر عرفات اور ابو جہاد دونوں سید موسیٰ الصدر کے ہم نوا ہیں اور تم جنوبی لبنان میں سید موسیٰ کے خلاف لوگوں کو اکساتے ہو اور اپنے لیڈروں کے احکام کو اپنے پاؤں تلے روندتے ہو" میں نے دیکھا کہ وہ مسکرا مسکرا کر اور طنزیہ انداز سے جواب دینے سے گریز کر رہا ہے۔ میں نے اس سے کہا "ابھی ایک ماہ نہیں گزرا کہ تم اور جنوبی لبنان میں فتح کے دوسرے بڑے عہدے دار

Presented by Ziaraat.Com

اپنے لیڈروں کے دباؤ کے تحت میرے کمرے میں بیٹھے اپنی پرانی حرکتوں پر ندامت کا اظہار کر رہے تھے اور معذرت خواہ تھے۔ اس وقت تم نے ہمارے ساتھ مکمل تعاون کے قول قرار کیے تھے اب کیا ہوا ہے کہ تم نے ایک بار پھر سید الصدر کے خلاف یہ حرکتیں شروع کر دی ہیں، اور حرکت المحرومین کے نوجوانوں پر یوں دباؤ ڈال رہے ہو؛ مختصر یہ کہ اس پر اتمام حجت کرتے ہوئے کہا: "جنوبی لبنان سارا تمہارے خلاف تھا۔ لیکن سید موسیٰ الصدرؒ نے دن رات محنت کر کے انھیں فلسطینی مزاحمت کا طرف دار بنایا لیکن اگر سید الصدر کے خلاف تمہاری حرکتیں جاری ہیں۔ تو جنوبی لبنان کے لوگ اپنی رائے بدل دیں گے اور اس کی ذمہ داری تم پر ہو گی؛ یہ بات سن کر اس نے بڑے غرور اور تمسخر سے کہا: "تم سید موسیٰ کے بارے میں بڑی باتیں کرتے ہو۔ ہم ہر گاؤں میں ۱۲ سید موسیٰ پیدا کر دیں گے۔" اس قسم کے تکبر اور غرور نے فلسطینی مزاحمت کو زبردست نقصان پہنچایا اور آج لبنان کے لوگ فلسطینیوں کو کچھ زیادہ پسند نہیں کرتے[1]

بہر حال ہماری بات چیت طرفین کے درمیان مزید تلخی کا باعث ہوئی اور ختم ہو گئی۔ پھر بھی ہم اتمام حجت کی خاطر نصف شب کے بعد یاسر عرفات اور ابو جہاد کی تلاش میں نکلے۔ ابو جہاد کیفون میں کمرہ عملیات (Operation Room) میں تھے جہاں وہ گولوں کی بارش میں فتح کے دوسرے افسروں کے ہمراہ جنگ جبل میں ہدایات دے رہے تھے انھوں نے بڑی گرم جوشی کے ساتھ ہمارا استقبال کیا اور تمام حالات سے آگاہ ہو کر سخت ناراض ہوئے انھوں نے ابو موسیٰ، سعید اور جنوبی لبنان میں فلسطینی مزاحمت کے بڑے عہدے داروں کو برا بھلا کہا، اسی وقت وائرلیس کے ذریعے سے جنوبی لبنان کے تمام ذمہ دار افسروں سے رابطہ پیدا کیا اور بڑے سخت احکام صادر کیے۔ نبطیہ میں فلسطینی مزاحمت کے کمانڈر سعید کے نام شدید لہجے کا خط لکھوایا اور اسے ان تمام حرکات کا ذمے دار قرار دیا۔ اسی طرح جورج حبش (الجبھۃ الشعبیۃ) جورج

[1] ڈاکٹر مصطفیٰ چمران کی ان باتوں کو بعد کے واقعات نے ثابت کر دیا۔ یاسر عرفات اور فلسطینی فدائیوں کا بیروت سے انخلاء اور پھر طرابلس میں یاسر عرفات کا محاصرہ اور بالآخر ان کا وہاں سے انخلاء اور اسی دوران میں بیروت اور طرابلس کے مسلمانوں کی خاموشی کے اسباب میں ایک سبب یہی غرور و تکبر ہے جو فلسطینی فدائیوں میں پیدا ہو گیا تھا۔ اور اس کا سب سے بڑا محرک جورج حبش، نائف حواتمہ احمد جبریل، اور ابو موسیٰ ایسے اشخاص کی غلط پالیسیاں تھیں۔

حادی (کمیونسٹ پارٹی) احمد جبریل القیادۃ العامۃ اور نایف حواتمہ (الجبھۃ الشعبیۃ الدیموقراطیۃ) سے رابطہ پیدا کیا اور ان سے مطالبہ کیا کہ صبح ۷ بجے تک بائیں بازو کے تمام دستے انصار کے قصبے سے نکل جائیں۔ ابو جہاد نے یاسر عرفات سے بھی بات چیت کی انھیں تمام حالات سے آگاہ کیا اور مجھے کہا کہ ابو موسیٰ پر مزید دباؤ ڈالنے کے لیے لازم ہے کہ تم خود یاسر عرفات سے بات کرو تاکہ وہ ابو موسیٰ کو سیدھا کر سکیں۔ آخر کار کیفون سے ہم لوگ یاسر عرفات کے ہیڈکوارٹر میں جو بیروت میں تھا، پہنچے وہ بھی اس وقت اپنے افسروں کے ساتھ میٹنگ میں تھے۔ انہوں نے بھی بڑے سخت احکام صادر کیے تاکہ بائیں بازو کے عناصر کی خراب کاریوں کا سد باب ہو سکے۔

ان باتوں سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ فلسطینی مزاحمت کے رہنما کوشش کرتے ہیں کہ بائیں بازو کے عناصر کو لگام ڈالیں لیکن وہ لوگ بحرانی مواقع سے فائدہ اٹھا کر من مانی کارروائیاں کرتے ہیں اور مزاحمت کے رہبروں کی خواہشوں کے برعکس مارکسیوں اور کمیونسٹوں کی خاطر تخریب کاری میں لگ جاتے ہیں۔

قبریخا کا حادثہ

ایک اور نمونہ بطور مثال پیش کرتا ہوں۔ کچھ مدت قبل جنوبی لبنان کے ایک مارکسی کمانڈر نے جس کا نام نور تھا۔ اور جو ایک منطقے کی کمان سنبھالے ہوئے تھا، یہ منصوبہ بنایا کہ "قبریخا" کے قصبے میں حزب العمل الشیوعی (کمیونسٹ مزدور پارٹی) کا جو لبنان کی کمیونسٹ پارٹی کی ایک شاخ ہے ایک مرکز کھولا جائے۔ "قبریخا" ایک چھوٹا سا قصبہ ہے اور یہاں کے لوگ بڑے دین دار واقع ہوئے ہیں۔ یہاں حرکت المحرومین کے جوانوں کی طاقت بے حد زیادہ ہے اور بائیں بازو کے کارکنوں کی تعداد نہ ہونے کے برابر ہے۔

حرکت المحرومین کے انچارج نے فتح کے افسر انچارج سے کہا کہ ہمارے درمیان باہمی تفاہم موجود ہے اگر آپ چاہتے ہیں کہ یہاں حزب العمل الشیوعی کا مرکز قائم ہو تو ہم اپنے تمام احکامات آپ کے سپرد کرتے ہیں۔ لیکن ہمیں سبب بتا دیجیے۔ جس کی بنا پر آپ اس قصبے میں کمیونسٹ پارٹی کا مرکز کھولنا چاہتے ہیں۔ نور نے بڑی شد و مد سے کہا کہ میں چاہتا ہوں کہ یہ مرکز یہاں قائم ہو

Presented by Ziaraat.Com

اگر یہاں کچھ گڑبڑ ہوئی تو تم اس کے ذمہ دار ہو گے۔ اس مرکز کے خلاف قصبے میں مظاہرے ہونا شروع ہوئے یہاں تک کہ عورتیں اور بچے بھی ان میں شریک ہونے لگے، ایک دن حزب العمل الشیوعی کے مسلح کارکنوں نے حرکت المحرومین کے دو جوانوں کو اور حرکت کے اس انچارج کو پکڑ لیا ان کو مارا پیٹا اور مرکز کے ایک کمرے میں بند کر دیا۔ قصبے میں غیظ و غضب کی ایک لہر دوڑ گئی۔ اس قصبے کے امام مسجد نے اپنی عبا میں ایک دستی مشین گن چھپائی اور مرکز میں چلے آئے وہاں انھوں نے مشین گن نکالی اور مرکز میں موجود تمام اشخاص کو ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دیا۔ انھوں نے ان تینوں اسیروں کو چھڑایا اور خود چلے آئے۔ شہر کے لوگوں نے مرکز پر پتھر پھینکنا شروع کر دیئے۔ یہاں تک کہ "جیش لبنان العربی" نے جو "فتح" کے زیر اثر تشکیل ہوئی تھی۔ اعلان کیا کہ وہ مرکز کو توپ سے اڑا دیں گے جب فتح کے قائدین کو اس بات کی خبر ہوئی تو انھوں نے حکم دیا کہ انور کے حکم کے باوجود اس مرکز کو بند کر دیا جائے۔ اب یہ قصبہ نہ صرف یہ کہ بائیں بازو کی پارٹیوں کو قریب نہیں پھٹکنے دیتا بلکہ وہ فتح سے بھی چنداں خوش نہیں۔

بائیں بازو کی پارٹیوں سے سب سے بڑا خطرہ یہ تھا کہ یہ لوگ فلسطینی مزاحمت کے کندھے پر سوار ہو کر اس کا اسلحہ حاصل کر کے اور اس کا نام لے کر اپنی اپنی پارٹی کے مفاد کے لیے کام کریں گے اور یوں فلسطینی مزاحمت کے پاکیزہ نام کو خراب کر کے ان پارٹیوں کے مانند بنا ڈالیں گے جن کا نہ نام کوئی تھا اور نہ ہے۔

سید موسیٰ الصدر کے قتل کی سازش

ان سازشوں کا جائزہ لینے پر جو دشمنوں نے کی تھیں اور ان نتائج کی بنا پر جو ان سے حاصل ہوئے تھے۔ انھوں نے یہ محسوس کیا کہ ان کے مقابل میں اہم ترین عوامل جو لبنان میں ان کی سازشوں کو ملیامیٹ کر دیتے ہیں، سید موسیٰ الصدر اور حرکت المحرومین کے جوان ہیں یہ دشمن اس بات کو جان چکے تھے کہ سید موسیٰ الصدر اور اس قسم کے جوانوں کی موجودگی میں یہ ممکن نہیں کہ وہ جنوبی لبنان کو ہڑپ کر سکیں۔ لبنان کی تقسیم کر سکیں۔ اور یوں اپنے مقاصد کو حاصل کر سکیں۔ اس وقت ایک بڑی سازش تیار ہوئی اور ان لوگوں نے فیصلہ کیا کہ اس بزرگ شخصیت کو ختم کر دیا جائے۔ دائیں

اور بائیں بازو کی جماعتوں نے چار بار کوشش کی کہ سید موسیٰ الصدر کو قتل کروا دیں۔

یہاں ایک اساسی نکتہ قابل توجہ ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ عیسائیوں کے برخلاف بائیں بازو کی جماعتیں سید موسیٰ الصدر کے خلاف نہ تھیں لیکن جب سید الصدر نے حرکت المحرومین اور تنظیم امل کی صورت میں شیعہ نوجوانوں کو منظم کرنا شروع کیا اور خصوصاً جب انھوں نے ان نوجوانوں کو فوجی اور جنگی تربیت کی جانب مائل کرنا شروع کیا تو پھر دائیں اور بائیں بازو کی جماعتیں دونوں ان کی مخالف ہو گئیں۔ اور انھوں نے سمجھ لیا کہ سید موسیٰ الصدر کوئی مذاق نہیں کر رہے بلکہ وہ تو ایک فکری تنظیم اور ایک گہری آئیڈیالوجی کے ساتھ ایک ایسی عسکری قوت بنانے پر تلے ہوئے ہیں جو ان کی سیاسی زندگی کو درہم برہم کر دے گی لہٰذا ان کی دشمنی، تہمت تراشی، اذیت اور دہشت پسندی نے سر اٹھایا۔ لبنان میں خانہ جنگی کے دوسرے مرحلے کی ابتداء سے ذرا پہلے لبنان کی کمیونسٹ پارٹی نے بنت جبیل میں ایک خفیہ جلسہ کیا جس میں سید موسیٰ صدر زیر بحث آئے۔ اس میں کہا گیا کہ ہماری پارٹی کے لیے موسیٰ الصدر اسرائیل سے زیادہ خطرناک ہے۔ اس لیے اس کا صفایا ہونا چاہیئے، لیکن ابھی اس کا موقع نہیں۔ ہمیں موقع کا انتظار کرنا چاہیئے۔ اور پہلی فرصت میں سید الصدر کا خاتمہ کر دینا چاہیئے یہ منحوس موقع انھیں ملا اور سید موسیٰ الصدر کی زندگی پر بار بار حملے ہوئے لیکن خدا کی مرضی یہ تھی کہ ان کی نگہبانی کرے۔

زیادہ تعجب خیز چیز یہ ہے کہ ایک بار انھیں نے چند شیعہ نوجوانوں کو اپنے فریب کا شکار بنایا۔ یہ ان نوجوانوں میں سے تھے جو ابھی تک الجبہۃ الشعبیۃ اور کمیونسٹ پارٹی میں شریک تھے۔ ان نوجوانوں کو بھیجا گیا کہ وہ سید موسیٰ الصدر کو مار دیں۔ وہ سڑک پر ایک کمین گاہ میں آر۔ پی۔ جی (ٹینک شکن) اور دیگر اسلحے سے لیس انتظار میں رہے کہ سید الصدر کی گاڑی آئے اور یہ اسے اڑا دیں لیکن مشیت ایزدی کچھ اور چاہتی تھی۔ سید الصدر کی گاڑی معینہ وقت سے پہلے گذر گئی تھی۔ یہ لوگ کافی دیر تک انتظار کرتے رہے۔ لیکن مطلوبہ گاڑی انھیں نظر نہ آئی۔ انتظار کی ان ساعتوں میں ان شیعہ نوجوانوں نے سوچنا شروع کیا کہ وہ کسے مارنے آئے ہیں، کسے اپنا نشانہ بنانا چاہتے ہیں۔ اور کس شخص نے انھیں بھیجا آپ جانتے ہیں کہ انھیں کس شخص نے بھیجا تھا؟ جورج حبش نے جو ایک عیسائی کمیونسٹ یا کمیونسٹ عیسائی ہے۔ اور الجبہۃ الشعبیۃ کا سربراہ ہے لے

(حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

Presented by Ziaraat.Com

اس شخص نے اور اس کی جماعت نے ان شیعہ نوجوانوں کو اپنا اجیر بنایا تھا۔ انھیں خریدا تھا، تاکہ وہ جاکر اپنے ہی لیڈر کو قتل کر دیں۔ اس لیڈر کو قتل کر دیں جس نے ان کے لیے اتنی تکلیفیں اٹھائیں اور اتنا کام کیا۔ ان نوجوانوں میں سے ایک جوان پلٹ گیا اور خود سے کہنے لگا کہ یہ ہم کیا کام کرنے آئے ہیں، اپنے شیعہ لیڈر کو ماردیں اور ایک عیسائی کمیونسٹ کی خاطر اپنے ہاتھوں سے ماریں۔ کون سی منطق اس بات کو قبول کرتی ہے۔ یہ نوجوان بدل گیا اور اس نے اپنے آپ کو امل کے کارکنوں تک پہنچایا اور ان سے سارا قصہ بیان کر دیا۔ امل کے کارکنوں نے اس علاقے کا محاصرہ کر لیا اور باقی ماندہ جوانوں کو گرفتار کر لیا۔ ان لوگوں نے بھی اعتراف کیا کہ وہ سید الصدر کو قتل کرنے کے لیے کمین گاہ میں بیٹھے ہوئے تھے۔ یہ لوگ کون تھے۔ الجبہہ الشعبیہ کے رکن جس کا سربراہ جورج حبش تھا۔

یہی وہ لوگ ہیں جنھوں نے ایران میں فدائینِ خلق جماعت کے تیجا یہ ماروں کو تربیت دی جن کی ان کے ساتھ ملی بھگت ہے، بڑا نزدیکی تعاون ہے۔ ایران میں جس قسم کی سازشیں انھوں نے انقلابِ اسلامی کے خلاف کی ہیں، اور جس قسم کے کارہائے بد شیعوں کے خلاف ان کے عقیدے کے خلاف اور ان کی آئیڈیالوجی کے خلاف سرانجام دیئے ہیں وہ اسی الجبہہ الشعبیہ کی تعلیم کا نتیجہ ہیں۔

ان نوجوانوں کو گرفتار کر کے سید موسیٰ الصدر کے سامنے پیش کیا گیا۔ انھوں نے حکم دیا کہ انھیں آزاد کر دو کیونکہ وہ جانتے تھے کہ ان کو ورغلایا گیا ہے۔ یہ بدنصیب لوگ ہیں جو بائیں بازو کی جماعتوں کے غلام بن چکے ہیں، ان کے اسیر ہیں، ان میں سے جو نوجوان بدل گیا تھا وہ تنظیم امل میں شریک ہو گیا اور بنت جبیل کے علاقے میں بڑے اچھے عہدے پر کام کرتا رہا، میں کافی دنوں تک بنت جبیل میں اس کے ہمراہ رہا۔ میں یہ دیکھتا تھا کہ وہ اپنے ماضی سے کس قدر ناخوش تھا اور کس شوق اور کس جذبے سے وہ تنظیم امل میں کام کرتا تھا، لڑتا تھا، قربانی کے جذبے کا اظہار کرتا تھا کہ وہ جنوبی لبنان اور دیگر علاقوں میں اسرائیل اور کتائب کے خلاف لڑائیوں میں کس طرح پیش پیش رہتا ہے۔

لہ اسی جورج حبش کی جماعت نے ۲۹ جنوری ۱۹۷۱ء کو مترجم کو پکڑ لیا تھا، اس کی آنکھوں پر پٹی باندھی تھی اور بیروت کے ایک محلے میں تین دن تک قید میں رکھا تھا اور اس دوران میں اس سے جو سوالات پوچھے گئے ان میں مرکزی نکتہ یہی تھا کہ سید موسیٰ الصدر سے تمہارا کیا تعلق ہے۔

ان جماعتیوں نے چار بار سید موسیٰ الصدر کو قتل کرنے کی کوشش کی لیکن انھیں قتل نہ کر پائے۔ سرکار استعمار نے یہ منصوبہ بنایا کہ انہیں اغوا کرایا جائے۔ لیبیا کی حکومت نے سرکاری طور پر انھیں دعوت دی۔ سید موسیٰ الصدر نے اپنے دو ساتھیوں شیخ محمد یعقوب اور عباس بدرالدین کے ہمراہ لیبیا کا سفر کیا لیکن وہاں سے واپس نہ آئے اور ابھی تک ان کا کچھ سراغ نہیں مل رہا لہ

لہ یہ بات مصطفیٰ چمران کی شہادت سے پہلے کی ہے لیکن سید موسیٰ الصدر کا سراغ اب تک نہیں ملا لیبیا کی حکومت یہ کہتی ہے کہ وہ وہاں سے اٹلی روانہ ہوئے تھے اور اٹلی والے یہ کہتے ہیں کہ وہ وہاں پہنچے نہیں ان کے زندہ ہونے یا نہ ہونے کے بارے میں قیاس آرائیاں جاری ہیں اور بہت سے لوگ لیبیا کی حکومت پر الزام لگاتے ہیں کہ لیبیا نے انھیں قید کر رکھا ہے۔ سید موسیٰ الصدر زندہ ہیں یا شہید ہو چکے اس کے بارے میں کچھ کہنا ممکن نہیں لیکن دو باتیں یقینی ہیں، ایک تو یہ کہ ان کو غائب کرنے یا قتل کرنے میں صرف ایک جماعت کا ہاتھ نہیں، بہت سے فریق اس میں شامل ہیں۔ مترجم کا اپنا تجربہ یہ کہتا ہے۔ (۱۹۷۱ء سے قبل) کہ لبنان کا شیعہ جاگیردار سید موسیٰ الصدر کی جان کا لاگو تھا۔ چند عمامہ پوش بھی ایسے تھے جو ان سے حسد کرتے تھے اور علی الاعلان کہتے تھے کہ یہ ایرانی یہاں آکر لیڈر بن گیا ہے۔ ان کے دشمنوں میں بائیں بازو کی جماعتیں بھی شامل تھیں۔ لبنان کی عیسائی نواز حکومت بھی تھی اور کتائب کے لوگ بھی تھے۔ گمانِ غالب یہ ہے کہ اس سازش میں یہ سب لوگ شریک ہیں۔ سید موسیٰ الصدر مصر کے جمال عبدالناصر کے حامی تھے اس لیے لیبیا کی حکومت کا ان سے خوش ہونا بھی ممکن نہ تھا ان سب لوگوں نے مل کر سید موسیٰ الصدر کو اپنے راستے سے ہٹایا۔ دوسری بات جو یقینی ہے وہ یہ ہے کہ انھیں سید موسیٰ الصدر کے غائب ہو جانے یا شہید ہو جانے سے کچھ حاصل نہیں ہوا بلکہ نقصان ہوا ہے۔ ان کا خیال یہ ہوگا کہ سید الصدر کے ہٹ جانے سے تنظیم امل اور "حرکۃ المحرومین" دونوں ختم ہو جائیں گی۔ لیکن ایسا نہیں ہوا بلکہ اس تحریک میں اور تیزی پیدا ہوئی ہے کیونکہ اب شیعہ نوجوانوں کو صبر کی تلقین کرنے والا کوئی نہیں اور لبنان کے ۸۴-۱۹۸۳ء کے حالات نے واضح کر دیا ہے کہ تنظیم امل کے جوانوں نے اسلحے کی کمی کے باوجود اور اس بات کے باوجود کہ کوئی عرب حکومت ان کے حق میں نہیں، ایک طرف انھوں نے بین الاقوامی امن فوج کے دانیوں کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا جس میں امریکہ بھی شامل ہے، اور اس امن فوج کو بادل ناخواستہ جانا ہی پڑا کیونکہ یہ امن فوج امن قائم کرنے کی بجائے کھلم کھلا کتائب کی بالادستی برقرار رکھنے پر تلی ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ ہی ان نوجوانوں نے لبنان کے اسلام دشمن، مسلم کش اور متعصب کتائبی صدر امین الجمیل کو مجبور کر دیا کہ وہ امریکہ کے

(بقیہ حاشیہ صفحہ آئندہ) ابھرے۔ لیکن سب سے بڑا کارنامہ ان جوانوں نے یہ سرانجام دیا کہ ان کی جان فشانیوں نے اسرائیل کو ناک چنے چبوا دیے ہیں۔ بظاہر اسرائیل نے جنوبی لبنان پر تسلط حاصل کیا ہوا ہے لیکن یہ علاقہ اس کے لیے سانپ کے منہ میں چھپکلی کے مانند بن چکا ہے کہ نہ نگلتے بنتی ہے، نہ اگلتے۔ نیوز ویک نومبر ۱۹۸۳ء کے مطابق امل کے جان فروشوں نے ایک دن میں اتنے اسرائیلی ٹھکانے لگا دیئے کہ فلسطین کی تنظیم آزادی تقریباً دس سال میں نہ لگا سکی اور آج ان نوجوانوں کی بناء پر اسرائیل میں داخلی مسائل پیدا ہو چکے ہیں اور اسرائیل کے انتخابات میں حزب مخالف کا منشور ہی یہ ہے کہ لبنان سے اسرائیلی فوجوں کو واپس بلاؤ کیونکہ اسرائیل والے اپنا اسلحہ تباہ کروا سکتے ہیں، اپنے آدمی نہیں مروا سکتے۔ اسی بات کے پیش نظر امریکہ نے امین الجمیل سے گٹھ جوڑ کر کے ۱۷ مئی ۱۹۸۳ء کے معاہدہ میں یہ شرط رکھوائی کہ اسرائیل کے ساتھ سوریا کی فوجیں بھی واپس چلی جائیں بہرحال سید موسیٰ الصدر کے غائب ہو جانے کی بنا پر تنظیم امل کو ایک نئی زندگی مل گئی ہے۔ اسی قسم کا خیال ایران کے دشمنوں کو آقائے خمینی کے خدانخواستہ انتقال کی توقع پر زندہ رکھے ہوئے ہے لیکن یہ ان کی غلط فہمی ہے۔

باب ششم دہم

خانہ جنگی کا تیسرا دور

خانہ جنگی کا دوسرا دور مسلمانوں کے مابین باہمی آویزشوں کے ساتھ ساتھ چلتا رہا اور اس کے نتیجے میں بہت سے اہم علاقے مثلاً تل زعتر، نبعہ، "مسلخ"، "کرنتینا"، "ضبیہ"، "حی غوارنہ"، جسر الباشا وغیرہ مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل گئے اور اس کے ساتھ ہی فلسطینی مزاحمت اور سوریا کے مابین تصادم بھی رونما ہوا۔ اسرائیل اور امریکہ کی یہ مشترک سازش ان تین مرحلوں میں مکمل ہوئی۔

الف۔ مسلمانوں اور عیسائیوں میں باہمی جنگ اور قتل علی الھویۃ یعنی شناختی کارڈ کی اساس پر قتل جس کا مطلب یہ ہے کہ ہر مسلمان صرف اس لیے کتائب کے ہاتھوں مارا جائے کہ وہ مسلمان ہے اور ہر عیسائی مسلمانوں کے ہاتھوں اس لیے مارا جائے کہ وہ عیسائی ہے۔ اس دور میں کیسا کیسا قتل و خون اور کیسے کیسے جرائم رونما ہوئے تمام عیسائی اپنے گروہی اختلافات کے باوجود کتائب کے ساتھ مل گئے اور یوں کتائب کو قوت حاصل ہو گئی۔

ب۔ سوریا اور فلسطینی مزاحمت کے مابین تصادم ہوئے یہ بہت بڑی خیانت اور بہت قبیح جرم تھا اور اس کا سبب لبنان کی بائیں بازو کی جماعتیں تھیں۔

ج۔ جنوبی لبنان میں لبنانیوں اور فلسطینیوں کے مابین لڑائیاں واقع ہوئیں یہ سازش ابھی تک جاری ہے لیکن سید موسیٰ الصدر کی کوششوں اور جنوبی لبنان کے شیعوں کے صبر و تحمل کی بنا پر ابھی تک اپنے قدرتی انجام تک نہیں پہنچیں۔

اس دوران میں بڑے شدید حالات پیدا ہوئے۔ ایسے لمحے بھی آئے جب زندگی کی امید اور حرکت المحرومین کے باقی رہنے کی توقع بہت کم رہ گئی تھی۔ بائیں بازو والوں نے سید موسیٰ الصدر کو واجب القتل قرار دے دیا تھا اور یہ بات میں کہہ چکا ہوں کہ انھوں نے چار بار انھیں مار ڈالنے کی کوشش کی۔

Presented by Ziaraat.Com

اس صورت حالات میں اور اس خطرناک دور میں حق بات کہنے کا مطلب موت تھا، جب مسلمانوں کی بہت بڑی تعداد لبنان سے چلی گئی تھی فرار کر گئی تھی اس وقت چند فدائیان اسلام ثابت قدم رہے اور انھوں نے بڑی بہادری سے کلمۂ حق اپنی زبانوں پر جاری رکھا وہ اس تاریک رات میں شمع فروزاں بنے اور حق و باطل کے مابین تمیز کا معیار۔

لبنان کے لوگ جو ان حوادث ان لڑائیوں اور تصادمات کو دیکھ رہے تھے انھوں نے جلد ہی حق و باطل میں تمیز کرنا شروع کر دی۔ اگر سید موسیٰ الصدر نہ ہوتے، اگر تنظیم امل نہ ہوتی اور بائیں بازو کے نظریات کامیاب ہو جاتے تو آج جنوبی لبنان کا وجود نہ ہوتا۔ اس وقت حق و باطل کو پرکھنے کا معیار نہ تھا ہر شخص کے سامنے صرف ایک ہی معیار تھا اور وہ بائیں بازو کا پیش کردہ معیار تھا سید موسیٰ الصدر اور حرکت المحرومین نے جس معیار کو پیش کیا وہ ایسا تھا جس نے اپنی حقانیت کی بنا پر بائیں بازو کی تمام جماعتوں کو شکست دی۔ سید الصدر کہا کرتے تھے کہ اس دور میں جب اسرائیل مسلمانوں کا قلع و قمع کرنا چاہتا ہے اور عیسائیت ہمیں نیست و نابود کرنا چاہتی ہے۔ اس وقت ہر قسم کی مسلمان کشی برادر کشی تمام عربوں اور مسلمانوں کے ساتھ غداری ہے اس لیے لازم ہے کہ اس کی روک تھام کی جائے اس کے لیے وہ سات بار سوریا گئے اور دو بار یاسر عرفات کو اپنے ساتھ لے گئے اور وہاں حافظ الاسد سے انھیں ملوایا اور صلح کروائی۔ ایک بار سات گھنٹے کی ایک نشست میں تمام مسائل کو زیر بحث لائے اور آخر کامیاب ہوئے یوں سوریا اور فلسطینی مزاحمت کے مابین اتحاد برقرار ہوگیا دونوں میں تعلقات قائم ہوگئے۔ دونوں کو اس بات کا احساس ہوگیا کہ ہر قسم کی آویزش دونوں کے لیے نقصان دہ ہے۔ وقت نے یہ بات واضح کر دی ہے کہ فلسطینی مزاحمت اور سوریا نیز بائیں بازو کی لبنانی جماعتیں سب کی سب شطرنج کے مہروں کے مانند اسرائیل کے نفع کے لیے مات کھا گئیں اور اصل فائدہ اسرائیل نے اٹھایا مگر بعض عرب ممالک مثلاً عراق اور لیبیا کے بے شمار پیسے نے بائیں بازو کی جماعتوں کی حتمی موت کو وقتی طور پر روک دیا۔

سوریا کے ساتھ نئی صلح

بہرحال سید موسیٰ الصدر کی مسلسل کوششوں کی بنا پر سوریا اور فلسطینی مزاحمت کے مابین تصادم ختم ہوگیا۔ کتائب کو اس بات پر بڑا غصہ آیا اور سوریا کے خلاف حرکت کی اور "فیاضیہ" کی لڑائی میں تقریباً ۱۵۰ سوری فوجیوں کو ہلاک کر دیا سوریا نے مجبور ہو کر "عین الرمانہ" کو گولا باری کا نشانہ بنایا اور بے شمار عیسائیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ یوں ایک بار سوریا فلسطینی مزاحمت کے حامی اور کتائب یا عیسائیوں کے دشمن کی حیثیت سے میدان جنگ میں اترا۔ لبنان میں عیسائی مورچوں کے مقابلے میں پچاس ہزار سوری سپاہیوں نے پوزیشنیں سنبھال لیں۔ اور بیروت میں ہر روز فریقین کے درمیان خونریز جھڑپیں ہونا شروع ہوگئیں۔ اسی طرح شمالی لبنان میں بھی سوریا اور کتائب کے مابین لڑائی شروع ہوگئی۔ تمام بائیں بازو والے، کمیونسٹ حتی کہ الجبهة الشعبیة کے ارکان اور انکے سربراہ جورج حبش سوریا گئے اور اپنے سابقہ اعمال پر اظہار ندامت کیا اور یوں حافظ الاسد سے صلح کرلی۔ اس وقت بائیں بازو کی تمام پارٹیاں اس بات کی معتقد ہیں کہ اگر سوریا ان کی مدد نہ کرتا تو عیسائی اور اسرائیل مسلمانوں کو ختم کر دیتے اور اب تمام تنظیمیں خصوصاً بائیں بازو کی پارٹیاں یہ کوششیں کرتی ہیں کہ سوریا سے نزدیک ہوں۔ لیکن وہ شخص کون تھا جس کی روحانی قوت نے اس سازش کو شکست دی اور حالات کا رخ موڑ دیا؟ یہ کام سید موسیٰ الصدر کے علاوہ اور کون کرسکتا تھا۔

اظہار معذرت کیوں نہیں کرتے؛

ایک فلسطینی رہنما کہا کرتے تھے کہ بخدا اگر سید موسیٰ الصدر شیعہ نہ ہوتے تو تمام فلسطینی اور سنی عوام ان کی قابل پرستش گرداننا شروع کر دیتے[1] اس کا سبب یہ ہے کہ انھوں نے ایسے مواقع پر ثابت قدمی دکھائی اور ایسی ایسی قربانیاں پیش کیں۔ جو بشری طاقت سے متوقع نہیں ہوتیں

---

[1] یہی بات لاہور کے ایک بہت بڑے اخبار کے چیف ایڈیٹر نے مترجم سے ایران کے اسلامی انقلاب کے بارے میں کہی تھی کہ اگر ایران کے لوگوں کی اکثریت شیعہ نہ ہوتی تو تمام عالم اسلام اس انقلاب کو گلے سے لگا لیتا۔ لیکن اب بہت سے مسلمان ملک اس انقلاب کی مخالفت کر رہے ہیں اور عراق کا ساتھ دے رہے ہیں۔ انھی تعصبات نے امت مسلمہ کو اغیار کے مقابلے میں کمزور کر رکھا ہے۔

Presented by Ziaraat.Com

اور بالآخر اپنی ایمانی طاقت سے کامیاب ہو گئے۔ لیکن بائیں بازو کی جماعتیں جو ایک زمانے میں ان پر تہمت تراشی کیا کرتی تھیں کہ وہ سوریا کے پروردہ ہیں۔ اور انھوں نے چار بار ان پر حملے کئے اور جان سے مارنے کی کوششیں کیں آج اس بات پر بھی تیار نہیں کہ اس عظیم شخص سے معذرت ہی کر لیں ان کا ضمیر انہیں ڈستا ہی نہیں۔ وہ سب کچھ بھول چکے ہیں۔

آج سب جماعتیں حتیٰ کہ بائیں بازو کی جماعتیں بھی اس امر کا اعتراف کرتی ہیں کہ سوریا اور فلسطینی مزاحمت کے مابین تصادم اور آویزش بہت بڑی غلطی تھی اور بعض لوگ تو خیانت کا نام بھی دیتے ہیں۔ لیکن کوئی بھی یہ نہیں پوچھتا کہ آخر اس تصادم کا ذمہ دار کون تھا؟ اور وہ لوگ کہاں چلے گئے جو سوریا کے خلاف نہایت اشتعال انگیز نعرے لگایا کرتے تھے اور وہ لوگ (اگر وہ مرد کہلانے کے مستحق ہوں) کہاں غائب ہو گئے۔ جو سوریا کے خلاف پراپگینڈا کیا کرتے تھے؛ اب وہ معذرت کیوں نہیں کرتے۔ وہ بڑے لوگ جنھوں نے اتنی بڑی غلطی کی (جو خیانت کے مترادف تھی) کہاں ہیں اور اس شریف سے معذرت کیوں نہیں کرتے جس نے ان لوگوں کی زیادتیوں کے باوجود راہ راست سے رخ نہ موڑا، ان کی تمام تہمتیں اور عداوتیں برداشت کیں حتیٰ کہ قتل کی دھمکی کو بھی سہہ لیا اور اپنے موقف کو نہ چھوڑا اور پھر ان دو متحارب گروہوں میں صلح کروا کے رہا۔ اور تو اور ان لوگوں نے ان بد کلامیوں اور الزام تراشیوں کو بھی واپس نہیں لیا اور اپنی اصلاح نہیں کی بات دراصل یہ ہے کہ یہ سب لوگ اتنے پست ہیں اتنے بے شرف ہیں اتنے بے اصولے ہیں کہ ان کی قسمت میں افتخار و کرامت قسم کی کوئی چیز ہے ہی نہیں اور افسوس تو یہ ہے کہ اس قسم کے پست حیوان صفت لوگ انقلاب کی رہبری اور معاشرے کی تبدیلی کی اہلیت کے دعوے دار ہیں۔

باب ہفدہم

اسرائیل و کتائب کے مقابل دادِ شجاعت کے چند نمونے

جنوبی لبنان میں گڑبڑ کی سازش؛

جنوبی لبنان میں لبنانیوں اور فلسطینیوں کے مابین تعلقات، بائیں بازو والوں کی ناشائستہ حرکات کی بنا پر اس حد تک خراب ہو گئے تھے کہ اسرائیل یہ چاہتا تھا کہ ان دو نو گروہوں کو ایک دوسرے سے لڑوا دے چونکہ فلسطینی اسلحہ جنگ کے اعتبار سے، جنوبی لبنان کے شیعوں سے کہیں زیادہ طاقت ور ہیں اس لیے ان لڑائیوں میں شیعوں کا شکست کھانا لازمی بات تھی یوں ایسے موقع مل جائے کہ وہ لبنانیوں کی طرف داری اور شیعوں کو بچانے کے لیے لبنان میں داخل ہو جائے اور فلسطینی مزاحمت کا قلع و قمع کر دے۔ لیکن یہ خطرناک منصوبہ، سید موسیٰ الصدر کی سیاسی سوجھ بوجھ اور تنظیم امل کے نوجوانوں کے صبر و تحمل کی بنا پر نقش بر آب ثابت ہوا اور فتح اور امل نے باہمی تنسیق کا ثبوت دیا۔ دوسرے الفاظ میں تنظیم امل، فلسطینی مزاحمت کے لیے سپر بن گئی اور انھوں نے فلسطینیوں کی حفاظت کی ذمہ داری قبول کر لی اور ان پر وارد ہونے والی بلاؤں کو اپنے آپ پر لے لیتے تھے اور یوں انھوں نے لبنانی شیعوں کو اجازت نہ دی کہ وہ فلسطینیوں سے جنگ آزما ہوں۔

لیکن بائیں بازو کی جماعتیں ایک اور سازش پر تلی بیٹھی تھیں۔ یہ جماعتیں اور انتہا پسند فلسطینی

Presented by Ziaraat.Com

لبنان کی سرحد پر واقع قصبوں اور گاؤں میں جا کر اسرائیل کی سرزمین پر راکٹ پھینکتے اور پھر اسرائیل ان قصبوں اور گاؤں پر گولا باری کرتا۔ ان پر بمباری ہوتی ہر روز بہت سے بے گناہ مرد عورتیں بچے مارے جاتے اور یہاں کے باشندے گروہ در گروہ ان قصبوں اور گاؤں کو خیرباد کہہ جاتے ان جماعتوں کا پروگرام اسرائیلی منصوبے سے ہم آہنگ تھا یعنی جنوبی لبنان کو شیعوں سے خالی کرا لیا جائے اور پھر اسرائیل جنوبی لبنان میں داخل ہو کر فلسطینی مزاحمت کو ختم کر دے۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ فلسطینی مزاحمت یعنی "فتح" بھی اس بات پر قادر نہ تھی کہ بائیں بازو کی جماعتوں کی ان حرکتوں کی روک تھام کر سکے۔ (یہاں تک بہت سے بائیں بازو کے عناصر ابھی "فتح" کی صفوں میں موجود تھے اور گڑبڑ کرتے رہتے تھے) بہر حال اپنی سوجھ بوجھ اور صبر و ضبط کی بنا پر جنوبی لبنان کے شیعوں نے اسرائیل کی اس سازش کو کامیاب نہ ہونے دیا۔ جب اس سازش میں ناکامی ہوئی تو اسرائیلی گوریلے جنوبی لبنان میں داخل ہو گئے۔ یہ اسرائیل کی توقعات کے برخلاف، جنوبی لبنان کے شیعوں نے "فتح" کے ساتھ مل کر ہلکے ہتھیاروں کی مدد سے اسرائیلی حملوں کا بڑی بہادری سے مقابلہ کیا اور اس کے تمام خواب پریشان ہو گئے۔ ان لڑائیوں میں، جن کا بہت سے لوگوں کو علم بھی نہ ہو پایا اور جن میں شیعوں کی دلیرانہ جنگ آزمائی کا انھیں پتا بھی نہ چل سکا "تنظیم امل" کے بہترین سپاہی جام شہادت پی گئے اور کئی ہزار لبنانی شیعہ اسرائیلی گولا باری اور بمباری کا نشانہ بن کر لقمۂ اجل بن گئے۔[۱]

بنت جبیل[۲] کی داستان شجاعت

۲۴ فروری ۱۹۷۷ کو صبح ۷ بجے اسرائیل اور کتائب کے بھاری توپ خانوں[۳] نے "بنت جبیل"

---

[۱] یہ تحریر ۱۹۷۶ء میں سپرد قلم ہوئی۔ [۲] بنت جبیل اسرائیلی سرحد کے قریب ایک بہت بڑا قصبہ تھا جو آج ایک خرابے کی شکل اختیار کر چکا ہے اور اس کے باشندے یا تو شہید ہو چکے ہیں یا خانماں برباد۔

[۳] اسرائیل کے پروردہ میجر حداد نے جواب جہنم رسید ہو چکا ہے جنوبی لبنان میں اسرائیلی سرحد کے قریب ایک عیسائی آبادی کے منطقے میں اپنی حکومت قائم کر لی تھی اور کتائب کے نمائندے کی حیثیت سے اسرائیلی پروگرام کو عملی جامہ پہناتا تھا۔ یہاں کتائب کے جس توپ خانے کا ذکر ہے وہ اسی میجر حداد کی کمان میں کام کرتا تھا۔

سے حملہ شروع کر دیا۔ اسی طرح امل اور جیش لبنان العربی کے دستوں نے مل کر "صف الہواء" کی طرف سے پیش قدمی شروع کی۔ سخت گھمسان کی لڑائی شروع ہو گئی اس حملے میں "فتح" کے دو جوان شہید ہو گئے۔ دشمن پسپا ہونے پر مجبور ہو گیا اور "امل" "فتح" اور جیش لبنان العربی تل شلعبون پر دوبارہ قبضہ کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ یوں "بنت جبیل" کو محاصرے سے نجات ملی۔ کتائب اور اسرائیل کے توپ خانے "بنت جبیل" پر برابر گولا باری کیے جا رہے تھے لیکن "امل" "فتح" اور جیش لبنان العربی کے شیر دل جوان پہاڑ کے مانند اس آگ اور لوہے کی بارش کے مقابلے میں ڈٹے ہوئے تھے۔

"تل مسعود" مسلمانوں کا سب سے بڑا اڈا تھا۔ یہ ٹیلہ "بنت جبیل" کے قریب بلندی پر واقع ہے اگر یہ ٹیلہ دشمن کے ہاتھ چلا جاتا تو "بنت جبیل" کا سقوط لازمی تھا کیونکہ شہر میں ہر چلتا پھرتا شخص ٹیلے پر بیٹھے ہوئے بندوق بازوں کی گولیوں کا نشانہ بن جاتا اور موت اس کا استقبال کرتی۔ اس لیے اس ٹیلے کی حفاظت "بنت جبیل" کے لیے بے حد اہم تھی۔ جنوبی لبنان کی لڑائیوں کے آغاز میں یہ ٹیلہ کمیونسٹ پارٹی کی نگرانی میں تھا۔ ایک رات ان پر وحشت سوار ہوئی اور انھوں نے خیال کیا کہ اسرائیل نے حملہ کر دیا ہے۔ اس بنا پر انھوں نے اپنا اسلحہ وہیں چھوڑا اور بھاگ نکلے اتفاق سے اسی آن امل کے جوان اس ٹیلے کی جانب بڑھے اور وہاں پہنچ کر انھیں معلوم ہوا کہ دشمن کا دور دور تک نشان بھی نہیں البتہ کمیونسٹ پارٹی والوں کا اسلحہ ضرور زمین پر بکھرا پڑا ہے اس وقت سے اس جنگی اہمیت کے ٹیلے کی حفاظت امل کے جوانوں کے پاس رہی۔ اب بھی امل اور فتح کے جوان مشترکہ طور پر اس کی حفاظت کرتے ہیں البتہ امل کی طاقت زیادہ ہے۔

ایک دن ۴ بجے سہ پہر کو کتائب نے "عین ابل" سے "تل مسعود" پر حملہ کر دیا حملہ آوروں کی تعداد کئی سو تھی اور ان کے ساتھ چند ٹینک بھی تھے کتائبی ٹینک اسرائیلی توپ خانے کی گولا باری کے سائے تلے "تل مسعود" کی چوٹی کی جانب چند میٹر پیش قدمی کر سکے اور کتائب کے دستوں نے امل اور فتح کے جوانوں پر گولیاں برسانا شروع کر دیں۔ چند میٹر کے فاصلے پر خونریز جنگ شروع ہوئی۔ صورت حالات بہت بھیانک تھی اور ہر آن یہ پتا چلتا تھا کہ "تل مسعود" مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل جائے گا۔ لیکن اس ٹیلے کے محافظوں نے قسمیں کھا رکھی تھیں کہ ایک قدم بھی پیچھے نہیں ہٹیں گے۔ اور کتائب کے فوجی اور ٹینک ان کی لاشوں پر گزر کر ہی چوٹی پر قبضہ کر سکیں گے

Presented by Ziaraat.Com

اس موقع پر بعلبک کے دلیر جنگ آزما بنت جبیل کے محاذ "تلۃ خلۃ المشلطۃ" کی حفاظت کر رہے تھے انھوں نے دور سے "تل مسعود" کی لڑائی کو دیکھا۔ انھوں نے اپنی جانوں پر کھیل کر اپنے آپ کو کتائب کے دستوں کے پیچھے پہنچایا اور ۳۰ میٹر کے فاصلے سے ان پر گولیاں برسانا شروع کر دیں۔ انھوں نے ۲۷ کتائبیوں کو واصل جہنم کیا اور اپنی بازوکا رائفلوں سے ان کے ٹینکوں پر حملہ کر دیا۔ فتح کی اطلاعات کے مطابق انھوں نے ۲ یا ۳ ٹینک برباد کر دیئے۔ کتائب کے دستے سخت نقصان اٹھا کر پسپا ہو گئے۔ رات کو ۷ بجے کے قریب چند ہیلی کوپٹر بمبار ہوائی جہازوں کے ساتھ اس علاقے میں آئے اور اپنی لاشوں اور زخمیوں کو اٹھا کر لے گئے۔ "تل مسعود" کے محافظوں نے نہایت بہادری اور ثابت قدمی کا ثبوت دیا جب کہ اسرائیل اور کتائب کا پراپیگنڈا نقش بر آب ثابت ہوا امل کے نوجوانوں کی یہ بہادری اور جانفشانی لبنان میں زبان زد عام ہے۔ حتیٰ کہ مارکسیوں نے امل کے جوانوں کی استقامت کو تسلیم کیا اور "فتح" کے لیڈروں نے سید موسیٰ الصدر کو اس فتح پر مبارک باد پیش کی[1]

"بنت جبیل" کا اور اس کی جنگ کا نقشہ ذیل میں دیا گیا ہے۔

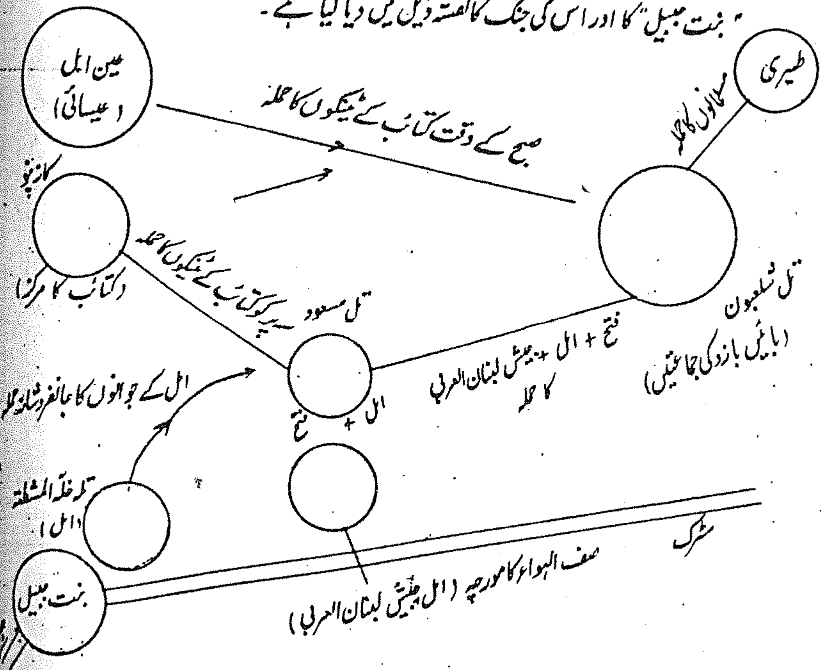

[illegible] ۱۹۷۷ء میں ضبط تحریر میں آئیں ۔

"بنت جبیل"[1] لبنانی۔ اسرائیلی سرحد پر لبنان کا سب سے بڑا شہر ہے اس کی آبادی تقریباً چالیس ہزار اشخاص پر مشتمل ہے اور اسرائیلی سرحد سے اس کا فاصلہ ۳ کیلو میٹر ہے۔

"عین ابل" ایک مارونی عیسائی قصبہ ہے۔ مارونیوں کے مذہبی پیشوا پطرک (اسقف اعظم) خریش اسی جگہ کے رہنے والے ہیں اس کی آبادی ۳ ہزار ہے۔ یہ قصبہ کتائب اور حزب الاحرار (کمیل شمعون کی پارٹی) کا بہت بڑا مرکز تھا۔ اسرائیل کی انگیخت پر یہاں سے بنت جبیل پر حملے ہوا کرتے تھے۔

کازنو کا مورچہ "عین ابل" کے قریب ایک ٹیلہ ہے اور اس وقت کتائب کے ٹینکوں اور توپ خانے کا مرکز ہے۔ یہ مورچہ کنکریٹ سے بنایا گیا ہے۔ یہاں سے بھاری مشین گنوں کے ذریعے تل مسعود پر گولیاں برسائی جاتی تھیں۔

"صف الہواء" "بنت جبیل کا دروازہ ہے یہ ایک درہ سا ہے اور لبنانی فوج کی چوکی ہے۔ جو "بنت جبیل" میں آنے اور یہاں سے باہر جانے والوں کی پڑتال کرتی ہے۔ اس جگہ پر امل اور جیش لبنان العربی کے دستے متعین ہیں"۔

"تل مسعود ایک اونچا ٹیلہ ہے اور فوجی نقطہ نظر سے بے حد اہم مقام ہے۔ یہاں سے "بنت جبیل" نظر آتا ہے۔ "تنظیم امل کے جوانوں کا مرکز یہاں تھا اگر یہ ٹیلہ دشمن کے قبضے میں جاتا تو پھر بھی ان کے پاس ہوتا۔ اسی لیے ابتدائے جنگ ہی سے یہ کتائب اور اسرائیل کے حملوں کا نشانہ بنتا رہا ہے۔ کوئی پندرہ دن قبل بعلبک کے ایک مجاہد حسین شکر اسی جگہ شہید ہوئے اور اسی حسین شکر کے عم زاد "علی شکر" شدید زخمی ہوئے (مارچ ۱۹۷۷) یہ ٹیلہ اسرائیل اور کتائب کے خلاف شجاعت و دلاوری کے عظیم کارناموں کا عینی شاہد ہے۔

"تلۃ خلۃ المشلطۃ" کا مورچہ بنت جبیل کا آخری مرکز ہے یہاں امل کے دلیر جوان متعین تھے۔ اور جنگ کے دوران میں انھوں نے کتائب کے عقب پر حملہ کیا جو "تل مسعود" کو اپنے قبضے میں لینے کے

[1] تازہ ترین اطلاعات کے مطابق اب اس قصبے یا شہر میں پانچ چھے سے زیادہ اشخاص باقی نہیں باقی یا مارے گئے یا یہاں سے محفوظ مقامات پر چلے گئے۔ مترجم اس قصبے کو دیکھ چکا ہے اور کئی بار وہاں کے قاضی سید ہاشم معروف مرحوم کے ساتھ یہاں کی گردش کر چکا ہے۔ یہاں کے گرد و نواح کے ٹیلوں سے رات کے وقت اسرائیلی علاقے کی روشنیاں نظر آیا کرتی تھیں۔

Presented by Ziaraat.Com

در پے تھے۔ یہ بات ایک طرح سے خودکشی کے مترادف تھی لیکن انھوں نے اپنی جان کی پروا کئے بغیر حملہ کیا اور متعدد کتائبیوں کو ٹھکانے لگا دیا۔

تل شلعبون بھی ایک ٹیلہ ہے جو بنت جبیل کے راستے میں واقع ہے۔ اس جگہ بائیں بازو کی جماعتوں کے رضاکار متعین تھے جب کتائب نے اس پر حملہ کیا تو یہ "دلاور" کسی قسم کی مزاحمت کئے بغیر یہاں سے فرار کر گئے۔

طیری بنت جبیل کے علاقے میں ایک شیعہ گاؤں ہے۔ "امل" اور "فتح" کا مرکز تھا اور اولین دفاعی خط شمار ہوتا تھا۔[1]

"طیبہ" کی جنگ!

طیبہ کی جنگ شجاعت و جانفشانی کی وہ داستان ہے جو "امل" کے جوانوں نے شیعیان لبنان کی تاریخ میں اپنے خون سے لکھی۔

محل وقوع: طیبہ کا قصبہ اور "رب الثلاثین" کا ٹیلہ جو اسرائیلی سرحد کے قریب جنوبی لبنان میں واقع ہیں یہ واقعہ ۳۰ مارچ ۱۹۷۷ء کو پیش آیا۔

صبح سویرے اسرائیل کے بھاری توپ خانے نے طیبہ پر گولا باری شروع کر دی تاکہ وہ لوگ جو محض تماشا دیکھنے کے لیے آتے ہیں چلے جائیں۔ اس قصبے میں آبادی نہیں تھی وہ لوگ جا چکے تھے لیکن مختلف پارٹیوں اور چھاپہ مار گروہوں نے یہاں اپنے اڈے بنا رکھے تھے تاکہ اسرائیل کے خلاف لڑیں۔ لیکن جب کبھی حملہ ہوتا یہ لوگ مقابلہ کئے بغیر بھاگ نکلتے۔

اس دن بھی حسب دستور سب فرار کر گئے۔ کیمونسٹ پارٹی، "الجبهة الشعبية" "الجبهة الديموقراطية" اور دیگر تنظیموں کے ارکان کا کوئی نشان نہ ملتا تھا صرف "فتح" اور "امل" مقابلے میں آئے۔ "اس فتح" نے چار شہید گذرانے اور "امل" نے چھ شہیدوں کی قربانی پیش کی اس کے علاوہ "امل" کے ایک جوان کا کوئی سراغ ہی نہ مل سکا۔

شدید گولا باری کے بعد اسرائیلی دستے "طیبہ" اور دیگر اہم نقاط کی جانب حرکت میں آئے

[1] فوجی نقشہ اور اس کی تشریح لبنان میں تیار ہوئے۔

چاندنی نے تمام ٹیلوں اور اس قصبے کو اپنی آغوش میں لے رکھا تھا اسی لیے دشمن کی فوجیں بہ آسانی اس قصبے کے قریب آگئیں اور انھوں نے تین طرف سے اس کا محاصرہ کر لیا۔ اس علاقے کا سب سے اونچا مقام ایک ٹیلہ ہے جس کا نام "رب الثلاثین" ہے جو چاروں طرف سے احاطے میں ہے۔ اور اس کی بلندیوں پر لبنان کا بے حد اہم کنکریٹ کا بنا ہوا مورچہ ہے جو شدید ترین گولا باری کا مقابلہ کر سکتا ہے۔ اور بمباری کی تاب لا سکتا ہے۔ اس ٹیلے کے چاروں طرف دشمن کی توپوں اور مارٹروں کے گولوں کے نشانات دکھائی دیتے ہیں بعض مقامات پر تو اس کے ایک میٹر کے فاصلے پر بھی گولے پھٹے ہیں اور یوں لگتا ہے کہ پورے علاقے پر گولوں کی بارش نے اس کے چپہ چپہ کو چھلنی کر دیا ہے تاکہ کوئی جاندار باقی نہ بچے۔

یہ ٹیلہ ایک خوفناک اور وحشت خیز جگہ ہے جو صرف شیروں کی کچھار ہے اور ان ہتھیلی پہ سر رکھ کر لڑنے والوں کا مرکز ہے اور جہاں تماشا دیکھنے والوں اور انقلاب کے جھوٹے مدعیوں کے لیے کوئی جگہ نہیں۔ یہ بلند ٹیلہ اسرائیلی سرحد کے بالکل سامنے سینہ سپر ہے اور اسرائیل کی توپوں سے نکلنے والے گولوں کا اولین نشانہ ہے، یہی وہ مشہور و معروف شہادت کا ٹیلہ ہے جہاں اگنے والا گلاب کا ہر پھول خون شہیداں سے سیراب ہو کر کھلتا ہے۔

اس بلند ٹیلے اور "طیبہ" کے درمیان ایک اور ٹیلہ ہے جہاں حکومت لبنان کی جانب سے ایک ماڈل زراعتی فارم قائم کیا گیا ہے۔ اسرائیل نے اپنے فوجی دستے اس ٹیلے کے قریب پہنچا دیئے تاکہ وہ "طیبہ" اور "رب الثلاثین" کے مابین رابطہ منقطع کر دیں۔ اس کے ساتھ ہی دوسرے دستوں نے شمالی اور جنوبی جانب سے "رب الثلاثین" اور "طیبہ" کا محاصرہ کر لیا اور بڑے ٹینکوں کے ساتھ "رب الثلاثین" کی چوٹی اور "طیبہ" کے مرکز کی جانب پیش قدمی شروع کر دی۔

"محمد شامی" "امل" کے دلیر ترین جوانوں میں تھا اور "مدرسہ صنعتی جبل عامل" کا فارغ التحصیل تھا اس نے اس ٹیلے کے مغربی جانب مورچہ قائم کر رکھا تھا اس کے پاس ۸۱ ملی میٹر کا ایک مارٹر تھا۔ اس نے اسرائیلی ٹینکوں کو نشانہ بنانا شروع کر دیا اور ان کی پیش قدمی کو روکنے لگا۔ یہ تنہا شخص تھا جو اپنے مارٹر کو استعمال کر رہا تھا دوسری تنظیموں کے پاس بے شمار مارٹر اور بھاری توپیں تھیں۔ لیکن ان سب نے بشمول "فتح" و "جیش لبنان العربی" خاموشی اختیار کر رکھی تھی۔ انھیں

Presented by Ziaraat.Com

خبر ہی نہ تھی اور یا پھر وہ وہاں سے چل دیئے تھے۔

صرف محمد شامی تنہا اسرائیلی ٹینکوں سے مقابلہ کر رہا تھا وہ پروانہ وار اپنے مارٹر کے گرد چکر لگا رہا تھا اور بڑی تیزی سے ایک کے بعد دوسرا گولا مارٹر میں ڈالتا اور اپنے دل کی آگ کو اس گولے کے ساتھ دشمن کی جانب روانہ کر دیتا۔

ادھر "طیبہ" کے قصبے کے وسط میں "امل" کا کمانڈر "ابوالفضل عباس" ایک لینڈ رور پر اور شکا کے پیچھے بیٹھا ہوا اسرائیلیوں سے جنگ آزما تھا[1]۔ وہ یہ دیکھ رہا تھا کہ "امل" کے مجاہدوں کے پاس صرف کلاشنکوف ٹائپ کی ہلکی مشین گنیں ہیں اور وہ ان سے اسرائیلی ٹینکوں کا مقابلہ کر رہے ہیں اور یکے بعد دیگرے جام شہادت پی رہے ہیں لیکن یہ دیکھنے کے باوجود وہ کوشش کر رہا تھا کہ مشین گن کی گولیوں سے ٹینکوں کی پیش قدمی روک دے۔ ان ٹینکوں نے تین طرف سے قصبے کو محاصرے میں لے رکھا تھا اور وہ قصبے کے مرکز کی جانب پیش قدمی کر رہے تھے۔ لیکن وہ اس بات پر قادر نہ تھا کہ بیک وقت تین اطراف پر جنگ کرے۔ اس موقع پر ایک ہیلی کوپٹر ظاہر ہوا اور اور اس نے جیپ پر راکٹ برسائے۔ ایک راکٹ جیپ پر لگا اور وہ الٹ گئی۔ جیپ کے ساتھ ابوالفضل عباس بھی زمین پر آ رہا لیکن وہ نہایت پھرتی سے اٹھا اور گولیوں کی بارش میں اپنے آپ کو ایک اور جیپ تک پہنچا پایا۔ وہ جیپ کو کھولنا چاہتا تھا کہ اس اثنا میں ایک اور راکٹ آیا جس نے جیپ کو تباہ کر دیا۔

البتہ وہ خود معجزانہ طور پر بچ گیا۔ ٹینک قصبے کے مرکز کی جانب پیش قدمی کر رہے تھے۔ اور جو مجاہد ان کی زد میں آ جاتا اسے خاک میں ملا دیتے۔ قصبہ دشمن کے قبضے میں آ گیا صرف ایک طرف سے راستہ کھلا تھا جو مغرب کی جانب کھلنے والے ایک درے تک لے جاتا تھا۔

ابوالفضل عباس نے جان لیا کہ کام تمام ہو چکا ہے اس لیے ضروری ہے کہ اپنے باقی ماندہ جوانوں کو بہر صورت اسرائیل سے نجات دلائے اس کے پاس صرف پچاس جوان رہ گئے اور ایک مارٹر، ایک دوشکا ٹائپ بڑی مشین گن اور باقی ہلکے ہتھیار تسلیم شدہ بات ہے کہ ان ہتھیاروں اور اس نفری کے ساتھ ممکن نہ تھا کہ وہ اسرائیلی ٹینکوں اور ہیلی کوپٹروں کا مقابلہ کرے اور انھیں آگے بڑھنے سے روک دے۔ اس لیے اس نے پیادہ پا اپنے آپ کو اپنے بکھرے ساتھیوں

تک پہنچایا اور حکم دیا کہ پسپا ہو کر مغربی درے کی راہ سے جو ابھی تک دشمن کے قبضے میں نہ آیا محاصرے سے نکل جائیں اور اپنے آپ کو بچا لیں۔

اس موقع پر وہ "محمد شامی" کی تلاش میں آیا جو مارٹر چلا رہا تھا۔ اس نے اس کے پاس پہنچ کر اسے حکم پسپائی دیا۔ "محمد شامی" نے اپنے کمانڈر سے کہا: "خدا کی قسم! جب تک میرے پاس ایک گولا بھی ہے میں پسپا نہ ہوں گا۔ وہ مارٹر چلا رہا تھا کہ اس کے سر پر ایک ہیلی کوپٹر ظاہر ہوا۔ اس نے اس کی پوزیشن دیکھ کر ایک راکٹ مارا جو عین مارٹر پر لگا اور اس جانفروش فدائی "محمد شامی" کو شہادت کی راہ پر روانہ کر دیا۔ ابھی اس کے پاس تین گولے باقی تھے۔

طیبہ کے سقوط کے بعد صرف "رب الثلاثین" کا ٹیلہ رہ گیا تھا جو ابھی تک اسرائیلیوں کی مزاحمت کر رہا تھا۔ اب اسرائیلی ٹینک چاروں طرف سے اس ٹیلے کی جانب بڑھنے لگے۔ اور "امل" کے باقی ماندہ مجاہدین کو اپنا نشانہ بنانے لگے۔ اب نہایت خونریز لڑائی شروع ہوئی۔ اور مجاہدین یکے بعد دیگرے جام شہادت سے سرفراز ہونے لگے۔ یہاں تک کہ مزاحمت کا آخری نقطہ یعنی ایک کنکریٹ کا بنا ہوا بنکر چاروں طرف سے محاصرے میں آ گیا۔ ایک ٹینک نے اپنی مشین گن کی نالی کی نشست بنکر کے دروازے پر کر لی۔ "فتح" کے چند مجاہدین جو محاصرے کو توڑنا چاہتے تھے اس مشین گن کی زد میں آ گئے اور انھوں نے جان جان آفرین کے سپرد کر دی۔ امل کا ایک جوان "موسوی نامی" بنکر کے اندر محاصرے میں تھا اور باہر نہ نکل سکتا تھا وہ اس بنکر کی ایک کھڑکی کے پاس گیا جس کی سلاخوں کو ایک توپ کے گولے نے خم کر دیا تھا، موسوی نے ان سلاخوں کو اپنے ہاتھوں سے اور خم کیا اور باہر نکلنے کی راہ بنائی اور باہر نکل کر اپنے آپ کو دشمن کے درمیان پھینک دیا اس نے کلاشنکوف کو بڑی پھرتی سے استعمال کیا اور دشمن کے بہت سے سپاہیوں کو اس کی گولیوں کا نشانہ بنا کر موت کی نیند سلا دیا۔ اس طرح اس نے ان کے خط دفاع کو توڑا اور ٹینکوں کے درمیان سے ہوتا ہوا اپنے آپ کو دشمن سے بچا کر مغربی درے پر پہنچا۔

[1] بقیہ صفحہ کا حاشیہ: [1] یہ جانفروش مجاہد بعلبک کے موسوی خاندان سے تھا اور اس کا عرف خاص کاسترو تھا۔ بے شمار جانفشانیوں کی بنا پر اور خاص طور پر رب الثلاثین کے معرکے میں پاؤں ضائع کروانے کی بنا پر سید موسیٰ الصدر نے اسے ابوالفضل عباس کا لقب دیا تھا۔

Presented by Ziaraat.Com

یہاں اس نے اپنے آپ کو ڈھلوان پر لڑھکا دیا اور یوں درے کے نیچے جا پہنچا جہاں دشمن کی گولیاں اس کو زد میں نہ لا سکتی تھیں۔

یوں جنوبی لبنان کی لڑائیاں عمل میں آئیں یوں اسرائیلی حملے ہوئے اور یوں "امل" کے جوانوں نے اپنی قربانیوں اپنی شہادتوں اور اپنی شکستوں سے لبنان کے ٹیلوں، دروں اور پہاڑوں پر داستان وفا لکھی اور اپنے خون سے انہیں سرخرو کیا۔

اس شکست کے چار دن بعد، سوریا کی فوجیں ان کی حمایت کے لیے آن پہنچیں اور دشمن کے خلاف تقریباً دس کیلومیٹر لمبا محاذ کھول دیا۔ سوریا کی گولاباری نے دشمن کے مواقع کی خوب خبر لی اور مسلمان مجاہدین نے فتح کی کمان میں "طیبہ" کو آزاد کرا لیا، "امل" کے ایک دستے نے نہایت جرأت سے حملہ کر کے "رب الثلاثین" کے ٹیلے پر قبضہ کر لیا اور دشمن کے بہت سے سپاہیوں کو پیوند خاک کر دیا اور ایک شخص کو گرفتار کر لیا[1]

الشیاح اور کتائب کے ایک اڈے کی تسخیر!

الشیاح اور عین الرمانہ کے درمیان شدید جنگ جاری تھی، "امل" کے مجاہدوں نے نہایت جوش و خروش سے "عین الرمانہ" پر حملہ کر کے کتائب کے ایک اڈے پر جو عین الرمانہ میں ایک کئی منزلہ عمارت تھی، قبضہ کر لیا۔ "عین الرمانہ" پر مختلف گروہوں کی جانب سے حملے ہو رہے تھے اور ہر گروہ اپنے طور پر ایک الگ گوشے میں لڑ رہا تھا مرنے والوں کی تعداد خاصی زیادہ تھی یہ گروہ آہستہ آہستہ پسپا ہوتے گئے، حتیٰ کہ "ناصری" گروہ کے بعض مرنے والوں کی لاشیں میدان قتال ہی رہ گئیں۔

کتائب نے اس عمارت کا محاصرہ کر لیا جس پر "امل" کے جوانوں نے قبضہ کر لیا تھا۔ انھوں نے اس عمارت کے بڑے دروازے کے سامنے ایک بھاری مشین گن نصب کر رکھی تھی۔ جس سے وہ ہر حرکت کرنے والے پر گولیاں برساتے تھے۔ اس کے بعد انھوں نے اس عمارت پر شدید گولاباری بھی کی۔

"امل" کے مجاہدین کے کمانڈر نے جس کا نام بھی مجاہد تھا، اپنے کندھے پر آر پی جی

[1] یہ واقعہ ایران میں تحریر کیا گیا۔

رائفل رکھی جس سے راکٹ چلائے جاتے ہیں اس نے اللہ اکبر کا نعرہ لگایا اور اپنے مورچے سے ذرا بلند ہوا اور اسی وقت اس نے دشمن کی مشین گن پر راکٹ مارا لیکن افسوس کہ فنی خرابی کی بنا پر راکٹ چل نہ سکا۔ مجاہد جو کتائب کی نظروں میں آ چکا تھا، زمین پر گرا، کتائب نے اس پر گولیوں کی بارش کر دی اور بم بھی پھینکے۔ ایک بم کے ٹکڑے اسے لگے اور اسے شدید طور پر زخمی کر دیا اس کا چہرہ خون سے تر تھا۔ مجاہد نے بڑی ہوشیاری سے اپنے آپ کو ایک کونے میں پہنچایا۔

"امل" کے ایک اور جوان نے مجاہد سے کہا کہ وہ اس کونے میں آرام کرے تاکہ دوسرے جوان اسے کسی نہ کسی طرح ہسپتال میں لے جائیں لیکن مجاہد نے انکار کر دیا۔ وہ اپنے ہاتھوں سے اپنے چہرے کا خون صاف کرتا جا رہا تھا اور کہہ رہا تھا کہ جب تک ایک رمق جان بھی باقی ہے، لڑتا رہوں گا۔

اس جوان نے جس کا دل "مجاہد" کی محبت سے پر تھا۔ اپنی دستی مشین گن دھمکانے کے لیے "مجاہد" پر تان لی اور غصے سے بھری ہوئی آواز میں للکارا کہ تم زخمی ہو چکے ہو۔ میں تمہیں حکم دیتا ہوں کہ لڑنے سے باز رہو اور مورچہ کے پیچھے آرام کرو تاکہ ہم تمہیں ہسپتال پہنچا دیں اب لڑنے کی ذمہ داری ہم پر ہے" مجاہد نے ایک بار پھر اپنا چہرہ خون سے صاف کیا اور اپنی مشین گن اٹھا کر کہا میں بحیثیت کمانڈر حکم دیتا ہوں کہ باتیں کم کرو اور جو کچھ میں کہہ رہا ہوں۔ فوراً عمل میں لاؤ۔ اب اس نے محاصرہ توڑنے کے لیے ایک نئی تکنیک استعمال کی اور یوں "امل" کے جوان اس عمارت سے نکل کر دوسری جگہ جا پہنچے "ناصری" گروہ کے دو شہیدوں کی لاشیں ابھی تک میدان جنگ میں پڑی تھیں اور یہ لوگ الشیاح کی جانب پسپا ہو چکے تھے۔

"مجاہد" نے اپنے زخمی بدن اور خون آلود چہرے کے باوجود فیصلہ کیا کہ ان شہیدوں کی لاشوں کو حاصل کرنے کے لیے نیا حملہ کیا جائے۔ اس نے سکیم تیار کی اور "امل" کے چند جوانوں کی معیت میں ایک ایسی راہ اختیار کی جس میں انھوں نے دیوار میں سوراخ بھی کیے اور انھیں گھروں میں سے بھی گزرنا پڑا۔ برستی گولیوں میں یہ لوگ بڑی جرأت اور بے باکی کے ساتھ اس جگہ پہنچے جہاں لاشیں پڑی تھیں۔ انھوں نے لاشوں کو اپنے کاندھوں پر اٹھا کر الشیاح پہنچایا۔

Presented by Ziaraat.Com

اور" ناصریوں" کے گروہ کے حوالے کر دیں جس پر تعجب کا اظہار بھی کیا گیا اور تحسین و آفرین بھی کہی گئی اس جھڑپ میں "اَمل" کے سات جوان زخمی ہوئے لیکن انھوں نے جنگ کے آخر تک اپنے زخموں کی پروا نہ کی [1]

الشیاح میں بنکر کی تکمیل!

چند دنوں سے "اُمل" کے جوان "حرکت المحرومین" کے نام سے ایک عمارت کو بنکر کی شکل میں تبدیل کر کے اپنے فلسطینی بھائیوں کے ہمراہ الشیاح کے محلے کا دفاع کر رہے تھے۔ جو مسلمانوں کے لیے باعثِ شرف ہے۔ یہ عمارت خیابان اسعد سے چند میٹر کے فاصلے پر تھی اور کتائب کی گولیوں کی زد میں تھی۔ اس عمارت میں "اُمل" کے بارہ مجاہد موجود تھے جن میں ایک باپ اور بیٹا بھی تھے۔ ان لڑنے والوں میں ایک شخص کا پوتا بھی تھا۔ یہ شخص "اُمل" کے نوجوانوں کے ساتھ مل کر کام کر رہا تھا۔

جنگی چالوں کے نقطہ نظر سے کسی ایسے مورچے یا بنکر میں رہنا درست نہیں جو بطور بنکر نہ بنا ہو اس لیے یہ بات ضروری تھی کہ نئے اور مضبوط بنکر بنائے جائیں اس لیے فیصلہ کیا گیا کہ خیابان اسعد کے قریب کنکریٹ سے ایک بنکر تیار کیا جائے اور وہاں سے دشمن پر حملے کیے جائیں اس قسم کے بنکر کے بنانے کے لیے چند شرطیں ضروری ہیں، بہادری ہو، شہادت پر ایمان کی قوت ہو، بردباری ہو اور سیمنٹ کے اور ریت کے تھیلے اور لوہے کے سریے اٹھانے کی ہمت ہو۔

ان مجاہدین نے اپنا کام بڑے ذوق و شوق اور خدا پر بھروسے سے شروع کر دیا۔ ابھی تھوڑی ہی مدت گذری تھی کہ کتائب نے ان لوگوں کو دیکھ لیا اور ان پر گولیوں کی بارش شروع ہو گئی لیکن خوش قسمتی سے کسی کو کوئی نقصان نہ پہنچا۔ ان لوگوں نے موت کے خوف کے بغیر مسلسل کئی گھنٹوں تک کام کیا۔ دوسرے دن بھی یہ کام میں مصروف ہو گئے۔ اب کے یہ ضروری تھا کہ ریت کی بوریاں اٹھائیں، چونکہ ان کے اٹھانے کے لیے کوئی وسیلہ نقل موجود نہ تھا

[1] یہ بیان لبنان میں قلمبند کیا گیا۔

اس لیے ان کے لیے ضروری تھا کہ وہ اسے اپنی کمر پر اٹھا کر بنکر کے مقام پر پہنچائیں۔ تھوڑی ہی دیر میں ریت کی بوریاں ایک دوسرے کے اوپر کافی تعداد میں رکھ دی گئیں۔ جب کتائب کے لوگوں نے یہ دیکھا تو انھوں نے ان پر گولیاں برسانا شروع کر دیں۔ ناگاہ ایک گولی محمد بسام حسادی کے کندھے پر لگی اور وہ بے چارہ زمین پر گر گیا۔ اس کے زخم شدید تھے لیکن شیعوں کو موت سے کوئی باک نہیں ہوتا۔ زخمی کو وہاں سے اٹھا کر ہسپتال میں لے گئے۔ باقیوں نے اپنا کام جاری رکھا چونکہ ابو حمید (محمد بسام حسادی کا جنگی نام) نے وہاں سے جاتے ہوا کہا تھا کہ بھائیو بنکر کو پورا کرو اور آگ اور لوہے سے ہراساں نہ ہونا۔

بدقسمتی سے جو گولی اسے لگی تھی وہ اس قسم کی تھی جو جسم میں داخل ہو کر پھٹ جاتی ہے یہ گولی بھی اس کے کندھے میں داخل ہو کر پھٹ گئی اور اسے بہت زیادہ نقصان پہنچایا۔ ابو حمید بارہ گھنٹے موت کے ساتھ دست بگریبان رہا اور آخر جامِ شہادت پی گیا۔ دنیا سے رخصت ہوتے وقت اس نے ایک ریوالور اور ایک وصیت چھوڑی اور وہ یہ تھی "بھائیو! فتحیاب ہونے تک اپنے ہتھیاروں کو زمین پر نہ رکھنا، انسانیت دشمن کتائبیوں کو جو لبنان کے محروم لوگوں کا خون چوس رہے ہیں۔ مہلت نہ دینا اور اپنی عمر کے آخری لمحے تک الشیاح کا دفاع کرنا کیونکہ عزت و آبرو کی موت شرمساری کی زندگی پر ہزار بار ترجیح رکھتی ہے [1]

حی لیلکی اور المدرسہ الانجیلیۃ کی تسخیر!

کفر شیما حی لیلکی اور مسلم ایسے مناطق ہیں جو حدث کے پہاڑی محلے کے دامن میں واقع ہیں جو حزب الکتائب اور حزب الاحرار کا اڈا ہے۔ ان محلوں کے رہنے والے سب کے سب محروم اور بدنصیب شیعہ ہیں جو انتہا درجے کی غربت اور بدنصیبی کی زندگی گزارتے ہیں۔ اور زندگی کے بنیادی وسائل سے بھی محروم ہیں، اس علاقے میں سردیوں میں اس قدر دھول ہوتی ہے کہ بعض جگہ آدمی کے پاؤں گھٹنوں تک دھولوں میں دب جاتے ہیں۔ اس علاقے کے تنگ و تاریک گلیاں اور کوچے اور

[1] اس واقعہ کا بیان لبنان میں لکھا گیا اور اس شہید کی وصیت کا آخری فقرہ امام حسین علیہ السلام کے قول سے ماخوذ ہے۔ جس کے الفاظ ہیں، الموت فی العز خیر من الحیاۃ فی الذل یعنی عزت کے ساتھ مرنا ذلیل ہو کر زندہ رہنے سے کہیں بہتر ہے۔

Presented by Ziaraat.Com

معمولی قسم کے مکان غربت اور محرومی کا رقت آفرین منظر پیش کرتے ہیں۔

فرقہ وارانہ جنگوں کے دوران میں کتائبی عیسائی ہمیشہ ان علاقوں کے شیعوں کو اپنی گولیوں کی زد میں لایا کرتے تھے اور اُمل کے جوان بھی شیعوں کے دفاع کے لیے اس علاقے کی حمایت میں مصروف رہتے تھے. کتائب کا طریقہ یہ تھا کہ وہ حدث کی اونچی اونچی عمارتوں سے اس علاقے میں ہر چلنے پھرنے والے کو گولیوں کا نشانہ بناتے جس کا نتیجہ یہ نکلتا کہ دن کے وقت یہاں چلنا پھرنا موت کی ہم رکابی کے مترادف تھا۔

حی لیلکی اور حدث کے درمیان ایک بہت بڑا مدرسہ المدرسۃ الانجلیلیۃ کے نام سے واقع ہے. کتائب نے اس مدرسے پر قبضہ کر کے وہاں اپنا مرکز قائم کر لیا تھا اور وہ اس مدرسے سے شیعوں کو اپنی گولیوں کا نشانہ بناتے لہٰذا یہ طے کیا گیا کہ اس مدرسے کو کتائبیوں کے تسلط سے آزاد کروایا جائے۔ اس مقصد سے چار جوان "اُمل" سے لیے گئے اور چار "فتح" سے اور انھوں نے ایک مشترکہ پروگرام کے ماتحت مدرسے پر حملہ کر دیا۔ حالانکہ کتائبیوں کی گولیوں کی بارش اور ان کے راکٹوں کے دھماکے قیامت برپا کر رہے تھے۔ فتح کے چاروں جوان شہید ہو گئے۔ لیکن "اُمل" کے نوجوانوں نے بڑی تیزی اور شدت سے اپنے آپ کو مدرسے تک پہنچا دیا اور ہلکی مشین گنوں کے وسیلے سے مدرسے کا راستہ کھولا اور اس میں داخل ہو گئے۔ "اُمل" کے نوجوانوں کے ہراول بعلبک کے ایک بہادر اور مومن منیر وندشں تھے. انھوں نے حملے سے پہلے دو رکعت نماز پڑھی اور اپنے دوستوں اور ساتھیوں کو خدا حافظ کہا اور منزلِ شہادت کی طرف روانہ ہو گیا منیر کے پاس کلاشنیکوف کے تین میگزین تھے جو مجموعی طور پر نوے گولیوں پر مشتمل تھے۔ منیر شوق شہادت میں اس قدر سرشار تھے کہ وہ زندگی اور موت کے درمیان فرق نہ کر رہے تھے[1]۔ وہ بڑی بہادری اور تیزی سے مدرسے کی عمارت کے پاس پہنچے اور اپنی کلاشنیکوف کی گولیوں سے دائیں بائیں کتائبیوں کو بھون ڈالا اور اپنے دوستوں کے لیے راستہ کھول دیا۔ جب ایک میگزین ختم ہو

[1] یہ کیفیت اس شخص کے صحیح ماننے والوں اور غلاموں کی ہو سکتی ہے جس کا قول تھا کہ مجھے اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں ابن ابیطالب کی جان ہے، لڑتے وقت مجھے یہ پتا نہیں ہوتا کہ میں موت پر جا پڑوں گا یا موت مجھ پر آ گرے گی۔

جاتا تو فوراً دوسرا میگزین چڑھا لیتا اور اپنی پیش قدمی جاری رکھتا۔ اس نے سات کتائبیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا حالانکہ اس کے اور اس کے ساتھیوں کے درمیان خاصہ فاصلہ پیدا ہو گیا تھا۔ لیکن اس نے اپنی پیش قدمی جاری رکھی. یک دم اس کی تمام گولیاں ختم ہو گئیں۔ اور کتائب کی ایک گولی اس کے سر کو لگی۔ اس کے ساتھی جلدی اس کے پاس پہنچے اور مدرسے کو کتائبیوں سے پاک کر دیا۔ منیر نے اپنے قلبی سکون اور شہادت کا افتخار لے کر اس دنیا سے سفر کیا اور اپنی نوجوان بیوی اور دو ماہ کے بچے کو اس دنیا میں چھوڑا تاکہ وہ بچہ بھی جوان ہو کر باپ کی راہ پر چلے[1]

زحلہ کے مرتفعات پر حملہ

بیروت پر کتائب کا حملہ بڑی شدت اختیار کر چکا تھا اور مسلمان محلے یکے بعد دیگرے ان کے تسلط میں آ رہے تھے۔ شیعوں کا ایک محلہ غوارنہ پر دو ہزار کتائبی گوریلوں نے حملہ کیا۔ یہ محلہ چند روز کی مزاحمت کے بعد کتائب کے ہاتھ آ گیا۔ اس میں تقریباً پچیس افراد نے جام شہادت پیا۔ محلے پر قبضہ کرنے کے بعد کتائب نے اس کے تمام بالغ مردوں کو جن کی تعداد چار سو کے قریب تھی محلے کے مرکزی میدان میں جمع کیا تاکہ انھیں اپنی گولیوں کا نشانہ بنا کر دیر یاسین[2] کی یاد تازہ کریں اور اس کا مقصد یہ تھا کہ مسلمان اپنے علاقوں سے بھاگ جائیں اور میدان کتائب کے ہاتھ میں رہے ایک فوجی افسر نے جو قریب سے اس واقع کو دیکھ رہا تھا اور کتائب کے شیطانی منصوبے سے آگاہ ہو چکا تھا، سید موسیٰ الصدر کو ٹیلیفون سے خبر دی کہ اگر انھوں نے ذرا سی دیر کی تو چار سو شیعہ اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے۔ غوارنہ امل کے ملیشیا کے لیے ایک کمزور نکتہ تھا۔

[1] یہ بیان لبنان میں لکھا گیا [2] دیر یاسین فلسطین کا ایک قصبہ تھا جہاں اسرائیلی دہشت پسندوں کے گروہ ہاگانہ نے وہ قتل عام کیا کہ دنیا اس پر لرز اٹھی۔ اب بھی فلسطینی جب شدید ظلم و ستم کی طرف اشارہ کرنا چاہیں تو دیر یاسین کا ذکر کرتے ہیں۔ فلسطینیوں کے اس قتل عام کی مثال اگر کہیں ملتی ہے تو اردن میں جہاں ستمبر ۱۹۷۰ء میں فلسطینیوں کو ٹھکانے لگانے کی کوشش کی گئی تھی۔ فلسطینی اس واقعے کو "ایلول الاسود" یعنی ستمبر سیاہ سے یاد کرتے ہیں۔

Presented by Ziaraat.Com

اور کسی طرح یہ ممکن نہ تھا کہ براہ راست ان بے گناہ اسیروں کی مدد کی جا سکے۔ سید الصدر نے ان لوگوں کی جان بچانے کے لیے جو اقدام کیئے ان میں ایک یہ تھا کہ بعلبک کے شیعوں کو حکم دیا کہ وہ زحلہ کے عیسائی شہر کا محاصرہ کرلیں اور اس پہ گولہ باری کریں۔ اس سیاسی اور فوجی چال کا مقصد یہ تھا کہ کتائب کو خبردار کیا جائے کہ اگر غوارنہ کے شیعوں کو نقصان پہنچا تو زحلہ میں بھی وہی داستان دہرائی جائے گی۔ اس طریقے سے ان چار سو افراد کو یقینی موت سے نجات ملی!

زحلہ کا محاصرہ ایک سیاسی اقدام تھا اور اس کا مقصد کتائب کو دھمکی دینا اور ان پر دباؤ ڈالنا تھا۔ زحلہ کے محاصرے کے دوران میں بعلبک کے جوانوں نے جس بہادری کا ثبوت دیا اس کی مکمل تفصیل بیان کرنے کے لیے ایک الگ کتاب چاہیئے۔ بعلبک کے لوگوں کے اس حملے میں "امل" کے جوانوں نے زحلہ کے مرتفعات میں کرک کے گاؤں پر بھی حملہ کیا جس میں وہ کامیاب ہوئے۔ اس میں "امل" کا ایک نوجوان محمد راغب لقیس شہید ہوا۔

یہ جوان کتائب کی گولیوں کی زد میں آکر اپنے ساتھیوں سے بہت دور زمین پر گرا تھا۔ گولیوں کی بارش میں اس کی لاش کو لانا ایک امر محال معلوم ہوتا تھا۔ لیکن انقلابی شرافت اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ شہید ہیرو کی لاش دشمن کی نظروں کے سامنے زیادہ دیر تک رہے۔ اسے ہر قیمت پر کتائب کے منطقے سے نجات دلانا ضروری تھا۔ اس لیے "امل" کے چار فدائی برستی گولیوں میں دشمن پر حملہ آور ہوئے اور بے مثال شجاعت کا ثبوت دیتے ہوئے شہید کی لاش کو لے آئے۔ حالانکہ اسی قسم کے ایک اور واقعے میں بائیں بازو کی جماعتوں کے چند افراد موت کی آغوش میں چلے گئے تھے اور ان کی لاشیں کئی دنوں تک دشمن کی زد میں رہیں اور ان خفتگانِ خاک کے دوستوں کو یہ ہمت نہ ہوئی کہ ان کی لاشوں کو لے آتے۔ آخر کار صلیب احمر اور فوج کے ذریعے سے وہ لاشیں حاصل کی گئیں اور ان کے رشتہ داروں کے حوالے کی گئیں [1]

حی مسلم سے کتائب کا فرار!

مسلم اور لیلکی کے قریوں کے درمیان ایک چھوٹا سا گاؤں ہے جس کا نام قریۃ الصدر النموذجیۃ

[1] اس حادثے کا بیان لبنان میں تحریر ہوا۔

(سید الصدر کا مثالی گاؤں) تھا۔ اس کی زمین مجلس الاسلامی الشیعی الاعلیٰ کی طرف سے اور آقائے صدر کی کوششوں سے حاصل کی گئی تھی۔ اس گاؤں کے رہنے والوں کی اغلب تعداد بعلبک کے شیعوں پر مشتمل تھی۔ یہ گاؤں حدث کے پہاڑی علاقے کے بالکل دامن میں آباد تھا جو کتائب کا بہت بڑا اڈا ہے اور جو ہمیشہ اس پر حملے کرتے رہتے ہیں۔ حدث اور اس گاؤں کے درمیان کی زمین ڈھلوان ہے اور باغ اور چھوٹے چھوٹے درختوں سے ڈھکی ہوئی ہے۔ ایک دن کتائب کے ایک بہت بڑے گروہ نے نہایت خاموشی سے اس گاؤں پر حملہ کر دیا اور اس کا دفاع کرنے والوں کو پسپا کر کے گاؤں کے گھروں کے قریب پہنچ گئے۔ یہ صورت دیکھ کر گاؤں کے لوگ اس بڑی طاقت کے مقابلے میں بھاگ گئے۔

ایک بھاری مشین گن کے ساتھ چھے کتائبی جنگجو حدث اور اس گاؤں کے درمیان ایک بلندی پر جمے بیٹھے تھے اور گاؤں کا دفاع کرنے والوں پر گولیاں برسا رہے تھے اور اس طریقے سے حملہ آوروں کو چھاتا مہیا کر رہے تھے۔ اس گاؤں کے شیعہ مجاہدین میں سے ایک چودہ سالہ لڑکا احمد شبل بھی تھا جس نے کتائب کو گاؤں کے گھروں کے قریب پہنچتے دیکھ لیا تھا۔ اس کے لیے یہ ممکن نہ تھا کہ زندہ رہے اور ان گھروں کو برباد ہوتے دیکھے اور یہ بات بھی اس کے مجال میں نہ تھی کہ اس گاؤں کو حملہ آوروں سے بچا سکے۔ لیکن اس نے بے حد دلیری اور شجاعت سے کام لے کر ایک بے نظیر کارنامہ سرانجام دیا اور اس گاؤں کو کتائب کے ہاتھوں سے نجات دلائی۔

احمد شبل نے نہایت پھرتی سے اپنی کلاشنکوف سنبھالی اور چھپتا چھپاتا ایک نالے کو پار کر کے کتائب کے دستوں کے پیچھے جا پہنچا اس نے نہایت تیزی سے اس بھاری مشین گن پہ حملہ کیا اور چھے کے چھے کتائبیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ البتہ اس کے چھوٹے سے جسم میں یہ طاقت نہ تھی کہ اس بھاری مشین گن کو اٹھا کر لے آئے۔ ہاں یہ ضرور ہوا کہ اس کے خاموش ہونے سے کتائبی بہت پریشان ہوئے اور گاؤں کی حفاظت کرنے والوں کو اطمینان سا ہوا۔ انھوں نے حملہ آوروں پر گولیاں برسانا شروع کر دیں۔ چونکہ کتائبیوں کو بڑی بھاری مشین گن کی حمایت حاصل نہ تھی اس لیے وہ سراسیمہ ہو کر حدث کی جانب پسپا ہو گئے اور اپنے پیچھے بہت سی لاشیں چھوڑ گئے۔[1]

[1] [illegible]

Presented by Ziaraat.Com

الشیاح میں پیئر جمیّل بلڈنگ کی بربادی

یہ وہ دن تھے جب تل الزعتر اور دکوانہ کا محاصرہ جاری تھا۔ کتائبی اور حزب الاحرار (کمیل شمعون کی جماعت) والے صہیونیت اور عالمی استعمار کی مدد سے کشت و خون اور گھروں کی بربادی میں مصروف تھے۔ ان حالات میں خاموش بیٹھنا اور تماشا دیکھنا بہت بڑا جرم ہے (فَضَّلَ اللهُ الْمُجَاهِدِيْنَ عَلَى الْقَاعِدِيْنَ اَجْرًا عَظِيْمًا، خداوند عالم نے مجاہدین کو ہاتھ پہ ہاتھ رکھ کر بیٹھنے والوں پر اجر عظیم دے کر فضیلت دی ہے)۔ پیئر جمیّل بلڈنگ میں واقع ایک مکان کی پشت سے کتائب کے جرائم پیشہ لوگ الشیاح پر گولا باری کرتے جس سے روزانہ کئی بچے، عورتیں، بوڑھے اور جوان شہید ہو جاتے اور بہت سے گھر راکٹوں اور مارٹروں کے گولوں کا نشانہ بنتے۔

"فتح" اور "امل" کے فوجی کمانڈروں نے یہ دیکھا کہ اس گولہ باری کی روک تھام کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ اس بلڈنگ کو تباہ کر دیا جائے۔ اب سوال یہ تھا کہ یہ بلڈنگ تباہ کیسے ہو۔ اس کا جواب ڈائنامیٹ کے سوا کچھ نہ تھا۔ لیکن پھر سوال پیدا ہوتا تھا کہ ڈائنامیٹ سے اس بلڈنگ کو اڑانے کا کام کن لوگوں کے ذریعے سے ہو۔ اس مسئلے کو "فتح" اور "امل" کے جوانوں کے سامنے رکھا گیا۔ یہ سن کر ان کی آنکھوں میں خوشی کے مارے چمک سی پیدا ہو گئی انھوں نے یک آواز ہو کر اپنی آمادگی کا اظہار کیا اور کہا کہ وہ اس بلڈنگ پر حملہ کر کے اسے برباد کر دیں گے لیکن سب لوگوں کا مل کر حملہ کرنا نہ معقول تھا نہ ممکن کیونکہ اس بات کا امکان تھا کہ سب کے سب دشمن کی گولیوں کی زد میں آ کر شہید ہو جائیں۔ اس لیے کمانڈروں نے ان میں سے بہترین افراد کو چنا اور باقی ماندہ افراد کو مختلف بنکروں اور مورچوں میں متعین کر دیا تاکہ وہ انہیں چھاتہ (حفاظتی) مہیا کر سکیں۔ مقررہ وقت قریب آ گیا اور ان چڑیوں (یہ وہ نام ہے جو اس گروہ کو لوگوں نے دیا تھا) نے بڑی ہوشیاری سے رات کی تاریکی میں حصولِ شہادت کے جذبے سے سرشار ہو کر کئی کلو ڈائنامیٹ منتقل کیا۔

اس بلڈنگ کی تین منزلیں تھیں اور لازم تھا کہ یہ ساری بلڈنگ پوری طرح برباد ہو جائے وہ جوان جن کی قسمت میں اس حملے میں شرکت نہ لکھی تھی اور وہ مورچوں میں بیٹھے بڑی تیز نگاہی سے اپنے ان بھائیوں کے اقدام اور ان پر دشمن کے حملے کا معائنہ کر رہے تھے انھوں نے کچھ سائے دیکھے جو بڑی پھرتی سے اس بلڈنگ کے نزدیک پہنچے اور وہاں کام میں مشغول ہو گئے چند منٹ گزرنے کے بعد وہ لوٹ آئے۔ اس گروہ نے ۴۵ منٹ کے وقفے میں اپنا کام مکمل کیا اور اس کام میں ایک معمولی سی غلطی بھی نہ کی۔ سب لوگ ان کے کام سے خوش تھے۔ بلڈنگ دھماکے کے لیے تیار ہو چکی تھی اور فلیتے آگ دکھانے والا گروہ حکم ملنے کے انتظار میں تھا۔

رات کی تاریکی میں دو گولیوں نے فضا کو منور کر دیا۔ یہ علامت تھی جو کمانڈروں کی طرف سے دھماکے کرنے کی اجازت کے طور پر دی گئی تھی۔ چند سیکنڈ کے بعد بڑا شدید دھماکہ ہوا۔ لوگ سراسیمہ ہو کر اپنے گھروں سے باہر نکل آئے۔ فضا پر گرد و غبار چھا گیا۔ لوگ نہیں جانتے تھے کہ یہ ہوا کیا ہے فقط ان لوگوں کو اس کا علم تھا جو ریت کی بوریوں کے پیچھے چھپے بیٹھے تھے یا منطقہ الشیاح کے شب زندہ دار لوگ یہ جانتے تھے کہ یہ ہوا کیا ہے۔ صبح کے وقت لوگوں نے اپنے گھروں سے دیکھا کہ کتائبیوں کی یہ بلڈنگ زمین بوس ہو چکی ہے اور اب اس جگہ سے نہ کسی گولے کے چلنے کی آواز آتی ہے اور نہ کسی مکان کے گرنے کی کیونکہ دشمن اس جگہ سے پسپا ہو چکا تھا[1]

عین الرمانہ پر حملہ

مسلمانوں کے حوصلے پست ہو چکے تھے، بائیں بازو کی جماعتیں ساری کی ساری فرار کر چکی تھیں فلسطینی تنظیمیں ناکارہ ہو چکی تھیں، حتیٰ کہ فتح کے لوگ بھی کتائب کے مقابلے سے عاجز آ چکے تھے۔

تل الزعتر اور دکوانہ دونوں علاقے دو ماہ سے کتائب کے محاصرے میں تھے۔ روزمرہ کی ضروریات ناپید تھیں۔ ایک کلو روٹی اپنی اصلی قیمت سے کئی گنا مہنگی ملتی تھی۔ کتائبی نسل پرست اس علاقے میں روٹی بھی لانے نہیں دیتے تھے۔ فلسطینی مزاحمت فتح نے ۴۸ گھنٹے کا الٹی میٹم دے رکھا تھا کہ اگر آٹا لانے کے لیے محاصرہ کرنے والوں نے اجازت نہ دی تو پھر وہ براہ راست

[1] یہ بیان لبنان میں لکھا گیا۔

Presented by Ziaraat.Com

جنگ میں شریک ہو جائیں گے اور زور بازو سے محاصرے کو توڑیں گے۔ فوج نے یہ کوشش کی کہ دو ٹرک آٹا تل الزعتر میں لائے لیکن کتائب نے ان پر حملہ کر دیا اور گولیوں کی بارش کے مقابلے میں انھوں نے پسپائی میں اپنی سلامتی جانی۔

آخر کار فتح کے لیڈروں نے حملے کا حکم صادر کیا اور فلسطینی فدائیوں نے ایک خون ریز لڑائی میں شرکت کی جو چار دن تک جاری رہی زمین لڑنے والوں کے خون سے رنگین ہو چکی تھی۔ گولوں کے پھٹنے اور مکانوں کے گرنے کی آوازیں ایک لمحے کے لیے بھی خاموش نہ ہوتی تھیں۔ اس چار روز کی خون ریز جنگ کے بعد "فتح" کے جوانوں کو پسپا ہونا پڑا اور تل الزعتر اور دکوانہ کے علاقے مایوسی کے عالم میں کتائب کے محاصرے میں پڑے رہے۔ اس کے مقابلے میں کتائب نے اب اپنے مقابل لوگوں کا صفایا کرنے کی ٹھان لی۔ انھوں نے ضُبَیَہ کا کیمپ اپنے قبضے میں کر لیا جس میں زیادہ تر فلسطینی عیسائی آباد تھے۔ کتائب نے یہاں بے شمار لوگوں کو قتل کیا اور تمام گھروں کو برباد کر دیا۔ اس کے بعد انھوں نے مُسلَخ اور قرنطینا کے علاقوں پر حملہ شروع کیا۔ ان علاقوں میں مسلمان آباد تھے۔ چند روز کی لڑائی کے بعد انھوں نے ان دونو علاقوں کو برباد کر دیا۔ تمام لڑنے والوں کو مار دیا اور یوں چنگیز کی داستان دہرائی۔ انھوں نے بچوں اور عورتوں کو بھی قتل کیا اور مرنے والوں کی لاشوں پر شراب پی کر رقص کرتے رہے۔ یہ واقعہ ۱۹ جنوری ۱۹۷۶ کو پیش آیا۔

مسلخ اور قرنطینا کی لڑائی کے ہنگامے میں جب مسلمانوں کے حوصلے بے حد پست ہو چکے تھے اور مایوسی کی اس تاریکی میں امید کی کوئی کرن دکھائی نہ دیتی تھی فلسطینی مزاحمت (فتح) نے فیصلہ کیا کہ مسلخ اور قرنطینا پہ کتائب کا دباؤ کم کرنے کے لیے اور مسلمانوں کی ڈھارس بندھانے کے لیے الشیاح اور عین الرمانہ کے علاقے میں کچھ دلیرانہ اقدام عمل میں لائے جائیں۔

عین الرمانہ کتائب اور حزب الاحرار (کمیل شمعون کی پارٹی) کا بے حد مضبوط مرکز تھا۔ یہیں پر دس ماہ قبل یعنی اپریل ۱۹۷۵ء میں کتائب نے فلسطینیوں کی ایک بس پر گولیاں چلائیں پھر اس میں سوار لوگوں کو قتل کیا اور یوں خانہ جنگی کے سلسلوں کا آغاز کیا۔ الشیاح کے علاقے میں مسلمانوں کی فوجی قوت بہت کم ہو گئی تھی۔ بائیں بازو کی پارٹیاں سب کی سب پیچھے ہٹ گئی تھیں۔ صرف تین گروہ رہ گئے تھے اور آمادۂ جنگ تھے۔ ان میں سے پہلا گروہ "فتح" کا تھا جس کا کمانڈر شاستری تھا۔ یہ بہت مشہور

اور تجربہ کار فدائی تھا جس نے اردن میں بڑی جاں فشانی کے جوہر دکھائے تھے۔ یہ یاسر عرفات کے ذاتی دوستوں میں شمار ہوتا تھا اور اپنی بہادری اور ماہرانہ صفات کے لیے بے نظیر سمجھا جاتا تھا۔ فتح کے ذمہ الشیاح کی جنوبی سمت سے عین الرمانہ پر حملہ کرنا تھا۔ دوسرا گروہ صاعقہ کا تھا۔ وہ سوریا کی پشت پناہی میں کام کرتا تھا اور فتح کے بعد مسلمانوں کی سب سے بڑی طاقت شمار ہوتا تھا اس گروہ کے ذمہ یہ تھا کہ وہ شمال کی جانب سے عین الرمانہ پر حملہ کرے۔ تیسرا گروہ حرکت المحرومین کا بازوئے شمشیر زن تنظیم امل تھا۔ اس کے افراد سب شیعہ تھے۔ اسلحہ کم تھا۔ فوجی تربیت بھی بے حد محدود تھی۔ البتہ شجاعت و ایمان کی خصوصیات سے متصف اور قربانی و شہادت کے جذبوں سے سرشار تھا۔ تنظیم امل کے جوانوں کی ذمہ داری تھی کہ وہ الشیاح کے مرکز سے عین الرمانہ کے مرکز پہ حملہ کریں۔

جب وقت مقررہ آن پہنچا تو پروگرام کے مطابق تین طرف سے حملہ شروع ہو گیا۔ الشیاح اور عین الرمانہ کے علاقے بموں، راکٹوں اور گولوں کی بنا پر لرز رہے تھے۔ یہ لڑائی عزت و شرف کی لڑائی تھی لوگوں کی نگاہیں الشیاح پر لگی تھیں جس کی گلیاں خون سے پر تھیں، جس کے لوگ ستم زدہ تھے اور مکان داغ داغ تھے۔ یہاں پر تقدیر نے قلم ہاتھ میں لیا کہ مسلمانوں کے مقدر کا نقشہ کھینچے۔ زندگی یا موت کی جنگ جاری تھی۔ شریفانہ موت بے غیرتی اور غلامی کی زندگی سے ہزار درجے بہتر ہے۔ سر پر کفن باندھے ہوئے شیعہ نوجوان یہ چاہتے تھے کہ اپنے قربانی و شہادت کے جذبے سے غلامی کی زنجیروں کو توڑ دیں اور اپنی اس بے عزتی کی زندگی سے نجات حاصل کریں۔ اپنی جان کی قربانی دے کر شیعوں کے لیے آزادی اور تشخص حاصل کریں۔

فتح کے جوانوں نے ابھی زیادہ پیش قدمی نہ کی تھی کہ کتائب کے اسلحے کی دیواروں نے انھیں عین الرمانہ میں داخل ہونے سے روک دیا۔ ان کا بہادر اور تجربہ کار کمانڈر شاستری گولی کا نشانہ بنا اور زخمی ہو گیا۔ فتح کا ایک اور افسر برکات بھی زخمی ہو گیا۔ گولی اس کے پیٹ میں لگی تھی اور دوسری طرف سے نکل گئی تھی۔ ان کے علاوہ اور بے شمار لوگ زخمی ہو گئے تھے۔ فتح کے جوانوں نے بڑی مشکل سے اپنے آپ کو اس قابل کیا کہ اپنے نیم جان کمانڈر اور دوسرے زخمیوں کو لے کر پسپا ہو جائیں گے۔

اسی طرح صاعقہ کا گروہ بھی پسپا ہونے پر مجبور ہو گیا تھا۔ اس کا کمانڈر شہید ہو گیا تھا یہ گروہ بھی

Presented by Ziaraat.Com

لپنے کا نڈر اور دوسرے شہداء کی لاشوں کو بمشکل کتائب کے ہاتھوں سے بچا کر الشیاح میں واپس آگیا
اب ساری امیدیں اور آرزوئیں تنظیم امل کے جوانوں پر مرکوز تھیں کیونکہ فلسطینی تنظیمیں پسپا ہو چکی تھیں۔
بیروت نالہ و فریاد کر رہا تھا۔ آگ کے دھوئیں نے بیروت کی فضا کو تاریک کر دیا تھا۔ زخمی اور ستم دیدہ الشیاح نے اپنے بہترین فدائی پیش کر دیئے۔ تنظیم امل کے رضا کار حسین حسینی[1] کی سرکردگی میں اپنی جرأت ایمانی اور قربانی کے جذبے سے اس قابل ہوئے کہ وہ کتائب کی دیوار اسلحہ میں شگاف ڈال دیں۔ وہ گولیوں اور راکٹوں کی بارش میں عین الرمانہ میں گھس گئے۔ یہاں نہایت خون ریز لڑائی شروع ہوئی امل کے مجاہدوں کے فولادی ارادے نے کتائب کی قوت مزاحمت کو پارہ پارہ کر دیا۔ انھوں نے نہایت کامیابی سے عین الرمانہ کے مرکز پر قبضہ کر کے وہاں کے تمام فوجی مقامات کو برباد کر دیا یہاں سے فارغ ہو کر انھوں نے ان حصوں پر حملہ کیا جن پر فتح اور صائقہ کو حملہ کرنا تھا۔ وہاں بھی انھوں نے بے شمار مواقع کو برباد کر دیا، ان کے ارادے اور ایمان نے عین الرمانہ میں جگہ جگہ عیسائیوں کے مواقع کو آگ دکھا دی۔ مختصر یہ کہ امل کے نوجوان اس خونین لڑائی میں کسی نقصان کے بغیر کامیاب ہو کر الشیاح میں واپس آگئے۔ ان کے چند افراد کو معمولی زخم پہنچے تھے۔
کامیابی کی یہ خبر جب الشیاح میں پہنچی تو تمام نبرد آزماؤں نے اس پر خوشی کا اظہار کیا اور دوست و دشمن نے اس کی تعریف و توصیف کی[2]

سعدیات اور دامور!

جنوبی لبنان میں کتائب اور حزب اللبنانئین الاحرار کا سب سے اہم مرکز جنیہ دامور اور سعدیات کا منطقہ تھا۔ یہ علاقہ بیروت سے جنوبی لبنان کو جانے والی شاہراہ پر واقع تھا۔ یہاں بے شمار بے گناہ عیسائیوں کے تشدد کا نشانہ بن کر موت کی وادی میں گم ہو گئے۔ مسلخ اور کرنتینا کے علاقوں میں کتائب کے ہاتھوں مسلمانوں کے قتل و غارت کا انتقام لینے کے لیے جنوبی لبنان کے مسلمانوں نے اس منطقے پر حملہ کر دیا۔

---

[1] یہ اٹھارہ سالہ جوان اس واقعے کے بعد ایک حادثے میں شہید ہو گیا تھا۔

[2] یہ بیان بھی لبنان میں لکھا گیا۔

حزب اللبنائمین الاحرار کا سربراہ کمیل شمعون خود سعدیات جا کر جنگی اعمال کی نگرانی اور ہدایت کرتا تھا۔ لبنانی فوج کا ایک دستہ بھی ٹینکوں، توپوں اور بھاری مشین گنوں کے ساتھ اس علاقے کے عیسائیوں کے دفاع کے لیے یہاں پہنچ گیا۔ جنگی کشتیاں اور مسلح ڈونگیاں جو لبنان بحریہ سے متعلق تھیں۔ یہاں خوراک اور ذخیرہ لاتی تھیں[1] لبنانی فوج کے ہوائی جہاز بھی مسلمانوں پر مشین گنوں سے گولیاں چلاتے اور ہوا سے زمین پر مار کرنے والے راکٹ مارتے تھے۔

یہ خونریز لڑائی چند دن تک جاری رہی لیکن آخر کار مسلمان نبرد آزماؤں نے اس علاقے میں عیسائیوں کی طاقت کو پاش پاش کر دیا اور تینوں قصبے حملہ آوروں کے ہاتھوں جل کر خاک ہو گئے۔ ان قصبوں کے سقوط سے قبل یہاں کی عیسائی آبادی نے اس علاقے کے مشرق میں جزین کی پہاڑیوں میں پناہ لی اور بہت سے لوگ متعدد جنگی کشتیوں میں بیٹھ کر فرار ہو گئے۔ خود کمیل شمعون نے ایک سرکاری ہیلیکوپٹر کے ذریعے سے فرار کرنا بہتر گردانا۔ کتائب اور احرار" کے تمام مراکز بموں سے اڑا دیئے گئے۔ خود شمعون کا خوبصورت محل نذر آتش ہو کر نمونہ عبرت بنا۔

---

[1] سعدیات دامور اور جنیہ تینوں سمندر کے کنارے اس سڑک پر آباد ہیں جو بیروت کو جنوبی لبنان کے صدر مقام صیدا سے ملاتی ہے ان میں سے دامور اور جنیہ یوں واقع ہیں کہ سمندر اور ان کے درمیان سڑک ہے لیکن سعدیات براہ راست سمندر کے کنارے ہے اصل میں "سعدیات" ایک چھوٹا سا گاؤں ہے جو سڑک کے اس پار پہاڑی کے دامن میں ہے لیکن جس وجہ سے یہ جگہ مشہور ہے وہ کمیل شمعون سابق صدر لبنان کا قلعہ نما محل ہے جو بالکل سمندر پر واقع ہے وہاں کشتیاں ٹھہرانے کے لیے گودیاں بنا کر اس محل کو بندرگاہ کی شکل دے دی گئی۔ موثق ذرائع کے مطابق یہاں اسرائیلی گن بوٹ ۵۶ سے آ رہی ہیں جب کمیل شمعون صدر تھا۔ اس نے اس محل کو عیسائی گوریلوں کی تربیت گاہ بنا رکھا تھا۔ لبنان کی خانہ جنگی میں یہ محل عیسائیوں کے لیے بڑی اہمیت کا مالک تھا۔ دامور کی جنگ میں یہیں سے لبنانی بحریہ کی کشتیاں سامان جنگ اور خوراک لاتی تھیں اور وہاں سے وہ جنوب میں دامور اور جنیہ کو بھیجی جاتی تھیں۔ بیروت سے صیدا آتے ہوئے پہلے "سعدیات" آتا ہے۔ پھر دامور اور پھر جنیہ۔

Presented by Ziaraat.Com

ان شجاعانہ لڑائیوں میں "امل" کے جوانوں نے بڑا مؤثر کردار ادا کیا جو سب کے لیے حیرت وتعجب کا باعث ہوا۔

میدان جنگ میں بھاری مشین گنیں (دوشکا) اور بڑے بڑے مارٹر بیکار پڑے تھے اور مختلف تنظیموں کے پاس کافی تعداد میں ماہرین موجود نہیں جو ان کو درست کر کے قابل استعمال بنا سکتے "امل" کے جوانوں نے موقع سے فائدہ اٹھایا اور ان مشین گنوں اور مارٹروں کو درست کر کے اہم مقامات پر پوزیشنیں سنبھال لیں۔ "امل" کے فدائیوں کے دوسرے گروہ اس اسلحہ کی حمایت میں پیش قدمی کرتے رہے۔ یہاں تک کہ لبنانی فوج کے ہوائی جہازوں کی بمباری نے بھی ان کے ارادوں کو متزلزل نہ ہونے دیا۔ بلکہ ایک مرکز پر راکٹوں کی بارش سے بربادی کے بعد انھوں نے بھاری اسلحہ اپنے کاندھوں پر اٹھا کر دوسری جگہ پہنچایا اور مناسب جگہ پر نیا مرکز قائم کر کے دشمن کو اپنا نشانہ بناتے رہے۔

پہلا گروہ جس نے "سعدیات" کمیل شمعون کے محل پر حملہ کیا وہ "امل" کے مجاہد ہی تھے جنھوں نے اللہ اکبر کے نعروں سے زمین کو لرزہ براندام کردیا اور بجلی کے مانند اس محل پر جنوب اور مغرب سے حملہ کیا۔ انھوں نے آر پی جی رائفلوں کے راکٹ مار مار کر اس کی دیواروں کو زمین بوس ہونے پر مجبور کر دیا اور شیروں کے مانند جوش وخروش سے داخل محل ہو کر عیسائیوں کے اس آخری اڈے پر قبضہ کرلیا جہاں سے ان کو کمک پہنچا کرتی تھی۔ باقیماندہ شمعونی ایک زیر زمین سرنگ کے ذریعے جو محل کو سمندر سے ملاتی تھی فرار کر گئے اور مسلمانوں نے اس منطقے کی تسخیر پر جشن کیا۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ "امل" کے جوانوں نے اللہ اکبر کے نعرے کچھ اس انداز سے لگائے کہ باقی تمام گروہ بھی "جن میں کمیونسٹ بھی شامل تھے یہی نعرے لگا رہے تھے۔

الشیاح اور حسین حسینی کا ایثار

ہمارے بہترین جوانوں اور نبرد آزماؤں میں حسین حسینی تھا جو اسی صنعتی مدرسے کا طالب علم رہا تھا۔ جس کی سربراہی میرے سپرد تھی۔ وہ حسینی سادات میں سے تھا اور اس کا خاندان

اھ یہ سال لبنان میں قلمبند کیا گیا۔

سادات حسینی میں بہت سربرآوردہ تھا۔ وہ مدرسے میں اول آیا کرتا تھا اور اسی طرح سرکاری امتحان میں پورے لبنان میں اول رہا تھا۔ ہرچند کہ وہ نوجوان تھا تاہم ہم نے الشیاح میں اسے تنظیمی امور کا ذمہ دار بنا رکھا تھا۔ الشیاح بیروت کا اہم ترین منطقہ تھا۔ یہ جوان میدان جنگ میں کتائب کے مقابلے میں بے مثال شجاعت اور بے نظیر مہارت کے ساتھ لڑا کرتا تھا ایک بہت بڑے محاذ کی ذمہ داری اس کے سپرد تھی اور اس کے ساتھ پورے منطقے کی ذمہ داری اس کے کاندھوں پر تھی۔

ایک روز میں الشیاح میں اس کے چچا کے ہاں گیا۔ اس کا خاندان بھی الشیاح ہی میں رہتا تھا۔ اس کے چچا نے کسی کو بھیجا کہ وہ حسین کو تلاش کر کے لائے تاکہ وہ ان کے ہاں دوپہر کا کھانا کھالے اور وہ اس وجہ سے کہ میں ان کے ہاں بطور مہمان آیا ہوا تھا۔ کھانا بے حد سادہ اور بغیر کسی قسم کے تکلفات کے تھا۔ شیعوں کی غربت اور محرومی کی بنا پر بالخصوص الشیاح کے منطقے میں روٹی اور تھوڑے سے شوربے کے سوا اور کوئی چیز نہ تھی۔ حسین آیا تو دوسرے لوگ بیٹھ چکے تھے ہر شخص نے کچھ نہ کچھ کھایا مگر حسین نے ایک لقمہ تک نہ لیا۔ اس کے چچا نے بہت اصرار کیا اور کہا کہ کھانا کیوں نہیں کھاتے۔ لیکن اس نے کھانا کھانے سے انکار کردیا۔ آخر کار میں نے اس سے بات کی اور اصرار کیا کہ کھانا کھالے تو اس نے مجھے کھانا نہ کھانے پر اصرار کا سبب بتایا۔ جو کچھ اس نے بیان کیا وہ حسب ذیل ہے۔

"اس سڑک میں جو کتائب کے بالکل سامنے تھی اور جہاں حسین حسینی کے ساتھی مجاہدین نے مورچہ بنا رکھا تھا وہاں ایک خستہ حال کمرے میں ایک غریب خاندان رہتا تھا۔ اس خاندان میں تیرہ بچے تھے۔ اس خاندان کا سربراہ چھ ماہ سے بیکار تھا۔ اس کا گھر جنوبی لبنان میں تباہ ہو چکا تھا۔ اور وہ خانماں برباد ہو چکے تھے اور ابھی تک انہیں زندگی بسر کرنے کے لیے کوئی ٹھکانہ نہ ملا تھا اگر کوئی جگہ ملی تو وہ یہ کمرہ تھا جو محاذ جنگ کے بالکل قریب تھا۔ ذرا تصور کیجیے ان لوگوں کی حالت کہ کتائب کے پہلے حملے میں ان کا شہید ہو جانا قدرتی بات تھی۔ چونکہ انھیں کوئی اور گھر نہ مل سکا تھا انھوں نے اس جگہ پناہ لے رکھی تھی جو نہایت خطرناک جگہ تھی اور کتائب کے مارٹروں کی زد میں تھی اسی لیے اس گھر کے مالک اسے چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ اور جنوبی لبنان کے اس بے گھر خاندان نے اپنے

Presented by Ziaraat.Com

آپ کو اس کمرے میں بند کر رکھا تھا۔

"ہمارے لڑنے والوں کی خوراک ایک چھوٹی سی سینڈوچ ہوتی تھی۔ جسے عربی میں "فوال کی سینڈوچ"[1] کہتے ہیں۔ یہ ہمبرگر کی طرح روٹی کے دو ٹکڑے ہوتے ہیں۔ جس کے اندر چنے اور پکی ہوئی پھلیاں وغیرہ بھر دیتے ہیں۔ یہ نہایت سستی چیز ہے۔ جب حسین حسینی لڑنے والوں کے لیے یہ سینڈوچ لاتا تو وہ یہ ملاحظہ کرتا کہ یہ تیرہ بھوکے بچے مورچے کے قریب اس کمرے میں ان کی طرف مسلسل دیکھتے رہتے۔ حسین حسینی کو تین دن ہو گئے تھے کہ وہ کچھ کھا نہ سکا تھا یہاں تک یہ چھوٹی سی سینڈوچ بھی نہ کھا سکا تھا۔ وہ اس دوران میں اپنے حصے کی سینڈوچ اور کسی اور کے حصے کی سینڈوچ، جو اس پر راضی ہوتا، ان بے گناہ بھوکے بچوں کو دے دیتا تاکہ ان کی بھوک کسی حد تک دور ہو سکے۔ تین دن کچھ نہ کھانے کی بنا پر اس کی انتڑیاں خشک ہو چکی تھیں اور معدہ چپک کر رہ گیا تھا۔ اب جب وہ اپنے چچا کے گھر آیا تو اس قابل نہ تھا کہ ایک لقمہ بھی حلق سے اتار سکے کیونکہ اس کا معدہ اور انتڑیاں خشک ہو چکے تھے۔ آخر وہ کہیں سے آبجوش (ابلا ہوا پانی) لائے اور تھوڑا تھوڑا کر کے اس کے حلق میں ڈالتے رہے۔ تب وہ جا کر اس قابل ہوا کہ کچھ شوربہ پی سکے"۔

یہ حسین حسینی ہمارے شہداء میں سے ہے ان لوگوں میں سے ہے جو ان جنگوں میں شہید ہوئے۔ ایسے جوان اور ایسے نبرد آزما جنھوں نے کتائب، اسرائیلیوں اور کفار کے مقابلے میں داد شجاعت دی اور منصب شہادت حاصل کیا وہ اپنی بلند ہمتی، پاکیزگی کی بناء پر پورے لبنان میں بے مثال تھے۔ فوجی نکتہ نظر سے بے نظیر تھے اور اخلاق، خلوص اور قربانی کے جذبے کے اعتبار سے مجسم اخلاق اور قربانی تھے[2]

الشیاح اور ایثار کا آتش فشاں!

---

[1] فول باقلا کی پھلیوں کو کہتے ہیں۔ جس طرح ہمارے ہاں دال کے ٹکیی لڈو بنتے ہیں اسی طرح لبنان میں اور سوریا وغیرہ میں باقلا کے لڈو بنائے جاتے ہیں، جن سے یہ سینڈوچ بنتی ہیں۔ ان کو فلیفل کہا جاتا ہے۔

[2] اس ایثار کا بیان ایران میں ایک تقریب کے دوران میں پیش کیا گیا۔

جنگ زوروں پر تھی۔ دونوں طرف سے گولوں کی بارش ہو رہی تھی جنوری ۱۹۰۹ کا زمانہ تھا بھاری مشین گن "دوشکا" کی آواز میدان جنگ کو ایک عجیب ہیبت بخش رہی تھی۔ کتائب کے مسلح رضا کار عین الرمانہ میں اونچے مقامات پر مورچوں میں بیٹھے مسلسل گولیاں چلاتے تھے! دوالشیاح میں چلنے والے ہر شخص کو اپنا نشانہ بناتے تھے۔ مسلمان مجاہدین دیواروں کے پیچھے، ریت کی بوریوں کے پیچھے اور مختلف کونوں کھدروں میں کمین لگائے بیٹھے تھے۔ جنگی اعمال کی ابتداء کتائب نے کی تھی اور مسلمان دفاع کر رہے تھے۔ کبھی کبھی وہ برائے وزن بیت اپنی دستی مشین گنوں کے گھوڑے دبا دیتے اور بغیر نشانہ لیے عین الرمانہ کی طرف گولیوں کی ایک بوچھاڑ روانہ کر دیتے۔

ہم نے الشیاح میں تین دفاعی مرکزوں کی ذمہ داری لے رکھی تھی۔ ان میں سب سے زیادہ خطرناک خیابان اسعد الاسعد کا مرکز تھا۔ معمول یہ تھا کہ لڑنے والوں کی حوصلہ افزائی اور دلجوئی کے لیے حرکت المحرومین کے لوگ اپنے مختلف مراکز کو دیکھنے جاتے اور لڑنے والوں سے ملتے، ان کے ساتھ بیٹھتے چائے پیتے، مورچوں کے پیچھے سے کتائبیوں کی پوزیشنوں کو دیکھتے۔ یہ کبھی کبھی انھیں کوئی سکیم بناتا، کبھی کبھی کوئی منصوبہ پیش کرتا، مقصد یہ کہ گھنٹوں ان دلاوروں کی صحبت میں بیٹھے رہتے۔

خیابان اسعد الاسعد کے بالکل ساتھ ایک چھوٹی سی سڑک ہے جس کا نام شارع الخلیل ہے یہ سڑک بھی خیابان اسعد الاسعد کی طرح کتائب کی گولیوں کی زد میں تھی جو ہر چلنے پھرنے والے کو اپنا نشانہ بناتے تھے۔ میں اس سڑک پر ایک اونچی دیوار کے پیچھے کھڑا تھا اور دزدیدہ نگاہوں سے دیوار پر سے عین الرمانہ کو دیکھ رہا تھا اور کتائب کی کمین گاہوں کا جائزہ لے رہا تھا۔ اس وقت سڑک بالکل خاموش تھی کوئی پرندہ تک بھی پر نہیں مار رہا تھا۔ یہاں تک کہ گولی چلنے کی آواز تک بھی نہ آتی تھی۔ موت سے زیادہ وحشتناک خاموشی سایہ کیے ہوئی تھی اور میں حیرت و ناامیدی اور تعجب کی دنیا میں سیر کر رہا تھا۔

سڑک کے اس پار مجھ سے کوئی دس میٹر کے فاصلے پر ایک گھر تھا جہاں ایک بچہ کھیل رہا تھا جس کی عمر دو یا تین سال سے زیادہ نہ تھی۔ گھر کا دروازہ کھلا تھا، یک لخت بچہ گھر سے نکل کر سڑک پر دوڑنے لگا۔ بغیر کسی ارادے کے میرے سینے سے ایک چیخ آسمان کی خبر لائی جس میں شور بھی تھا

Presented by Ziaraat.Com

اور بجلی کی کڑک بھی۔ میں نے اس قسم کی چیخ اب تک اپنے آپ سے بلند ہوتے ہوئے نہیں سنی مجھے یہ خبر نہیں کہ میں نے کیا کہا اور مجھ پر کیا کیفیت طاری تھی اور میرے شور مچانے سے کون سا آتش فشاں پھٹ پڑا تھا۔ البتہ یہ کہ اس بچے کی جوان ماں نے مضطرب ہو کر ایک چیخ ماری اور اپنے پریشاں بالوں سے ننگے پاؤں سڑک پر بھاگی۔ ابھی اس کا ہاتھ بچے تک نہ پہنچا تھا کہ گولی کی آواز بلند ہوئی اور اس کے اس سینے میں پیوست ہو گئی جس میں محبت مادری جوش کھا رہی تھی۔ اس نے ایک چکر کھایا اور چیخ مار کر زمین پر گر گئی۔ ایک ہاتھ اس نے اپنے سینے پر رکھا ہوا تھا جس کی انگلیوں سے خون کا ایک فوارہ رہا تھا اور دوسرا ہاتھ اس نے بچے کی طرف بڑھا رکھا تھا اور کہہ رہی تھی "ہائے میرے بیٹے! ہائے میرے بیٹے!" میں اب زیادہ برداشت کرنے کے قابل نہ تھا۔ صبر کا کوئی وقت نہ تھا، موت کا خطرہ اور خطرے کا ڈر بے معنی ہو چکے تھے۔ میں بجلی کی سی تیزی کے ساتھ سڑک کے درمیان میں پہنچا اور جلدی سے بچے کو اٹھایا اور چھلانگ لگا کر گھر کے دروازے میں داخل ہو گیا۔ گولیاں برس رہی تھیں ظاہر ہے کہ کتائب کے ماہر نشانچی اس موقع کے منتظر تھے۔ لیکن یہ اتفاق تھا اور احتمال تھا کہ ان گولیوں میں سے کون سی گولی ہمیں مٹی میں ملا دے گی۔

میں گھر میں داخل ہوا۔ بچہ میرے بازو کے نیچے ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔ میں اس کی ماں کی طرف متوجہ ہوا۔ میں نے دیکھا کہ اس کا ہاتھ ابھی تک اپنے بیٹے کی طرف بڑھا ہوا ہے۔ اور آنکھیں ہمیں دیکھ رہی ہیں۔ جب وہ ہماری سلامتی سے مطمئن ہو گئی تو اس نے اپنا سر زمین پر رکھ دیا اور ہاتھ بھی زمین پر گر گیا۔ میں نے بچے کو ایک کونے میں رکھا اور تیار ہوا کہ اس کی ماں کو بچانے کے لیے اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالوں۔ یہ ساری باتیں چند لمحوں میں ہو گئی تھیں لیکن اس قدر خوفناک اور شور انگیز تھیں کہ میری ہڈیوں کی گہرائیوں تک ان کا اثر ہو گیا تھا۔

اس وقت ہمارے لڑنے والے بھی پہنچ چکے تھے۔ انھوں نے ہر گوشے سے عین الرمانہ کی طرف بے تکان گولیاں چلانا شروع کر دیں۔ گولیوں کی اس بارش نے ہمارے لیے ایک چھاتہ سا مہیا کر دیا۔ میں اس وقت تک سڑک کے درمیان میں پہنچ چکا تھا ایک اور رضاکار نے بھی مدد کی اور ہم جلدی سے ماں کو گھر میں لے آئے۔ بچہ فوراً ماں کی گود میں چلا گیا۔ ماں

نے ایک آہ کھینچی اور بچے کو اپنے سوراخ شدہ سینے سے لگا لیا۔ بچہ رو رہا تھا اور ماں کی آنکھوں سے آنسوؤں کے قطرے گر رہے تھے خوشی کے آنسو، شکر کے آنسو، کہ اس کا بیٹا بچ گیا ہے۔

البتہ ماں کے ہاتھ آہستہ آہستہ سُن ہو گئے۔ اس کی آنکھیں بھر گئیں۔ ہاں ماں اپنی جان فدا کر چکی تھی اور بچہ ابھی تک رو رہا تھا۔ ہمسایوں کی عورتیں اور بچے جمع ہو چکے تھے۔ نالہ و فریاد کی صدائیں بلند تھیں۔ لوگ آ جا رہے تھے اور خاصی بھیڑ لگ گئی تھی۔ لیکن میں ایک اور دنیا میں پھر رہا تھا۔ لوگوں سے دور، شور اور ہنگامے سے دور، میدان جنگ سے دور، اس بچے کی وجہ سے مجھے کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ بچہ جس نے جرم کیا تھا وہ جرم کیا تھا کہ اس نے اپنی ماں کو موت کے منہ میں دھکیل دیا، لیکن اس کے باوجود وہ بے گناہ تھا۔ اس کی معصوم شکل سے، اس کی اشک آلود آنکھوں سے اور اس کے لرزتے ہوئے لبوں سے پاکیزگی خلوص اور ماں کی ضرورت کا احساس ظاہر ہو رہے تھے۔

پھر میں نے ماں کی طرف نگاہ کی۔ اس کا ہاتھ ابھی تک سینے پر تھا۔ اس کی انگلیاں خون میں غرق، خشک ہو چکی تھیں۔ اس کی آنکھوں کے گوشوں پر ابھی تک آنسوؤں کے قطرے تھے اور اس کے ہونٹ مسکرا رہے تھے۔ گویا وہ آرام و آسائش سے سو رہی ہو۔[1]

---

[1] تحریر لبنان میں جنوری ۱۹۰۶ء میں لکھی گئی۔

Presented by Ziaraat.Com

باب ہجدہم

لبنان کی خانہ جنگی میں "امل" اور "فتح"

شیعیان لبنان کی تحریک![1]

شیعیان لبنان کی تحریک نے چند سال کی مدت میں کئی سو سال کی راہ طے کی ہے جس کے نتائج کا خلاصہ بیان کرنا ممکن ہے سطور ذیل میں یہ جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔

۱ ۔ اس تحریک کے زیر اثر شیعیان لبنان کو ایک تشخص ملا۔ اب ان میں ایک احساس فخر پیدا ہوا حالانکہ وہ اس سے قبل اپنے آپ کو شیعہ کہتے ہوئے شرماتے تھے۔ اور انھوں نے اپنی بدنصیبیوں اور ذلتوں کے سامنے ہتھیار ڈال رکھے تھے۔ لیکن اب انھوں نے جذبے، جوش، شجاعت و شرافت کے ساتھ علَم جہاد بلند کیا ہے اور وہ اس بات پر آمادہ نہیں کہ دنیا کی کسی طاقت حتیٰ کہ اسرائیل اور امریکہ کے سامنے سر تسلیم خم کریں اور ظلم کے سامنے ہتھیار ڈال دیں۔

۲ ۔ لبنان کے شیعوں کے لیے ایک اسلامی شیعی تنظیم وجود میں آئی جس کا آئیڈیالوجی سے تعلق ہے۔ پھر یہ کہ محرومین کو طاقت ملی انھیں مفہوم شہادت اور جہاد اسلامی کے تصور سے عملی طور پر آشنا کر دیا گیا۔ اور مزید یہ کہ پہلی بار لبنانی شیعوں کے لیے ایک عسکری تنظیم وجود میں آئی جو اس قابل ہوئی کہ اپنے لیے فوجی تربیت کے کیمپ بنا سکے اور اپنے وجود و تشخص کا مسلح دفاع کر سکے۔

۳ ۔ لبنان کے شیعوں نے فلسطینی مزاحمت کا دفاع کیا اور دکھلایا کہ اگر سید موسیٰ الصدر اور

[1] یہ جائزہ ایران کے اسلامی انقلاب سے قبل ۱۹۷۶ء میں لبنان میں سپرد قلم کیا گیا۔

حرکۃ المحرومین کا وجود نہ ہوتا اور شیعوں نے طاقت حاصل نہ کی ہوتی تو کم از کم پانچ بار فلسطینی مزاحمت "فتح" کو نیست و نابود ہونے کا خطرہ پیدا ہو جاتا اور اردن میں ہونے والے ستمبر سیاہ (۱۹۷۰ء) کے واقعات دہرائے گئے ہوتے۔ یہ فلسطین کی تحریک آزادی اور مشرق اوسط کے تمام حریت پسندوں کی بہت بڑی خدمت ہے۔

۴ ۔ شیعوں کے بارے فلسطینیوں کے نقطہ نظر میں کیفی تبدیلی پیدا ہوئی۔ اس سے قبل شیعوں کو فلسطینیوں کا دشمن گردانا جاتا تھا۔ انھیں غدار سمجھا جاتا تھا۔ انھیں دُمدار جانور قرار دیا جاتا تھا۔ اور اب یہ عالم ہے کہ بڑے بڑے فلسطینی شیعہ افکار میں دلچسپی لے رہے ہیں اور ان کی تکریم و توصیف میں اہتمام خاص سے کام لے رہے ہیں۔ چونکہ فلسطینی رہنماؤں کے افکار تمام دنیائے عرب میں پھیلے ہوئے ہیں اور اثر رکھتے ہیں اس لیے یہ بات دنیائے عرب میں شیعوں کی مقبولیت اور ان کے افکار کے احترام کا بہت اہم طریقہ ہے۔[1]

۵ ۔ اسی طرح فلسطینی مزاحمت "فتح" بھی "حرکۃ المحرومین" کی طرف داری پر کمربستہ ہے۔ اگر فلسطینی مزاحمت اس کی طرف داری نہ کرتی تو خدا جانے کتنی بار "حرکۃ المحرومین" کو ناپید ہونے کا خطرہ لاحق ہوتا۔ یہ بات اس امر کی غمازی کرتی ہے کہ مقاصد کا اشتراک اور عرب ممالک نیز دیگر مشرقی و مغربی حکومتوں سے بے نیازی ان دونوں تنظیموں کو نزدیک لانے کا سبب ہوئی ہے۔

۶ ۔ یہ کئی بار اسلام کے انقلابی افکار نظریے کی سطح سے بلند ہو کر عملی طور پر سامنے آئے ہیں۔ حقیقی طور پر مسلمان اور اہل ایمان عمل کے میدان میں اترے ہیں۔ ان کی قیادت نے استعمار کے خلاف جنگ کا بیڑا اٹھایا اور اپنے فلسفے کو عملی شکل دینے کے لیے ایک مرکز قائم کیا اور یوں انقلابی اسلام کو دنیا سے متعارف کرایا۔

۷ ۔ تمام عرب ممالک میں اسلام کے انقلابی افکار کی نشر و اشاعت ہوئی۔ اور مشرق اوسط

[1] اس کا اندازہ صرف اسی بات ہی سے ہو سکتا ہے کہ مرحوم جمال عبدالناصر نے تاریخ میں پہلی بار جامعہ الازہر میں فقہ جعفری کی تدریس کا آغاز کرایا۔

Presented by Ziaraat.Com

کے تمام مسلمانوں کو جن میں شیعہ بھی شامل ہیں، ظلم و استبداد اور استعمار کے خلاف آمادہ جنگ کیا۔ اب "حرکۃ المحرومین" کی خبریں اکثر عرب ممالک اور خلیج فارس کی امارات میں سنسر ہوتی ہیں اور ان ممالک میں "حرکۃ المحرومین" کے افکار کی نشر و اشاعت کے خلاف اقدامات عمل میں لائے جاتے ہیں[1]۔ بحیثیت مجموعی تمام ستم کش اور محروم عوام کی نگاہ لبنان پر اور "حرکۃ المحرومین" پر لگی ہے۔

۸ ۔ دوسرے مذاہب و ادیان نے مذہب شیعہ کو مورد توجہ و احترام گردانا شروع کیا[2]

[1] ان ایام میں کویت، بحرین، متحدہ عرب امارات، مسقط و عمان اور دیگر عرب ممالک میں مظلوم اور ستم رسیدہ عوام نے اپنی اپنی حکومتوں کے خلاف محاذ قائم کر رکھے ہیں اور آئے دن انکے عملی اقدامات کی خبریں سامنے آتی رہتی ہیں۔

[2] یہ بات ڈاکٹر چمران شہید نے بہت پہلے کہی تھی لیکن اس کی صداقت اب کھل رہی ہے۔ لبنان میں شیعوں کی بیداری اور اس کے بعد ایران کے اسلامی انقلاب کے جو نتائج سامنے آئے ہیں ان میں ایک بات یہ ہے کہ اب غیر مسلمان دانشوروں نے اور بالخصوص مستشرقین نے مذہب شیعہ کو بھی اس قابل سمجھنا شروع کیا ہے کہ وہ اس کا مطالعہ کریں۔ امریکہ اور یورپ کی بہت سی یونیورسٹیوں میں فقہ جعفری، شیعہ عقائد اور شیعہ ثقافت کا مطالعہ شروع ہو گیا ہے۔ ورنہ اس سے قبل جب کوئی شخص اسلام پر کتاب لکھتا تھا یا بات کرتا تھا تو اس کے سامنے صرف سرکاری اسلام اور زیادہ تر فقہ حنفی ہوتا تھا اور اس کا سبب ظاہر ہے کہ ترکی کی عثمانی حکومت نے یورپ کو جو تاثرات دیئے ہیں ان میں ایک تاثر یہ بھی ہے کہ اصلی اسلام وہ ہے جو حکومت کے زیر نگرانی کام کرتا ہے۔ اس کے علاوہ اسلام کی جتنی تعبیریں ہیں انھیں (Herecy) یعنی انحراف گردانا جاتا تھا۔ اسی لیے فقہ جعفری کی یا عقائد شیعہ کی بہت کم کتابیں غیر زبانوں میں ترجمہ ہوئی ہیں۔ مترجم کو زیادہ معلومات کا دعویٰ نہیں لیکن جو کچھ معلومات بھی اس کے پاس ہیں ان کے مطابق بیلی (Bailey) نے شرائع الاسلام کے ان ابواب کا ترجمہ کیا جن کا تعلق زواج و طلاق و وراثت کے مسائل سے تھا۔ اور وہ بھی اس لیے کہ انگریزوں کو ہندوستان میں مسلمانوں کے لیے قانون احوال شخصی Personal Law رائج کرنا تھا۔ اسی طرح فرانسیسی میں بھی شرائع الاسلام کا ترجمہ ہوا یا پھر بیسویں صدی کی چھٹی دہائی میں علامہ حلّی کے باب الحادی عشر کا ترجمہ (Eleventh Chapter) کے نام سے چھپا۔ لیکن اب صورت حال بدلتی جا رہی ہے۔ اب تو لاہور میں برکلے یونیورسٹی پروگرام

۔ بہت سے سنی نوجوان "حرکۃ المحرومین" سے وابستہ ہو چکے ہیں۔ بلکہ بہت سے غیر متعصب عیسائی بھی جو فرقہ پرستی سے آزاد ہیں وہ "حرکۃ المحرومین" سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ لوگ شیعوں کی تحریک بیداری کو عوام کی نجات کا راستہ اور استعمار و استحصال کے خلاف جنگ آزمائی کا بہترین وسیلہ سمجھتے ہیں، اور شیعہ مذہب نے اپنے آپ کو دوسرے ادیان و مذاہب سے ایک ترقی پسند اور انقلابی مذہب کے طور پر روشناس کروایا ہے۔

۹ ۔ اسلامی آیڈیالوجی ایک تاریخی اور عالمی پیغام کے طور پر سامنے آ رہی ہے۔ ۱۰۰۰ سال کے بعد اسے یہ موقع ملا ہے کہ وہ اپنے وجود کا اثبات کر سکے اور تحرک اور ترقی پسندی کے لیے گنجائش پیدا کر سکے جس کا دائرہ اب لبنان کی حدود سے باہر نکل رہا ہے اور اس ارتقاء کا سراغ مل رہا ہے۔ جس کا سفر آدمؑ سے شروع ہوا اور حضرت ابراہیمؑ، موسیٰؑ و عیسیٰؑ کے زمانوں سے ہوتا ہوا جناب سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، جناب امیر المومنین علیہ السلام اور امام حسین علیہ السلام کے ادوار سے گزرتا ہوا ہمارے اپنے دور تک آن پہنچا ہے۔ یہ عظیم پیغام ارتقاء کو دنیائے جدید سے وابستہ کر رہا ہے اور انسان کے مستقبل کی آرزوؤں اور امیدوں کو ظہور حضرت ولی العصر عجل اللہ فرجہ کے زمانے تک تر و تازہ بنا رہا ہے۔

"فتح" اور "امل" کا باہمی ارتباط!

فلسطینی مزاحمت "فتح"، یاسر عرفات (ابو عمار) ابو جہاد اور بعض دوسرے فلسطینی مجاہدین کی رہبری میں اس لیے وجود میں آئی تھی کہ فلسطین کو آزاد کرانے کے مقدس مقصد کو حاصل کیا جائے۔ گیارہ سال کی مدت میں اس تحریک نے اپنی زندگی میں بہت سے نشیب و فراز دیکھے۔ اس نے ایسی پیشرفت بھی دکھائی جس کا تصور کرنا بھی ممکن نہ تھا، اس نے تمام دنیا کو اپنی جانب متوجہ کیا اور تمام ممالک کے حریت پسندوں اور انقلابیوں کی نگاہوں کا مرکز بنی۔

"فتح" نے سب سے زیادہ ترقی ۱۹۶۷ء کی شکست کے بعد حاصل کی جس جنگ کے دوران میں عربوں کی بڑی بڑی حکومتوں نے اسرائیل کے مقابلے میں گھٹنے ٹیک دیے اور عربوں کی

(بقیہ حاشیہ) کے تحت جو اسدو پڑھائی جاتی ہے اس میں بھی تشیع پر لیکچر ہوتے ہیں اور دو مرثیہ کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔

Presented by Ziaraat.Com

امیدوں اور تصورات کے محل زمین بوس ہو گئے۔ اس وقت تمام لوگوں کی توجہ انقلاب اور "فتح" کی جانب منبدول ہو گئی۔ ایک سال کی مدت میں تمام دنیا سے کوئی ایک لاکھ افراد "فتح" میں شامل ہو گئے اور "فتح" کے پاس دولت وسامان کی فراوانی بھی ہو گئی۔ "کرامہ" کا معرکہ "فتح" کی انقلابی روح "فداکاری" ایمان، تقوی اور خلوص کے اظہار معراج تھا۔ جو لوگ اس زمانے میں امام حسین علیہ السّلام کا انداز نظر رکھتے تھے وہ انھیں کے مانند نبرد آزما ہوتے تھے اور منزل شہادت تک رسائی حاصل کرتے تھے۔ انھوں نے اس معرکے میں اسرائیل کو ناکوں چنے چبوا دیئے یادر بات ہے کہ اس معرکے میں "فتح" کے ۲۵۰ فدائیوں میں سے ۱۵۰ افراد شہید ہو گئے لیکن انھوں نے اسرائیل کی کمر توڑ دی۔ مختصر یہ کہ ہزارہا تازہ وارد ارکان کے شامل ہو جانے سے "فتح" کی پاکیزہ انقلابی روح تقویٰ اور فداکاری میں تبدیلی واقع ہوئی۔ یہ تازہ واردان جب فلسطینی مزاحمت میں شریک ہوے تو اپنے ساتھ اپنی تمام نفسیاتی الجھنیں، شکست خوردہ ذہنیتیں خراب و فاسد انداز نظر، خود پسندی اور انتقام کے جذبات بھی لے کر آئے۔ انھوں نے ہتھیار سنبھالے تو، لیکن کئی بار یہ ہتھیار ان کی خود پسندی اور انا کی تسکین کے لیے استعمال ہوے "فتح" کے کم اور بے تجربہ ارکان اس قابل نہ تھے کہ نو واردوں کے اس سیلاب کو قابو میں لاتے ان کی تربیت کرتے اور ان میں درست انقلابی روح پھونکتے، "فتح" اب ایسی تنظیم کی شکل اختیار کر گئی جس کے پاس سرمایہ تھا، سامان جنگ تھا اور اسباب شہرت تھے۔ اب وہ حصول طاقت انتقام جوئی اور اپنی کمتری کے احساس اور ظلم وستم کا بدلہ لینے کا ذریعہ بن گئی تھی۔ اور آہستہ آہستہ انقلابی خلوص انقلابی ماضی اور انقلابی پرہیزگاری کو فراموش کرتی جا رہی تھی۔

بائیں بازو کے مارکسی گروہوں نے بھی "فتح" کو خاصہ جانکاہ نقصان پہنچایا، استعماری طاقتوں اور صہیونیت کے ایجنٹوں نے بھی "فتح" کے کمزور پہلو سے فائدہ اٹھایا۔ انھوں نے فلسطینی مزاحمت کو اردن کے باشندوں اور اس کی فوج سے بھڑا یا جس کا نتیجہ ستمبر ۷۰ء کے سانحے کی صورت میں نکلا۔ اردن میں "فتح" کا صفایا ہو گیا اور اس کے رضاکاروں اور جانبازوں کو اردن سے دیس نکالا مل گیا۔ ہم اس تجزیے میں کسی بنا پر اردن کے بادشاہ یا صہیونیت کو بیگناہ قرار دینے کا ارادہ نہیں رکھتے۔ اور یہ نہیں چاہتے کہ انھیں ان امور سے بری گردانیں چونکہ ہماری نظر میں دشمن دشمن

ہی ہے اور اس کا کام ہر بات میں اپنا نفع حاصل کرنا ہوتا ہے۔ جب ہم دشمن سے لڑنے جاتے ہیں تو اس سے کوئی توقع خیر وابستہ نہیں کرتے۔ کیونکہ اس کی دشمنی فطری بات ہے لیکن اگر ہماری اپنی غلطیاں اور بدگمان غالب داخلی خیانتیں، جن کی توقع نہیں کی جاتی ہماری شکست کا باعث ہوں تو ہمیں چاہیئے کہ ہم دقت نظر سے ان کا جائزہ لیں اور خیانتوں کو ہر ممکن سختی سے جڑ سے اکھاڑ پھینکیں اور اپنی شکست کا سبب دشمن کے بجائے انھیں قرار دیں۔

ستمبر سیاہ (۱۹۷۰) کے بعد فلسطینی مزاحمت کے رہنماؤں کو کچھ دیر کے لیے ہوش آئی اور انھوں نے اصلاحات پر کمر باندھی اور ان عناصر کا صفایا کرنا چاہا جن سے "فتح" کے مراکز اور اس کی صفوں میں جو بورژواری، مادہ پرستی، حصول زر اور جاگیردارانہ ذہنیت در آئی تھی۔ اس کے خلاف نبرد آزمائی کی اور اس راہ میں انھوں نے پیش رفت بھی کی لیکن افسوس کہ یہ پیش رفت سطحی اور عارضی تھی۔

اصولی طور پر "فتح" کی اپنی کوئی آئیڈیالوجی نہیں اگرچہ اس کے رہنماؤں کی غالب اکثریت مسلمان ہے۔ ان میں سے صرف ایک شخص ابو صالح کمیونسٹ ہے۔ "فتح" کا صرف ایک مقصد ہے اور وہ فلسطین کو آزاد کروانا ہے۔ ہر قسم کی آئیڈیالوجی رکھنے والا شخص "فتح" میں شامل ہو سکتا ہے۔ اس بنا پر مارکسیوں نے "فتح" میں نفوذ حاصل کر لیا، فتح میں آئیڈیالوجی کا خلا ہونے کے باعث انھوں نے بڑی تیزی سے ترقی کی اور نوجوان پڑھے لکھے رضاکاروں کی اکثریت کو انھوں نے اپنی جانب مائل کر لیا۔ چونکہ یاسر عرفات اور ابو جہاد آئیڈیالوجی اور انداز فکر کی جانب توجہ نہیں کرتے تھے اس لیے مارکسیوں نے بغیر کسی رکاوٹ کے "فتح" کے اکثر فدائیوں کو اپنے حلقہ اثر میں لے لیا۔ "فتح" کے تمام اخبارات "مجلات" نشریات اور ریڈیو ان مارکسیوں کے ہاتھ میں آ گئے۔ ایک کمیونسٹ ماجد ابو شرار، جس کا ذکر آ چکا ہے۔ "فتح" کے تمام پراپیگنڈے کا کرتا دھرتا بن گیا اور یوں اپنے کارکنوں اور فدائیوں کو مارکسی افکار کے سوا اور کوئی ذہنی خوراک نہ دیتا۔ چند دن قبل الشیاح میں "فتح" کے ایک سیدھے سادے کارکن سے میری بات چیت ہوئی، اس بچارے کا خیال یہ تھا کہ "فتح" کی آئیڈیالوجی مارکسیت ہے

Presented by Ziaraat.Com

اور میرا یہ استدلال اس کے لیے تعجب کا باعث تھا کہ فتح کی اپنی کوئی آئیڈیالوجی نہیں۔

"فتح" کے دوش بدوش اور فلسطینی تنظیمیں بھی کام کرتی تھیں اور ابتداء ہی سے وہ مارکسیت کی طرف دار تھیں۔ بعدازاں وہ سب کی سب مل کر جبہۃ الرفض کی شکل میں "فتح" کے مقابل صف آرا ہو گئیں۔ ان کی فکری رہنمائی حکیم دبیش جورج حبش کرتا تھا۔ یہ انتہا پسند گروہ "فتح" کے خاتمے کے خواہاں تھے، انھوں نے اردن میں ستمبر سیاہ کے اسباب پیدا کیے اور خود میدان سے ہٹ گئے جب کہ فتح کو ان حالات کا مردانہ وار مقابلہ کرنا پڑا اور قربانیاں دینا پڑیں۔ پھر انھیں گروہوں نے اپنی انتہاپسندی کی بنا پر ۱۹۷۳ء میں لبنانی فوج کو "فتح" کے در پے کروا دیا اور بے شمار جھگڑے ہوئے جن میں ۴۰۰ فلسطینی فدائی اور ۶۳ لبنانی فوجی کام آئے اور پھر سوریا کی مداخلت اور سید موسیٰ الصدر کی "فتح" کی حمایت میں ناقابل فراموش سرگرمیوں کی بنا پر اس جنگ کا خاتمہ ہوا

اس طرح ۱۹۷۵ء میں شروع ہونے والی لبنانی خانہ جنگی میں بھی زیادہ قصور بائیں بازو کی جماعتوں اور جبہۃ الرفض کی انتہاپسند فلسطینی تنظیموں کا ہے اگرچہ اس خانہ جنگی کا آغاز عیسائیوں نے کیا جو لبنان کی تقسیم کے خواہاں تھے۔ لیکن بائیں بازو کی جماعتیں بھی جنگ کی آگ کو بھڑکاتی اور لوگوں کو اکساتی تھیں۔

تنظیموں کے نقطۂ نظر سے جبہۃ الرفض اور بائیں بازو کی لبنانی جماعتیں "فتح" کی دشمن گردانی جاتی ہیں۔ لیکن افکار کے لحاظ سے بائیں بازو کی جماعتوں اور "فتح" کے مارکسی کارکنوں میں گہرا رابطہ ہے جب کبھی نظریاتی یا فکری اختلاف رونما ہوتا ہے۔ "فتح" کے یہ کارکن اور فدائی جبہۃ الرفض کا ساتھ دیتے ہیں اور "فتح" کی قیادت کو مفلوج کر دیتے ہیں۔ اگر "فتح" کی قیادت زیادہ دباؤ ڈالے تو پھر "فتح" کے اندر داخلی گڑبڑ کا خطرہ بڑھ جاتا ہے۔ جو بحرانی دور میں ناقابل برداشت ہے اس بنا پر ہم یہ دیکھتے ہیں کہ مارکسیوں نے اپنی آئیڈیالوجی کو "فتح" کے کارکنوں میں پھیلا کر فلسطینی مزاحمت کے حساس ترین حصوں پر تسلط جما رکھا ہے اور فلسطینی مزاحمت کے نام پر، اس کے روپ میں اور اس کے اسلحے سے اپنے افکار کی نشر و اشاعت میں مصروف ہیں۔ اس سے بھی زیادہ خطرناک بات یہ ہے کہ فلسطینی مزاحمت کے ساتھ ایک تقدس کا پہلو بھی وابستہ ہے۔ اور یہ تقدس مارکسیوں کے ہاتھ میں سب سے بڑا حربہ ہے۔

کس میں جرأت ہو سکتی ہے کہ فلسطینی مزاحمت کے اسلحے یا اس کے پیسے اس کے اثر و رسوخ اور اس کے تقدس کے مقابل کھڑا ہو سکے اور کچھ کہہ سکے؟ یہاں تک کہ خود یاسر عرفات بھی اس قابل نہیں حالانکہ وہ اس تنظیم کے سربراہ ہیں۔ یہاں تک کہ ابوجہاد بھی جو فتح کے سب سے اعلیٰ عسکری عہدے پر فائز ہیں، اس قابل نہیں کہ کچھ بول سکیں جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں اور تجربے نے اسے ثابت کر دیا ہے۔ ان حضرات نے مارکسیوں اور بائیں بازو والوں کے سیلاب کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا ہر چند کہ وہ دلی طور پر ان کے دشمن تھے تاہم عملی طور پر ان کے سامنے بے بس ہو چکے تھے اگر یاسر عرفات بائیں بازو والوں کے منہ آتے تو ان کی قیادت ختم ہو جاتی۔ سال گذشتہ کے دوران میں بائیں بازو نے یاسر عرفات کو بار بار قتل کروانا چاہا اور خود فتح کے بائیں بازو کے عناصر نے یاسر عرفات کا کانٹا نکالنے کی کوشش کی سچی بات تو یہ ہے کہ یاسر عرفات میں ایسی جرأت و شجاعت کا فقدان تھا جو انہیں مارکسیوں کی طاقت اور ان کے پراپیگنڈے کے مقابلے میں کھڑا کر سکتی۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ لبنان کی حالیہ تاریخ میں حرکۃ المحرومین اور سید موسیٰ الصدر کے حامی جوان "فتح" کے بڑی شدت سے حامی تھے۔ اور اس طرف داری کی بنا پر "فتح" کے بائیں بازو کے عناصر ان کے خلاف تھے اور ان پر حملے کرتے رہتے اس قسم کا نعرہ بھی مشہور ہو چکا ہے کہ حرکۃ المحرومین کے جوان "فتح" والوں سے زیادہ فتحی ہیں۔ چند ماہ قبل جب "فتح" میں داخلی آویزش بے حد زیادہ بڑھ چکی تھی یہ خطرہ پیدا ہو گیا تھا کہ شاید ابوجہاد "فتح" کے بائیں بازو کے عناصر کے ہاتھوں قتل ہو جائیں۔ جیسے کہ ان کے ہاتھوں نقیب فاخر اور جواد وغیرہ کو قتل کر دیا گیا تھا اور قصور ان کا یہ تھا کہ مسلمان تھے۔ اس بنا پر حرکۃ المحرومین سے درخواست کی گئی کہ ابوجہاد کی حفاظت کے لیے دس عدد جانبازوں کو بھیجے کیونکہ ابوجہاد کو "فتح" کے عناصر پر اعتماد نہ تھا۔ اس پر حرکۃ المحرومین کے ذمہ دار افراد نے اعلان کیا کہ وہ اپنی ساری فوجی طاقت یاسر عرفات اور ابوجہاد کی حفاظت کے لیے پیش کرتے ہیں۔ یہ واقعہ ۱۹۷۶

Presented by Ziaraat.Com

میں پیش آیا۔

اس بنا پر "فتح" کے بائیں بازو نے کوشش کی کہ حرکۃ المحرومین کو "فتح" سے الگ کر دیا جائے۔ سید موسیٰ الصدر کو اپنا ہدف بنایا اور حرکۃ المحرومین کے جوانوں کا صفایا کر دیا جائے۔ تاکہ "فتح" کے رہبروں کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہ رہے کہ وہ مارکسیوں کے حاشیہ بردار بن جائیں۔ سید موسیٰ الصدر کے خلاف پہلی بار مہم چلانے والا جنوبی لبنان میں "فتح" کا کمانڈ میجر ابوموسیٰ تھا[1]۔ جس نے صنور میں مسجد اس میں سید موسیٰ الصدر کے عمامے اور منبر کی توہین کی جہاں وہ جماعت کرواتے تھے اور یوں کمیونسٹوں اور بائیں بازو کے لیے راہ ہموار کی کہ وہ بھی سید موسیٰ الصدر کے خلاف تہمت تراشی دروغ بافی اور دریدہ دہنی کا طوفان برپا کریں۔

ابوموسیٰ "فتح" کی قیادت کے ایک کمیونسٹ رکن ابوصالح روس کے حامی کمیونسٹوں میں سے ہے اور بے حد اثر و رسوخ کا مالک ہے۔ اسے ایک طاقتور ملک کی حمایت بھی حاصل ہے۔ اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ پورا جنوبی لبنان اور ابوموسیٰ کی دست برد میں ہے اور اس لحاظ سے انتہاپسند مارکسی اس کا کاروبار چلاتے ہیں۔

بیروت "فتح" کے بائیں بازو کے لڑنے والوں نے کئی بار سید موسیٰ الصدر کے گھر پر حملہ کیا، وہاں کے چوکیداروں سے ہتھیار چھین لیے اور ان کی بے عزتی کی اور یوں بائیں بازو والوں کی راہ ہموار کی کہ وہ سید موسیٰ الصدر پر حملہ کریں۔ ورنہ لبنان میں کسے جرأت تھی کہ سید موسیٰ الصدر پہ حملہ کرے، انہیں گالیاں دے اور ان کی بے عزتی کرے یہ سب کچھ فلسطینی مزاحمت فتح کے نام پر اور اس کے اسلحے سے ہو رہا تھا۔ ان واقعات کی بنا پر شیعہ جوش میں آئے اور انھوں نے بعلبک میں ۱۰ فلسطینیوں سے

[1] یہ ابوموسیٰ ابتداء ہی سے یاسر عرفات کے خلاف تھا اور آخر اسی ابوموسیٰ اور اس کے ساتھیوں نے طرابلس لبنان ہی میں یاسر عرفات اور ان کے حامی عناصر کا محاصرہ کیا اور بالآخر انھیں وہاں سے نکلنے پر مجبور کیا اور اس کام میں سلیمان فرنجیہ کے ملیشیا نے ان کی مدد کی۔

ہتھیار چھین لیے اور چاہتے تھے کہ انھیں ماردیں۔ لیکن سید موسیٰ نے فوری طور پہ مداخلت کی اور شیعوں کو بڑی توبیخ کی اور سرکاری طور پر اعلان کیا کہ اگر فلسطینی میرے ایک گال پر طمانچہ ماریں تو میں دوسرا گال ان کے سامنے کر دوں گا کہ وہاں بھی ماریں اور اس کے باوجود ان کی عزت کروں گا اور کہوں گا نحن معکم (ہم تمہارے ساتھ ہیں) سید موسیٰ الصدر نے اپنی فراست فداکاری اور ایمانی جذبے نیز صداقت کی بنا پر اعلان کیا کہ میں یہ نہیں چاہتا کہ ایک ہزار سال کے بعد بھی تاریخ یہ کہے کہ شیعوں کے ہاتھ فلسطینیوں کے خون سے رنگے ہوئے ہیں"۔

سیّد الصدر نے حکم دیا کہ بائیں بازو کی جماعتوں کی حرکتوں کے باوجود اور فتح کے بعض کارکنوں کی ایذا رسانی کے باوصف "حرکۃ المحرومین" کا فرض ہے کہ وہ اپنی پالیسی پر کاربند رہے جس کا لازمی جزو فلسطینی مزاحمت کے ساتھ تعاون ہے۔ اور ان تہمتوں کو "الزامات کو" دروغ بافیوں کو اور اہانتوں کو یہاں تک کہ خیانتوں کو بھی برداشت کرے اور شیعوں کو ترغیب دے کہ وہ "فتح" کے ساتھ مل جل کر کام کریں کیونکہ اس کا ہدف بڑا مقدس ہے اور اس مقدس ہدف کی خاطر ہمیں سب باتیں برداشت کرنا چاہییں۔

اس عظمت، فداکاری اور صبر و تحمل کے مقابلے میں مارکسی ہوا کے گھوڑے پر سوار تھے اور انھوں نے اپنی رسوائی، بے غیرتی، رذالت، خیانت اور مجرمانہ ذہنیت کو اسفل السافلین کی حد تک پہنچا دیا اور وہ اس لیے کہ سید موسیٰ الصدر فلسطینی مزاحمت کے خلاف کوئی اقدام نہیں کریں گے۔ اس لیے وہ فلسطینی مزاحمت کے مورچوں میں بیٹھ کر اور اس کے تقدس کا لبادہ اوڑھ کر پوری آزادی کے ساتھ غارت گری اور فساد کو اپنا پیشہ بنا سکتے ہیں۔

ہماری ذہنی پختگی اور فداکاری اس وقت ظاہر ہوئی جب ہم نے ان تمام مصیبتوں اور آزمائشوں کو برداشت کیا لیکن ایک لمحے کے لیے بھی "فتح" سے الگ نہ ہوئے۔ اس کی حمایت سے دستبردار نہ ہوئے اور یاسر عرفات یا ابوجہاد سے رابطہ نہ توڑا ہم نے جنگ کے اولین مورچوں کبھی ترک نہ کیا حالانکہ اس وقت حالت یہ تھی کہ ہم

Presented by Ziaraat.Com

بازو کی لبنانی پارٹیاں اور جبہتہ الرفض کی تمام فلسطینی تنظیمیں بیروت سے نو دو گیارہ ہو چکی تھیں۔ فتح کے پہلو بہ پہلو صرف ہم باقی رہ گئے تھے اور ہم نے "فتح" کے ساتھ مل کر الشیاح، کفر شیما، حی لیلکی، برج البراجنہ، ردبیس کا دفاع کیا۔ جب اسرائیل نے کتائب کے ساتھ مل کر جنوبی لبنان پر حملہ کیا اور بنت جبیل کے گرد و نواح تک پہنچ گئے تو بائیں بازو کے نعرے باز دلیر نوجوان میدان جنگ سے ہوا ہو گئے تھے۔ اس وقت بھی حرکتہ المحرومین کے جوانوں نے "فتح" کے مورچوں سے آگے بڑھ کر پوزیشنیں لیں اور دفاع کیا اور آج یاسر عرفات بڑی جرأت سے یہ کہتے ہیں کہ صرف "فتح" اور "امل" اس قابل ہیں کہ جنوبی لبنان کی حمایت حاصل کر سکیں۔ آج مارکسی اور بائیں بازو کے ارکان لبنان میں شکست کھانے والے اور "فتح" اس قابل ہو گئی ہے کہ خود کو حرکت میں لائے اور بائیں بازو کے نفوذ سے کسی حد تک آزاد ہو کر اپنے قدرتی سفر پر روانہ ہو جس کی منزل فلسطین کی آزادی ہے اور اس سفر میں وہ ہر قسم کی آئیڈیالوجیوں کی آویزش سے آزاد ہو۔

گذشتہ حوادث میں دائیں اور بائیں بازو کی جماعتوں نے خاصہ فائدہ اٹھایا ہے وہ پیسہ جو انھیں باہر سے آتا تھا اور وہ پیسہ جو وہ مختلف بنکوں اور اداروں سے جگا ٹیکس کے طور پر وصول کرتی تھیں، وہ پیسہ اپنے لڑنے والوں کو نہایت فراخ دلی سے دیتی تھیں ان کے پاس اسلحہ اور گولہ بارود بھی نہایت فراوانی کے ساتھ موجود تھا۔ ہر قسم کی سہولتوں سے محروم بھوکے اور بدنصیب لوگ اپنا پیٹ بھرنے کی خاطر اور اپنی جان بچانے کی خاطر ان پارٹیوں کا رخ کرتے تھے تاکہ پیسے اور اسلحہ لے سکیں اور یہ پارٹیاں بھی انھیں آہستہ آہستہ گروہ در گروہ گولی کا نشانہ بننے کے لیے بھیج دیتی تھیں اور موت کے منہ میں اتار دیتی تھیں۔ ۷۶ - ۱۹۷۵ء میں مرنے والوں کی اکثریت ان پارٹیوں سے وابستہ تھی اگرچہ انھیں ان کی آئیڈیالوجی سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ مثلاً وسطی لبنان میں جہاں نہ جنگ تھی، نہ اسرائیل موجود تھا [illegible] خطہ، بائیں بازو کی پارٹیوں کے لوگ آدھی رات کو ہوا میں مسلسل گولیاں

چلا کر سکوتِ شب کو پارہ پارہ کر دیتے تھے اور شہروں کے یا قصبوں کے گرد و نواح میں خوفناک دھماکے کر کے ایک جھوٹ موٹ کا میدان جنگ اور بدامنی کی فضاء پیدا کرتے تھے اور جب صبح آتی تو اس قصبے یا شہر کے تمام نوجوان اسلحہ طلب کرتے تاکہ اس بے امنی کی فضاء میں اپنا دفاع کر سکیں۔ البتہ ہم کہ محروم تھے اور اسلحہ نہیں رکھتے تھے، اس لیے یہ پارٹیاں جوانوں میں اسلحہ، گولہ بارود اور پیسے تقسیم کرتیں اور انھیں اپنی طرف مائل کر لیتیں۔ وہ جوق در جوق ان پارٹیوں میں اپنا نام لکھواتے تاکہ اسلحہ لیں۔ ماہانہ تنخواہ لیں اور خوراک کا سامان مفت حاصل کریں اور یوں زندہ رہیں۔ جو لوگ ان پارٹیوں کی طرف مائل نہ ہوئے وہ صرف وہ اہلِ ایمان تھے جو سید موسیٰ الصدر، حرکتہ المحرومین اور "امل" سے وابستہ تھے۔

کسی بھی شخص کے لیے یہ بات بڑی دشوار ہے کہ وہ بھوکا ہے، اس کے پاس ہتھیار نہ ہوں، اس پر حملے ہوں، اسے قتل ہونے یا بے عزت ہونے کا نشانہ بننا پڑے اور اس کی تنظیم اس قابل نہ ہو کہ اس کی ضروریات پوری کر سکے۔ لیکن اس کے باوجود وہ شخص بھوک، خوف، امکان موت، تحقیر اور اہانت کو برداشت کرے اور ان پارٹیوں کے ساتھ تعلق پیدا نہ کرے، صرف اپنے عقیدے سے، اپنی تنظیم سے اور اپنی قیادت سے رسم وفا نبھائے، یہ بات بڑی سخت اور بڑی نادر۔ اس خدمت کی راہ میں ہمارے لیے یہی کافی ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ہم نے فکری اور تربیتی تاثیر کی بناء پر الوہی اقدار کی بناء پر فداکاری کی بناء پر اپنے ماضی کی بناء پر اور اپنی ثابت قدمی کی بناء پر لبنان کے لوگوں میں یہ روح پھونک دی جو تاریخ میں اپنی مثال آپ ہے۔ یہی وہ ایمان ہے اور یہی وہ طریقِ سفر ہے جس نے لبنان کی نام نہاد اور کھوکھلی جماعتوں کے ایوانوں میں لرزہ پیدا کر دیا اور وہ سب مل کر لوگوں کو ہمارے خلاف بھڑکاتے ہیں۔

Presented by Ziaraat.Com

سازش کا خلاصہ

لبنان کی خانہ جنگی اسرائیلی امریکی سازش تھی اور اس کا مقصد فلسطینی مزاحمت کو ختم کرنا تھا۔ اس کے آغاز ہی میں یہ بات تسلیم شدہ تھی کہ "کتائب" اور حزب اللبنانیین الاحرار (کمیل شمعون کی پارٹی) نے اپنے آپ کو استعمار کے ساتھ بیچ دیا ہے تاکہ وہ مزید مراعات و مفادات حاصل کریں اور مسلمانوں سے انتقام لیں اور اسی لیے انھوں نے اسرائیل اور امریکہ سے تعاون کیا۔ وہ کتائب ہی تھے جنھوں نے پہلا گولا فلسطینی مزاحمت پر پھینکا اور وہ کتائب ہی کا گروہ تھا۔ جنھوں نے خانہ جنگی کا آغاز کیا۔ فلسطینی مزاحمت اس بات سے آگاہ تھی کہ سازش کی کھچڑی پک رہی ہے۔ اور بڑی فراست و زیرکی سے عیسائیوں کے ساتھ تصادم سے پرہیز کر رہی تھی۔ یہاں تک کہ پہلی خانہ جنگی میں عیسائیوں نے "سن الفیل" سے "تل زعتر" پر حملہ کر دیا اس وقت مزاحمت نے کوشش کی کہ جنگ کو "تل الزعتر" سے "نبعۃ" میں منتقل کر دے یعنی لبنانی فلسطینی لڑائی کو لبنانی لڑائی کی صورت دے دے اور وہ اس کوشش میں کامیاب بھی ہو گئی اور اب جنگ کا بازار "برج حمود" "نبعۃ" "اشیاح رویس" "حی اللیلکی" "کفرشیما" وغیرہ کے شیعہ آبادی کے علاقوں میں گرم ہو گیا۔

خانہ جنگی کے ابتدائی مہینوں میں مزاحمت نے لڑائی سے کنارہ کشی کی اور بار بار جنگ بندی کی خواہش کا اظہار کیا۔ اس نے سید موسیٰ الصدر پر دباؤ ڈالا کہ وہ اپنا سارا اثر و رسوخ جنگ کو ختم کرانے کے لیے استعمال کریں۔ سید الصدر بھی دن رات اسی کوشش میں رہے کہ یہ مشکل کسی طرح حل ہو اور کشت و خون بند ہو جائے۔ لیکن افسوس کی بات ہے کہ بائیں بازو کے لوگ فلسطینی مزاحمت کی خواہش کے برعکس جنگ کی آگ کو بھڑکاتے اور جب کبھی صلح کامیاب ہو جاتی یہ لوگ از سر نو کوئی نہ کوئی تصادم پیدا کر دیتے اور مزاحمت کو یعنی "فتح" کو اس میں پھنسا کر جنگ کو اس کے فدائیوں پر ٹھونس دیتے۔ بہرحال بائیں بازو کے لوگ ہوں یا دائیں بازو کے دونوں گروہوں کا اس سازش میں بڑا

ہاتھ تھا، ہر دو کی خواہش تھی کہ لبنان کی تقسیم ہو جائے تاکہ شمالی لبنان میں مارونی حکومت قائم ہو جائے اور جنوبی لبنان میں کمیونسٹ حکومت گویا روس بھی اس آگ کو ہوا دیتا تھا اور یوں مشرق و مغرب دونوں بلاکوں کے درمیان اس معاملے میں تعاون تھا۔

فلسطینی مزاحمت یا "فتح" ابتداء میں عیسائیوں کے ساتھ تصادم سے گریز کرتی تھی لیکن بصد افسوس اسے اس میں کھینچ آنا ہی پڑا۔ ایک سال قبل یعنی ۱۹۷۵ء میں جب کہ "تل الزعتر" کے محاصرے کو دو ماہ گزر چکے تھے۔ "فتح" نے الٹی میٹم دیا کہ اگر ۴۸ گھنٹے کے اندر اندر انھوں نے محاصرے کا حلقہ نہ کھولا تو فتح باقاعدہ طور پر شریک جنگ ہو کر اس منطقے کو خوراک کا سامان فراہم کرے گی۔ محاصرہ ختم نہ ہوا اور "فتح" کو معرکے میں شریک ہونا پڑا اور وہ چار دن تک لڑتی رہی لیکن "تل الزعتر" کے محاصرے کو اٹھوا نہ سکی۔ کتائب کا غرور اب اور بڑھ گیا اور فلسطینی مزاحمت کی کمزوریاں آشکار ہوئیں۔ عیسائیوں کے دلوں میں "فتح" اور اس کی طاقت کی جو دہشت تھی جو خوف دہراس تھا وہ اس واقعے سے زائل ہو گیا کتائب نے نہایت بے رحمی سے "مسلخ" اور "کرنتینا" پر ہلہ بول دیا اور مسلمانوں کا قتل عام کیا انھوں نے شراب پی کر شہیدوں کی لاشوں پر رقص کیے۔ مسلمان آبادی کے علاقے یکے بعد دیگرے سقوط کرتے گئے۔ کتائب نے "ضبیہ" کے کیمپ پر قبضہ کر لیا "سنبیہ" ان کے ہاتھ لگا "غوارنہ" کے محلے پر ان کا تسلط ہو گیا۔ "جسر الباشا" "نبعہ" اور "تل الزعتر" بھی سقوط کرنے والے تھے۔ بیروت کا محاصرہ ہو چکا تھا۔ چار دن ایسے بیروت سے باہر جانے والی تمام سڑکیں بند ہو چکی تھیں بیروت میں روٹی، پٹرول، ڈیزل اور دیگر ضروری اشیاء کا قحط ہو چکا تھا اور خطرہ اس بات کا تھا کہ عیسائی تمام بیروت پر قبضہ کر کے مسلمانوں کا قتل شروع کر دیں گے۔

ان حالات میں "عرمون" کانفرنس کا انعقاد ہوا جس میں مسلمان رہنما یاسر عرفات کمال جنبلاط، مفتی اعظم اہل سنت شیخ حسن خالد، سید موسیٰ الصدر، رشید کرامی اور صائب سلام شریک ہوئے۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کی حالت زار کا جائزہ لیں۔

Presented by Ziaraat.Com

اوران کے خوف ناک مستقبل کے بارے میں کچھ سوچیں۔ انہیں کوئی دُہ نہ ملی اور انھوں نے طے کیا کہ سوریا کی مدد لیے بغیر کوئی چارہ نہیں اس لیے ان سب نے ہم آواز ہو کر درخواست کی کہ سوریا لبنان میں داخل ہو جائے۔ سوریا نے اس بات سے اتفاق نہ کیا اور کہا کہ یہ بات سوریا کے خلاف سازش ہے۔ لیکن مسلمانوں نے اصرار کیا اور یہاں تک اصرار کیا کہ سید موسیٰ الصدر پر دباؤ ڈالا کہ وہ بذات خود سوریا جا کر حافظ الاسد کو راضی کریں۔ سید موسیٰ الصدر برستی گولیوں میں اپنی جان کو خطرے میں ڈال کر سوریا گئے اور خاصی طویل بات چیت کے بعد حافظ الاسد کو راضی کر لیا کہ وہ لبنان میں اپنی فوجیں بھیجے۔

سوریا لبنان میں داخل ہوا۔ "دامور" پر مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا۔ زحلہ کا محاصرہ ہوا اور "رغر ما" پر جو فرنجیہ کا صدر مقام تھا حملہ ہوا اور قریب تھا کہ مسلمان اس پر قبضہ کر لیں۔ اس صورت حالات نے عیسائیوں کو جنگ بندی قبول کرنے پر مجبور کر دیا لیکن سازشی گروہ بیکار نہیں بیٹھا ہوا تھا۔ انھوں نے عراق کو سوریا سے بھڑا دیا۔ عراق نے بے حد زیادہ پیسہ اور اسلحہ دے کر بائیں بازو کی لبنانی جماعتوں کو سوریا کے خلاف صف آراء کو دیا اور افسوسناک بات یہ ہے کہ لیبیا نے بھی یہی حرکت کی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ خود مسلمانوں کی صفوں میں دھڑہ بندی اور آویزشیں شروع ہو گئیں۔ کتائب نے اس موقع سے دوبارہ استفادہ کیا اور اس سازش کو چلانے کے لیے کمربستہ ہو گئے۔ سوریا کے لبنان میں داخل ہونے کے بعد دو ماہ تک امن و امان برقرار رہا۔ تمام جگہیں کھل گئیں اور زندگی معمول کے مطابق رواں دواں ہو گئی حتیٰ کہ تل الزعتر اور "نبعہ" میں بھی عیسائیوں کو یہ جرأت نہیں ہوتی تھی کہ وہ کسی مسلمان کو ٹیڑھی آنکھ سے دیکھ سکیں۔ ایسی قراردادیں اور فیصلے طے پائے جو مسلمانوں کے حق میں تھے اور جن کا ایک حصّہ خود فلسطینی مزاحمت کے رہنماؤں نے بھی لکھا تھا اور سوریا نے زور دے کر عیسائیوں کو انہیں قبول کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس وقت کے لبنانی صدر سلیمان فرنجیہ نے خود ان فیصلوں کو ریڈیو سے نشر کیا اور انھیں قبول کیا۔ حافظ الاسد اس صلح اور امن و امان کے نگہبان کی حیثیت سے ابھرے لیکن افسوسناک

صورت یہ پیدا ہوئی کہ بائیں بازو کی لبنانی جماعتوں نے پھر گڑبڑ شروع کر دی اور "جنگ جبل"[1] کا آغاز ہوا۔ عیسائیوں نے حق پر ہونے کا روپ دھار لیا اور سوریا سے فریاد کی کہ ہم نے صلح قبول کر لی ہے اور حافظ الاسد اس صلح کے نگہبان ہیں۔ لہٰذا انھیں چاہیئے کہ گڑبڑ کرنے والوں کے خلاف اقدام کریں۔ یہ بات بالکل منطقی تھی اور حافظ الاسد کے پاس کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ گڑبڑ کرنے والوں کو قابو میں لائیں، حتیٰ کہ اگر وہ فلسطینی بھی کیوں نہ ہوں اس بناء پر سوریا اور فلسطینی مزاحمت کے مابین تصادم واقع ہوا اور اس سازش کا سب سے بڑا جزو عمل میں آیا جس کا مقصد یہ تھا کہ سوریا کے ہاتھوں فلسطینی مزاحمت کی پٹائی کروائی جائے۔

سید موسیٰ الصدر نے پورے خلوص اور پوری شدت سے کوشش کی کہ اس تیسری خانہ جنگی کو روک سکیں لیے وہ سات بار سوریا گئے اور ایک بار یاسر عرفات کو ساتھ لے کر حافظ الاسد سے ملے تاکہ یاسر عرفات ذاتی طور پر اپنی مشکلات حافظ الاسد کے سامنے رکھ سکے اور وہ ان کا ازالہ کر سکیں۔ انھوں نے صلح و صفائی کروا دی اور اس تصادم کی روک تھام کروائی۔ لیکن استعمار ان سے زیادہ قوی تھا اور اس کے ایجنٹ بڑے سرگرم تھے۔ اس کے مقابلے میں سوریا اور فلسطینی مزاحمت کے سربراہ غافل بھی تھے اور ناپختہ ذہنوں کے مالک بھی۔ لہٰذا سوریا اور فلسطینی مزاحمت کے مابین تصادم پھر شروع ہو گیا۔ یہ تصادم صیدہ میں بائیں بازو کی جماعتوں کا تشاخسانہ تھا اور اس کی تحریک یاسر عرفات کے مشہور دشمن میجر ابو موسیٰ نے کی تھی۔

---

[1] پاکستان کے اخباروں میں اس زمانے میں بڑے زور کی خبریں چھپی تھیں کہ سوریا نے عیسائیوں کی حمایت میں فلسطینیوں کو مارنا شروع کیا ہے سوریا کی مذمت میں قراردادیں بھی پاس ہوئیں۔ لاہور سے شائع ہونے والے ایک عربی رسالے میں جو خلیل حامدی صاحب کی نگرانی میں بغیر کسی ڈیکلریشن کے لاہور اور فیصل آباد سے چھپتا تھا اور غالباً چھپ رہا ہے، اس رسالے میں حافظ الاسد کو نو گالیاں دی ہی گئی تھیں اس کے ساتھ سوریا کے علویوں کو بھی تہمتوں سے نوازا گیا تھا صرف یہی نہیں بلکہ تمام دنیا کے شیعوں کو لتاڑنے کے ساتھ آیت اللہ خمینی کے خلاف بھی دریدہ دہنی کا ثبوت دیا گیا تھا لیکن یہاں کے عوام کو یہ بتانے کی کوشش نہ کی گئی کہ سوریا اور فلسطینیوں میں لڑائی کیوں ہو رہی ہے۔

Presented by Ziaraat.Com

اس پر سید موسیٰ الصدر نے ایک بیان صادر کیا جو فلسطینی مزاحمت کے رہبروں ابو ایاد اور ابو اللطف کی موجودگی میں لکھا گیا تھا۔ اس بیان کی ایک شق یہ کہتی تھی کہ فلسطینی مزاحمت ایک مقدس شعلہ ہے اور ہم اپنے جان و دل سے اور زور بازو سے اس کی حفاظت کریں گے۔ ایک اور شق میں سوریا کی حکومت سے مطالبہ کیا گیا تھا کہ لڑائی کو فوری طور پر بند کر دیا جائے اور سوریا کی فوجیں اس حد تک پیچھے چلی جائیں جو فلسطینیوں کے لیے باعث اطمینان ہو۔ اسی طرح اس بیان کی ایک اور شق میں یہ کہا گیا تھا کہ سوریا اور فلسطینی مزاحمت کے مابین کسی بھی قسم کا تصادم دونوں کے لیے بہت بڑی مصیبت ہے اور جو شخص بھی اس تصادم کو پیدا کرنے کے لیے کاروائی کرتا ہے وہ فلسطینی مزاحمت اور عربوں کے ساتھ غداری کا مرتکب ہے۔

اس بیان کی اس آخری شق کی زد کمال جنبلاط پر پڑتی تھی جو اپنی پوری طاقت سے جنگ کو ہوا دینے، سوریا کے خلاف بے معنی مہم چلانے اور کشت و خون کو جاری رکھنے کے حق میں تھا۔ سید الصدر کے اس بیان کا نتیجہ یہ نکلا کہ جنبلاط اور بائیں بازو کی لبنانی جماعتوں کے دل میں سید موسیٰ الصدر کے خلاف بغض و کینہ اور بڑھ گیا اور اب انھوں نے ہر قسم کی دروغ بافی، تہمت تراشی، بدگوئی، دریدہ دہنی اور زہر افشانی سے کام لیا جس کی زد سید موسیٰ الصدر کی ذات تھی۔

آخر کار سید الصدر کے دباؤ کا نتیجہ یہ نکلا کہ سوریا کی فوجیں لڑنے سے باز رہیں اور صیدہ و بیروت سے پیچھے ہٹ کر جزین اور صوغر کی پہاڑیوں میں چلی گئیں۔ یہ بات کہنا ضروری ہے کہ صیدہ میں تصادم شروع ہونے پر "فتح" اور حرکۃ المحرومین کے درمیان جو تعاون تھا اس کے پیش نظر حرکۃ المحرومین کے لڑنے والوں کا ایک دستہ صیدہ پہنچا تا کہ وہ فلسطینی مزاحمت کی مدافعت کر سکے۔ انھوں نے اس موقع پر سوریا کی فوجوں کے بالمقابل صف اول میں مورچہ بندی کی۔ اسی طرح اس کے بعد بھی جزین میں وہ فلسطینی مزاحمت کی جانب سے سوریا کے خلاف جنگ آزما ہوئے۔ دوسرے لفظوں میں حرکۃ المحرومین نے اپنے قول اور فعل سے یہ بتا دیا کہ فلسطینی مزاحمت کی زندگی خطرے میں ہے اور وہ اپنی پوری

طاقت سے فلسطینی مزاحمت کی حمایت کریں گے۔ یہ وہ حقیقت ہے جس سے ابو موسیٰ جیسے دشمن کو بھی انکار کی گنجائش نہ تھی اور ہمیشہ کہتا تھا کہ حرکۃ المحرومین کے جوان لبنان کے بہادر ترین مخلص ترین لڑنے والے ہیں۔ بس ان کا قصور یہ ہے کہ وہ سید موسیٰ الصدر کی پیروی کرتے ہیں اور بائیں بازو کی جماعتوں کے ساتھ مل کر کام نہیں کرتے۔

آخر کار سید موسیٰ الصدر کے دباؤ اور ان کی ثاثانہ کوششوں سے سوریا اور فلسطینی مزاحمت میں دوبارہ صلح ہو گئی اور سوریا ایک بار پھر کتائب کے مقابلے میں اور مسلمانوں کی حمایت میں خم ٹھونک کر میدان میں آگیا۔ اب بھی سوریا اور فلسطینی مزاحمت اور ان کے ساتھ تمام مسلمان اور بائیں بازو کی جماعتیں عیسائیوں کے خلاف صف بستہ ہیں اور ان کے درمیان دوستانہ روابط ہیں[1]

سازش کا نتیجہ

ہمیں یہ معلوم ہو گیا ہے کہ ان حوادث میں ہر گروہ کا اپنا اپنا مقصد تھا۔ اسرائیل یہ چاہتا تھا کہ فلسطینی مزاحمت (فتح) کا خاتمہ کر دے۔ کتائب اور دیگر عیسائیوں کے پیش نظر یہ بات تھی کہ مزید مراعات حاصل کریں۔ مارکسی گروہ اور ان کے ہمنوا اس بات کے خواہاں تھے کہ جنوبی لبنان میں ان کی حکومت قائم ہو اور وہ اس حکومت کے ذریعے سے اپنے افکار اور اپنی آئیڈیالوجی کو "فتح" پر اور پھر پورے لبنان پر ٹھونس دیں۔ مسلمانوں کے علاقے میں خاصی مدت تک بائیں بازو کو بالادستی حاصل رہی۔ تمام اخبارات رسالے ٹیلیویژن، ریڈیو اور پراپیگنڈے کے وسائل ان کے ہاتھ آگئے۔ انھیں نے فلسطینی مزاحمت کے نام پر اور اس کے پردے میں اپنے عقائد کو رائج کیا۔ پراپیگنڈے کا ایک سیلاب تھا جو دن کو رات اور رات کو دن بنا دیتا تھا اور ان پڑھ سادہ لوح عوام اس سیلاب میں بہہ نکلے تھے۔ ہر چند کہ بائیں بازو کے لوگ دین اور دینی عقائد کے خلاف تھے۔ تاہم وہ عوام کے ان دینی جذبات کو بھڑکا کر انھیں میدان جنگ میں کھینچ لاتے تھے

[1] یہ بیان ۱۹۷۶ء میں تحریر کیا گیا۔

Presented by Ziaraat.Com

[1] اور حالت یہ تھی کہ ان کے زہر آلود پراپگنڈے نے "فتح" کے رہنماؤں کو بھی خاموش رہنے اور ان کی حاشیہ برداری پر مجبور کر دیا تھا۔ یہ شدید شر پسندانہ پراپگنڈا بائیں بازو کے معیاروں اور قدروں کو پیش کرتا تھا اور جو کوئی ان معیاروں پر پورا نہ اترتا اسے غدار، رجعت پسند اور جاسوس قرار دے کر اس کا خون ہدر کر دیا جاتا۔

عربوں کی لوک کہانیوں میں ایک کہانی ہے جس کا نام "دریائے جنون" ہے۔ یہ دریا ایک شہر کے پاس سے گزرتا تھا اس شہر کے تمام لوگ اسی دریا کا پانی پیتے تھے۔ صرف شہر کا حکیم اور اس کا بیٹا اس سے گریز کرتے تھے۔ سب لوگ اس کا پانی پی کر پاگل ہو گئے۔ حکیم اور اس کا بیٹا دونو اس صورت حالات سے پریشان تھے اور اپنے انجام کے بارے میں فکر مند تھے لیکن ان کے سامنے کوئی چارہ کار نہ تھا اس لیے انھوں نے بھی اس دریا کا پانی پی لیا اور پاگل ہو گئے اور

خواہی نشوی رسوا ہم رنگ جماعت شو[2]

کے مصداق پاگل ہو کر ہر قسم کے خوف و خطر اور علیحدگی کے احساس سے بے نیاز ہو گئے۔

لبنان میں بھی گذشتہ ڈیڑھ سال کے دوران میں تمام لوگوں نے بائیں بازو کے پراپگنڈے کے دریائے جنون سے پانی پیا اور ان کے لاؤڈ سپیکروں اور پراپگنڈا کرنے والوں کے ہم نوا ہو گئے اور انھوں نے واضح و روشن حقیقتوں کو بھی اپنے پاؤں تلے

---

[1] لبنان کے اجتماعی تضادات میں ایک بات یہ بھی تھی۔ ترقی پسند اور بائیں بازو کے عناصر دین کے خلاف ہونے کے باوجود مذہبی جنگ میں شریک تھے جورج حبش نائف حواتمہ جورج حادی وغیرہ سب عیسائی تھے لیکن ان کی جماعتیں مسلمانوں کی صف میں شامل ہو کر کتائب اور عیسائیوں کے خلاف جنگ آزما تھیں اور بڑی شدت سے اس فرقہ وارانہ جنگ کو ہوا دینے میں کوشاں تھیں صرف یہی نہیں بلکہ وہ اپنے مخالفوں پر کفر کے فتوے بھی عاید کرتی تھیں بالکل ویسے ہی جیسے عراق میں بعثی حکومت کے ارکان آیۃ اللہ خمینی اور ان کے ساتھیوں کو کافر اور دشمن اسلام قرار دے رہے ہیں۔ حالانکہ بعث پارٹی مذہب پر تین حرف بھیجتی ہے اور میشال عفلق کی سربراہی میں عراق کے دیندار طبقے کو ظلم و ستم کا نشانہ بناتی ہے۔

[2] اگر چاہتے ہو کہ رسوا نہ ہو جاؤ تو جماعت کا رنگ روپ اپنا لو۔

کچل دیا حتیٰ کہ "فتح" بھی ان کے ہم رنگ ہو گئی۔ لیکن ہم اس دریائے جنون کا پانی پینا پسند نہیں کرتے تھے اور نہیں چاہتے تھے کہ جماعت کے ہم رنگ ہو جائیں۔ ہم یہ نہیں چاہتے تھے کہ ہم اپنے عقائد کو اپنے افکار کو ان کے معیاروں کے مطابق کر لیں اور ان کی اقدار کے سانچے میں ڈھال لیں اور یہی ہمارا بدترین گناہ تھا ورنہ ہم نے تو ہمیشہ نہایت خلوص سے فلسطینی مزاحمت کی حمایت کی ہے حالانکہ دوسرے لوگ راہ فرار اختیار کر جاتے رہے ہیں اور کتائب کے مطابق جنگ آزما ہوتے ہیں اور اب اسرائیل کے ساتھ پنجہ آزمائی کر رہے ہیں۔ ہم نے ان سب سے زیادہ قربانیاں دی ہیں اور شہید پیش کیے ہیں۔ اس حالت میں بھی ہر طرف سے ہم پہ حملے ہوئے ہیں تہمتیں لگی ہیں اور دشمن گردانے گئے ہیں لیکن ہم نے صبر سے کام لیا ہے اور سچائی کی راہ میں استقامت کا ثبوت دیا ہے۔

ہمارے عقائد کا اثر

فلسطینی مزاحمت کے رہنما ہمارے معیاروں اور ہمارے رویوں پر اعتقاد رکھتے تھے اور سچے دل سے یہ چاہتے کہ اپنے آپ کو پوچ پروپگنڈے اور گھڑے ہوئے قدری قالبوں کے دباؤ سے آزاد کریں لیکن نہ ان کے پاس اس کا امکان تھا اور نہ جسارت تھی کہ وہ اس طوفانی دور میں اپنے آپ کو نئی مشکلات اور خطرناک گرداب میں گرفتار کر لیں۔ ہم نے ان کے لیے راستہ ہموار کر دیا تھا اور ان کے سامنے سچائی کی شمع روشن کر دی تھی۔ ہم نے مزاحمت کے رہنماؤں کے لیے واپسی کی راہ کی نشاندھی بھی کر دی تھی اور کلمہ حق کو کہ حجت خدا ہے ہمیشہ اپنی نگاہوں کے سامنے رکھتے تھے۔

اگر ہم نہ ہوتے، اگر ہم حقانیت کے پرچم کو اپنے کاندھوں پر رکھ کر نہ چلتے، اگر ہم بائیں بازو کی انحرافی راہوں کے مقابلے میں اپنی راہ دکھا کر صراط مستقیم کی نشاندھی نہ کرتے تو یہ بات بعید تھی کہ فلسطینی مزاحمت سیدھی راہ پر آ جائے اور لوگوں کی آنکھیں حقیقت حال کو دیکھ سکیں۔ یہ تھا سب سے بڑا اثر جو ہمارے عقائد نے لبنان

Presented by Ziaraat.Com

میں پیدا کیا۔ [1]

بدلتے ہوئے معیار اور انکے مقابلے میں سید موسیٰ الصدر اور امل کی مزاحمت

گزشتہ تین سال کی خانہ جنگی میں بہت سے معیار بدلے گئے۔ بہت سے پوچ اور بے معنی دعوے سمندر کے جھاگ کی طرح بیٹھ گئے۔ دروغ بافیاں، تہمت تراشیاں، مکروفریب، غلط قسم کے نعرے اور خیانتیں، سب پر سے پردے اٹھ چکے ہیں دائیں بازو اور بائیں بازو کی جماعتوں، یہاں تک کہ فلسطینی جماعتوں کی قدر و قیمت اور حیثیت بہت کچھ کم ہو گئی۔ لیکن جو چیز لبنان میں پہلے سے کہیں زیادہ واضح اور روشن ہو گئی اور ہر روز اس میں اضافہ ہو رہا ہے وہ سید موسیٰ الصدر کی شجاعت، پاکبازی اور حق گوئی ہے۔ شدید ترین لمحات میں موت کے خطرے کے سامنے اور شکست کے دیو کی نگاہوں تلے تہمت تراشیوں اور دریدہ دہنیوں کی ضربوں کے باوجود سید موسیٰ الصدر ایک لمحے کے لیے بھی خاموش نہ بیٹھے بلکہ انھوں نے ہر جگہ اور ہمیشہ اعلائے کلمۃ الحق کا پرچم بلند رکھا اور ان لمحوں میں بلند رکھا جب کلمۂ حق کا کوئی خریدار نہ تھا اور انھیں معلوم تھا کہ سچی بات تمام اطراف کو اور تمام فریقوں کو ناراض بھی کرے گی اور انھیں غصہ بھی دلائے گی اور پھر یہ سید موسیٰ الصدر ہی تھے کہ انھوں نے عظیم معجزے دکھائے ہیں۔ انھوں نے کئی بار فلسطینی مزاحمت کو ختم ہونے سے بچایا اور یہ بات مبالغے کی نہیں بلکہ خود "فتح" کے رہنماؤں نے اس کی توثیق و تصدیق کی ہے۔ ان خطرناک لمحوں میں جب لبنان کی تقسیم تقریباً امر واقع معلوم ہوتی تھی سید موسیٰ الصدر نے نہایت شدت سے اس کی مخالفت کی اور آخر کار اس میں کامیاب ہو گئے۔

سید موسیٰ الصدر ہی وہ تنہا شخصیت ہیں انھوں نے اس خانہ جنگی کے پہلے دن سے اب تک ایک ہی بات کہی ہے اور سیدھی راہ اختیار کی ہے حالانکہ ان کے مقابلے

---

[1] یہ تحریر ایک خط کا متن ہے جو لبنان کی وضع کے بارے میں ۱۹۷۶ء میں لکھا گیا۔

[2] یہ تجزیہ ایک خط کا متن ہے جو لبنان میں سید موسیٰ الصدر کی موجودگی میں تحریر کیا گیا۔

میں دوسرے رہنما ہر روز اپنے موقف بدلتے تھے، ہر روز کوئی نیا نعرہ لگاتے تھے اور اس میں "فتح" کے رہنما بھی شامل ہیں۔ سید موسیٰ الصدر کے مؤقف اور ان کی پیش بینیاں حقیقت پسندانہ تھیں۔ پورے لبنان میں تنہا وہ شخص تھے جنھوں نے کسی غیر ملکی حکومت سے پیسہ نہیں لیا اور کسی طاقت کی ہم نوائی اور حاشیہ برداری نہیں کی۔ بلکہ انھوں نے جو قدم بھی اٹھایا اس میں عوام کا مفاد اور ان کے اپنے آئیڈیل پیش نظر رہے میں یہ جانتا ہوں کہ ممکن ہے بعض لوگ مجھ پر حرف گیری کریں اور کہیں کہ میں سید موسیٰ الصدر کی باتیں اتنی زیادہ کیوں کرتا ہوں، یا وہ یہ کہیں کہ میں جذباتی ہو رہا ہوں، حالانکہ بات یوں نہیں ہے جو کچھ میں دیکھ چکا ہوں اور سید موسیٰ الصدر کا دوسروں سے مقابلہ کر کے جو کچھ محسوس کر چکا ہوں ان کے مقابلے میں حیف ہے کہ میں خاموش رہوں اور سچی بات نہ کروں۔ میں جن دوسرے رہنماؤں سے انکا مقابلہ کرتا ہوں ان میں یاسر عرفات بھی شامل ہیں اور پھر یہ بات بھی شامل ہے کہ ہر قسم کی تہمت تراشیوں کے باوجود انھوں نے جس فداکاری، ثابت قدمی اور اپنے اصولوں پر ایمان کی پختگی کا ثبوت دیا ہے اس کے پیش نظر محض اس خوف سے خاموش رہوں کہ کوئی مجھے جذباتی نہ کہے بڑی حیف کی بات ہے پس ایک جملہ کہتا ہوں کہ پاک نفسی، فداکاری، ایمان اور شخصیت کے اعتبار سے جب میں سید موسیٰ الصدر اور دوسرے مدعیان رہنمائی کا مقابلہ کرتا ہوں تو مجھے زمین و آسمان کا فرق معلوم ہوتا ہے۔

سید موسیٰ الصدر اور امل کے رویے اور طرز عمل میں ان اخلاقی اور انسانی قدروں کا حصہ بھی ہے جن کی بنیاد اسلامی آئیڈیالوجی پر ہے۔ اسی لیے وہ معاشرے کے سامنے تقویٰ، فداکاری، ایمان باللہ، خلوص نیت، صدق اور خدمت خلق کے نئے معیار پیش کرتے تھے۔ یہ ایسی اقدار تھیں جو سب انسانوں کو اپنی طرف کھینچ لیتی ہیں کمیونسٹ پارٹی اور بائیں بازو کی دوسری جماعتوں کے لیے ان اقدار کا ماحصل کوئی معنی نہیں رکھتا تھا۔ یہ لوگ تو سیاسی جوڑ توڑ، دروغ گوئی، تہمت تراشی، لین دین کے قائل تھے ان کے لیے یہ ممکن نہ تھا کہ ان کے پاس جو کچھ ہے وہ اسے انسانی اقدار کی قربان گاہ پر چڑھا دیں

Presented by Ziaraat.Com

کرنے پر قادر تھیں لیکن سید موسیٰ الصدر اور امل سے وہ یہ معاملہ نہیں کر سکتی تھیں چونکہ سید الصدر اور امل دونوں کو پیسے یا دوسرے مراعات سے خریدنا ممکن نہ تھا۔ اگر سید الصدر اور امل کی اقدار معاشرے پر ثابت ہو جاتیں تو دیگر جماعتوں کی ہوا اکھڑ جاتی۔ اگر لوگ ان پارٹیوں سے خلوص، پاک نفسی اور صدق و صفا کی امید رکھ بیٹھتے تو یہ جماعتیں میدان عمل میں شکست کھا جاتیں۔ انھیں یہ بات پسند نہ تھی کہ اسلامی اقدار کو فتح حاصل ہو اور معاشرہ ان کا حلقہ بگوش ہو جائے یہ سب جماعتیں کسی نہ کسی غیر ملکی حکومت کی حاشیہ بردار تھیں اور ان سے مال حاصل کرتی تھیں۔ ان سب کو یہ معلوم تھا کہ وہ بیرونی طاقتوں کے ہاتھ میں کھیل رہی ہیں اور وہ اس بات سے بھی آشنا تھیں کہ ان کے پر شور اور تند و تیز نعرے بالکل کھوکھلے ہیں اور ان کی بنیاد جھوٹ پر ہے۔

اگر اقدار کی اس تاریکی میں کوئی شمع روشن ہو جاتی تو ان کی سیاہ طاقتی کا محل اس شمع کی روشنی میں خواب پریشاں بن جاتا۔ لہٰذا انھوں نے یہ منصوبہ بنایا کہ اپنی پوری طاقت اس شمع کو خاموش کرنے میں صرف کر دیں۔ اس کے لیے انھوں نے آندھیاں چلائیں شدید پروپیگنڈے کی آندھیاں، جن کی مثال دنیا میں بہت کم ملتی ہے۔ اس معاملے میں بائیں بازو اور دائیں بازو کی جماعتیں شیر و شکر ہو گئی تھیں کیوں کہ دونوں کے اپنے اپنے مفادات خطرے میں تھے۔ ہر چند کہ دونوں فریق ایک دوسرے کے دشمن تھے تاہم وہ سید الصدر کو اپنی آئیڈیالوجیوں کا مشترک دشمن سمجھتی تھیں دونوں فریقوں نے مل کر بے انصافی اور جرائم کاری کا ایک طوفان برپا کیا۔ کیسی کیسی تہمتیں لگائی گئیں۔ کیسی کیسی دروغ بافیاں عمل میں آئیں، کیسی کیسی گالیاں انھیں دی گئیں، ان پر کس کس انداز سے سیاسی اور فوجی حملے کیئے گئے اگر ان کی جگہ کوئی اور ہوتا تو اس کا پتا بھی نہ چلتا۔ لیکن سید الصدر اور امل کے جوان ثابت قدمی کے مجسمے بن گئے۔ فدا کاری پر بھروسہ کر کے ان کی کم تعداد نے اپنے دل موت پر فدا کر دیئے، اپنی ہر چیز سے درگذرے، وہ شمع بنے اور جل اٹھے اور یوں انھوں نے اس ظلمت اور تاریکی کا مقابلہ کیا جس نے ہر چیز کو اپنی [illegible]

تاریکیوں کے طوفان کے مقابلے میں، موت اور فنا کو قبول کرنے، امر واقعی کے خلاف نبرد آزما ہونے، ظلم اور دروغ و فریب کے سامنے سر تسلیم خم نہ کرنے کے لیے سید موسیٰ الصدر اور تنظیم امل نے جس انداز سے مزاحمت کی وہ انسانی تاریخ ارتقاء کا قابل فخر قدم ہے۔ آپ یہ خیال کریں گے کہ میں شاید مبالغہ کر رہا ہوں لیکن حقیقت یہ ہے کہ جب تک کوئی شخص میدان عمل میں ظلم و ستم و خیانت کے شبانہ روز حملوں کی زد میں نہ آئے، جب تک وہ عالمگیر کذب و دروغ بافی اور مرگ و نیستی کو اپنی آنکھوں سے نہ دیکھے، جب تک کوئی شخص اپنی زندگی میں ایک لمحے کے لیے بھی اطمینان سے محروم نہ ہو، جب تک وہ ہر لحظہ اپنے دوستوں اور عزیزوں کے مرنے، گم ہونے، اسیر ہونے کی خبریں نہ سنے اور ان سب کے باوصف وہ تاریکی اور مایوسی کا شکار نہ ہو، جب تک کوئی اپنے گرد و پیش سازشوں کا جال بچھا ہوا نہ پائے اور طاغوتی طاقتوں کے وحشیانہ حملوں کا شکار نہ ہو، جب تک وہ امل کے نوجوانوں کی فداکاری اور استقامت کو اپنے سامنے نہ دیکھے اس وقت تک وہ اس قابل نہیں ہو سکتا کہ وہ "تنظیم امل" کے سرفروشوں کے جذبہ ایمانی، ان کی فداکاری کی قدر و قیمت اور ان کو پیش آنے والے خطرات کی گہرائی کا اندازہ لگا سکے۔

"امل" کے جوان لبنان کی جنوبی سرحد پر اسرائیل سے جنگ آزما ہیں۔ ایک لڑائی میں ان میں سے چھ جوان منزل شہادت پر جا پہنچے لیکن ان قربانیوں کے باوجود تاریکیوں میں لپٹے ہوئے کفر و جہالت و ظلم کے شکار اور گندگیوں میں اٹے ہوئے جنوبی لبنان میں، جہاں کثافت اور تاریکی کا راج ہے، دوسروں کے ہاتھوں میں کھیلنے والی پارٹیاں ان جوانانِ "امل" پر غداری کی تہمت دھرتی ہیں۔ یہاں تک کہ ان شہداء کی تصویریں بھی دیواروں سے مٹا دی جاتی ہیں۔ یہ پارٹیاں دیواروں پر لکھواتی ہیں کہ "امل" کے نوجوان خیانت کار اور غدار ہیں اور بائیں بازو کی جماعتیں انھیں اجازت نہیں دیتیں کہ وہ جنوبی لبنان کو اسرائیل کے حوالے کر دیں۔

جنوبی لبنان کے متعدد دیہات میں جوانانِ امل "پر حملے ہوئے انھیں مارا پیٹا جاتا اور گرفتار کر لیا جاتا وہ جوان جو جنوبی سرحدوں پر جا کر اسرائیل کے خلاف

Presented by Ziaraat.Com

جنگ آزما ہونے کا خواہاں ہوتا اور شہادت کا طالب اسے اس کے گھر میں گاؤں میں اور جنوبی سرحد تک جانے کے لیے امن و امان نصیب نہ ہوتا۔ اس کے لیے لازم تھا کہ وہ خفیہ طور پر رات کی تاریکی میں سفر کرے۔ جب طیبہ کے شہیدوں کی خبر وصول ہوئی تو بائیں بازو کے اخباری گماشتوں نے مشہور کیا کہ "امل" کے یہ جوان اسرائیلی اور کتائبی دستوں کے ہمراہ تھے اور انھیں "فتح" کے آدمیوں نے قتل کیا ہے چونکہ جنوبی لبنان میں "فتح" کی تنظیم بائیں بازو کے لوگوں کے زیر اثر تھی اس لیے اس نے اپنے ہونٹ سی لیے اور ایک جملہ تک نہ کہا کہ "امل" کے فدائی اسرائیل کے خلاف جنگ آزما تھے اس لیے وہ شہید ہوئے۔ انھوں نے ایک لفظ تک نہ کہا کہ "امل" اور "فتح" کے جوانوں میں تعاون کا گہرا رشتہ ہے۔ "فتح" کا بایاں بازو "امل" کو نیست و نابود کرنا چاہتا تھا لیکن وہ کھل کر "فتح" کی جانب سے "امل" کے خلاف بات نہیں کر سکتا تھا اور اس کا واضح سبب یہ تھا کہ "فتح" کی قیادت (یاسر عرفات اور ابو جہاد) کو "امل" کے جوانوں کی بڑی شدید ضرورت تھی۔ انھیں سید موسیٰ الصدر کی ضرورت تھی ان کی زندگیاں سید موسیٰ الصدر کی مرہون منت تھیں۔ اس لیے ان کے بس میں نہ تھا کہ وہ سید موسیٰ الصدر اور "امل" کے خلاف خود کوئی بات کریں اور اسی بنا پر انھوں نے بائیں بازو والوں کو کھلی چھٹی دے رکھی تھی۔ کہ وہ الزام تراشی اور تہمت زنی کی مہم سنبھالیں اور یہ لوگ خاموش رہ کر ان کی مدد کریں۔

کوئی شخص ان لوگوں کو اچھی طرح نہیں جان سکتا جب تک اس نے خود انھیں اچھی طرح دیکھا بھالا نہ ہو۔ تعجب نہ کیجیے کہ سب کچھ ہو رہا تھا بڑی دردناک بات ہے کہ "فتح" کی طرف سے "امل" کے ان جوانوں کی پٹائی ہو، انقلاب فلسطین کے نام پر حاصل کیے ہوئے اسلحے سے انہیں مارا جائے اور یہ جوان اس کے باوجود راہ حق پر چلتے رہیں "فتح" کی حمایت کریں، اس کے دشمنوں سے لڑیں، شہید ہوں اور پھر ان پر غداری کی تہمت بھی دھری جائے

سچی بات یہ ہے کہ خداوند بزرگ و برتر پر ایمان اور اقدار کے مقابلے میں ہر چیز کو ہیچ سمجھنے کے سوا اور کیا چیز ہو سکتی تھی۔ جو "امل" کے ان جوانوں کو اس قسم کا آہنی ارادہ دے سکتی اور انھیں ناقابل تبدیل جذبہ قربانی سے سرشار کر سکتی سازشوں

کے اور دشمنیوں کے گرداب میں خداوند عالم سے وابستگی کے سوا کون سی امید کسی شخص کو زندہ رکھ سکتی ہے۔

ایک شاعر موسیٰ شعیب جنوبی لبنان میں عراقی بعث پارٹی کی نمائندگی کرتا تھا اس نے ایک جلسے میں صاف صاف کہہ دیا کہ "میں تعجب کرتا ہوں کہ امل کیا عجوبہ ہے اور کس چیز سے اس کا خمیر اٹھا ہے کہ اس قدر دباؤ اس قدر صدمات، اس قدر حملوں اور اس قدر غیر مناسب ماحول کے باوجود اب تک زندہ ہے۔ کسی گروہ یا کسی پارٹی کے خلاف اگر اس قسم کی مہم جاری رہتی تو کب کی ختم ہو چکی ہوتی"۔ موسیٰ شعیب نے درست کہا۔ خدا پرستوں خوف خدا رکھنے والوں اور دنیا مافیہا سے بے نیاز لوگوں کے سوا کوئی شخص بھی اس ظلم و ستم، اس عداوت اور اس قسم کے حملوں کا مقابلہ نہیں کر سکتا اور نہ انھیں برداشت کر سکتا ہے۔

تنظیم "امل" اور سید موسیٰ صدر کی عظمت کے دلیل کے طور پر یہی بات کافی ہے کہ دائیں اور بائیں بازو کی طاغوتی اور شیطانی طاقتیں اپنے پورے ساز و سامان سے تنظیم "امل" اور سید موسیٰ صدر پر حملہ آور ہوتی ہیں اور انھیں گولہ باریوں، تہمتوں اور دروغ بافیوں کا نشانہ بنا کر انھیں نیست و نابود کر دیں۔ اگر سید الصدر اور تنظیم "امل" کی کوئی اہمیت نہ ہوتی اور اس کی کوئی قدر و قیمت نہ ہوتی تو یقیناً ان پر وہ حملے نہ ہوتے۔ یہ سارا بغض و کینہ، یہ تمام ظلم و ستم، یہ ساری بے انصافی، جس کی نہ کوئی حد ہے نہ شمار ہے، یہ سب سید موسیٰ الصدر اور تنظیم "امل" کی اہمیت کا سراغ دیتی ہیں۔

تنظیم امل جیسی تنظیم کا پیدا ہونا ایک معجزے سے کم نہیں اس قسم کے لوگوں میں اس قسم کے فاسد اور تاریک ماحول میں تین سال کی مختصر مدت کے دوران میں فقر، تہی دستی

لہ اس سے قبل ذکر ہو چکا ہے کہ "فتح" کی قیادت کی درخواست پر سید موسیٰ الصدر نے یاسر عرفات اور ابو جہاد کے باڈی گارڈ کے طور پر "امل" کے جوانوں کی خدمات ان کے سپرد کی تھیں کیوں کیا انھیں بذات ایسے "فتح" کے فدائیوں پر اعتماد نہ تھا۔ اور ان سے خدشہ تھا کہ وہ انھیں ٹھکانے لگا دیں گے۔

Presented by Ziaraat.Com

اسلحے کی نایابی، جغرافیائی عوامل کی عدم مناسبت، دیگر عرب حکومتوں کی دشمنی، عراق لیبیا اور مصر کی کینہ پروری، اور کمیونسٹ پارٹی نیز روس کی شدید دشمنی کے باوجود اس تنظیم کا اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا معجزہ ہی تو ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ سوائے عشق و جنون کے، والئے راہ حسین علیہ السلام پر چلنے کے، اور سوائے خدا پر ایمان مطلق کے اور کوئی بات اس قابل نہیں کہ اس قسم کی تبدیلی عمل میں لا سکے لیے اس ماحول میں جہاں بہترین انقلابی اور مخلص تنظیم "فتح" ہے، اس ماحول میں ایمان، خلوص اور قربانی کے جذبے کے اعتبار سے امل کا ایک شخص فتح کے ہزار اشخاص پر بھاری ہے۔ اقدار پر ایمان، سچائی، خلوص اور فداکاری کے اعتبار سے آقائے صدر کو یاسر عرفات پر ہزار درجہ فوقیت حاصل ہے۔

یہ بات فراموش نہیں کرنا چاہیئے کہ سید الصدر اور امل کے نوجوان معصوم نہیں اور میں یہ کہتا ہوں کہ ان میں اور ہمارے تصورات کے اور آرزؤں کے نکتہ کمال میں بڑا فاصلہ ہے۔ میں ان کی مشکلات کو ان کی نارسایوں اور ان کے عیوب کو اچھی طرح جانتا

لے جب ستمبر ۱۹۷۱ء میں مترجم لبنان سے واپس ہوا تو اس وقت حرکۃ المحرومین اور تنظیم امل نے خواب کی صورت بھی اختیار نہیں کی تھی۔ شاید سید موسیٰ الصدر کے ذہن میں کوئی بات ہو تو ہو ورنہ بظاہر کوئی آثار نہیں تھے کہ لبنان کے شیعوں کو اس طرح منظم کیا جا سکے جس صنعتی مدرسے کا بار بار ذکر ہوا ہے، اس مدرسے کی عمارت تو مکمل ہو چکی تھی لیکن مدرسے کا آغاز نہیں ہوا تھا۔ اس عمارت میں معہد الدرسات الاسلامیہ کو اسی سال منتقل کیا گیا تھا۔ یہ درسگاہ پہلے شہر صور کے وسط میں ایک کرائے کی عمارت میں تھی۔ البتہ سید موسیٰ الصدر کی سرگرمیوں سے یہ ضرور سراغ ملتا تھا کہ وہ کچھ نہ کچھ کرنے والے ضرور ہیں کیونکہ لبنان کے بعض مفاد پرست شیعہ خاندان اور ان کے حلقہ بگوش علمائے کرام سید موسیٰ الصدر کے بہت مخالف تھے کیونکہ مجلس الاسلامی الشیعی الاعلیٰ قائم ہو چکی تھی، سید موسیٰ الصدر اس کے تا حیات صدر منتخب ہوئے تھے۔ اس وقت سید موسیٰ کی سرگرمیاں شیعوں کے ساتھ رابطہ کی حد تک محدود تھیں اور ان کی مقبولیت میں خاصا اضافہ ہو چکا تھا۔ صیدہ کے مقاصد سکول برائے طالبات (ثانویۃ المقاصد للبنات) میں اور صیدہ کے بدمن کیتھولک کیتھیڈرل میں ان کی تقریریں ان کی مقبولیت اور شخصی نفوذ کی نشاندہی کرتی تھیں۔ حرکۃ المحرومین اور تنظیم امل کہیں ۱۹۷۳ء میں تشکیل پذیر ہوئیں اور تین سال سے کم مدت میں ان تنظیموں کو سب چیلنج قبول کرنا پڑے۔

ہوں۔ البتہ یہ ضرور کہوں گا کہ لبنان کے ماحول میں شیاطین کے درمیان اور لبنان کی متعفن اور فاسد فضا میں "امل" کے نوجوان فرشتہ ہیں۔

بعض لوگ مجھ پر تنقید کرتے ہیں کہ میں "امل" اور آقائے صدر کے دفاع میں مبالغے سے کام لیتا ہوں۔ لیکن میں آپ کو خدا کی قسم دے کر کہتا ہوں کہ میری دفاعی کوششوں اور میرے نالہ درد آمیز کی دائیں اور بائیں بازو کی جماعتوں کے پروپیگنڈے کے طوفان کے سامنے کیا حیثیت ہے! میں جو کچھ بھی کہوں ان لوگوں کے جھوٹے پروپیگنڈے اور ہزارہا تہمت تراشیوں کا درست جواب نہیں دیا جا سکتا۔ اگر کوئی شخص مجھے درست طور پر سمجھ لے تو یہ احساس کر سکتا ہے کہ میرا وجود، میری زندگی، میرا عشق اور میری فداکاری سرتاپا فریاد بن چکے ہیں۔ یہ فریاد ظلم کے خلاف ہے، طاغوتوں کے خلاف ہے وہ شخص جو ان طاغوتوں کو نہ دیکھے، جو "فتح" کی پرستش کرتا ہو۔ جو بائیں بازو کی جماعتوں کی خیانت کو نہ دیکھتا ہو اور یوں مجھے اپنی تنقید کا نشانہ بنائے، میرے سرتاپا فریاد وجود کا احساس نہ کرے اور یک طرفہ فیصلہ کر دے، وہ میری باتوں کو مبالغہ ہی سمجھے گا لیکن حقیقت یہ ہے کہ میں "امل" کے بارے میں کتنی ہی باتیں کیوں نہ کروں اور سید الصدر کی حمایت میں کتنا ہی مبالغہ کیوں نہ کروں، میں ہرگز اس بات پر قادر نہیں ہو سکتا کہ ان کے خلاف لگائے جانے والے الزامات، ان کو دی جانے والی گالیوں اور ان کے دشمنوں کے بغض و کینہ کے ایک ذرے کو بھی ختم کر سکوں۔ یہ بات بڑے ظلم کی ہے کہ ہم دوسری جماعتوں کو ان کی تمام خرابیوں، خیانتوں، کج رویوں، دشمنیوں اور خراب کاریوں کے باوجود مقدس گردانیں لیکن اپنے دوستوں کو جو ان عفریتوں کے مقابلے میں فرشتے دکھائی دیتے ہیں، ہدف تنقید بنائیں اور ان کے اقدامات کے بارے میں بال کی کھال اتاریں۔ یہ بات بالکل غلط ہوگی اگر ہم لبنان کے ماحول کو فراموش کر دیں اور "امل" کے نوجوانوں اور دیگر جماعتوں کے کارکنوں کا تقابل نہ کریں اور گھر بیٹھے ان پر حکم لگا دیں۔

میں خود "امل" کے نوجوانوں سے پوری طرح مطمئن نہیں، میں دوسروں سے کہیں زیادہ ان کے نقائص اور کمزوریوں سے آگاہ ہوں، ان سے جو برائی ہوتی ہے سب

Presented by Ziaraat.Com

سے پہلے میری آنکھیں ان کا زخم کھاتی ہیں۔ میں دوسروں سے کہیں زیادہ تکلیف محسوس کرتا ہوں۔ "امل" کے نوجوانوں کی برائیاں، ان کی خود پسندیاں اور ان کی انانیتیں دوسروں سے کہیں زیادہ جانتا ہوں کیونکہ میں نے ان کے درمیان زندگی بسر کی ہے اور میری حساس روح اس قابل ہے کہ برائی کو، جھوٹ کو، غرور کو اور فساد کو فوراً محسوس کرلے۔ لیکن اصل حقیقت یہ ہے کہ "امل" اور "فتح" کا تقابل کرتے میں "امل" کے ایک شخص کا "فتح" کے ایک شخص سے مقابلہ کرنا ممکن ہی نہیں۔ اس طرح امل کے ایک افسر کا "فتح" کے ایک افسر سے مقابلہ کرنا ظلم ہوگا۔ اور سچی بات ہے کہ یہ بھی ناانصافی ہوگی کہ موجودہ دور کے تصورات کے سائے میں بیٹھ کر جو "فتح" کے تقدس کے گن گاتے ہیں "امل" کی اسلامی آئیڈیالوجی کی کمزوریوں کی نشاندہی کی جائے۔

خانہ جنگی کے دوران میں بائیں بازو کی جماعتیں اور "فتح" دونوں پیسے اور اسلحے کے ذریعے لوگوں کو جمع کرتی تھیں اور لوگ اپنی سلامتی، اپنی روٹی اور ہتھیار حاصل کرنے کے لیے اس جماعت کے ساتھ وابستہ ہو جاتے تھے جو ان کی زیادہ قیمت ادا کرتی تھی اسی بات کے لیے بڑا جگرا چاہیئے کہ ایک انسان پر چاروں طرف سے حملے ہو رہے ہوں زمین و آسمان سے مختلف قسم کی بلائیں اور مصیبتیں اسے گھیرے ہوئے ہوں، وہ مفلس و قلاش ہو، اس کے پاس اسلحہ نہ ہو اور بائیں بازو کی جماعتیں اسے پیسے بھی دیں اس کی حمایت بھی کریں، اسے اسلحہ بھی دیں اور... وہ ان سب چیزوں کو رد کر کے بغیر پیسے کے اور بغیر اسلحے کے "تنظیم امل" میں شامل رہے، موت کا خطرہ مول لے اور اس تنظیم کو چھوڑ کر دوسروں کے ساتھ نہ جا ملے۔ سچی بات یہ ہے کہ اس کے لیے بڑی ہمت، بڑا حوصلہ بڑا جگرا چاہیئے[1] "امل" کے نوجوانوں کے خلوص، ان کے حسن سلوک اور ان کے جذبے

---

[1] خود نیوز ویک کے ایک مضمون میں اس بات کا اعتراف کیا گیا ہے کہ "امل" ملیشیا کے افراد کی تعداد لگ بھگ پندرہ ہزار ہے اور ان کے پاس جو ہتھیار ہیں وہ وہ ہیں جو انہوں نے ادھر اُدھر سے گرے پڑے اکٹھے کیے ہیں اور ان ہتھیاروں کے لیے ان کے پاس ذخیرہ بھی کافی نہیں۔ پھر یہ بات بھی واضح ہے کہ "تنظیم امل" کی مالی امداد کرنے والی حکومت کوئی بھی نہیں۔ مسلمان اور عرب حکومتیں ان کا شیعہ ہونا فراموش نہیں کرتیں

کے اصیل ہونے کے لیے صرف یہی بات کافی ہے۔ میں اس سے زیادہ نہیں کہوں گا اور اس سے زیادہ کسی اور بات کا طالب نہیں، نہ کسی اور بات کی توقع رکھتا ہوں۔

مختصر یہ کہ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ "تنظیم امل" اور اس کی منزل کمال کے درمیان ابھی بہت فاصلہ ہے۔ قدم اٹھ چکا ہے، ہر شخص گامزن ہو چکا ہے لیکن بہت سی مشکلات سد راہ ہیں۔ اچھے کارکن کم ہیں۔ اس منطقے میں اخلاق اور آئیڈیالوجی کی بنیادیں کمزور ہیں البتہ کام کرنے کے مواقع بے شمار ہیں۔ جو شخص چاہے کہ وہ تعلیمی، اخلاقی حتیٰ کہ جنگی میدان میں کام کرے، اس کے لیے آزادی بھی ہے اور امکان بھی ہے۔ دوسرے ممالک میں یہ امکان شاذونادر ہی نصیب ہوتا ہے۔ لبنان ہمارے لیے ایک تربیتی مرکز شمار ہونا چاہیئے جہاں انسانوں کی تربیت ہوتی ہے، افکار کی تربیت ہوتی ہے اور جہاں تنظیمی اور عسکری تربیت عمل میں آتی ہے۔ ہمارے لیے یہ ممکن ہے کہ اس مرکز کو کامیاب بنانے کے لیے قدم اٹھائیں اور اپنی خواہش کے مطابق اسے مضبوط بنائیں، راہ میں بے شمار مشکلیں ہیں اور سب سے بڑی مشکل خود وہاں کا انسان ہے، لبنان انسان جو خاصہ پسماندہ ہے، لیکن سید موسیٰ الصدر کے نکتہ نظر سے ایک شمع روشن کی جا سکتی ہے، ایک چراغ جلایا جا سکتا ہے جس کے تلے کا علاقہ جو لبنان ہے، شاید سائے میں رہے لیکن وہ شمع پورے ماحول کو روشن کرے۔ یہ جگہ ادیان و مذاہب اور تنظیمی اور سیاسی افکار کی نشرگاہ ہے، یہاں پہلی بار اس قسم کی تحریک ان خصوصیات کے ساتھ پیدا ہوئی ہے جس کے پیدا کرنے میں اور جسے برقرار رکھنے میں سید الصدر کی شخصیت کا بہت اہم حصہ ہے۔ بظاہر اس علاقے میں اس قسم کی تحریک کا ابھرنا محال نظر آتا تھا۔ ہم پہ لازم ہے کہ ہم لبنان کو اور "تنظیم امل" کو ایک فکری، تنظیمی اور سیاسی مرکز کے طور پر دیکھیں اور سید الصدر کے امکانات سے استفادہ کریں اور یوں "تحریک امل" کو زیادہ مضبوط بنائیں، اس کا اسلامی رنگ گہرا کریں۔ اور اس کی بنیادیں محکم کریں اور یہ جان لیں کہ "تنظیم امل" کی کامیابی ہمارے لیے اور تمام دنیا

(بقیہ حاشیہ) روس کے نزدیک وہ گردن زدنی ہیں کہ وہ دین کا نام لیتے ہیں۔ اور امریکہ ان کی یہ خطا نہیں بخش سکتا کہ "امل" کے نوجوانوں نے اسرائیلی منصوبوں کو خاک میں ملا دیا ہے۔

Presented by Ziaraat.Com

کے ستم زدہ انسانوں کے لیے بہت بڑی کامیابی ہے [1]

سیّد موسیٰ الصدر کے خلاف سازش

سید موسیٰ الصدر نے لبنان میں تاریخ کی سب سے بڑی تحریک کا آغاز کیا اور اسے چلایا۔ اس تحریک کی مخالفت دائیں بازو والوں نے اور بائیں بازو والوں نے خوب زور شور سے کی۔ چونکہ سید موسیٰ الصدر نے انھی ایام میں "لاشرقیہ ولاغربیہ" کا نعرہ لگایا تھا اس لیے دائیں بازو والوں اور بائیں بازو والوں، دونوں کے فکری نظام اس قابل نہ تھے کہ وہ اس نعرے کی حقیقت کو سمجھ پائیں۔ دائیں بازو سے وابستہ کسی شخص کے لیے ہر وہ شخص کمیونسٹ تھا جو دائیں بازو سے تعلق نہ رکھتا ہو اس لیے انھوں نے کہا کہ سید موسیٰ الصدر کمیونسٹ ہیں۔ کمیل شمعون نے اخباروں میں کھلم کھلا تحریر کیا کہ سید الصدر کمیونسٹ ہیں۔ خاص طور پر مجھے یاد ہے کہ دو سال قبل یعنی ۱۹۷۷ء میں ڈاکٹر علی شریعتی کے جہلم کے موقع پر جب بیروت میں تعزیتی جلسہ ہوا تو سابق شاہ کی مخالفت کی بناء پر اور کمیل شمعون کے سبب سے جو شاہ کا بڑا گہرا دوست تھا، دائیں بازو والوں نے سید موسیٰ الصدر کے خلاف بہت طوفان اٹھایا اور کہا کہ سید موسیٰ الصدر کمیونسٹ ہیں اور علی شریعتی بھی کمیونسٹ تھے۔ ایک آفت بپا ہو گئی تھی۔ اب اتفاق ہے کہ عربی میں کمیونسٹ کے لیے جو لفظ ہے وہ شیوعی ہے۔ یہ لفظ شیعی کے بہت نزدیک ہے تلفظ کے اعتبار سے بھی اور صوتی اعتبار سے بھی، لہٰذا انھوں نے ان دونوں الفاظ کو مترادف کے طور پر استعمال کرنا شروع کر دیا اور کہا کہ جتنے شیعی ہیں وہ شیوعی ہیں، یعنی کمیونسٹ ہیں۔

دوسری طرف بائیں بازو والے بالخصوص عراق کے بٹھو جب یہ دیکھتے تھے کہ سید موسیٰ الصدر ان کے ساتھ نہیں بلکہ ان کی ایک اپنی لائن ہے تو وہ ان پر حکم لگا دیتے اور کہتے کہ سید موسیٰ امریکہ کے ایجنٹ ہیں۔ بائیں بازو کے تمام اخباروں اور

[1] یہ یادداشت ۱۹۷۷ء میں لبنان میں لکھی گئی تھی۔

ان کی دوسری تحریروں میں سید موسیٰ الصدر اور شیعوں کے خلاف تہمت تراشی اور افواہ سازی کا بازار بڑی شدت سے گرم تھا۔ یہاں تک کہ خود ایران میں ہم نے دیکھا ہے کہ دو سال کے اندر یعنی انقلاب کے ابتدائی ایام میں کتنی کتابیں، پمفلٹ اور پوسٹر سید موسیٰ الصدر اور تنظیم "اَمل" کے خلاف شائع ہوئے ہیں۔ ایران کی بائیں بازو کی جماعتیں بھی لبنان کی بائیں بازو کی جماعتوں سے تعلق رکھنے کی بناء پر سید موسیٰ الصدر کو اپنی تنقید کا ہدف بناتی رہی ہیں۔ انھوں نے ان کے خلاف کتابیں بھی لکھیں اور مختلف یونیورسٹیوں میں پوسٹر بھی لگائے اس کا سبب یہ ہے کہ دائیں بازو والے ہوں یا بائیں بازو والے، ان کی فکری روش میں یہ بات سما نہیں سکتی کہ کوئی شخص ان دونوں سے آزاد بھی ہو سکتا ہے، اس کا ایک اپنا طریقۂ کار بھی ہو سکتا ہے۔ وہ یہ سوچتے ہیں کہ جو شخص ان کے ہمراہ نہیں وہ لازماً دشمن کے ہمراہ ہے وہ یہ تصور ہی نہیں کر سکتے کہ کچھ لوگ ایسے بھی ہو سکتے ہیں جو آزاد ہوں، خود اپنے پاؤں پر کھڑے ہوں اور اپنے زورِ بازو سے دشمن کے خلاف جنگ آزما ہوں۔ یہ بات ان کے نزدیک تصور کے قابل ہی نہیں یہی سبب ہے کہ سید موسیٰ الصدر اور تنظیم "اَمل" کے خلاف تہمتوں اور الزاموں کا ایک طوفان اُٹھ کھڑا ہوا اور ابھی تک جاری ہے، یہاں تک کہ ایران میں بھی یہ تہمت تراشیاں وجود رکھتی ہیں۔

بہر حال دائیں بازو اور بائیں بازو والوں نے سید موسیٰ الصدر کے خلاف بڑی شدت سے مؤقف اختیار کیا اور انھیں اپنی تہمتوں اور الزاموں کا نشانہ بنایا۔ لیکن جو شخص خدا کی راہ اختیار کرتا ہے وہ دشمن کی طاقت سے ڈرا نہیں کرتا اور نہ دشمن کی عددی فوقیت ہی اس کے دل میں کوئی وحشت پیدا کر سکتی ہے وہ اپنی راہ میں ثابت قدم رہتا ہے اور اپنی منزل کی طرف رواں دواں۔ سید موسیٰ الصدر نے بھی یہی وطیرہ اختیار کیا اس لئے ان کے دشمنوں نے کوشش کی کہ ان کا صفایا کر دیا جائے۔ ان دشمنوں میں دائیں اور بائیں بازو والے دونوں شامل تھے کیونکہ وہ دونوں یہ دیکھتے تھے کہ سید موسیٰ الصدر کا وجود ان کے لئے خطرے کا باعث ہے۔ جس طرح ہماری امت کے رہبر امام خمینی نے اور ہمارے مقدس انقلاب

Presented by Ziaraat.Com

نے شرق و غرب دونوں کو لرزہ براندام کر رکھا ہے اسی طرح لبنان میں بھی یہ دونوں گروہ محسوس کرتے تھے کہ سید موسیٰ الصدر کا وجود ان کے لیے باعثِ خطر ہے[1]

اسرائیل، مصر اور امریکہ کیمپ ڈیوڈ میں اکٹھے ہوئے اور وہاں قرارداد پاس ہوئی کہ فلسطین کے مسئلے کے حل کے لیے جنوبی لبنان کے دو حصے کر دیئے جائیں ایک حصہ اسرائیل کو دے دیا جائے اور دوسرے حصے میں فلسطینیوں کو آباد کر دیا جائے اس لئے ضروری ہوا کہ اس منطقے کے اصل باشندوں کو اپنی توپوں اور بموں کا نشانہ بنائیں اور انھیں اپنے گھروں سے باہر نکال پھینکیں۔ کیمپ ڈیوڈ کے معاہدے کا ایک نتیجہ یہ تھا جسے اسرائیل مصر اور امریکہ تینوں نے مانا تھا لیکن سید موسیٰ الصدر نے اس کی شدت سے مخالفت کی وہ اس بات کی ہرگز اجازت نہیں دیتے تھے کہ جنوبی لبنان کو یعنی جبل عامل کے مقدس اور شیعہ منطقے کو اسرائیل اور اس کے ہمنوا تقسیم کر دیں اور ہڑپ کر جائیں۔ سید موسیٰ الصدر کے لیے یہ بات تسلیم کرنا ناممکن تھا اس لیے انھوں نے اس کے خلاف جہاد کی راہ اختیار کی۔ اس جہاد میں وہ اور ان کے ساتھی تنہا تھے۔ اب دشمن یہ منصوبہ بناتے ہیں کہ کسی طرح سید الصدر کا صفایا کیا جائے کیونکہ ان کے ہوتے ہوئے ان لوگوں کا پروگرام یعنی جنوبی لبنان کی تقسیم ممکن نہ تھی انھوں نے کئی مرتبہ انھیں اپنی دہشت گردی کا نشانہ بنایا لیکن ہر بار وہ خدا کے فضل و کرم سے بچ نکلتے رہے۔ آخر دو سال قبل وہ حکومت لیبیا کے سرکاری دعوت نامے کے جواب میں وہاں گئے اور پانچ دن انھوں نے وہاں قیام کیا۔ چھٹے روز یعنی ۳۱ اگست ۱۹۷۸ کو وہ دو بجے بعد دوپہر اپنے دو ساتھیوں کے ہمراہ اپنے ہوٹل سے سرکاری گاڑیوں میں بیٹھ کر کرنل قذافی سے ملنے گئے۔ اس کے بعد وہ دکھائی نہیں دیے اور ایک پراسرار طور پر غائب ہو گئے۔ ہمارے خیال میں لیبیا کی حکومت ان کی حفاظت کی ذمہ دار تھی اور سید موسیٰ الصدر کے یوں غائب ہو جانے میں اس کی ذمہ داری برقرار رہتی ہے۔

---

[1] یہ تقریر ۱۳۵۹ شمسی ہجری مطابق ۱۹۸۰ میں ایران میں کی گئی۔

باب نوزدہم

انقلابِ اسلامی ایران کی کامیابی اور سید موسیٰ الصدر کا اغواء

اب تک یہ خیال کیا جا رہا تھا کہ سید موسیٰ الصدر کے اغواء کا سبب یہ تھا کہ وہ جنوبی لبنان کو فلسطینیوں کا وطن بنانے کے خلاف تھے[1] لیکن انقلابِ اسلامی ایران کی کامیابی تمام مظلوم ملکوں کے محروم اور مظلوم طبقوں میں امید اور کامیابی کی آرزو اور اس منطقے کے فاسد اور ظالم نظاموں کے لیے بربادی کا خطرہ، یہ سب چیزیں مل کر آقائے الصدر کے گم ہو جانے کی ایک نئی تفسیر اور اس کے اسباب پر نئی روشنی پیش کرتے ہیں۔ اس لیے یہاں یہ کوشش کی جاتی ہے کہ سید الصدر کے گم ہو جانے کے مسئلے اور اس منطقے میں انقلابِ اسلامی ایران کے اثرات سے بحث کی جائے اور اس کا تجزیہ پیش کیا جائے[2]

انقلاب اسلامی ایران کامیابی کی طرف گامزن ہے

اس قسم کا عظیم انقلاب کہیں نہیں دیکھا گیا۔ یہ ایسا انقلاب ہے جس کی توجیہ مشرق و مغرب کا کوئی نظریہ نہیں کر سکا اسی لیے شرق و غرب کی سب طاقتیں اس سے وحشت کھا رہی ہیں۔ اس انقلاب کے جو حتمی نتائج برآمد ہوئے ہیں وہ حسب ذیل ہیں :۔

---

[1] اس سے پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ اسرائیلی اور لبنان کی دائیں اور بائیں بازو کی جماعتیں لبنان کی تقسیم کے درپے تھیں اور اسرائیل یہ چاہتا تھا کہ جنوبی لبنان کے جنوبی حصے پر قاسمیہ تک خود قابض ہو جائے اور باقی حصے میں فلسطینیوں کا وطن بنایا جائے۔ سید الصدر اس کے مخالف تھے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ جنوبی لبنان میں فلسطینیوں کے رہنے کے مخالف تھے۔

[2] یہ تجزیہ انقلاب اسلامی ایران کی کامیابی سے پہلے ۱۹۷۸ کے موسم خزاں میں لبنان میں لکھا گیا۔

Presented by Ziaraat.Com

۱۔ اسلامی آئیڈیالوجی کی برتری

دنیا میں ایک نئی راہ پیدا ہوئی ہے۔ مغرب کے مادی اور مشرق کے مارکسی نظریات اس کی توجیہ سے قاصر ہیں۔ دور جدید کے ذہن میں دو عظیم تاریخی انقلابوں کی یاد تازہ ہے۔ ان میں سے پہلا فرانس کا انقلاب ہے جو آزادی جمہوریت اور مساوات کے لیے برپا ہوا اور مغربی ملکوں کے نظام ہائے حکومت میں جو تبدیلیاں آئی ہیں ان کی اساس اسی انقلاب کے اثرات پر ہے۔ دوسرا انقلاب اکتوبر کا روسی انقلاب ہے جس کی اساس مارکسیت اور اشتراکیت پر ہے۔ یہ انقلاب سرمایہ داری اور بورژوازی کے خلاف جنگ آزما ہونے اور معاشرے میں طبقات کو ختم کرنے کے لیے وجود میں آیا اور دنیا کے جملہ اشتراکی نظاموں کی اساس بنا۔

البتہ ایران کا انقلاب آیت اللہ خمینی کی رہبری میں مختلف قسم کا انقلاب ہے۔ اس نے ایک ایسی راہ کھولی ہے جس کی بناء پر وہ ان دونوں انقلابوں سے مختلف ہو جاتا ہے۔ انقلاب ایران کی سب سے اہم قدر، اس کی روحانیت، خدا پر ایمان اور جذبہ فداکاری ہے، شہادت کی آرزو اور یوں کمال مطلق کا حصول ہے۔ آج کی مادی دنیا میں سب لوگ، تاجر ہوں یا عالم یا انقلابی مادی زندگی اور شخصی مفادات کے اسیر ہیں۔ ایران کے لوگوں نے اپنے پرخلوص سینوں کو آتشیں گولیوں کا نشانہ بنا رکھا ہے۔ یہاں تک کہ مرتے وقت بھی نماز شہادت ادا کرتے ہیں۔ وہ اعلیٰ ترین اخلاص نہایت گہرے عشق اور شیریں ترین شہادت کے نمائندے ہیں۔ استبدادی حکومتوں کی عادت ہے کہ وہ قوت کے بل پر لوگوں کو ہراساں کر کے اور انھیں موت کی دھمکیاں دے دے کر اپنے آپ کو باقی رکھتی ہیں۔ لیکن آج کے ایران میں ایسے لوگ پیدا ہو چکے ہیں۔ جو اپنے پاؤں چل کر قربان گاہِ عشق میں پہنچتے

ہیں، اپنے سینوں کو آزمائشوں کی سپر بنا دیتے ہیں اور شہادت کی آرزو سے سرشار ہیں۔ اس طریقے سے انھوں نے حکومت سے اس کا ہتھیار چھین لیا حکومت کا ہتھیار لوگوں کو مارنا ہے لیکن جو لوگ نہایت خلوص سے اپنی زندگیوں کی قربانیاں پیش کرتے ہوں وہ شاہ کے فاسد نظام حکومت اور آتشیں گولیوں کے خطروں سے نہیں ڈرا کرتے۔

مارکسی اور مغرب کی مادی آئیڈیالوجیوں کو اپنی قطعی شکست دکھائی دے رہی ہے اور یہ دونوں گروہ یہ چاہتے ہیں کہ تہمت تراشیوں، دروغ بافیوں اور نامردانہ افواہوں کے ذریعے سے اس مقدس انقلاب کی اصالت کو خراب کریں لیکن حقیقت کہیں زیادہ قوی ہے کہ وہ ان تہمت تراشیوں اور دروغ بافیوں سے شکست کھا جائے۔

۲۔ دنیا کے شیعوں کی بیداری

صدیوں تک شیعوں کو جاسوسی، خیانت، کفر و الحاد اور اس قسم کی دوسری تہمتوں سے نوازا گیا ہے۔ اور شیعہ ہمیشہ مرکب نقص کا شکار رہے ہیں۔ تعصب اور بغض و عناد کے آسمان سے ان پر جھوٹی تہمتوں کی بارشیں ہوتی رہی ہیں لیکن اب انھوں نے اپنے شیعہ ہونے پر فخر کا اظہار کرنا شروع کر دیا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ سب پر بات ثابت ہو چکی ہے کہ شیعہ انقلاب دراصل اسلامی انقلاب ہے۔ محروم و مظلوم شیعوں کو اب موقع ملا ہے کہ وہ چین کا سانس لے سکیں اور اپنے شیعہ ہونے پر شرمندہ نہ ہوں۔

۱؎ ڈاکٹر مصطفیٰ چمران شہید کا یہ بیان ۱۹۷۸ء میں تحریر ہوا لیکن ان کی بصیرت کا ثبوت اب واضح طور پر مل رہا ہے اور مغربی دنیا بڑی سنجیدگی سے شیعوں کے عقائد ان کے کلچر وغیرہ کا مطالعہ کر رہی ہے۔ مغربی اخبارات نے شیعوں کا نوٹس لینا شروع کر دیا اور بار بار خطرے کی گھنٹیاں بجا رہے ہیں حال ہی میں نیٹو کے سابق کمانڈر جنرل ہیگ نے راولپنڈی اور اسلام آباد میں کھلم کھلا شیعوں کو مطعون کیا اور امریکی حلقہ اثر کی حکومتوں کو شیعہ تحریک سے خبردار کیا ہے۔

Presented by Ziaraat.Com

ان کے خلاف تکفیر کے حربے اور ان کے مخالفوں کی تہمت تراشیوں کا سدباب ہو چکا ہے اور متعصب دشمنوں کی جھوٹی کہانیاں ۔ان کے الزامات وغیرہ خود بخود زائل ہو چکے ہیں۔

۳۔ فاسد نظام ہائے حکومت کے لیے خطرہ

اس منطقے کی اکثر فاسد اور ظالم حکومتیں اپنے لیے خطرہ محسوس کر رہی ہیں اور یوں امریکی مفاد بھی خطرے میں پڑ گئے ہیں اس منطقے کی عرب حکومتیں خاص طور پر خوف زدہ ہیں کہ ان کا خاتمہ قریب آگیا ہے۔ انقلاب ایران اس قدر آتشیں اور اس قدر نورانی ہے کہ تمام فاسد نظاموں کو جلا ڈالتا ہے اور جہالت و تاریکی کو نیست و نابود کر دیتا ہے ایران کا انقلاب اکثریت کا انقلاب ہے یہ ہمارے دور کے دوسرے انقلابات کی طرح اقلیت کا انقلاب نہیں یہاں لوگوں کی بھاری اکثریت جس میں عورتیں، مرد، بچے، بڑے سب شامل ہوں، اس قسم کی ذہنی پختگی، اس قسم کے ایمان اور ظلم و فساد کے خلاف جذبہ قربانی سے سرشار ہوں اور وہ اپنے قدموں پر کھڑی ہو چکی ہے۔ اسے دنیا کی کوئی استبدادی طاقت روک نہیں سکتی۔

لبنان اور سید موسیٰ الصدر

۱۔ یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ لبنان کے پس منظر اور سید موسیٰ الصدر کی خدمات کا مختصر سا جائزہ لیا جائے۔[۲]

۲۔ ماضی میں لبنان کے شیعوں نے بے شمار ظلم و ستم برداشت کیے ہیں، ان کے قتل عام ہوتے رہے ہیں، ان کے شہروں کو نذر آتش کیا جاتا رہا ہے۔ اس قسم کے جرائم نے وہاں کے شیعوں کو کچل کر رکھ دیا تھا۔ ترکان عثمان نے لبنان کے شیعوں پر جو ظلم و ستم روا رکھا وہ ناقابل بیان ہے، اور جدید میں بھی مارونیوں اور ان کے

ساتھیوں نے جو لبنان کے اصلی حاکم ہیں، شیعوں کی کافی حق تلفی کی ہے اور ان کی تحقیر کی ہے۔ اس بناء پر لبنان میں شیعوں کو تیسرے درجے کا شہری تصور کیا جاتا رہا ہے۔ ان کو حیوان، کافر، ایجنٹ اور جاسوس کے القاب سے یاد کیا جاتا رہا ہے۔ بہت سے لوگوں کے لیے اپنی شیعیت کا اظہار کرنا بھی تحقیر کے مترادف تھا یہاں تک کہ بعض شیعوں نے ان باتوں سے تنگ آکر اپنے شناختی کارڈوں میں تبدیلی کروالی اور کسی دوسرے دین کو اختیار کر لیا۔[۱]

۲۔ سید موسیٰ الصدر لبنان تشریف لائے اور تاریخ میں پہلی بار شیعوں میں مرکزیت پیدا ہوئی۔ انھوں نے شدید جدوجہد کے بعد "المجلس الاسلامی الشیعی الاعلیٰ" کی تاسیس کروائی اور شیعوں کے غصب شدہ حقوق کی واپسی کے لیے میدان جہاد میں اترے۔ ان کی سرکردگی میں ہونے والے مظاہروں، ہڑتالوں اور احتجاجی جلسوں نے لبنان کے حاکموں کو لرزہ براندام کر دیا اور مسلمانوں کو واضح کامیابیاں نصیب ہوئیں انھیں نے شیعوں کے لیے ایک تشخص حاصل کیا۔ ان کے دلوں سے احساس حقارت کو ختم کیا۔ اب شیعوں نے اپنے آپ پر فخر کرنا شروع کر دیا۔ انھیں اپنی انسانیت، اپنی عزت اور اپنی شرافت کا احساس ہوا۔ اب انھوں نے دائیں اور بائیں بازو والی جماعتوں سے

---

[۱] یہ بڑی دردناک داستان ہے۔ غریب لیکن ذہین شیعہ لڑکے اور لڑکیاں اپنے سامنے کوئی موقع نہیں پاتی تھیں کہ وہ اعلیٰ تعلیم حاصل کر سکیں۔ وہاں مارونی اور دوسری عیسائی جماعتیں ان کا استحصال کرتی تھیں اور وہ عیسائی بن جاتے تھے تاکہ معاشرے میں اعلیٰ مقام حاصل کر سکیں۔ اس سلسلے میں چارلز مالک نے بڑی سرگرمی کا ثبوت دیا۔ یہ صاحب اقوام متحدہ کے صدر بھی رہ چکے ہیں اور وہاں لبنان کے نمائندے بھی ان کا بیروت کی امریکن یونیورسٹی سے بھی تعلق رہا ہے۔ جن شیعہ نوجوانوں کو ان صاحب نے ورغلا کر عیسائی بنایا ان میں ڈاکٹر ماجد فخری کا نام سرفہرست ہے۔ یہ صاحب بیروت کی امریکن یونیورسٹی میں فلسفے کے استاد رہے ہیں، شاید اب بھی ہوں۔ یہ جنوبی لبنان کے ایک مشہور شیعہ خاندان کے فرد ہیں لیکن اسی غربت اور افلاس کی بناء پر چارلز مالک کے ہتھے چڑھ گئے اور اسلامی فلسفے "محققانہ کام" کرنے کا عہدہ ان کے سپرد ہوا۔ پاکستان کے فلسفے کے استاد انھیں اکثر مسلمان سمجھتے ہیں۔ مترجم نے ان صاحب سے بڑھ کر اسلام کو نگاہ حقارت سے دیکھنے والا اور کوئی شخص بیروت میں نہیں دیکھا۔

Presented by Ziaraat.Com

نجات حاصل کرلی۔ وہ سید الصدر کے ارد گرد جمع ہو گئے اور یوں انھوں نے ایک بے نظیر طاقت کو حاصل کرلیا۔

۳۔ دائیں اور بائیں بازو کی جماعتوں نے جب اپنے مفادات کو خطرے میں پایا انھوں نے سید الصدر کے خلاف ایک شدید مہم کا آغاز کیا۔ آقائے صدر اور لبنان کے شیعوں کے خلاف زہر آلودہ پروپیگنڈے کا ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔ ایک بہت بڑی سازش وجود میں آئی جس نے پورے لبنان کو خانہ جنگی کی آگ میں جھونک دیا۔ دوسرے تمام گروہوں کے مقابلے میں شیعوں نے کہیں زیادہ جرأت اور دلیری کا ثبوت دیا اور دوسروں کے مقابلے میں کہیں زیادہ قربانیاں پیش کیں اور شہید گنوائے۔ جنگ اکثر اوقات شیعوں کے محلے ہی میں واقع ہوتی تھی اور ہے اور وہاں کے بے گناہ بچے اور عورتیں اس کا نشانہ بنتے رہے اور ہیں۔ شیعوں کی مخالف جماعتوں نے شیعہ لیڈروں اور کارکنوں کا صفایا کرنے کا کام شروع کیا یہاں تک کہ کئی بار آقائے صدر کی جان لینے کے بھی درپے ہوئے کیونکہ ان کے نزدیک وہی لبنان میں خانہ جنگی کا باعث تھے اور وہی تھے انھوں نے مسلح مظاہروں اور ہڑتالوں کے ذریعے لوگوں کو ترغیب دلائی کہ وہ فوجی تربیت حاصل کریں اور ہتھیار اٹھالیں۔ اسی باعث عیسائیوں کو پریشانی لاحق ہوئی اور انھوں نے پہلے سے زیادہ تیاری کرنا شروع کی اور پہلے سے زیادہ مسلح ہو گئے جس کا نتیجہ لبنان میں خانہ جنگی کی شکل میں ظاہر ہوا۔

۴۔ دائیں اور بائیں بازو کی جماعتوں کے ڈھول کا پول کھل گیا اور وہ لوگوں کی نگاہوں میں گر گئیں۔ ان جماعتوں نے بے شمار دروغ گوئی، تہمت تراشی، دھونس اور دسہ گیری سے کام لے کر لوگوں کو اپنے قابو کر رکھا تھا۔ لیکن انھوں نے سوائے مصیبتیں پیدا کرنے، پریشانیاں لانے، جرائم کاری اور خیانت کے اور کوئی کام نہ کیا۔ سید الصدر نے ان سے الگ ہو کر ایک آزاد راہ اختیار کی۔ اس لیے ہر گروہ انھیں دوسرے گروہ سے متعلق گردانتا تھا اور ان کو مورد طعن و تشنیع بناتا تھا۔ مگر انھوں نے ان تہمتوں اور ان الزامات کی

پروا کیے بغیر اپنے عقیدے نیز انسانی اور اسلامی قدروں کی بنیاد پر جو راہ اختیار کی تھی وہ اس راہ پر چلتے رہے۔

لبنان میں خانہ جنگی کے آغاز ہی نے اس استعماری سازش کے پروگرام کا راز فاش کردیا اور سب کو یہ دعوت دی کہ وہ ہوش مندی سے کام لیتے ہوئے ان سازشیوں کے جال میں نہ پھنسیں جس زمانے میں دونوں گروہ جنگ کے نعرے لگا رہے تھے صرف وہی یعنی سید موسیٰ الصدر صلح و امن کی صدا بلند کر رہے تھے اور کوشش کر رہے تھے کہ خانہ جنگی کا سدباب کرسکیں۔ لیکن سازش بہت مضبوط تھی اور آتش جنگ بھڑک اٹھی۔ دائیں اور بائیں بازو کی جماعتوں نے اس آگ کو اور ہوا دی اور پھر وہ زمانہ آیا جب "قتل علی الھویۃ" یعنی محض مسلمان یا عیسائی ہونے کی بناء پر قتل شروع ہوا۔ مسلمانوں کے علاقوں میں جن کی رہنمائی بائیں بازو کی مارکسی جماعتیں کر رہی تھیں ہر عیسائی کو صرف اس بات پر قتل کر دیا جاتا تھا کہ وہ عیسائی ہے۔ اسی طرح عیسائی بھی ہر مسلمان کو صرف اس لیے قتل کر دیتے تھے کہ وہ مسلمان ہے۔ اس لیے جنگ کا دائرہ وسیع ہوا اور قتل و غارت میں تیزی پیدا ہوئی۔ عیسائیوں کو بامر مجبوری متحد ہو کر کتائب کے جھنڈے تلے جمع ہونا پڑا۔ سید موسیٰ الصدر تنہا وہ شخص تھے جنھوں نے محض مسلمان یا محض عیسائی ہونے کی بناء پر قتل کے خلاف صدائے انسانیت بلند کی یہاں تک کہ وہ چار دن تک بیروت کی مسجد عاملیہ میں بھوک ہڑتال میں رہے

دائیں اور بائیں بازو کی جماعتیں لبنان کو تقسیم کرنے کے درپے ہو گئیں اور انھوں نے اپنے اپنے علاقے میں داخلی حکومتیں قائم کرلیں۔ تنہا کسی شخص نے اگر ان کی مخالفت کی وہ آقائے صدر تھے جنھوں نے دونوں فریقوں کی شدت سے مخالفت کی۔

جب اسرائیل اور امریکہ کی سازش کے نتیجہ میں سوریا اور فلسطینی مزاحمت کے درمیان ٹھن گئی اور بائیں بازو کی جماعتیں اس فساد کو مزید بڑھانے کی کوشش کرتیں اور اگر دونوں کے درمیان کوئی صلح ہو جاتی تو ایک نئی سازش شروع ہو جاتی اور جنگ چھڑ جاتی اس وقت دائیں بازو والے بھی اس برادر کشی کی حوصلہ افزائی کرتے۔ اس وقت بھی کسی شخص نے اس برادر کشی کے خلاف مؤقف اختیار کیا تو وہ سید موسیٰ الصدر ہی تھے۔ انھوں نے اس

Presented by Ziaraat.Com

جنگ کو پورے عربوں کے لیے غداری قرار دیا۔ وہ سات آٹھ بار سوریا گئے، چند بار وہ یاسر عرفات کو اپنے ساتھ لے گئے اور انھیں حافظ الاسد سے ملا کر صلح کروائی۔ اس بناء پر ان کے خلاف گالیوں اور تہمتوں کا ایک طوفان اٹھایا گیا۔ آج یہ دونوں فریق اپنی ماضی کی حرکات کا اعتراف کر چکے ہیں اور اس وقت متحد ہو کر کام کر رہے ہیں۔ انھوں نے آقائے صدر کے بارے میں جو ناگفتنی باتیں کی تھیں ان کے بارے میں انھوں نے آنکھیں بند کر لی ہیں۔ یہاں تک کہ معذرت تک بھی نہیں کی۔ یہ فریق نہیں چاہتے کہ سید موسیٰ الصدر کی طاقت ایمان ان کی ثابت قدمی، ان کی فداکاری، ان کے نظریات کی درستی، ان کے اخلاص، بڑی طاقتوں سے ان کی بے نیازی اور دائیں اور بائیں بازو کی دھڑے بندیوں سے ان کی علیحدگی کا اعتراف کریں۔

پھر یہ بھی ہے کہ استعماری طاقتوں اور ان کے حاشیہ برداروں نے کوشش کی کہ شیعوں اور سنیوں کے مابین پھوٹ ڈالیں۔ جنوبی لبنان کے شیعوں اور فلسطینیوں کے کے درمیان فساد پیدا کریں اور شیعوں کو فلسطینیوں کے غلط اقدامات کی بنیاد پر جو ان کی جو ان کی پٹائی ہوئی تھی، اس کے سبب سے انہیں اسرائیل کی جانب مائل کریں۔ لیکن یہ سب سازشیں آقائے صدر کی موجودگی اور ان کی قیادت کی بناء پر نقش بر آب ثابت ہوئیں انھوں نے اپنے واضح اور اٹل احکام میں لوگوں سے یہ کہا کہ "التعامل مع اسرائیل حرام" یعنی اسرائیل کے ساتھ کسی قسم کا لین دین حرام ہے۔ ان کے ان بیانات نے اس سازش کو شکست دی اور شیعوں کو سقوط سے نجات دلائی۔ استعمار پرستوں نے یہ دریافت کر لیا کہ آقائے الصدر کی موجودگی میں وہ اپنے استعماری پروگرام کو پورا نہیں کر سکتے۔ ہر روز ان کی مقبولیت اور طاقت بڑھتی جا رہی تھی۔ ان کے افکار و نظریات نے لوگوں کے دلوں میں گھر کرنا شروع کر دیا تھا اور وہ گروہ در گروہ ان کی طرف مائل ہو رہے تھے اور اس کے مقابلے میں دائیں اور بائیں بازو کی جماعتیں نظری اعتبار سے بھی اور عوام میں اثر کے اعتبار سے بھی زیادہ سے زیادہ مائل بہ شکست ہو رہی تھی۔

ہمسایوں پر انقلاب ایران کا اثر

ایران کے انقلاب نے اپنے ہمسایوں پر جو اثر کیا ہے ان میں چند باتیں قابل توجہ ہیں۔

۱۔ دنیا کے شیعوں میں بیداری اور حرکت :۔ ترکی ہو یا ہندوستان، عراق ہو یا کویت، سعودی عرب ہو یا خلیج فارس کے ملک یا لبنان، ہر جگہ کے شیعوں کے دلوں میں خون جوش مار رہا ہے۔ جن شیعوں نے صدیوں تک دباؤ اور تشدد کے تحت زندگی گذاری ہے، تہمتوں کا نشانہ بنتے ہیں اور اقتصادی، سیاسی اور اجتماعی محتاجی کا شکار رہے ہیں انھیں اب دم لینے کی فرصت ملی ہے۔ ان کے اندر حرکت کے آثار پیدا ہوئے ہیں۔ شیعوں کے اٹھ کھڑے ہونے کے خطرے نے اس نیلے آسمان کے نیچے گھنٹیاں بجانا شروع کر دی ہیں۔

۲۔ عرب حکومتوں کو سقوط کا خطرہ :۔ لبنان کی تقریباً نصف آبادی شیعہ ہے۔ ترکی میں کوئی چودہ لاکھ شیعہ اور علوی (نصیری) آباد ہیں، سعودی عرب میں شیعوں کی آبادی تین لاکھ کے قریب ہے۔ عراق کی آبادی کا ساٹھ فیصد حصہ شیعہ ہے۔ کویت، خلیج فارس کے ممالک اور بحرین کی اکثریت شیعہ ہے۔ یہ منطقہ دنیا کے پٹرول پیدا کرنے والے مناطق میں بڑی اہمیت کا مالک ہے۔ اس میں امریکی مفادات بے حد وحساب ہیں۔ لہٰذا اس منطقے میں عرب حکومتوں کو جو خطرہ لاحق ہوا ہے اس سے امریکہ کو بڑی پریشانی ہو رہی ہے۔

۳۔ روس بھی انقلاب اسلامی ایران کی طاقت اور اس کے اثرات سے پریشان ہے۔ ایران کی اسلامی حکومت فرقہ وارانہ وابستگیوں اور لسانی اور نسلی اختلافات سے قطع نظر سب قوموں کو اپنی طرف کھینچ رہی ہے۔ جنوبی روس کے مسلمان علاقوں قفقاز، ترکستان، تاجیکستان، ازبکستان وغیرہ کے لوگوں کا اپنے مسلمان بھائیوں کی طرف مائل ہونا قدرتی چیز ہے۔ علاوہ ازیں روس کے بہت سے مفادات ایران

Presented by Ziaraat.Com

میں ہیں، اس انقلاب کی بناء پر اسے ان مفادات سے ہاتھ دھونا پڑے گا۔ ان مفادات میں سب سے اہم روسی آئیڈیالوجی کی شکست کا مسئلہ ہے جس سے دنیا میں مارکسیت کا مستقبل متاثر ہو جائے گا۔

۴۔ لبنان کے شیعوں کے رہنما دنیائے عرب کی مقبول ترین اور فعال ترین مذہبی شخصیت ہیں۔ ان میں ایک حرکی روحِ انقلابی موجود ہے۔ وہ جدید و قدیم علوم سے آشنا ہیں[1]۔ ان کے پاس سیاسی، اجتماعی اور انقلابی تجربہ بھی ہے۔ اس شیعہ رہنما نے لبنان کے شیعوں کی مستقبل کی داستان ہی کو بدل دیا ہے جس سے دوسرے عرب مناطق کے باشندوں پر بھی اثر پڑا ہے۔ اب جب کہ انقلاب ایران اپنی ترقی کے مراحل طے کر رہا ہے۔ (موسم خزاں ۱۹۷۸) اور اس منطقے کے تمام محروم و مظلوم شیعوں میں انقلابی جذبہ جوش میں آ رہا ہے، اس وقت سید الصدر کی ایک فعال اور موثر شیعہ رہنما کی حیثیت سے موجودگی اس بات پر قادر ہے کہ وہ اکثر عرب حکومتوں کے زوال وسقوط کے لیے خطرہ بن جائیں۔ دور حاضر میں دنیا کے بیشتر شیعہ ایران ولبنان کے سوا قیادت سے محروم ہیں مثال کے طور پر ترکی کے چودہ لاکھ شیعہ اور علوی کوئی رہبر اور رہنما نہیں رکھتے۔ یہ حالات سے تنگ آئے ہوئے اور انقلابی شیعہ بامر مجبوری بائیں بازو کی جماعتوں سے وابستہ ہو جاتے ہیں اور دشمن بھی انھیں کمیونسٹ کے نام سے بڑی آسانی سے اپنی صفوں میں کھینچ لیتا ہے اور دنیا اس جرم کو دیکھ کر خاموش رہتی ہے۔ یہ مسلم بات ہے کہ ایک ہوش مند، پختہ کار اور باصلاحیت لیڈر ان انقلابی طاقتوں کو صحیح رستے پر ڈال سکتا ہے۔ لہذا بڑی طاقتوں کے نکتہ نظر سے آقائے صدر کا وجود اس منطقے کے لئے بڑے خطرے کا باعث ہے۔

---

[1] سید موسیٰ الصدر حوزہ علمیہ نجف میں تعلیم حاصل کرنے کے علاوہ تہران یونیورسٹی کے دانشکدہ الہیات سے علم الاقتصاد اور سیاسیات میں لیسانس (ایم۔اے) حاصل کر چکے ہیں۔

سیّد موسیٰ الصدر کا اغواء

ان بحرانی اور مشکل حالات میں ایک فعال اور ہوش مند رہنما اغوا ہو گیا۔ ان کے اغوا ہونے کے جو اسباب بیان کیے گئے ہیں وہ حسب ذیل ہیں۔

۱۔ مذہبی اختلافات:۔ لیبیا کے صدر قذافی شیعوں کے بارے میں کوئی موافقانہ نکتہ نظر نہیں رکھتا۔ اس کے علاوہ وہ اپنے آپ کو "خلیفۃ اللہ فی الارض" اور "امیر المومنین" کہلواتا ہے، صرف قرآن کو قبول کرتا ہے، سنت اور شریعت کے دوسرے مصادر کو رد کرتا ہے اور قرآن مجید کی ایک خاص تفسیر کا قائل ہے۔ وہ شیعہ اور سنی دونوں قسم کے مذاہب کو رد کرتا ہے اس نے ایک کتاب میں جس کا نام سبز کتاب ہے۔ اپنے افکار کو واضح کیا ہے، انھیں اختلافات کی بناء پر اس نے لیبیا کے تیس سے زائد سنی علما کو جیل میں ڈال دیا۔ یہاں تک کہ سینیول کے نمائندے اور لبنان کے مفتی کو بھی مذہبی اختلافات کی بناء پر دس دن جیل میں رہنا پڑا۔ کہا جاتا ہے کہ یہی مذہبی اختلافات اس بات کا سبب ہوئے کہ معمر قذافی کی وساطت سے سید موسیٰ الصدر کو اغوا کیا گیا۔

۲۔ اس بات کا امکان ہے کہ سید موسیٰ الصدر کے اغواء میں "الجبہہ الشعبیہ" اور کمیونسٹ پارٹی جیسی بائیں بازو کی جماعتوں کا ہاتھ ہو جن کے لیبیا میں بڑے مضبوط اڈے ہیں۔ ان جماعتوں کے ساتھ سید موسیٰ الصدر کا اختلاف بڑی واضح بات ہے۔ ان کی طرف سے سید موسیٰ الصدر کے خلاف تہمت تراشیوں کی مہمیں اور انھیں ختم کرنے کی باتیں، ان جماعتوں کے لیے معمولی باتیں تھیں۔ لیکن ہمارا نکتہ نظر یہ ہے کہ لیبیا میں یہ ممکن نہیں کہ کوئی جماعت یا تنظیم معمر قذافی کی مرضی اور اس کے علم کے بغیر کوئی کام سرانجام دے سکے۔ یہاں تک کہ اگر ان جماعتوں نے اپنے مفادات کے پیش نظر سید موسیٰ الصدر کو غائب کیا تو بھی وہ لیبیا کی حکومت کے علم اور رضامندی کے بغیر ممکن نہیں۔

Presented by Ziaraat.Com

۳۔ بین الاقوامی سازش:۔ سید موسیٰ الصدر کے اغواء ہونے کے اسباب میں بڑی طاقتوں اور بعض عرب حکومتوں کی شرکت بھی ہے۔ اس نکتہ نظر کو ماننے والوں کی تعداد بہت زیادہ ہے اور اس تعداد میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔ چار ماہ قبل یہ خیال کیا جاتا تھا کہ جنوبی لبنان کو فلسطینیوں کا وطن قرار دینے کا مسئلہ اور کیمپ ڈیوڈ قرارداد سید موسیٰ الصدر کے اغواء کا سبب ہے کیونکہ سید الصدر اپنی عوامی مقبولیت کی طاقت کی بناء پر اس قرارداد کی مخالفت کرتے تھے۔ لیکن انقلاب ایران کے ترقی پذیر ہونے کے بعد اس سازش کے بعض نئے پہلو روشن ہوئے ہیں[1] جو جنوبی لبنان اور اسے فلسطینیوں کا وطن بنانے، حتیٰ کہ فلسطین کے مسئلے سے بھی اہم ہیں۔ آج کل بہت سی عرب حکومتوں کو سقوط کا خطرہ لاحق ہے، امریکہ

[1] ڈاکٹر چمران شہید نے جن ممکن اسباب کا ذکر کیا ہے وہ اپنے مقام پر درست ہیں لیکن انھوں نے ایک اہم عامل کا ذکر نہیں کیا اور وہ یہ ہے کہ لبنان کے بڑے بڑے شیعہ جاگیردار سید موسیٰ الصدر کے شدید مخالف تھے۔ ان میں کامل الاسعد سرفہرست ہے۔ مزید برآں لبنان کے عظیم مجتہد سید عبدالحسین شرف الدین مرحوم کا خاندان بھی سید موسیٰ الصدر سے رشتہ داری کے باوجود ان کے مخالف تھا۔ سید موسیٰ صدر کی ہمشیرہ کی شادی سید عبدالحسین شرف الدین کے پوتے حسین شرف الدین سے ہوئی ہے۔ لیکن شرف الدین خاندان کے اکثر افراد عراقی بعث کے حامی ہیں جن میں سرفہرست لبنانی پارلیمنٹ کے سابق رکن اور سابق وزیر جعفر شرف الدین کا نام آتا ہے ان کے ایک بھتیجے حسن شرف الدین عراق کی وزارت خارجہ میں کام کرتے ہیں۔ سید موسیٰ الصدر اور اس خاندان کے مابین چپقلش صرف سیاسی امور کی بناء پر نہیں تھی بلکہ ذاتی مفادات بھی شامل تھے۔ شرف الدین خاندان اپنے آپ کو صدر کے مشہور کالج "الکلیہ الجعفریہ" اور "جمعیۃ البر والاحسان" کا مالک سمجھتا تھا اور اس کے پیسے کو من مانے طور پر استعمال کرنا چاہتا تھا۔ سید موسیٰ الصدر اس کی مخالفت کرتے تھے۔ ۱۹۶۹ کے اواخر میں سید الصدر کے گھر میں رات کو کچھ لوگ داخل ہوئے۔ اور بعض اہم کاغذات اور دستاویزات کو چرانے کی کوشش کی جس واقعہ پر لوگوں نے کھلم کھلا شرف الدین خاندان کے افراد کو ملزم گردانا تھا اور اس کے خلاف صور اور بعلبک میں شدید مظاہرے بھی ہوئے تھے۔ مزید برآں لبنان کے وہ شیعہ علماء جو دین کو اپنی زر خرید کنیز گردانتے تھے اور جن کا ذکر ڈاکٹر چمران نے اس کتاب کی ابتداء میں کیا ہے، وہ بھی سید موسیٰ الصدر کے حاسدوں اور مخالفوں

کے تیل کے مفادات کو خطرہ لاحق ہے اور دنیا کے اس اہم سٹریٹیجک علاقے میں بہت سی تبدیلیاں متوقع ہیں۔ مغربی ممالک اور امریکہ کے مفادات کے لیے سید موسیٰ الصدر جس قسم کا خطرہ بنے ہوئے تھے وہ تصور سے کہیں زیادہ ہے بالخصوص یہ کہ سید موسیٰ الصدر یہ قدرت رکھتے تھے کہ وہ امام خمینی کے پیغام کو عرب ممالک میں پہنچا سکیں۔ عرب شیعہ انہیں خوب جانتے ہیں، ان میں انھیں بڑی مقبولیت حاصل ہے۔ اور ان کی بات بڑی اثر رکھتی ہے۔ وہ عربوں کے عادات و افکار اور ان کے روحانی تلاطم سے آشنا ہیں۔ وہ ان کے مصائب و آلام اور ان کی ذہنی الجھنوں سے واقف ہیں اور انھیں ان لوگوں سے براہ راست علاقہ تھا۔ لہٰذا شیعہ عربوں میں بیداری اور موجودہ عرب حکومتوں کے متوقع زوال میں ان کی بڑی اہمیت سمجھی جاتی تھی۔

اغواء کی تفصیل

سید موسیٰ صدر کے تعلقات لیبیا کی حکومت سے دوستانہ نہ تھے۔ لبنان میں لیبیا کی حاشیہ بردار جماعتیں انہیں بے نقط سناتی تھیں اور ان پر عجیب و غریب تہمتیں لگاتی تھیں۔ لبنان کے وہ اخبار جو لیبیا نے خرید رکھے تھے اور اسی طرح وہ ریڈیو سٹیشن جو لیبیا کے ہم نوا تھے سید موسیٰ الصدر کے خلاف کسی قسم کی تہمت لگانے سے گریز نہ کرتے۔ ۱۹۷۸ء کے موسم گرما کے وسط میں سید موسیٰ الصدر الجزائر تشریف لے گئے جہاں انھوں نے الجزائر کے حکام سے خصوصاً الجزائر کے صدر ہواری بومدین سے مذاکرات کئے اور ان کے ساتھ باہمی تعاون اور اتفاق رائے حاصل کیا۔ اسی طرح "تنظیم امل" اور الجزائر کے محاذ آزادی ایک دوسرے کے حلیف بنے اور ان کی طرف سے ایک مشترکہ بیان جاری ہوا۔ ان مذاکرات کے دوران میں الجزائر کے بعض ذمہ دار افراد نے سید موسیٰ الصدر سے قذافی کے ساتھ تعلقات کا ذکر بھی کیا اور یہ تجویز پیش کی کہ یہ کشیدگی ختم ہونا چاہیئے۔ سید الصدر نے بات قبول کر لی۔ لیبیا کی حکومت سے رابطہ

(بقیہ حاشیہ) میں شمار ہوتے تھے اس لیے کوئی بعید نہیں کہ سید الصدر کے اغواء میں ان مفاد پرستوں کا بھی ہاتھ ہو۔

Presented by Ziaraat.Com

پیدا کیا گیا جس پر لیبیا نے سید موسیٰ الصدر کو خاص دعوت دی کہ وہ لیبیا تشریف لائیں۔ سید الصدر ۲۵ اگست ۱۹۷۸ء کو لیبیا تشریف لے گئے۔ وہ ۳۱ اگست تک وہیں رہے۔ لیبیا کی سرکاری اطلاعات کے مطابق صدر قذافی سے ان کی ملاقات نہ ہو سکی انھوں نے یہ ارادہ کیا کہ ۳۱ اگست کو وہ لبنان روانہ ہو جائیں۔ اس دن ۲ بج کر ۵ منٹ بعد دوپہر کو ہوٹل کے سامنے دیکھے گئے لیکن اس کے بعد وہ اپنے دونوں رفقائے سفر شیخ محمد یعقوب اور عباس بدر الدین کے ہمراہ مفقود ہو گئے۔

لیبیا کے ہم نوا بعض اخباروں نے جن میں لبنان کا روزنامہ السفیر بھی شامل ہے بڑی آب و تاب سے یہ خبریں شائع کیں کہ سید الصدر ایران کے انقلاب میں شرکت کرنے کے لیے اور سابق شاہ ایران کے خلاف جدوجہد کے لیے خفیہ طور پر ایران چلے گئے ہیں۔ ان لوگوں نے یہ چاہا تھا کہ عوام کی نگاہیں حقیقت سے ہٹا دیں لیکن کسی نے اس بات کو قبول نہ کیا۔

عوام کا ردِ عمل

سید الصدر کے گم ہو جانے کے بارے میں خبر پھیلتے ہی لبنان میں ایک ہیجان برپا ہو گیا۔ شیعہ، سنی اور دُرزی فرقوں کے دینی رہنماؤں نے ایک دن کے لیے عام ہڑتال کا اعلان کیا۔ لبنان کے تمام مسلمان علاقے بند ہو گئے اور ایسی ہڑتال ہوئی کہ تاریخ میں اس کی نظیر نہیں ملتی۔ بعلبک، صیدہ اور صور جیسے مقامات پر ایسے مظاہرات ہوئے جو آج تک نہ دیکھے گئے تھے۔ صور کا ماتم زدہ شہر جو تین سال تک سید الصدر کے دشمنوں یعنی بائیں بازو کی جماعتوں کے چنگل میں تھا اور اب اسرائیلی بمباروں نے اس کو برباد بھی کر دیا تھا، اس شہر میں ایسے مظاہرے ہوئے جنکی مثال ڈھونڈے سے نہیں ملتی۔ ایک لاکھ سے زیادہ افراد نے ان مظاہرات میں شرکت کی۔ عورتیں اور بوڑھے مرد بچوں کی طرح حزن کے آنسو بہا رہے تھے اور گلی کوچوں میں یوں اپنے احساسات کو فریاد کی شکل میں بلند کر رہے تھے گویا ان کا باپ دنیا سے رخصت ہو گیا ہو۔

چند دنوں کے بعد دوبارہ مظاہرات شروع ہوئے۔ لبنان کی تمام مسجدوں میں بلا تفریق مذہب دینی رہنماؤں نے بھوک ہڑتال کی۔ پھر چند دنوں کے بعد تیسری بار لوگوں نے سید الصدر سے اپنی وفاداری کا اظہار کیا اور ایک بہت بڑا جلوس جس میں لبنان کے مختلف علاقوں کے لوگ شامل تھے۔ سوریا کی طرف روانہ ہوا جہاں عرب حکومتوں کے سربراہوں کی کانفرنس ہو رہی تھی جس میں بومدین، قذافی، یاسر عرفات اور حافظ الاسد سب شریک تھے۔ اس عظیم جلوس کا ایک حصہ دمشق میں تھا اور دوسرا حصہ سوریا۔ لبنان کی سرحد پر لبنان کے شیعوں نے سید الصدر کے حق میں جو نعرے بلند کیے اس نے پورے دمشق کو لرزا دیا۔ عرب سربراہوں کی کانفرنس کے شرکاء سب اس جلوس کی طرف متوجہ تھے جس میں کم از کم تین لاکھ افراد شریک تھے[1] خود قذافی نے بھی بڑی حیرانی سے شیعیانِ لبنان کے اس اظہار وفاداری اور عظمت و قدرت کو ملاحظہ کیا۔ وہ کانفرنس ہال کی ایک کھڑکی سے کاروں، بسوں اور پیادہ پا لوگوں کا عظیم جلوس دیکھ رہا تھا۔

شیعہ نمائندے کانفرنس ہال میں داخل ہوئے اور انھوں نے سید الصدر کی گمشدگی کا مسئلہ پیش کیا۔ حافظ الاسد کی خواہش پر ان نمائندوں اور قذافی کے درمیان ایک الگ کمرے میں میٹنگ ہوئی۔ اس میٹنگ میں قذافی نے پہلا سوال یہ کیا اور پوچھا کہ آیا آپ سب لوگ شیعہ ہیں؟ اس پر صیدہ کے سنی مفتی شیخ احمد الزین اٹھ کھڑے ہوئے اور کہا کہ میں سنی ہوں اور سید الصدر صرف شیعوں کے رہنما نہیں، وہ ہم سب کے رہبر ہیں۔ قذافی نے کہا کہ وہ تو ایرانی ہیں۔ آپ ایک ایرانی کی اس قدر حمایت کیوں کرتے ہیں؟ بیروت کے شیعہ مفتی شیخ عبد الامیر قبلان نے قذافی کو بڑا مدلل جواب دیا۔ ان مظاہروں اور جلوسوں نے سب

---

[1] سوریا اور لبنان کے مابین سفر کرنے کے لیے ان ملکوں کے شہریوں کو پاسپورٹ کی ضرورت نہیں ہے بلکہ وہ اپنے شناختی کارڈوں کی بنیاد پر سفر کر سکتے ہیں۔ اس کا اطلاق ان غیر ملکی شہریوں پر بھی ہوتا ہے جن کے پاس لبنان یا سوریا میں طویل قیام کا اجازت نامہ ہو۔ لہٰذا اس بات پر تعجب نہیں کرنا چاہیے کہ ان تین لاکھ افراد نے سوریا کی سرحد کیسے عبور کی۔ یہاں یہ بات بھی یاد رہے کہ سوریا کی سرحد کے ساتھ کے لبنانی مناطق کی بھاری اکثریت شیعہ ہے۔

Presented by Ziaraat.Com

لوگوں پر ثابت کر دیا کہ سید موسیٰ الصدر کس قدر مقبولیت کے حامل ہیں اور یہ کہ لوگوں کی اکثریت ان کے حامیوں کی ہے۔ یہ بات دائیں اور بائیں بازو کی جماعتوں کے منہ پر ایک بڑا سخت طمانچہ تھا۔ وہ یہ خیال کرتے تھے کہ تین سال کے جھوٹے پروپیگنڈے سے انھوں نے ان کی مقبولیت ختم کر دی ہے۔ یہاں تک کہ ان میں سے بعض نے قذافی سے یہ بھی کہا تھا کہ اب سید الصدر کا حامی کوئی نہیں اور انھیں مار دینا یا غائب کر دینا آسان بات ہے۔ لیکن ان کی حمایت میں ان عظیم مظاہروں نے اور تنظیم امل کے جوانوں کی طرف سے انتقام لینے کے اعلان نے سب دشمنوں کو پریشان کر دیا۔ سازشیوں نے کوشش کی کہ غصے میں بھرے ہوئے شیعوں کو سنیوں سے یا فلسطینیوں سے لڑا دیں اور داخلی ہنگاموں کی بناء پر ان کی یہ طاقت برباد ہو جائے لیکن شیعہ لیڈروں کی ہوش مندی اور بیداری نے اس سازش کو بھی چلنے نہ دیا۔ لبنان کے شیعہ اپنے آپ کو یتیم محسوس کرتے ہیں لیکن اس قسم کی نامردانہ سازشوں کے مقابلے میں خاموش نہیں رہیں گے۔

بیرونی ردعمل

حافظ الاسد، بومدین اور یاسر عرفات نے قذافی کو اس امر پر راضی کرنے کی واضح کوششیں کیں کہ وہ سید الصدر کو رہا کر دیں۔ حافظ الاسد نے ایک میٹنگ میں قذافی سے کہا کہ ہوش سے کام لو، ایسا نہ ہو کہ حادثہ کربلا کی تکرار ہو جائے۔ یاسر عرفات تین بار بذات خود لیبیا گئے اور انھوں نے قذافی پر دباؤ ڈالا۔ آخری بار ان کے اور قذافی کے مابین شدید تو تو میں میں ہوئی۔

مسلمانوں کے عظیم رہبر امام خمینی نے سید الصدر کی گرفتاری کی خبر سن کر بڑے غم و غصے کا اظہار کیا۔ انھوں نے یاسر عرفات کے نام ایک تار میں اپنے جذبات ظاہر کیے اور ان سے درخواست کی کہ وہ اس معاملے کی تحقیق کریں اور اس کا حل تلاش کریں۔ جب عرب سربراہوں کی کانفرنس سوریا میں ہو رہی تھی اس وقت بھی امام خمینی نے حافظ الاسد کو تار دیا اور مطالبہ کیا کہ کانفرنس کے ارکان آقائے صدر کی گمشدگی کے معاملے کی تحقیق کریں جب

لیبیا کی حکومت نے آقائے خمینی کو لیبیا آنے کی دعوت دی تو انھوں نے جواب دیا کہ اس دعوت کی قبولیت سید موسیٰ الصدر کی واپسی پر منحصر ہے۔ انھوں نے سید الصدر کی واپسی سے پہلے لیبیا سے کسی قسم کی بات چیت کرنے سے انکار کر دیا۔

امام خمینی کے دیئے ہوئے تاروں کے بعد دوسرے مسلمان رہنماؤں اور اسلامی تنظیموں کی طرف سے برقیات کا ایک سیلاب لیبیا، الجزائر اور سوریا پر وارد ہوا۔ ایران میں بہت سے جلسوں میں مقررین نے سید الصدر کے مسئلے پر تقریریں کیں۔ یہاں تک کہ اس کا ردعمل ان پر شور ایام میں مظاہرہ کرنے والوں سے بھی ظاہر ہوا ایسے جو انقلاب ایران کے لیئے جدوجہد کر رہے تھے۔

آقائے خمینی سے وساطت

جو چیز واضح نظر آتی ہے وہ ایران کے انقلاب کا عروج اور شاہ کی حتمی شکست

لہ لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ پاکستان کے مسلمانوں نے اس حادثے پر کسی قسم کا ردعمل ظاہر نہیں کیا اس میں شیعہ اور سنی دونوں طبقے شامل ہیں۔ کسی جماعت نے یہ تکلیف نہ کی کہ وہ احتجاجی تار ہی بھیج دیتے اس سلسلے میں پاکستان کے شیعوں کی سرد مہری اور بے توجہی زیادہ تکلیف دہ ہے۔ پاکستان کے شیعہ علماء میں سے کسی کو یہ توفیق نہ ہوئی کہ وہ مجالس میں اور جمعوں کے خطبوں میں عوام کو سید الصدر کی گمشدگی کے بارے میں کچھ بتاتے۔ صرف یہی نہیں بلکہ ان کی اکثریت کو شاید اب تک یہ معلوم نہیں کہ سید موسیٰ الصدر کون تھے اور ان کی گمشدگی کے پس پردہ کون سے محرکات کارفرما ہیں۔ ایران اور عراق کے علماء کے کارناموں کو ہمارے علماء ہمیشہ شان کر بیان کرتے ہیں لیکن ان سے کوئی پوچھنے والا نہیں کہ کیا وہ خود بھی ایران کے علماء کی طرح قومی جدوجہد میں عوام کی رہنمائی کر سکتے ہیں یا نہیں۔ ہمارے ہاں بے شمار مجالس ہوتی ہیں جن میں لچھے دار تقریریں کرنے والے حضرات کی جیبیں بھی گرم ہوتی ہیں لیکن ان مجالس کو عوام کی بیداری کے لیے استعمال نہیں کیا جاتا۔ اگر ان مجالس کو سید موسیٰ الصدر کی گمشدگی پر بحث کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا تو نہ صرف یہ کہ یہاں کے عوام ان حالات سے آگاہ ہوتے بلکہ یہ بھی کہ وہ ان حالات سے اطلاع پا کر اپنے گریبان میں منہ ڈالنے کے قابل بھی ہو سکتے۔

Presented by Ziaraat.Com

اور اس کے ساتھ اس منطقے میں امریکی مفادات کا نیست و نابود ہونا ہے۔ البتہ امریکہ ہاتھ پاؤں مار رہا ہے کہ وہ شاہ کی اس شکست کا سد باب کر سکے اور یہ تحریر انقلاب ایران کی کامیابی سے پہلے کی ہے۔ کبھی وہ بڑی سختی کے ساتھ اور عناد کے ساتھ میدان میں اترتا ہے اور کبھی بے چارگی کے عالم میں سازش گٹھ جوڑ اور ملی بھگت سے کام لیتا ہے۔ چونکہ امریکہ کی بے چارگی بڑی واضح ہے اس لیے اس نے بڑی کوشش کی ہے کہ کسی طرح آیت اللہ خمینی سے مصالحت ہو سکے۔ وہ اس بات کے لیے تیار ہے کہ شاہ کو ایران سے لے جائے۔ وہ اس کے لئے بھی تیار ہے کہ ایران کا نظام حکومت بدل جائے۔ لیکن خواہش اس کی یہ ہے کہ اس علاقے میں اس کے مفادات محفوظ رہیں لیکن اب تک اس نے جو کوششیں کی ہیں ان میں ناکامی کے سوا اسے اب تک کچھ نہیں ملا۔

۱۔ امریکہ نے پوری کوشش کی ہے کہ دباؤ ڈال کر شاہ کو بدلنے پر مجبور کرے تاکہ وہ لوگوں کو آزادی اور جمہوری نظام دے سکے اور یوں عوام کو راضی کر لے۔

۲۔ امریکہ اس بات کے لیے بھی تیار ہو گیا کہ ڈاکٹر امینی بڑے کر و فر سے آئے اور شاہ کو سرزنش کرے۔ یہاں تک کہ اسے شکست تسلیم کرنے پر آمادہ کرے۔

۳۔ اس نے کوشش کی کہ ڈاکٹر سنجابی کو حزب مخالف کے لیڈر کی حیثیت سے روشناس کرائے اور شدید پروپگینڈے کے ذریعے سے عوام کے ذہنوں میں اس کی قدر و قیمت بڑھائے اور پھر اس کے ساتھ مل کر سازش کرے۔ امریکہ ہر حالت میں اس بات کے لیے تیار تھا کہ شاہ کو در خور اعتنا نہ گردانے کیونکہ اب شاہ رسوا ہو چکا تھا اور اس کا کچھ فائدہ نہ تھا۔ بس شرط ایک تھی کہ امریکی مفادات محفوظ رہیں۔ لیکن امام خمینی کی مزاحمت نے اس کے لیے ساری راہیں بند کر دیں اور اس کے سارے منصوبے دھرے کے دھرے رہ گئے۔

اس شکست کے بعد امریکہ نے کوشش کی کہ براہ راست امام خمینی سے مذاکرات کرے اور یوں ایک طرح کی نئی سازش کرے۔ اس کام کے لیے اس نے بہت سے

طریقے اختیار کیے۔ اس کے لیے اس نے بڑی بڑی شخصیتوں کو بطور واسطہ چنا۔ اس نے اردن کے ملک حسین کو سرکاری طور پر مصر کے میں شریک کیا جس نے آقائے صدر کے مسئلے سے بھی فائدہ اٹھایا اور ان کی حمایت میں یہ تجویز پیش کی کہ ملک حسین، حافظ الاسد اور امام خمینی تینوں مل کر قذافی کو خط لکھیں اور اسے دھمکی دیں۔ لیکن امام خمینی نے اسے قبول نہ کیا۔ یہ بات تسلیم شدہ ہے کہ یہ ترکیب امام خمینی کے نزدیک ہونے کے لیے کی گئی تھی تو دونوں طرفوں کو ایک اہم مسئلے کے حل میں شریک کرنے کا منصوبہ بنایا تھا تاکہ اس کے بعد امام خمینی تک پہنچنے کی راہ ہموار ہو سکے۔ یہ باتیں واضح طور پر اس چیز کی نشاندہی کرتی ہیں کہ امریکہ امام خمینی کے قریب ہونے اور ان پر دباؤ ڈالنے کے لیے بڑی بے چینی سے ہاتھ پاؤں مار رہا ہے۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا امریکہ واقعی طور پر آقائے خمینی کی بات تسلیم کرنے کے لیے تیار ہے؟ کیا وہ واقعی یہ چاہتا ہے کہ امام خمینی کو اپنے قریب لے آئے یہ بات بظاہر بعید از قیاس ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ اولاً تو امام خمینی اور ان کے رفقاء کا گروہ اپنے اسلامی اور انقلابی طرز فکر کی بنا پر امریکہ کے لیے بے حد خطرناک ہے اور دوسرے یہ کہ اگر امریکہ امام خمینی کی رائے کو اور ان کے خیالات کو ماننے کے لیے تیار ہے تو پھر وہ اس کشت و خون کے درپے کیوں ہے اور شاہ کے فاسد نظام حکومت کی حمایت پر کیوں زور دے رہا ہے اور اس کے باوجود امام خمینی پر دباؤ ڈال رہا ہے۔

واضح بات یہ ہے کہ امریکہ آقائے خمینی سے بات چیت پر آمادہ تو ہے لیکن اس لیے نہیں کہ وہ ان کی بات کو قبول کر لے بلکہ اس لیے کہ اپنے آپ کو بے گناہ ثابت کرے اور جہاں تک ممکن ہو سکے اپنے مفادات کی حفاظت کرے۔ بلکہ یہ بھی چاہتا ہے کہ وہ امام خمینی پر دباؤ ڈال کر انھیں اس منطقے کے بارے میں امریکہ کے بعض نظریات قبول کرنے پر آمادہ کرے اور یہ نظریات وہ ہیں جنھیں آیت اللہ خمینی قبول نہیں کرتے۔ لہذا ان نظریات کو قبول کروانے کے لیے امریکہ کو ضرورت ہے کہ وہ امام خمینی پر دباؤ ڈالے اور ان پر اپنے نظریات ٹھونسے۔ دوسرے لفظوں میں وہ ان نظریات ٹھونسنے کے لیے دباؤ

Presented by Ziaraat.Com

کی راہ اختیار کر رہا ہے۔

بہت سے ارباب فکر کا نظریہ ہے کہ سید الصدر کی گمشدگی کا مسئلہ امریکہ کو اس وساطت سے کھیلنے کا بہت بڑا موقع دے رہا ہے۔ ان کی گمشدگی اور امام خمینی پر دباؤ تاکہ وہ وساطت کے ذریعے امریکی نظریات کو قبول کر لیں، امریکہ کے نفع میں ہے۔

یہ بات ذہن نشین رکھنا چاہیئے کہ مغربی ممالک اپنے استعماری پروگراموں کو عملی جامہ پہنانے کے لیے بہت سی راہیں اختیار کرتے ہیں۔ ان میں سے ایک راہ یہ ہے کہ ایک انقلابی تحریک کو ہوا دی جائے جو اپنے تیز و تند نعروں سے ہر قسم کی تخریبی کارروائیوں پر قادر ہو۔ فلسطینی مزاحمت میں الجبہہ الشعبیہ کے کارکن یہی کام کر رہے ہیں۔ انھوں نے قتل و غارت اور دنگا فساد کر کے فلسطینی مزاحمت کو تقریباً ختم کر دیا ہے لیکن نعرے وہ ایسے بلند کرتے ہیں جو دوسرے لوگ بلند نہیں کر سکتے۔ اس لیے ان لوگوں نے فلسطینی مزاحمت کے عام پروگرامو کی شدید مخالفت کی۔ عراق کی حکومت بھی اپنے آپ کو بڑی انقلابی شمار کرتی ہے یہاں تک کہ بعض دیگر عرب حکومتوں کو غدار، پسماندہ، رجعت پسند اور ڈرپوک قرار دیتی ہے۔ اس لئے ان کے ساتھ تعاون نہیں کرتی۔ عراق کی حکومت مصر اور اسرائیل کے خلاف عربوں کے موقف کو خراب کرتی ہے۔ لیکن تیز و تند انقلابی نعرے لگا کر۔ عراق نے اب تک جو کام کیے ہیں وہ سب کے سب اسرائیل کے لیے نفع بخش اور فلسطینی مزاحمت اور عربوں کے لیے نقصان دہ ہیں۔ (۱۹۷۸) جہاں تک امام خمینی کا تعلق ہے، ہم یہ دیکھتے ہیں کہ عراق نے بڑی ڈھٹائی کے ساتھ شاہ کا ساتھ دیا اور انھیں عراق سے نکال دیا۔ اب ان دنوں میں اگر عراق کی حکومت سوریا کے قریب ہو رہی ہے یا دوسری عرب حکومتوں سے تعاون کر رہی ہے تو صرف اس ڈر سے کہ کہیں انقلاب ایران کی کامیابی کے بعد اس کا اپنا تیا پانچا نہ ہو جائے[1]

عربوں اور اسرائیل کے درمیان ۱۹۷۳ کی جنگ میں تمام عرب حکومتوں نے مغربی ممالک

---

[1] ڈاکٹر چمران شہید نے یہ باتیں ۱۹۷۸ میں لبنان میں بیٹھ کر تحریر کی تھیں۔ اس وقت کسی کے گمان میں بھی نہیں آسکتا تھا کہ حالات یہ رخ اختیار کریں گے۔ پاکستان میں "الجبہہ الشعبیہ" کے کارناموں کو بہت سراہا جاتا رہا ہے۔ اور عام طور پر لوگ انھیں بڑے زبردست انقلابی تصور کرتے ہیں۔ "جبہہ شعبیہ" کی ایک کارکن لیلیٰ خالد کو بہت بڑی انقلابی

کو تیل دینا بند کر دیا تھا لیکن عراق اور لیبیا نے ایسا نہیں کیا۔ انھوں نے امریکہ اور ان ممالک کو تیل فراہم کیا۔ تمام تند و تیز نعروں اور موجودہ پروگراموں میں بین بیخ نکالنے کے باوجود ان دونوں حکومتوں کے یہ کالم ہر منصف شخص کو ان کے بارے میں کم از کم شک میں مبتلا کر دیتے ہیں۔

آقائے صدر کی گمشدگی لیبیا کے بارے میں بڑا زبردست شک پیدا کرتی ہے چونکہ ان کی گمشدگی سے صرف استعماری طاقتوں کو، اسرائیل کو اور عربوں کی رجعت پسند حکومتوں کو فائدہ پہنچتا ہے۔ لیکن پوری صراحت اور جرأت کے ساتھ یہ کہا جا سکتا ہے کہ قذافی نے امام خمینی کو پوری طرح پہچانا نہیں ہے جس طرح دوسری بڑی طاقتوں نے انھیں پہچانا۔

(بقیہ حاشیہ) خاتون سمجھا جاتا ہے۔ لیکن لبنان میں فلسطینی تحریک کو جو زک پہنچی ہے اس سے واضح ہو گیا ہے کہ "الجبہہ الشعبیہ" کی ان کارروائیوں سے فلسطینی تحریک آزادی کو کوئی فائدہ نہیں ہوا البتہ اسرائیل کو یہ موقع مل گیا کہ وہ لبنان میں فلسطینی تحریک کے سب سے بڑے مرکز کو برباد کر دے۔ جب ڈاکٹر چمران یہ تحریر لکھ رہے تھے اس وقت ابھی انقلاب ایران کامیابی سے ہمکنار نہیں ہوا تھا اور ایران اور عراق کے درمیان لڑائی کسی کے تصور میں بھی نہیں آسکتی تھی۔ لیکن ڈاکٹر چمران کی دوررس نگاہوں نے مستقبل کے آئینے میں ان حالات کی جھلک دیکھ لی تھی۔ آج ان کی

Presented by Ziaraat.Com

باب بیستم

شیعیان لبنان پر انقلاب اسلامی ایران کا اثر

موجودہ حالات میں یہ کہنا بجا ہوگا کہ لبنان کے شیعہ یتیم ہوگئے۔ انھیں چودہ سو سال کے بعد ایک مناسب موقع ملا تھا کہ وہ اپنے آپ کو نکبت و ذلت و مفلسی کے جنگل سے نجات دلا سکیں، اور پہلی بار اپنی نفسیاتی الجھنوں پر قابو پا لیں۔ لیکن یک لخت انہیں پتا چلتا ہے کہ ان کا رہنما گم ہوگیا ہے اور ان کے وطن پر حملہ ہو رہا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس سازش کا سرچشمہ ایک ہی ہے۔ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اگر ایران کا اسلامی انقلاب کامیاب و کامران نہ ہوجاتا تو لبنان کے شیعوں کی زندگی محال ہوجاتی۔ لبنان کے پسے ہوئے فلاکت زدہ مفلس و قلاش لوگوں کے پاس زندگی میں اور کچھ ہے نہیں سوائے اس کے کہ انہوں نے اپنی نظریں ایران اور اس کے اسلامی انقلاب پر گاڑ رکھی ہیں۔ آپ یہ جانتے ہیں کہ انقلاب ایران کی حمایت میں دنیا کے سب سے بڑے مظاہرے لبنان ہی میں برپا ہوتے ہیں۔ یہ مظاہرے ان علاقوں میں خاص طور پر ہوتے ہیں جو اسرائیلی گولا باری کی زد میں ہیں اور جہاں کے باشندے ہر روز جان و مال کی قربانیاں دیتے ہیں یعنی وہ لوگ جو ہر روز استعمار کے ظلم و تعدی کا نشانہ بنتے ہیں انھیں ایران کے انقلاب کی قدر و قیمت کا اندازہ ہے۔ ان مظاہروں میں بعض اوقات مظاہرین کے جذبات اس قدر شدت اختیار کر لیتے ہیں کہ وہ فرط جوش سے اپنے گریبان چاک کر ڈالتے ہیں۔ عورتیں مکانوں کی چھتوں سے ان پر چاول پھینکتی ہیں اور حوصلہ افزائی کے نعرے لگاتی ہیں[1]۔ یہ وہ پر جوش احساسات ہیں جو لبنان کے یہ مظلوم، بدنصیب اور پسے

[1] جنوبی لبنان کی ایک رسم ہے کہ خوشی کے موقع پر اظہار جذبات کے لیے چاول پھینکے جاتے ہیں۔ غالباً یہ رسم یورپ سے یہاں پہنچی ہے جہاں شادی کے موقع پر جب دولھا دلھن گرجا گھر سے باہر نکلتے ہیں تو ان پر چاولوں کی بارش کی جاتی ہے۔

ہوئے لوگ انقلاب ایران کے بارے میں رکھتے ہیں اور اس بات میں بھی کوئی شک نہیں کہ اس بھری دنیا میں لبنان کے مظلوم و معتوب شیعوں کی حمایت کرنے والا ایران کے سوا اور کوئی ملک نہیں۔

لبنان میں ہر ایک تنظیم کسی نہ کسی عرب ملک پر تکیہ کرتی ہے لیکن لبنان کے شیعہ ایران کے سوا کوئی حمایتی دریافت نہیں کر پاتے۔ اس لیے ان تمام لوگوں کی نظریں خدا کے بعد ایران پر لگی ہوئی ہیں۔ ہم یہاں ایک بات کھول کر بیان کرنا چاہتے ہیں اور وہ شاید زیادہ خطرناک ہو۔ اور وہ یہ ہے کہ "امل" کے یہ سرفروش نوجوان جنھوں نے اسرائیل کے مقابل ڈٹ جانے کا عزم کر رکھا ہے؛ اور شریفانہ موت کو اس زندگی پر ترجیح دے رکھی ہے اس بات کے لیے بھی تیار تھے کہ وہ ایران جائیں اور اپنے بھائیوں کے دوش بدوش طاغوت و استبداد کے خلاف جنگ آزما ہوں۔ ان آخری چوبیس گھنٹوں میں جب ایران کا بحران عروج پر تھا۔ ان میں سے پانچ سو نوجوان تیار ہوگئے تھے اور سوریا کی حکومت نے بھی یہ بات منظور کر لی تھی کہ وہ اپنے جنگی ہوائی جہاز ان کو دے دے تاکہ وہ براہ راست تہران پہنچیں اور وہاں شریک جہاد ہوں۔

یہاں سے ہمیں یہ احساس ہوتا ہے کہ ہماری قوم ایسی جانفروشی و فداکاری اور اپنی قسمت کا فیصلہ کرنے کی ایسی کوشش کے سلسلے میں ایک ذمہ داری رکھتی ہے جسے فراموش نہیں کرنا چاہیئے۔ کیونکہ موجودہ صورت حالات میں خدا کے بعد ان مظلوم لوگوں کو پوری دنیا میں ایران کے سوا کوئی سہارا دینے والا نہیں۔

وہ اکیلا رہنما جو صدیوں کے بعد ان میں ابھرا تھا، جس نے انھیں اپنے آپ پر فخر کرنے کا موقع دیا تھا عظمت دلائی تھی۔ انھیں متحد کیا تھا، دشمنوں کے مقابلے میں انھیں طاقت دلائی تھی آج گم ہوچکا ہے۔ اگر انقلاب ایران نہ ہوتا اور اس کی کامیابی نہ ہوتی تو کوئی بعید نہ تھا کہ ان لوگوں کی اکثریت خودکشی کر لیتی۔ آپ ہر روز یہ خبر سنتے ہیں کہ جنوبی لبنان کا کوئی نہ کوئی شیعہ نوجوان کوئی ہوائی جہاز اغوا کرتا ہے اور پھر واپس آجاتا ہے کیا یہ لوگ دیوانے ہوچکے ہیں؟ نہیں نہیں یہ دیوانے نہیں انھیں معلوم نہیں کہ انھیں

Presented by Ziaraat.Com

کرنا کیا چاہیئے۔ کہا جاتا ہے کہ وہ سید موسیٰ صدر کی تلاش میں ہیں، اپنے معنوی باپ کی تلاش میں ہیں، وہ یتیم ہو چکے ہیں۔ جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں ان کی تنہا آرزو اور تنہا امید ایران اور صرف ایران ہے۔ یہ وہ جگہ ہے جہاں ایک اور قوم اور مختلف قسم اقوام صمیم قلب سے انقلاب ایران کی اہمیت اور قدر و قیمت کو جانتے ہیں، پہچانتے ہیں اور جانچتے ہیں۔ شاید وہ ہمارے لوگوں سے بھی زیادہ اس انقلاب کی قدر و قیمت کا اندازہ کرتے ہیں اور یہ محسوس کرتے ہیں کہ ہمارے انقلاب کی کامیابی سے ان کی امیدیں وابستہ ہیں اور ہمارے لوگ ہیں، جیسا کہ آپ جانتے ہیں، ایک دوسرے سے دست بگریبان ہو رہے ہیں اور اپنی طاقت کو برباد کر رہے ہیں۔ داخلی اختلافات اس بات کا سبب ہوتے ہیں کہ دشمن کے ہاتھ میں ایک ہتھیار دے دیں جس سے وہ ہمیں اور ہمارے انقلاب کو زدوکوب کرے۔ یہ اس لیے ہے کہ شاید انھوں نے اس انقلاب کی قدر و قیمت کو اس طرح نہیں پہچانا اور جانا جیسا کہ انھیں جاننا اور پہچاننا چاہیئے تھا۔[1] البتہ وہ لوگ جو اس وقت گولوں کی بارش میں زندگی بسر کر رہے ہیں اور اپنی ساری زندگی، اپنے وجود، حتیٰ کہ اپنے معنوی رہنما سے بھی ہاتھ دھو چکے ہیں وہ اس انقلاب کی قدر و قیمت کو کہیں بہتر سمجھتے ہیں اور ہم سے کہیں زیادہ ان کے دل اس انقلاب کے لیے جوش سے مملو ہیں۔

لبنان کے سارے فرقے اور ساری جماعتیں کسی نہ کسی ملک کی حمایت حاصل کیے ہوئے ہیں سوائے شیعیان لبنان اور "تنظیم امل" کے جو صرف خدا پر تکیہ کیے تھے اور ہیں لیکن اسلامی انقلاب کی کامیابی کے بعد انھیں نے خدائے بزرگ کے بعد اپنی امیدیں

[1] یہ تحریر ۱۹۸۰ کے اوائل کی ہے جب ایران میں داخلی اختلافات رونما ہو رہے تھے اور ایران دشمن طاقتوں نے کردستان میں نسلی اختلافات کو ہوا دے رکھی تھی اور باقی علاقوں میں نظریاتی اختلاف کی بنا پر جھگڑے ہو رہے تھے لیکن خدائے بزرگ و برتر نے ایران کے اسلامی انقلاب کو استحکام بخشا اور دشمنوں کی سازشیں ناکام ہو گئیں اور اب ایران منافقین اور مارکسین کے مقابلے میں سیسہ پلائی دیوار بن چکا ہے۔ اس لیے ایران دشمن طاقتوں نے اب اپنے پروپیگنڈے کا رخ دوسرے ممالک کی طرف کر دیا ہے جہاں مفاد پرست لوگ ایران کے خلاف ان سازشیوں کے ہاتھ میں کھیل رہے ہیں۔

انقلاب اسلامی سے وابستہ کر رکھی ہیں تاکہ وہ اس کی معنوی اور سیاسی حمایت سے بہرہ یاب ہو کر اسلام کے دشمنوں کے وہ بائیں بازو کے ہوں یا دائیں بازو کے اسرائیل، مقابلے میں بہتر طریقے سے جنگ آزما ہو سکیں۔

اسلامی انقلاب ایران کی کامیابی اور قوتوں کے توازن کی تبدیلی

ایران کا اسلامی انقلاب امریکی نواز بادشاہ کی طاغوتی حکومت کے شکست کھا جانے پر کامیاب ہو گیا۔ اس کامیابی نے اس منطقے میں قوتوں کا توازن بدل دیا ہے اور استعمار کے خلاف عوام کی کامیابی کی راہیں ہموار کر دی ہیں۔ اس نے انھیں قدرت و جرأت دے دی ہے کہ وہ اسلام پر بھروسہ کر کے تمام طاغوتی اور استبدادی طاقتوں کے خلاف کھڑے ہو سکیں اور جنگ آزما ہوں۔ اس نے ایسے معیار پیش کیے ہیں جنھوں نے سب لوگوں کو جنگ آزمائی اور جدوجہد کی صحیح راہیں سمجھا دی ہیں۔ اس علاقے کے دوسرے ممالک کے ساتھ تعلقات کے سلسلے میں خصوصاً لبنان اور عراق میں انقلاب اسلامی ایران نے بڑے گہرے اثر چھوڑے ہیں۔

ایران میں انقلاب کی کامیابی کے بعد لبنان میں بالعموم اور جنوبی لبنان کے آفت زدہ شہروں میں بالخصوص عورتیں، بچے، بوڑھے، جوان سبھی دیوانہ وار کوچہ و بازار میں نکل پڑے اور انھوں نے جنوبی لبنان کی فضا کو "خمینی زندہ باد" کے نعروں سے پر کر دیا۔ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ دنیا کے کسی خطے میں کسی نے بھی انقلاب ایران کی کامیابی کی یوں صمیم قلب سے آرزو نہیں کی۔ سبب اس کا یہ ہے کہ اگر خدانخواستہ انقلاب ایران کامیاب نہ ہوتا تو لبنان کے شیعوں کے لئے بالعموم اور جنوبی لبنان کے شیعوں کے لیے بالخصوص مستقبل کی ساری راہیں تاریک اور وحشتناک ہو جاتیں۔ ان کے لیے کوئی روزن امید نہ ہوتا۔ ان کے ایک طرف بائیں بازو کے لوگ تھے دوسری جانب اسرائیل تھا اور پھر وہ عیسائی تھے جو اسرائیل کی شہ پر اور اسرائیل کے پٹھو سعد حداد کی رہبری میں جنوبی لبنان میں دست اندازی کر رہے تھے۔ اس علاقے کے لیے مسئلے کے حل کی کوئی راہ نہ تھی

Presented by Ziaraat.Com

اس کے کہ ایرانی انقلاب کامیاب ہو، وہ طاقتوں کا توازن بدل دے اور پھر اسرائیل اور عیسائی دونوں اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ جائیں اور شیعہ آرام کا سانس لے سکیں۔

لبنان کی عیسائی جماعتوں اور وہاں کے عیسائیوں کی حمایت مغرب کے عیسائی ملک کر رہے ہیں جو ہر آن ان کی پشت پناہی کے لیے تیار ہیں۔ لبنان کے اہل سنت کا انحصار ہمسایہ عرب ملکوں پر ہے اور لبنان کے شیعہ بالکل بے پناہ ہیں۔ تاریخ میں اس علاقے کی تنہا شیعہ حکومت ایران رہی ہے۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں ایران کا سابق شاہ اسرائیل کا مددگار اور ہم کار تھا اور شیعوں کے خلاف کارروائیاں کرتا تھا[1] یہاں تک کہ لبنان کے شیعہ رہنما سید موسیٰ الصدر اور ان کے ساتھیوں کے خلاف سازشوں میں شریک ہوتا تھا۔ یہی وہ شاہ تھا جو لبنان کی سیاسی پارٹی "حزب الاحرار" کے سربراہ اور امریکہ کے کاسہ لیس کمیل شمعون کو اسلحہ بھی دیتا تھا اور پیسہ بھی اس لیے یہ دنیا کی تنہا شیعہ حکومت لبنان کے شیعوں کے مفادات کے خلاف کام کرتی تھی اور شیعہ اسی پوری بھری دنیا میں نہ صرف یہ کہ کوئی حمایتی نہ رکھتے تھے بلکہ شاہ کی نام نہاد شیعہ حکومت انہیں زک بھی

---

[1] اس کی بڑی واضح دلیل مسقط و عمان کی سلطنت میں ظفار کے مجاہدین کے خلاف سابق شاہ ایران کی امداد ہے مسقط و عمان میں سارا اقتدار "باغی" خارجیوں کے ہاتھ میں ہے ان کی چیرہ دستیوں کے خلاف ظفار کے لوگوں نے جد و جہد شروع کی۔ ان لوگوں کو "حیدر آبادی" کہا جاتا ہے اور اس کا سبب یہ ہے کہ یہ لوگ ظلم و ستم سے تنگ آ کر بڑی تعداد میں حیدر آباد دکن کو ہجرت کر گئے تھے۔ اور وہاں سے واپس آئے تو انھیں "حیدر آبادی" کہا جانے لگا۔ یہ سب لوگ یا ان کی بھاری اکثریت شیعہ ہے۔ سلطان مسقط و عمان نے ان لوگوں کے خلاف سابق شاہ ایران سے مدد طلب کی اور اس کی فوجیں اس منطقے میں شیعوں کے قتل و غارت میں مصروف رہیں ان لوگوں کی جد و جہد اب بھی جاری ہے اگرچہ پاکستان میں خبریں بہت کم پہنچتی ہیں۔ یاد رہے کہ مسقط و عمان وہ واحد عرب ملک ہے جہاں ہندوستانی ہندوؤں نے اپنے مندر بنا رکھے ہیں اور حکومت وقت کی سرپرستی میں نہ صرف بت پرستی کو فروغ دیتے ہیں بلکہ وہاں کے سارے کاروبار پر بھی چھائے ہوئے ہیں۔ سچ ہے کہ بادشاہوں کا کوئی مذہب نہیں ہوتا۔

پہنچاتی تھی۔ البتہ اب اس انقلاب کی کامیابی کے بعد لبنان کے شیعوں کے لیے راہیں روشن ہو گئیں اور انھیں ایک واقعی دوست اور حمایتی مل گیا ہے اور وہ تاریخ میں پہلی بار اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ دنیا میں ایک ایسی قوم ہے جو بڑے اخلاص اور محبت سے ان کی پشت پناہی کر رہی ہے اور یہ لوگ ایران کے عوام ہیں۔

انقلاب اسلامی ایران کی کامیابی کے بعد تصادم اور شہادتیں

چونکہ ایران کے اسلامی انقلاب کی کامیابی نے اپنے جدید معیاروں اور قدروں کے ذریعے سے اس علاقے کی رجعت پسند اور پٹھو حکومتوں کی بنیادوں کو ہلا دیا ہے اس لیے انھوں نے اس انقلاب کو دبانے اور اس کے اثرات کو رد کرنے کے لیے مل جل کر کارروائیاں کرنا شروع کر دی ہیں۔ ان کا پہلا ردعمل ان پارٹیوں کے وسیلے سے لبنان میں ظاہر ہوا جو ان کی زرخرید ہیں۔ انھوں نے یک دم اس تنہا عقائدی جماعت کی مخالفت بڑے واضح انداز میں شروع کر دی جو ایرانی انقلاب کی طرفدار تھی، یہ پارٹی تنظیم امل تھی، جس کا نتیجہ بے شمار تصادموں اور شہادتوں کی صورت میں پورے لبنان میں ظاہر ہوا میں چاہتا ہوں کہ نمونے کے طور پر ان چند واقعات کا ذکر کروں اور وہ حقائق واضح کروں جو کہیں نہ پڑھے گئے ہیں نہ سنے گئے ہیں۔

محمد فتونی اور علی مرتضیٰ کی شہادت

صور کے شہر میں جہاں میں رہتا تھا، بائیں بازو کی لبنانی جماعتوں اور فلسطینیوں کو مکمل بالادستی حاصل تھی اور وہ ان کے اثر و رسوخ کا علاقہ تھا۔ وہ ایک بہت بڑا سرکاری مدرسہ ہے۔ جس کا نام "ثانویۃ صور الرسمیہ" یعنی گورنمنٹ ہائر سیکنڈری سکول صور ہے۔ اس میں کوئی دو ہزار طالب علم ہیں۔ ان طالب علموں میں تنظیم امل کے چند کارکن مجاہد بھی شامل ہیں۔ اس مدرسے کا ایک طالب علم محمد فتونی نام کا تھا۔ وہ لبنان کا بہترین ایتھلیٹ اور کھلاڑی تھا اور "امل" کے بہترین جنگ آزماؤں میں شمار

Presented by Ziaraat.Com

ہوتا تھا۔ اس نے سوریا اور بعلبک میں بڑی تربیت حاصل کی تھی اور اپنی جسمانی استعداد کی بنا پر دشمن کے بہترین جنگ آزماؤں کے پاؤں اکھاڑ دیتا تھا۔

یہ محمد فتونی، ایران کے اسلامی انقلاب کی کامیابی کے دنوں میں آیۃ اللہ خمینی کی تصویریں شہر صور میں تقسیم کیا کرتا تھا۔ جب وہ مدرسے آیا تو اس نے وہاں بھی دیواروں پر حضرت آیۃ اللہ خمینی کی تصویریں دیواروں پر لگانا شروع کر دیں اس اثنا میں ایک کمیونسٹ آیا اور اس نے آقائے خمینی کی تصویر پھاڑ دی۔ محمد فتونی جو نہایت اچھا کھلاڑی، اتھلیٹ اور جنگ آزما تھا، آقائے خمینی کی تصویر کی بے حرمتی دیکھ کر غصے میں آگیا اس نے اس بدبخت کو دو تھپڑ رسید کیے اور اسے زمین پر گرا دیا۔ بائیں بازو کے چند اور لوگوں نے اپنے ساتھی کی حمایت میں اس پر حملہ کیا لیکن اس نے انھیں بھی پچھاڑ دیا۔ کچھ وقت گزرنے کے بعد کمیونسٹ پارٹی نے اپنے مسلح رضا کاروں کو مدرسہ میں بھیجا اور انھوں نے آتے ہی محمد فتونی کا سراغ لینا شروع کیا اور اس کے لیے مدرسے کا محاصرہ کر لیا۔ محمد فتونی لڑائی کی آنکھیں دیکھ چکا تھا وہ فوراً سمجھ گیا کہ اس کے دشمن کس نیت سے آئے ہیں اور ان کے پاس کس قسم کے ہتھیار ہیں۔ اس لیے اس نے ان سے لڑنے سے گریز کیا اور مدرسے کی دیوار پھاند کر ایک پرانے تاریخی قبرستان میں کود گیا اور لونودگیارہ ہو گیا۔

جب مجھے اس بات کی خبر ملی اس وقت میں اس مدرسے سے چند کلومیٹر دور ایک اور مدرسے میں تھا۔ میں نے اپنی ملیشیا کے چند نفر وہاں بھیج دیئے اور عسکری امور کے انچارج کو بھی روانہ کیا کہ وہ اس مدرسے میں پہنچ کر دیکھے کہ قصہ کیا ہے۔ یہ لوگ مدرسے کے پرنسپل کے دفتر میں جمع ہو گئے اور اسے ساری داستان کہ سنائی۔ پرنسپل نے کہا کہ کل یعنی دوسرے دن ایک تحقیقاتی کمیٹی بیٹھے گی جس کے سامنے محمد فتونی اور اس کے مخالف کمیونسٹ طالب علم پیش ہونگے اور وہاں حکم سنایا جائے گا۔ چونکہ ہم یہ نہیں چاہتے تھے کہ داخلی جھگڑے شروع ہوں اس لیے میں نے محمد فتونی کو خود بلوایا اور اس سے کہا کہ وہ دوسرے دن سہ پہر کو چار بجے اس تحقیقاتی کمیٹی کے سامنے پیش ہو اور پرنسپل جو بھی حکم دے اسے قبول کرے یہاں تک کہ اگر اسے مدرسے سے بھی نکال دیا جائے محمد فتونی

نے بات قبول کر لی اور دوسرے دن دو بجے ابعد دوپہر مدرسے گیا۔

کمیٹی کی کاروائی شروع ہونے سے ایک گھنٹہ پہلے کمیونسٹوں نے دوبارہ مدرسے کا محاصرہ کر لیا۔ محمد فتونی نے چاہا کہ پہلے کی مانند اپنے آپ کو اس محاصرے سے نکالے اس لئے اس نے پھر دیوار کا سہارا لیا اور اسے پھاند کر مدرسے کے پیچھے ایک گلی میں کود گیا لیکن وہاں اس نے دیکھا کہ کمیونسٹ پارٹی کی گاڑیاں اسلحے کے ساتھ موجود ہیں اور سبھی نے اسے اپنی زد میں لے رکھا ہے انھوں نے محمد فتونی سے کہا کہ اپنے ہاتھ اٹھا لے اور اپنے آپ کو ان کے حوالے کر دے۔ محمد فتونی نے کہا کہ خدا کی قسم کہ میں خدا کے سوا کسی طاقت کے سامنے سر تسلیم خم نہیں کروں گا اور ہاتھ نہیں اٹھاؤں گا۔ اس پر گولیوں کی ایک بوچھاڑ آئی اور اس کے سینے کو چھید گئی اور وہ خاک و خون میں غلطاں زمین پہ گر گیا۔

اس موقع پر "تنظیم اَمل" کا ایک اور جرأت مند رضا کار علی مرتضیٰ پہنچ گیا۔ یہ لڑکا صور میں "تنظیم اَمل" کا کمانڈر تھا۔ وہ کئی مہینوں تک اسرائیل کے مقابل لڑتا رہا تھا اور بیروت میں بھی اس نے کتائب کے خلاف جنگ آزمائی کے جوہر دکھائے تھے۔ شاید آپ کو یاد ہو کہ انقلاب کے دنوں میں تہران میں ایک تصویر جلوس نکالنے والوں کے ہاتھ میں ہوتی تھی جس میں ایک جوان فوجی وردی پہنے، ہاتھ میں کلاشنکوف لیے، نشانہ باندھے دکھائی دیتا تھا، یہ تصویر اسی لڑکے علی مرتضیٰ کی تھی جو جنوبی لبنان بنت جبیل کے محاذ پہ اسرائیل کے خلاف داد شجاعت دیتا تھا۔ میں نے خود اس جذبۂ قربانی سے سرشار جوان سے بہت کچھ سیکھا ہے اور دوسروں نے بھی اس سے استفادہ کیا ہے اور اس کی تصویریں جلوسوں میں اور مظاہروں میں پھرائی جاتی تھیں۔ اس وقت بھی آپ بہت سی کتابوں کی پشت پر اس مجاہد علی مرتضیٰ کی تصویریں دیکھتے ہوں گے۔ یہ جوان بے حد بہادر، بہت با ایمان اور بے مثال لڑنے والا تھا۔ جس کی نظیر نہیں ملتی۔ وہ صور کے شہر میں "تنظیم اَمل" کا کمانڈر تھا۔ وہ عین اس وقت اس گلی میں پہنچا جب محمد فتونی، اس کا دوست اس کا ساتھی، خاک و خون میں غلطاں زمین پر گرا تھا۔ وہ فوراً اس کے پاس پہنچا تا کہ اسے اٹھائے اور ہسپتال پہنچائے۔

Presented by Ziaraat.Com

اسے ابھی یہ معلوم نہ تھا کہ ہوا کیا ہے۔ جب وہ اس کے نزدیک گیا اور اسے اٹھانے لگا تو گولیوں کی ایک بوچھاڑ نے اس کا خیر مقدم کیا۔ وہ فوراً زمین پر لیٹ گیا اور پھر چھلانگ لگا کر دیوار کے پیچھے مورچہ بند ہو گیا اور یوں اس نے جان بچائی۔ لیکن اسے احساس ہو رہا تھا کہ دشمن ہر لمحہ اس کے قریب ہو رہا ہے۔ اس کے پاس صرف ایک ریوالور اور نو گولیاں تھیں۔ اس نے ان گولیوں سے آٹھ دشمنوں کو کیفر کردار تک پہنچایا لیکن مخالفین کے پاس آر پی۔ جی، دشکا مشین گنیں اور بھاری اسلحہ تھا۔ انھوں نے اس پر گولیاں برسانا شروع کیں اور وہ نہایت پھرتی سے اپنی جگہ بدلتا پھر رہا تھا تا آنکہ اس کا تمام ذخیرہ ختم ہو گیا اور وہ دشمن کی گولیوں کا نشانہ بن کر زمین پر گر گیا۔

یہاں میں چاہتا ہوں کہ ایک بات بیان کروں جو بہت ضروری ہے، خصوصاً ان دنوں میں جو رمضان کے مقدس مہینے میں گذر رہے ہیں۔ یہ جوان علی مرتضیٰ شہر صور کے مرتضیٰ خاندان سے تھا جن میں سے ایک بزرگ نہج البلاغۃ کے شارح بھی ہو گذرے ہیں۔ وہ ایران کے انقلاب کے دوران میں خواہشمند تھا کہ وہ ایران جائے اور شہادت سے فیض یاب ہو۔ ہم بھی یہ سوچ رہے تھے۔ کہ پانچ سو جوانوں کو تیار کریں اور ایران میں شریک معرکہ ہوں۔ ہم نے سوریا کی حکومت سے بات چیت کی اور اس نے ہماری بات مان لی کہ وہ ایک ہوائی جہاز اور ساز وسامان ہمیں دے تاکہ ہم ان پانچ سو نوجوانوں کو جہاں چاہیں لے جائیں۔ یہاں تک کہ فرح آباد اور تہران کے وسط میں انھیں شریک معرکہ کیا جائے میں ان انتظامات میں مصروف تھا کہ ان نوجوانوں کو کسی طریقے سے شریک معرکہ کردوں۔ میں بیان نہیں کرسکتا کہ یہ نوجوان ایران جانے اور اپنے ایرانی بھائیوں کے شانہ بشانہ شہادت حاصل کرنے کے لیے کس قدر جوش وخروش کا اظہار کر رہے تھے۔ لیکن جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ تہران میں اس معرکے نے چوبیس گھنٹے کا بھی وقت نہ دیا اور اس مختصر مدت میں طاغوت ایران سے بھاگ نکلا اور ملت ایران کامیاب ہو گئی اس بناء پر یہ موقع نہ مل سکا کہ لبنان کی جنگ کے یہ ہیرو اور چھاپہ مار لڑائی کے ماہرین ایران پہنچ پاتے اور اپنے ایرانی بھائیوں کے ساتھ مل کر لڑتے۔

یہ علی مرتضیٰ ان لوگوں میں سے تھا جو ایران پہنچنے کے لیے بے تاب تھے۔ اس کے ذوق وشوق کا یہ عالم تھا کہ راتوں کو ہمارے مدرسے میں سوتا تھا مبادا کہ میں خود چلا جاؤں اور اسے نہ لے جاؤں۔ وہ جنوبی لبنان کے سرحدی محاذ سے اور بیروت کے معرکوں سے کنارہ کشی کر کے یہاں آگیا تھا تاکہ وہ ہمارے ساتھ جا سکے اور ایسا نہ ہو کہ اس کی غیر حاضری میں ہم لوگ چلے جائیں۔

مجھے یاد پڑتا ہے کہ ۱۷ شہریور ۱۳۵۷ ہجری شمسی (۸ ستمبر ۱۹۷۸) تہران میں ہزاروں افراد شہید ہوئے تھے۔ ان شہدا کے درمیان ایک جوان تھا جس کی تصویر امریکہ اور یورپ میں بھی تقسیم کی گئی تھی۔ یہ جوان مومن گولی کا نشانہ بن کر زمین پر گر گیا لیکن اس نے اپنی ساری طاقت مجتمع کی اور دوبارہ کھڑا ہو گیا تاکہ نماز شہادت ادا کر سکے۔ وہ بڑے خلوص اور پاکیزگی کے ساتھ اپنے پاؤں پر کھڑا ہو گیا اس کے بدن سے خون اور لبوں پر کلمات نماز جاری تھے۔ اس اثناء میں ایک ٹینک کے گولے نے اسے اس حالت میں منزل شہادت پر پہنچایا جب وہ نماز ادا کر رہا تھا۔

جب میں اس شہید کا قصہ تنظیم "امل" کے رضا کاروں کو سنایا کرتا تھا تو علی مرتضیٰ بڑے زور شور سے روتا، اس کے جسم میں ایک کپکپی سی طاری ہو جاتی اور وہ آرزو کرتا کہ اس قسم کی شہادت اسے بھی نصیب ہو۔ یہاں تک کہ وہ دن آیا جب وہ صور کی اس گلی میں کمیونسٹوں کی گولیوں کا نشانہ بنا اور وہ زمین پر گر گیا۔ ابھی اس میں کچھ رمق جان باقی تھی۔ قریب کے دیکھنے والوں نے مشاہدہ کیا کہ اس نے اپنے آپ کو قبلہ رخ کر لیا اور نماز پڑھنا شروع کر دی۔ اس کی خواہش تھی کہ وہ بھی ۸ ستمبر ۱۹۷۸ کو شہید ہونے والے اپنے دوست کی طرح اپنی زندگی کے آخری لمحات نماز شہادت میں گذارے۔ لیکن بدبخت دشمنوں نے اس کو اس امر کی اجازت بھی نہ دی۔ وہ اس کے قریب گئے اور کلاشنیکوف کی گولیوں سے پہلے اس کی کمر کو دو نیم کیا اور پھر اس کے ہاتھوں کو اڑا دیا۔ محمد فتونی جو ابھی تک زمین پر پڑا تڑپ رہا تھا، اس کو بھی انھوں نے گولیوں کی ایک بوچھاڑ سے منزل شہادت پر پہنچا دیا۔

Presented by Ziaraat.Com

تصور کیجیے کہ یہ کس قسم کے ہیرو تھے، کیسے باایمان لوگ تھے جو ایسے خبیث دشمنوں کے ہاتھوں صرف اس لیے مارے جائیں کہ حضرت آیت اللہ خمینی کی تصویر مدرسے کی دیوار پر چسپاں کر دی۔ یہ تصویر اسلامی فکر کی علامت ہے اور کمیونسٹ پارٹی یہ نہیں چاہتی کہ یہ فکر اور اس کی علامت لبنان میں منتشر ہو۔ اس بناء پر انھوں نے دو جوانوں کو یوں جام شہادت پینے پر مجبور کیا۔ دوسرے دن صور کے شہر میں عام ہڑتال ہوگئی۔ کمیونسٹوں نے تمام دکانداروں اور تاجروں کو الٹی میٹم دیا کہ اگر انھوں نے دکانیں بند کیں تو وہ ان کو اڑا دیں گے اور سرمایے کو غارت کر دیں گے۔ لیکن صور کے لوگوں نے کہا کہ ہم اس بات کے لیے تیار نہیں کہ ایسے جرائم پر جس کا یزید نے بھی ارتکاب نہیں کیا تمہارے ہمنوا ہوں اور تمہارے اشاروں پر ناچیں۔ جو چاہتے ہو کر لو۔ کمیونسٹوں کی دھمکیوں کے باوجود صور کے شہر میں زبردست ہڑتال ہوئی جس سے پتا چلتا تھا کہ لوگوں کو کمیونسٹ پارٹی اور اس کے ہمنوا افراد سے کس قدر نفرت ہے[1]

آیۃ اللہ سید باقر الصدر کے سوگ پر بائیں بازو کے کاسہ لیسوں کی حرکات بد

آپ کو بخوبی معلوم ہے کہ آیۃ اللہ سید محمد باقر الصدر عراق کے شیعوں کے بہت عظیم المرتبت مرجع تھے۔ ان کی کتابیں ان کے مقالات ان کا انداز فکر دنیا میں اپنی مثال آپ ہے عربوں کے اچھے اچھے مصنف اور ارباب فکر اپنے آپ کو ان کا مقلد گردانتے ہیں، وہ صاحب فکر صاحب ایمان، مومن و متقی اور بے مثال شخصیت کے مالک تھے اور ہمارے مقدس اسلامی انقلاب کے طرف دار تھے۔ ایک مدت تک وہ قید رہے اور اس لیے کہ وہ آیۃ اللہ العظمی سید روح اللہ الموسوی الخمینی کی حمایت کرتے تھے۔ آیت اللہ سید محمد باقر الصدر لبنان کے شیعوں کے عظیم رہنما سید موسیٰ الصدر کے عم زاد تھے۔ لبنان کے شیعہ دیکھتے تھے کہ ایک تو ان کے رہنما سید موسیٰ الصدر گم ہو چکے ہیں اور تقریباً دو سال سے ان کا کوئی سراغ نہیں مل رہا[2] اور پھر یہ کہ ان کے چچازاد آیۃ اللہ باقر الصدر بھی صدام سفاک کے ہاتھوں منزل شہادت پہنچ گئے

لہ۔ اس شہادت کا قصہ ڈاکٹر مصطفیٰ احمران شہید نے ۱۹۸۰ میں تہران میں ایک تقریر کے دوران میں بیان کیا۔

لکہ۔ یہ تقریر ۱۹۸۰ سے تعلق رکھتی ہے۔

ایک ہولناک رات کو سید باقر الصدر اور ان کی گرامی قدر ہمشیر سیدہ بنت الہدیٰ کو گرفتار کر کے تشدد کا نشانہ بنایا اور وہ دونوں پاک روحیں اس دنیا سے سفر کر گئیں اور پھر ایک ماہ کی مدت میں عراق کے دلیر آزادی خواہوں میں سے ایک ہزار افراد کو موت کے غار میں دھکیل دیا۔

اس سانحے پر آقائے خمینی نے تین دن کے لیے سوگ کا اعلان کیا۔ لبنان کے شیعہ بھی سڑکوں پر نکل آئے اور انھوں نے صدام سفاک کے خلاف شدید مظاہرے کیے[1] یہ مظاہرہ کرنے والے بیروت کی سڑکوں پر سے گذرتے ہوئے روزنامہ "المحرر" کی بلند و بالا عمارت کے سامنے جا کر جمع ہوئے۔ یہ اخبار آج کل عراقی حکومت سے پیسے بٹورتا ہے، اس کی قصیدہ خوانی کرتا ہے اور صدام کے مخالفین کو گالیاں دیتا ہے۔ عراقی حکومت کے وظیفہ خواروں نے اس عمارت کے اوپر ریت کی بوریاں رکھ کر مورچے بنا رکھے تھے۔ جب بیروت کے بے کس دبے لوگ سید باقر الصدر کے سوگ میں بازاروں سے گذرتے ہوئے یہاں پہنچے تو ان عراقی حکومت کے تنخواہ دار پٹھوؤں نے ان ماتمیوں پر گولیاں برسائیں۔ بہت سے لوگ مارے گئے۔ بے شمار زخمی ہوئے۔ اس موقع پر "امل" کے رہنما کاروں نے لوگوں سے درخواست کی کہ وہ صبر کریں اور پیچھے ہٹ جائیں۔ "امل" کے مجاہدین کے ایک سرفروش گروہ نے اس سات منزلہ عمارت پر حملہ کیا پہلے ایں انھوں نے آر۔ پی۔ جی کے استعمال سے اس عمارت کی دو تین منزلوں کو اپنا نشانہ

لہ۔ پاکستان میں بھی سید باقر الصدر شہید اور ان کی ہمشیرہ کے سلسلے میں مجالس ترحیم برپا ہوئیں۔ اور کچھ غم و غصے کا اظہار کیا گیا لیکن اس موقع پر پاکستان کی ایک بہت بزعم خود طاقتور جماعت جس نے اپنے آپ کو اسلامی امور کا جہان پناہ بنا رکھا ہے اس موقع پر بالکل خاموش رہی۔ یہاں تک کہ پاکستانی شیعہ بھی کچھ زیادہ حرکت میں نہیں آئے لیکن پاکستانی شیعوں سے کیا توقع کی جا سکتی ہے کیونکہ ان میں سے بہت سے حضرات ابھی تک اسی دبدے میں ہیں کہ عراق کی بعثی حکومت ظالم ہے یا نہیں۔ ابھی حال ہی میں بعض جنادری قسم کے شیعہ لیڈروں نے عراقی حکومت کے خرچ پر زیارتیں کیں اور عراقی حکومت کی تعریفوں کے پل باندھے کہ انھوں نے مقامات مقدسہ کے لیے بڑا کام کیا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ انھیں یہ معلوم نہیں کہ یہ کام موجودہ حکومت نے نہیں کیا بلکہ اس کا سلسلہ شاہ فیصل اور عبدالکریم قاسم کے زمانے سے شروع ہوا تھا۔ پاکستان کے شیعہ تو شاید یزید کی بھی تعریف کر دیں بشرطیکہ وہ شبیہہ ذوالجناح کا جلوس نکلوا دے اور بعد میں نذر امام تقسیم کرے۔

Presented by Ziaraat.Com

بنایا اور عمارت میں گھس گئے۔ ستر عراقی پٹھو اس حملے میں مارے گئے اور باقی ماندہ چار افراد کو گرفتار کر لیا گیا۔ اس لڑائی میں "امل" کے رضا کاروں میں سے ایک شہید ہوا۔ عراق کے وظیفہ خواروں کو یہ زک جو پہنچی تو اس سے صدام بہت تڑپا کر یوں اس کے ایجنٹوں کو "امل" کے رضا کاروں نے شکست دی اور اس نے انتقام لینے کی ٹھانی۔

ایران کے سفارت خانے پر حملہ ؛

دوسرے دن عراق کے ہمنوا لوگوں نے بیروت کے ایرانی سفارت خانے پر حملہ کیا۔ بیروت میں ایرانی سفارت خانے کا تنظیم "امل" سے کوئی تعلق نہیں۔ اگر کوئی تعلق ہے تو صرف اتنا کہ تنظیم "امل" آیت اللہ خمینی کے انداز فکر کی حامل ہے۔ اور ایران کے اسلامی انقلاب کی طرف داری کرتی ہے۔ البتہ اس سے ایک روز قبل کی جو لڑائی شیعہ عربوں اور عراقی پٹھوؤں کے درمیان ہوئی اس کا ایران سے کوئی تعلق نہ تھا لیکن عراقی حکومت کے وظیفہ خواروں نے ایرانی سفارت خانے کا محاصرہ کر لیا اور پانچ گھنٹے تک سفارت خانے کی عمارت کو مارٹروں اور راکٹوں سے برباد کیا اور کئی لاکھ روپے کا نقصان پہنچایا سفارت خانے کے تمام کمرے راکٹوں سے برباد ہو گئے۔ اس وقت سفارت خانے میں صرف آٹھ ایرانی تھے جنھوں نے بڑی پھرتی سے اپنے آپ کو تہہ خانے میں پہنچا کر اس گولہ باری سے محفوظ رکھا۔ سفارت خانے کے افسر نے ٹیلیفون کے ذریعے لبنان کے تمام با اثر اداروں سے رابطہ پیدا کیا لبنان کی حکومت سے، سوریا کی حکومت سے، لبنان کی فوج اور پولیس سے، فلسطینی مزاحمت سے سب سے مدد طلب کی اور کہا کہ ہم مسلح نہیں ہیں اور ہم صرف آٹھ اشخاص ہیں اور یہ لوگ چاہتے ہیں کہ ہمیں نیست و نابود کر دیں لیکن کوئی ادارہ یا کوئی تنظیم ان کی مدد کے لیے نہ آئی۔ جیسا کہ میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں، ایسے موقع پر کہتے ہیں کہ جب عرب اور عجم کے درمیان لڑائی ہو تو کسی کو حق نہیں پہنچتا کہ وہ عجم کی مدد کرے۔ عرب قوم پرستی کا جذبہ ان سب باتوں سے قوی ہے۔ جہاں پر کوئی عقائدی فکر نہ ہو وہاں پر قومی عصبیت تسلط حاصل کر لیتی ہے۔

یہاں پر تنظیم "امل" کو دوبارہ مجبوراً شریک معرکہ ہونا پڑا۔ انھوں نے عراقی سفارت خانے پر آر۔ پی۔ جی اور راکٹوں سے حملہ کر کے بہت سے عراقی پٹھوؤں کو مار گرایا اور تیار ہو گئے کہ وہ عراقی سفارت خانے پر قبضہ کر لیں۔ جب عراقیوں نے یہ دیکھا کہ ان کے سفارت خانے پر قبضہ ہونے لگا ہے تو انھوں نے ایرانی سفارت خانے کا محاصرہ اٹھا یا اور اپنے سفارت خانے کے دفاع کے لیے پہنچے جہاں ان کے اور "امل" کے رضا کاروں کے درمیان جنگ ہوئی۔ یوں آٹھ ایرانی سفارت کار زندہ بچے اور سفارت خانے سے باہر آئے۔ پھر بھی ان میں دو افراد کو گولی مار کر زخمی کر دیا گیا لیکن بحمد اللہ کہ ان کے زخم سطحی تھے۔

الزہراء ہسپتال پر حملہ ؛

اس دوسری شکست کے بعد جسے عراق کی حکومت اپنی ذاتی شکست گردانتی تھی عراقی پٹھوؤں نے الزہراء ہسپتال پر حملہ کیا۔ عراقی حکومت ایرانی سفارت خانے پر قبضے میں ناکامی کو اپنی شکست یوں سمجھتی تھی کیونکہ ان کا مقصد ایرانی سفارتخانے پر حملہ کر کے ایرانیوں کو قتل کرنا تھا۔ لیکن اس کے عوض میں بہت سے عراقی ایجنٹ مارے گئے اور خود عراقی سفارتخانہ تنظیم "امل" کے حملے کی زد میں آیا۔ اس کا بدلہ لینے کے لیے الزہراء ہسپتال پر حملہ کیا گیا جو سید موسیٰ الصدر نے قائم کیا تھا۔ ہسپتال پر مارٹروں اور آر۔ پی۔ جی سے حملوں کی بناء پر تقریباً نصف عمارت تباہ ہو گئی۔ بہت سے مریض اور زخمی مارے گئے ہسپتال ایک ایسی جگہ ہوتی ہے جس کا دفاع نہیں ہوتا۔ یہ ایسی جگہ نہیں جہاں جنگ ہو اور اس پر حملہ کیا جائے لیکن عراق کے وظیفہ خوار تو یہ چاہتے تھے کہ شیعوں سے انتقام لیں جب انھوں نے دیکھا کہ سڑکوں اور سفارتخانے میں لڑائی ممکن نہیں انھوں نے نہایت ڈھٹائی سے ہسپتال پر گولہ باری کی۔ بہت سے لوگ شہید ہوئے۔ ہسپتال پر جو راکٹ پھینکے گئے ان میں سے ایک راکٹ ساتھ کے ایک مکان میں جا گرا جو زمین بوس ہو گیا اور ایک بے گناہ بوڑھی عورت ماری گئی۔ عراقی ایجنٹوں کی خباثت اس درجے پر پہنچی ہوئی ہے کہ وہ ہسپتالوں پر بھی حملہ کرتے ہیں اور بیماروں کو بھی مارتے ہیں۔ اس واقعے سے لبنان کے شیعہ غصے میں

Presented by Ziaraat.Com

آ گئے اور انھوں نے اکٹھے ہوکر بیروت کے شہر میں حزب بعث اور عراق کے وظیفہ خواروں کے سب اڈوں پر حملہ کیا، ان پر گولہ باری کی اور ان سب لوگوں کو شہر سے نکال دیا۔

میں آپ سے یہ گذارش کر چکا ہوں کہ جب کوئی شیعہ نوجوان یا بعلبک کا رہنے والا ہتھیار لے کر کھڑا ہو جائے اور بازار میں نکل آئے تو پھر اس کا مقابلہ کرنے کی سکت کسی میں نہیں ہوتی یوں شیعہ عراق کے وظیفہ خواروں کے اڈوں پر ٹوٹ پڑے اور انھیں تہس نہس کر دیا اور عراقی وہاں سے بھاگ نکلے لیکن افسوس یہ ہے کہ فلسطینی مزاحمت نے اس وقت مداخلت کی اور "تنظیم امل" سے یہ اڈے واپس لے کر حزب بعث اور جبھۃ التحریر العربیۃ کے حوالے کر دیئے۔

تنظیم امل کے خلاف بائیں بازو کی جماعتوں کا حملہ :

اس شکست کے بعد جو ایک بار پھر عراق اور اس کے کاسہ لیسوں کو برداشت کرنا پڑی حکومت عراق نے ہوائی جہازوں کے ذریعے بہت سے کمانڈر اور باقاعدہ فوج کے افراد کو بیروت بھیجا اور شمالی وجنوبی لبنان میں موجود اپنے رضا کاروں کو بیروت کی جانب روانہ کر دیا۔ علاوہ ازیں لبنان کی بائیں بازو کی تمام تنظیمیں اور کمیونسٹ پارٹی نے باہمی اتحاد کر کے ایک بہت بڑا متحدہ محاذ بنایا جس میں بائیں بازو کے تمام فلسطینی، بائیں بازو کے لبنانی اور عراقی حکومت کے وظیفہ خوار شامل تھے اور ان کا مقصد تنظیم امل کو ختم کرنا تھا۔

جب صدام نے دیکھ لیا کہ باایمان رضا کاران امل نے اس کے زرخرید لوگوں کو پچھاڑ دیا ہے تو اس نے پیسے کے زور پر دائیں بازو کے لبنانیوں کو خریدنے کی ٹھان لی۔ اس نے لبنان کے مسلمان دشمن اور امریکہ نواز سابق صدر کمیل شمعون کو جو حزب اللبنانیین الاحرار کا رہنما ہے پچاس لاکھ ڈالر کی رشوت دی تاکہ عراقی رضا کاروں اور فوجیوں کو طرابلس سے بیروت آنے دے تاکہ وہ وہاں اپنا گٹھ جوڑ پورا کر سکیں اس طرح شمالی اور جنوبی لبنان میں ان کے جو فوجی دستے موجود تھے انھیں بھی بیروت میں لے آئے اور یوں لبنان کی بائیں بازو کی ساری جماعتیں "امل" کے خلاف جمع ہو گئیں۔ ان میں کمیونسٹ پارٹی۔ حزب العمل الشیوعی، جو کمیونسٹ پارٹی ہی کا ایک شعبہ ہے۔ جورج حبش کا الجبھۃ الشعبیۃ

نائف حواتمہ کا الجبھۃ الشعبیۃ الدیموقراطیۃ یہاں تک کہ فلسطینی مزاحمت "فتح" کے بائیں بازو کے لوگ جو ابو صالح کی سرکردگی میں کام کرتے تھے سب شامل تھے تاکہ لبنان کے شیعوں اور "تنظیم امل" کا تیا پانچا کریں۔ ایک حملہ میں انھوں نے ۵۷ شیعہ مجاہدوں کو زخمی کیا جن میں ۸ افراد شہید ہو گئے۔

نہایت شدید لڑائی شروع ہوئی۔ ایک شیعہ رضا کار کے مقابلے میں تقریباً ۵ عدد لبنانی اور فلسطینی موجود تھے ان رضا کاروں میں سے ایک مجھے تہران میں ملا اس نے کہا کہ بھوکے رہ کر "پا برہنہ ہوکر" ذخیرہ کی عدم موجودگی کے باوجود یہ سرفروش اس انداز میں ان بائیں بازو والوں کے مقابل ہوئے اور ایسی داد شجاعت دی کہ کوئی تصور نہ کر سکے۔ وہ اس لیے لڑتے تھے کہ ان دشمنوں کو شیعہ مناطق میں داخل نہ ہونے دیں، ان ایام میں عورتیں اور بچے بھی وارد معرکہ ہو چکے تھے۔ وہ کوٹھوں اور چھجوں سے بائیں بازو کے غنڈوں پر لکڑی کے کندے اینٹ پتھر، ٹوٹے ہوئے برتن غرضیکہ جو چیز ان کے ہاتھ لگتی پھینکتے۔ یہ زرخرید غلامان عراق ہر قسم کے ہتھیاروں سے لیس کوشش کرتے کہ شیعہ مناطق پر قبضہ کر لیں لیکن ہر بار ناکام رہتے اور پھر "برج البراجیہ" اور "صبرا" کے فلسطینی کیمپوں میں چلے جاتے جہاں سے وہ مارٹروں کے ذریعے سے شیعہ آبادی پر گولا باری کرتے جس سے بہت سے بے گناہ زخمی اور شہید ہو جاتے یوں بائیں بازو کے یہ بہادر ان بے گناہ لوگوں سے انتقام لیتے۔ آخر کار سوریائی فوجیں امن قائم کرنے کے لیے بیروت میں داخل ہو گئیں اور انھوں نے تنظیم امل اور بائیں بازو کے دستوں کے مابین پوزیشن لے لی اور یوں یہ جنگ ختم ہوئی۔

اس کے بعد اکا دکا قتل اور دہشت گردی کے واقعات شروع ہوئے۔ کوئی دن نہ جاتا تھا کہ ان عراقی دہشت گردوں کے ہاتھوں کچھ لوگ زخمی نہ ہوتے اور کچھ لوگ بے گناہ مارے نہ جاتے۔ بعض اوقات اس دہشت گردی کا شکار ہونے والوں کی تعداد دس بارہ تک بھی جا پہنچتی، ابھی آج ہی کی بات ہے کہ لبنان میں دو ایرانی شہیدوں کا جہلم تھا یہ محمد حسین شریف اور محمد رضا رمضانخانی تھے جو لبنان میں مسلمان طلبہ کی انجمن کے موسسین میں شمار ہوتے تھے بلکہ محمد حسین شریف نے یہ انجمن شروع کی تھی۔ وہ ایک سرگرم کارکن تھا

Presented by Ziaraat.Com

اور فکری اعتبار سے بے نظیر نوجوان تھا۔ یہ دونوں جوان یونیورسٹی سے نکل رہے تھے کہ ایک کار میں سوار چند عراقی وظیفہ خواروں نے انھیں گھیر لیا اور قتل کر دیا۔ اس سے تین دن قبل، جنوبی لبنان کے ایک قصبے میں سید موسیٰ الصدر کے نمائندے شیخ علی بدرالدین ان دہشت گردوں کے ہاتھوں شہید ہوئے۔ ایک دن چھے افراد اور ایک اور دن اٹھارہ افراد کو ان کرایے کے قاتلوں نے شہید کیا۔

علی موسوی کی شہادت :

ان بہادروں میں سے جو شہید ہوئے علی موسوی نامی ایک جوان بھی تھا جو نہایت بہادر رزم آرا تھا وہ پہلے فوج میں تھا، اور بیروت کے ایک فوجی اڈے پر عیسائیوں کے ساتھ اس کی ڈیوٹی بھی تھی۔ یہ دن لبنان کی خانہ جنگی کے تھے ہر روز ریڈیو اور ٹیلیویژن سے خبریں نشر ہوتیں کہ مثلاً آج تین سو شیعہ مارے گئے[2] اس موقع پر عیسائی افسر مسرت کا اظہار کرتے۔ تالیاں پیٹتے اور خوشی کے نعرے لگاتے تھے علی موسوی ایک غیرت مند بہادر تھا۔ اس سے یہ بات برداشت نہ ہو سکی ایک دن اس نے اپنی کلاشینکوف اٹھائی اور گولیوں کی بوچھاڑ سے چالیس افسروں کو جہنم واصل کیا اور وہاں سے سید موسیٰ الصدر کے پاس آگیا۔ آقائے صدر نے اسے سوریا پہنچوا دیا جہاں دمشق میں حضرت زینب سلام اللہ علیہا کے مزار پر آگیا۔ آقائے صدر نے اسے سوریا پہنچوا دیا۔ اس نے وہاں داڑھی بڑھالی اور اپنے آپ کو دینی طالب علم کی شکل دے دی[3] اس حالت میں وہ دو سال وہاں رہا۔ پھر وہ بیروت آگیا اور الشیاح کے شیعہ علاقے میں ایک سرفروش گروہ کی بنیاد رکھی۔ اس نے دشمنوں کے خلاف نہایت بے جگری سے داد شجاعت دی۔ اس

(بقیہ حاشیہ) [1] یہ تقریر ۱۹۸۰ء میں تہران میں ہوئی۔

[2] اس زمانے میں یہ کشت و خون ایک عام بات تھی۔ جہاں کہیں کوئی مسلمان ملتا خصوصاً شیعہ، عیسائی اس کا سر جدا کر دیتے۔

[3] دمشق میں زینبیہ میں، جہاں حضرت زینبؑ کا مزار ہے۔ دینی علوم کا بہت بڑا مدرسہ ہے۔

جیالے نوجوان کو انھیں دہشت گردوں نے شہید کیا۔ اور اس کی شہادت کتنا بڑا سانحہ تھی!!

موت سے کھیلنے والا بہادر :

ان دلیروں میں سے ایک اور جو منزل شہادت پر پہنچا اس کا نام میں کبھی نہیں بھول سکتا۔ یہ جوان چار سال تک صور میں ہمارے مدرسے کا طالب علم رہا اور پیشے کے اعتبار سے مکینک تھا۔ اپنی ہوشمندی، اپنی استعداد اور اپنے جنگجویانہ خصائص کے اعتبار سے یہ اپنی مثال آپ تھا۔ یہ اسرائیل کی فوجوں سے ایک کھیل کھیلا کرتا تھا جسے موت کا کھیل کہا جاتا تھا۔ یہ کھیل یوں تھا کہ اسرائیل کی سرحد سے پانچ سو میٹر دور لبنان میں ایک ٹیلا تھا جس کا نام "رب الثلاثین" تھا۔ اسرائیلی سرحد پر جو مورچے اور بنکر بنے ہوئے تھے ان میں ہر قسم کے ہتھیار، توپیں، مارٹر وغیرہ موجود تھے۔ اسرائیلیوں کے پاس ایسے الیکٹرونک آلات ہیں جن سے فوراً اس بات کا پتا چل جاتا ہے کہ کس طرف سے گولی آئی ہے اور اس کے مطابق اسرائیلی توپخانہ اس جگہ پر گولہ باری شروع کر کے چند لمحوں میں اس جگہ کو برباد کر دیتا۔ میں نے خود مشاہدہ کیا ہے کہ چند سیکنڈ کے وقفے میں اسرائیلی اس جگہ کو اپنا نشانہ بنا دیتے۔ اب یہ جوان جس کا نام حسین عواد تھا اور جو بعلبک کے ایک مشہور خاندان کا فرد تھا اس کے پاس ایک چھوٹی پک اپ تھی جس کے اوپر اس نے پچاس کیلیبر کی ایک "دُشکا" مشین گن نصب کر رکھی تھی۔ جس پر ایک اور رضا کار مشین گن چلانے کا کام کرتا تھا۔ یہ دونوں اسرائیلی مورچوں کے سامنے رک کر ان پر مشین گن سے گولیاں برساتے۔ اسرائیل اپنے الیکٹرونک آلات کی مدد سے اس جگہ کا سراغ لے کر مارٹر یا توپ سے گولہ باری کرتا لیکن اس دوران میں حسین عواد جلدی سے پک اپ کو وہاں سے کوئی بیس میٹر پرے لے جاتا اور جب اس کی اصلی جگہ پر گولہ پھٹتا تو حسین عواد وہاں سے کوئی تیس، چالیس میٹر دور جا چکا ہوتا۔ وہاں سے وہ پھر گولیاں برساتا اور اسرائیلی فوجی نئی جگہ پر گولے برساتے یوں حسین عواد ایک جگہ سے دوسری جگہ گھومتا پھرتا اور گھنٹوں اسرائیل کے ساتھ لڑائی کی یہ آنکھ مچولی کھیلتا۔ اس کارروائی کو وہاں "لعبۃ الموت" یا موت کا کھیل کہتے تھے۔ اس میں اگر کسی وقت

Presented by Ziaraat.Com

تھوڑی سی دیر ہو جائے یا وہ اندازہ لگانے میں غلطی کرے تو موت یقینی تھی۔ اسرائیل یہ تصور کرتا تھا کہ وہاں پر کئی سو افراد جمع ہیں اور اس کے خلاف لڑ رہے ہیں حالانکہ درحقیقت وہاں صرف دو نفر تھے۔ اس کارروائی کا ہیرو حسین عواد تھا۔ ایسا بہادر جوان تھا کہ جب سخت ترین معرکوں میں کسی جگہ تنہا جانا چاہتا تو صرف حسین عواد کو اپنے ساتھ لے جاتا۔ یہ جوان لڑائی، ہوشمندی اور جذبہ قربانی کے نقطہ نظر سے بے مثال تھا۔ چھاپہ مار جنگوں کا یہ درخشاں ستارہ اور اسرائیل کے خلاف نبرد آزمائی کا یہ ہیرو پچھلے مہینے بیروت کے شہر میں عراقی دہشت پسندوں کے ہاتھوں شہید ہو گیا! وہ جوان جسے القدس کو آزاد کرانا چاہیئے تھا۔ جسے اسرائیل کے خلاف جنگ کرنا چاہیئے تھی، وہ ان وظیفہ خواروں کے ہاتھوں منزلِ شہادت پر پہنچ گیا۔

بہرحال اس قسم کی جھڑپیں جاری رہیں جن کے نتیجے میں اسرائیل اور کتائب کے سوا کسی کو فائدہ نہ ہوا، عراقی حکومت کے یہ پٹھو اسرائیل کے خلاف کچھ نہیں کرتے بلکہ بہترین شیعہ لڑنے والوں کو جو اسرائیل کے خلاف ہیں اپنی دہشت گردی کا شکار بناتے ہیں اور یہ بات خود ان کی اسرائیل سے وابستگی کی دلیل ہے۔

لبنان اور فلسطین کی کامیابی اور انقلاب اسلامی ایران :

میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں اور پھر کہتا ہوں کہ لبنان کے شیعوں کے پاس ایران کے سوا کوئی پناہ گاہ نہیں۔ ایک عمر رسیدہ خاتون کا شوہر شہید ہو چکا تھا، اس کا بیٹا بھی شہید ہو گیا تھا اور اس کا گھر کھنڈر بن چکا تھا۔ جب اس سے پوچھا گیا کہ کیا چاہتی ہو تو کہنے لگی کہ میں خدا سے دعا یہ کرتی ہوں کہ ایران کا انقلاب کامیاب ہو جائے چونکہ میں جانتی ہوں کہ اگر ایران کا انقلاب کامیاب ہو گیا تو ہماری نجات کی صورت بھی پیدا ہو جائے گی اگر انقلاب ایران خدانخواستہ کامیاب نہ ہوا تو ہم سب کے سب نیست و نابود ہو جائیں گے، نہ لبنانیوں کو کچھ ہاتھ آئے گا نہ فلسطینیوں کو یہی وجہ ہے کہ جب بہت سے جوان مجھ سے ملتے ہیں اور اس خواہش کا اظہار کرتے ہیں کہ لبنان جا کر لڑیں تو میں ان سے بڑی صراحت سے یہ کہتا ہوں کہ اگر چاہتے ہو کہ لبنان اور فلسطین کامیاب ہوں تو تمہارا فرض ہے کہ ایران کے

مقدس انقلاب کی حفاظت کرو۔ تمہیں چاہیئے کہ کردستان میں جا کر لڑو، تمہارا فرض ہے کہ خوزستان میں داد شجاعت دو، تم پر لازم ہے کہ عراق اور دوسرے سازشیوں کے مقابلے میں انقلاب ایران کی پاسبانی کرو[1]۔

شیعیان لبنان سے بے مہری اور بے توجہی :

ان دنوں میں بیروت کے شہر اور بعض نواحی علاقوں میں گھمسان کی لڑائی ہو رہی ہے ہر روز ہمارے جوانوں میں سے بہت سے شہید ہو جاتے ہیں۔ لبنان کی وہ تنہا فکری تنظیم جو ایران کی حمایت کرتی ہے اور ہمارے مقدس انقلاب کی طرف داری، وہ تنظیم "امل" ہے۔ بلکہ یہ کہنا بہتر ہو گا کہ تمام دنیا میں وہ واحد تنظیم جس کے پاس ایک عقائدی نہج ہے ایسی نہج جو ایران میں موجود ہے اور جو اپنے خون کے آخری قطرے تک اس انقلاب کے لیے لڑنے اور جدوجہد کرنے کے لیے تیار ہے، وہ یہی تنظیم امل ہے۔ لیکن افسوسناک بات یہ ہے کہ میں بہت سے لوگوں کو اس حالت میں پاتا ہوں کہ وہ اس تنظیم "امل" کو لوگوں سے متعارف کروانے کے خلاف ہیں۔ وہ یہ نہیں چاہتے کہ لبنان کے شیعوں کا دفاع کیا جائے۔ چند دن ہوئے (۱۹۸۰) دنیا کی انقلابی تنظیموں کے نمائندے یوم القدس کے سلسلے میں ایران آئے ہوئے تھے۔ وہ مجلس شوریٰ اسلامی (ایرانی پارلیمنٹ) میں بھی گئے اور وہاں انھوں نے تقریریں کیں۔ اس موقع پر سبھی تنظیموں کو دعوت دی گئی تھی، سوائے تنظیم "امل" کے اور یہ بہت بڑا ظلم ہے۔ مجھے پورا اطمینان ہے کہ جن لوگوں نے دعوت نامے جاری کیئے تھے وہ اگر تنظیم "امل" کو بھی بلا لیتے تو یہ بات ان کے لیے باعثِ شرف و افتخار ہوتی کیونکہ یہی وہ تنہا تنظیم ہے جو ہر روز اسرائیل، عراق اور دیگر دشمنوں کے مقابلے میں شہداء پیش کرتی ہے اور یہی وہ لوگ ہیں جو شہادت پر اور اپنے ایمان پر فخر کرتے ہیں۔ تنظیم "امل" کو دعوت دے کر اس تنظیم کو کوئی عزت حاصل نہ ہوتی بلکہ دعوت دینے والوں کے سر پر سہرا

[1] یہ باتیں ڈاکٹر چمران نے اس وقت کہی تھیں جب بین الاقوامی سازش کے ماتحت کردستان کے لوگوں نے انقلاب ایران کے خلاف بغاوت کر رکھی تھی اور اس کے ساتھ عراق نے جنوبی لبنان پر حملہ کر دیا تھا، جسے

Presented by Ziaraat.Com

ہوتا۔

انقلاب دشمنوں نے "امل" کے خلاف کتابیں لکھی ہیں، پوسٹر چھاپے ہیں، دائیں اور بائیں بازو کی جماعتیں مل کر "تنظیم امل" کو تباہ کرنے کی کوششیں کرتی ہیں۔ جو لوگ ایران میں اہل فکر و ایمان کو برا بھلا کہتے ہیں، وہی لوگ "امل" کی عقائدی نہج کے خلاف کوشاں ہیں۔ جیسا کہ حضرت آیت اللہ خمینی نے ارشاد فرمایا ہے صرف اسلامی آئیڈیالوجی کے سائے تلے اور اس کے عقائدی نہج کو اختیار کر کے اسرائیل کو شکست دینا اور قدس کو آزاد کرانا ممکن ہے۔ تنظیم امل کو اس بات پر فخر ہے کہ اپنی غربت، افلاس اور محرومی کے باوجود وہ شہید پیش کرتی ہے۔ قربانیاں دیتی ہے۔ اسے اگر کسی کا آسرا ہے تو صرف اپنے ایمان کا اور اگر کسی پہ بھروسا ہے تو صرف اپنی عقائدی نہج پر۔ وہ مسلسل لڑ رہی ہے اور اس امر کے لیے تیار ہے کہ اس وقت تک برابر جنگ کرتی رہے جب تک ایران کا اسلامی انقلاب پوری طرح کامیاب نہیں ہو جاتا۔[1]

(بقیہ حاشیہ) خوزستان کہتے ہیں اور عراق اور اس کے ساتھیوں کو یہ خیال تھا کہ خوزستان کے عرب باشندے عراقی فوجوں کا خیر مقدم کریں گے اور اس صوبے کو فتح کر کے ایران کی فاسد شہنشاہیت کو ایک بار پھر موقع دیا جائے گا کہ وہ یہاں پر اپنی حکومت قائم کر کے انقلاب ایران کو ناکام کر دے۔

[1] ڈاکٹر چمران شہید کو اس بات پر افسوس ہے کہ ایران میں تنظیم "امل" کے کارناموں کا اعتراف نہیں ہو رہا لیکن اب ایران میں صورت حالات بدل گئی ہے۔ اگر ڈاکٹر چمران زندہ ہوتے اور وہ پاکستان آتے اور یہاں کے شیعوں کی سرد مہری بلکہ بے مہری کو دیکھتے تو انھیں افسوس نہ ہوتا بلکہ شرم آتی۔ پاکستان میں اب بھی شیعیان حیدر کرار کی اکثریت جس میں علماء و خطباء اور مقررین بھی شامل ہیں نہ صرف یہ کہ تنظیم "امل" سے واقف نہیں، بلکہ تنظیم "امل" کے بارے میں مفاد پرست خبر رساں ایجنسیوں کی رپورٹوں پر اعتماد کر کے اس تنظیم کے کام میں کیڑے بھی ڈالتے ہیں اور نبیہہ بری کے بارے میں شکوک و شبہات کے غبارے اڑاتے ہیں کہ ان کی آئیڈیالوجی درست نہیں۔ یہ اور بات ہے کہ انھیں خود آئیڈیالوجی کے نہ معانی آتے ہوں اور نہ اس کے صحیح مفہوم سے واقفیت ہو۔ نبیہہ بری اور تنظیم "امل" نے اپنے فقر و فاقہ، افلاس و نکبت اور محرومی و بے بسی کے باوصف جو کام کیا ہے وہ تمام شیعیان حیدر کرار کے لیے باعث فخر ہے کہ لبنان کی تاریخ میں پہلی مرتبہ شیعوں کی طاقت کو تسلیم کیا گیا ہے۔ لبنان کے عیسائیوں نے اور مغرب کے استعمار گروں نے تو تنظیم "امل" کی حیثیت کو مان لیا ہے۔ لیکن پاکستان کے نعرے باز لیڈروں اور شعلہ بیان خطیبوں نے اسے اب تک تسلیم نہیں کیا۔

جیسا کہ میں گذارش کر چکا ہوں حکومت عراق یہ کوشش کرتی ہے کہ ایران کے ساتھ اپنی چپقلش کو قوم پرستی کا رنگ دے اور یہ کہے کہ عرب عجم کے خلاف نبرد آزما ہے۔ یہاں تک کہ آپ یہ بھی دیکھتے ہیں کہ اس علاقے کی انقلابی جماعتیں بھی ایران کے انقلابیوں اور ایران کے اسلامی انقلاب کی حمایت کرنے کی جرائت نہیں کرتیں چونکہ عرب قوم پرستی کا بھوت سب کے سروں پر سوار ہے۔ ہاں تنہا وہ جماعت جو ہماری نہج فکر اور ہمارے اسلامی انقلاب کے لیے جنگ کر رہی ہے وہ "تنظیم امل" ہے۔

کوئی ایک ہفتہ قبل کی بات ہے کہ تین شیعہ نوجوانوں نے تین ہوائی جہاز اغوا کر لیے۔ ان میں سے ایک نوجوان جنوبی لبنان سے تھا جس نے بغداد کی فضاء میں ہوائی جہاز کو اغوا کیا اور چاہتا تھا کہ اسے ایران لے جائے لیکن حکومت ایران نے یہ قبول نہ کیا کہ وہ تہران میں اترے۔ یہ نوجوان مجبور ہو کر ہوائی جہاز کو بیروت لے گیا۔ وہاں پہنچنے پر ہوائی کمپنی نے اس سے بات چیت شروع کی تاکہ اس کی شرطیں پوچھی جائیں۔ یہ بات آپ کو معلوم ہے کہ اگر کوئی شخص ہوائی جہاز کو اغواء کرے تو اسے قید کر دیا جاتا ہے۔ یہ جوان ایسی شرطیں پیش کر سکتا تھا جن کی رو سے وہ کسی اور ملک میں جا سکتا۔ لیکن اس جوان نے صرف ایک شرط پیش کی اور وہ یہ تھی کہ تمام نامہ نگاروں کو ہوائی جہاز کے قریب جمع کیا جائے تاکہ وہ آزادی کے ساتھ اپنی بات دنیا تک پہنچا سکے اور یہ برداشت کیا کہ وہ جیل میں چلا جائے۔ ہوائی کمپنی نے اور حکومت لبنان نے یہ شرط قبول کر لی اور تمام نامہ نگاروں کو ہوائی جہاز کے قریب لے آئے۔ اس نے صرف تین باتیں کہیں اور وہ یہ تھیں۔

۱۔ اولاً اس نے ایران کے اسلامی انقلاب کی حمایت و مدافعت کی۔ ذرا تصور کیجیے کہ تنظیم "امل" کا یہ نوجوان جس کے رہنما کو اغوا کر لیا گیا ہے، جس کے وطن پر اسرائیلی سایہ موجود ہے جس کے وطن کی چار لاکھ آبادی میں سے تین لاکھ سے زیادہ لوگ بے گھر ہیں، جس کے وطن کا نصف حصہ ویران ہو چکا ہے اور کوئی شخص وہاں پر اطمینان کی زندگی بسر نہیں کر سکتا، جس کا مستقبل، جس کا ملک، جس کی قیادت سب کے سب خطرے میں ہیں وہ پہلی بات جو بیان کرتا ہے یہی ہے کہ اس کی سب سے بڑی آرزو ایران کے اسلامی

Presented by Ziaraat.Com

انقلاب کو کامیاب دیکھنا ہے۔

۲۔ دوسری بات جو اس نے کہی وہ سید موسیٰ الصدر کی، جو لبنان کے شیعوں کے رہنما ہیں۔ آزادی کی بات تھی۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ لبنان کے ان جوانوں کے نزدیک ہمارا انقلاب ہر حقیقت سے زیادہ قدر و قیمت کا مالک ہے۔ وہ اس بات کو بخوبی جانتے ہیں کہ اگر یہ انقلاب کامیاب ہو گیا تو انھیں بھی کامرانی حاصل ہو گی۔ اسی بناء پر انھوں نے اپنا سب کچھ ہمارے اسلامی انقلاب کے لیے تج دیا ہے۔ لیکن افسوس کی بات تو یہ ہے کہ ان کے کارناموں کا کسی کو علم نہیں۔ یہاں تک کہ وہ خبر جس کا میں نے ابھی ذکر کیا ہے۔ جس میں ایک شیعہ نوجوان ہوائی جہاز کو اغوا کرنے کے جرم میں جیل میں چلا گیا، صرف اس لیے کہ انقلاب اسلامی ایران کی کامیابی کی خبر پوری دنیا میں ایک گونج پیدا کرے، یہ خبر دنیا کی خبر رساں ایجنسیوں اور اخباروں نے کہیں نشر نہیں کی۔

یہ افسوسناک بات ہے۔ لوگوں کو معلوم ہونا چاہیئے کہ لبنان کے شیعوں کے لیے ایران کے سوا کوئی سہارا نہیں وہاں کے عیسائی، امریکہ، اسرائیل اور مغرب کے دیگر ممالک سے وابستہ ہیں۔ ہمارے سنی بھائیوں کو اس علاقے کے بہت سے عرب ممالک کی پشت پناہی حاصل ہے۔ شیعہ اگر کسی پر بھروسہ کر سکتے ہیں تو صرف ایران پر۔ شاہ کی فاسد حکومت نے انھیں بہت زک پہنچائی ہے۔ شاہ سابق کتائب اور کمیل شمعون کے ساتھ شیر و شکر تھا اور شیعوں کے خلاف لڑتا تھا، شیعوں کی پٹائی کرتا تھا اور انھیں نیست و نابود کرنے کی کوششیں کرتا تھا۔ اب جب کہ اس طاغوت کا جھنڈا سرنگوں ہو چکا ہے اور ہمارا انقلاب کامیاب ہو چکا ہے، لبنان کے شیعوں کو اس بات کا انتظار ہے کہ ہمارا انقلاب ان کی مدد کرے۔

ایک بندوق اور چھے افراد؛

میں چاہتا ہوں کہ اپنی ان گذارشات کا اختتام ان ایرانی نوجوانوں کے خیالات کا ذکر کرکے کروں جو ماہ گذشتہ جنوبی لبنان گئے تھے اور واپسی پر انھوں نے اپنے مشاہدات کو

ایرانی اخباروں میں شائع کروایا تھا۔ یہ مشاہدات جنوبی لبنان میں اسرائیلی سرحد کے قریب ایک گاؤں کے بارے میں ہیں جس کا نام اور جو اسرائیلی سرحد سے پانچ سو میٹر دور ہے۔ یہ نوجوان مغرب کے قریب اس گاؤں میں پہنچے۔ "امل" کے رضا کاروں نے جو اس گاؤں میں موجود تھے ان سے کہا کہ رات کے وقت آپ کا واپس جانا خطرے سے خالی نہیں اس لیے بہتر ہے کہ آپ رات یہیں گذاریں کیونکہ راستے میں لوگ کمین گاہوں میں بیٹھ کر حملہ کرتے ہیں اور اس بات کا احتمال ہے کہ آپ کو مار دیں۔ ان ایرانی نوجوانوں نے بھی یہ فیصلہ کیا کہ وہ رات گاؤں ہی میں گذاریں اور گاؤں کے وسط میں ایک گھر میں چلے گئے۔ وہاں گاؤں کے سب چھوٹے بڑے جمع ہو گئے۔ ان میں سے بعض روتے تھے۔ اور بعض اپنی مشکلات بیان کرتے تھے۔ اسی دن "امل" کے جانبازوں میں سے چار افراد اس علاقے میں اسرائیل کے ہاتھوں شہید ہوئے تھے۔ اس بناء پر ان شہداء کے افراد خانہ ہنگامہ کر رہے تھے۔ وہ لوگ مختلف قسم کی باتیں کر رہے تھے ایک ایرانی اخبار نویس نے ایک بوڑھی عورت سے جو اپنے بیٹے کی شہادت پر رو رہی تھی پوچھا کہ آخر تم ہمارے رہبر امام خمینی سے کیا چاہتی ہو۔ جواب میں اس نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے اور کہا کہ خدا سے میں یہی چاہتی ہوں کہ وہ زندہ رہے۔ یہ خاتون نہ پیسے طلب کرتی ہے نہ مدد مانگتی ہے نہ اسلحہ چاہتی ہے، نہ لڑنے والے، نہ کوئی اور چیز، فقط آقائے خمینی کی سلامتی کی طالب ہے۔

اس اثناء میں گاؤں پر اسرائیلی ہیلی کاپٹر اڑنے لگے کیونکہ لازماً کسی جاسوس نے یہ خبر دی ہو گی کہ گاؤں میں ایرانی آئے ہیں۔ گاؤں کے تمام مردوں نے یہ فیصلہ کیا ساری رات وہ پہرہ دیں گے اور اپنے مورچوں میں رہیں گے یہ ایرانی اخبار نویس بھی جس کا تعلق روزنامہ جمہوری اسلامی سے تھا ان کے ساتھ مورچوں میں چلا گیا تاکہ وہ یہ دیکھے کہ یہ لوگ لڑتے کیونکر ہیں۔ وہ ایک ایسے مورچے میں گیا جو اسرائیلی سرحد کے بالکل سامنے تھا وہاں اس نے دیکھا کہ صرف ایک جوان کے پاس کلاشینکوف ہے اور باقی پانچ ... اور جوان کسی ہتھیار کے بغیر وہاں موجود ہیں۔ اس ایرانی نے ان سے پوچھا کہ تم خالی ہاتھ اسرائیل سے کیوں لڑو گے تو انھوں نے کہا کہ کیا کریں۔ ہمارے پاس اسلحہ نہیں ہے۔ صرف یہی ایک کلاشینکوف ہے ہم یہاں اس انتظار میں ہیں۔ کہ اگر یہ جوان شہید ہو جائے تو ... دوسرا ہتھیار سنبھال لے اور لڑے۔ یہاں تک کہ باری باری سب لوگ اس ہتھیار کو استعمال

Presented by Ziaraat.Com

کریں۔ گاؤں کے مردوں نے ان سے کہا کہ ہم ان مورچوں میں اس لیے آئے ہیں کہ اگر اسرائیل حملہ کرے تو پہلے ہمیں مارے اور پھر ہمارے گھر والوں کو۔ ہم اس بات کو ترجیح دیتے ہیں کہ جب اسرائیلی ہمارے گھروں تک پہنچیں ہم اس دنیا سے جا چکے ہوں۔ اس بناء پر اسلحہ ہو یا نہ ہو ہم ان مورچوں میں آ گئے ہیں۔ یہ سن کر اس ایرانی نوجوان پر لرزہ طاری ہو گیا اور وہ سوچنے لگا کہ یہ شیعہ اس خطرناک ماحول میں کافی اسلحے کے بغیر یا بنیادی ترین سہولتوں کے بغیر اسرائیل جیسی طاقت کے خلاف کیوں کر لڑتے ہیں اور بھاگتے نہیں۔

وہاں کے کمانڈر نے صبح ہوتے ہی ان ایرانیوں سے کہا کہ جس قدر جلد ممکن ہو آپ یہاں سے چلے جائیں کیونکہ آپ کی زندگی خطرے میں ہے۔ اسرائیل کو معلوم ہے کہ آپ لوگ یہاں ہیں پس یہ لوگ نماز فجر کے فوراً بعد اپنی گاڑی میں سوار ہو کر وہاں سے چل دیئے۔ عین اسی وقت اسرائیلی توپخانے نے اس گاؤں پر گولہ باری شروع کر دی اور اس گھر کو نشانہ بنایا جس میں انھوں نے رات گذاری تھی اور اسے تباہ کر دیا۔ چونکہ جاسوسوں نے انھیں سب اتا پتا دے دیا تھا۔ اس لیے اسرائیل نے فوراً اس گھر کو تباہ کر دیا۔ لیکن خوش قسمتی سے ایرانی وہاں سے جا چکے تھے اور وہ سلامت رہے لیکن انھیں یہ معلوم نہ ہوا اور کسی کو بھی معلوم نہیں کہ ان بے بس اور بے سہارا لوگوں میں سے کتنے آدمی مارے گئے اور ان کے گھر کا کتنا نقصان ہوا صرف اسی بناء پر کہ انھوں نے ان ایرانیوں کو اپنے گھر میں رات گذارنے کی اجازت دے دی تھی۔

اس قسم کے ظلم و ستم ان علاقوں کا معمول بن چکا ہے۔ بہت سے خاندان ہیں جنھوں نے اپنے جوان شہید کروا دیئے۔ اپنے گھر تباہ کروا لیے اور کوئی شخص نہیں جو ان کا پرسان حال ہو۔ دنیا میں واحد شیعہ حکومت ایران ہے۔ لیکن افسوسناک بات یہ ہے کہ اس نے بھی ابھی ان کی طرف توجہ نہیں کی بہرحال ان لوگوں کی قسمت انقلاب ایران سے وابستہ ہے۔

دنیا کے تمام محروموں اور مظلوموں کی قسمت انقلاب اسلامی ایران کے ہاتھ میں ہے اگر ہمارا اسلامی انقلاب اپنی آخری کامیابی تک پہنچ جائے تو ایک روشن مستقبل ان کا انتظار کر رہا ہے اور اگر خدانخواستہ یہ انقلاب ناکام ہو جائے تو یہ سب لوگ نیست و نابود

ہو جائیں گے۔ صرف لبنان اور فلسطین ہی نہیں بلکہ دنیا کے بیشتر ممالک کے لوگ جو ظلم و استبداد کے خلاف نبرد آزما ہیں انقلاب اسلامی ایران کی طرف نظریں جمائے بیٹھے ہیں۔

ہم شہدا کی پاک روحوں سے ہمت طلب کرتے ہیں تاکہ ہم اس پر فخر کر سکیں کہ ہم ان کے اختیار کردہ راستے پر چلے اور دنیا کے طاغوتوں کو شکست دی۔

اے پروردگار! لبنان کے شیعوں نے صدیوں تک ظلم و ستم برداشت کیئے ہیں وہ جرائم کا نشانہ بنے ہیں، ان کے قتل عام ہوئے ہیں، انھوں نے بنو امیہ اور بنو عباس کے مظالم سہے ہیں، عثمانی ترکوں کی طرف سے قتل عام کا نشانہ بنے ہیں، مغربی استعمار کے اندھیروں نے ان کی زندگیاں برباد کی ہیں اور آج کل وہ عالمی صیہونیت کے تسلط میں ہیں ان کی گولہ باریوں، ان کے جرائم اور ان کی طرف سے پیش آنے والی ذلتوں کا مقابلہ کر رہے ہیں

اے خداوند عالم! تیرا شکر ہے کہ تو نے شیعوں کو شہادت کے ہتھیار سے آراستہ کر دیا ہے تاکہ وہ طاغوتوں، ستمگاروں اور ظلم و تعدی کے پرستاروں کے خلاف جنگ آزما ہوں اور اپنے خون سرخ سے ایک ہزار سال کی ذلتوں کو تشیع کے دامن سے دھو ڈالیں اور معرکہ زندگی میں شہادت کی قدر و قیمت کو سمجھ پائیں، اپنے خدا پر ایمان اور اپنے آہنی ارادے کی بناء پر اپنے آپ کو جسمانی اور روحانی اسیری کی دلدل سے نجات دیں، علی کی طرح زندگی گذاریں اور حسین کی سرخ راہ پر چلیں اور یوں تشیع کے اصلی شرف و افتخار کو جو صدیوں تک ستمگروں کی دراز دستیوں کا نشانہ بنا رہا ہے۔ دوبارہ حاصل کریں۔

پروردگارا! ہم اپنے آپ کو تیرے سپرد کرتے ہیں تاکہ تو ہمیں طوفانوں اور گردابوں میں رہنمائی دے۔ نور ایمان سے ہمارے دلوں کو روشن کرے اور آتش عشق سے ہماری خودپسندیوں اور ناپاکیوں کو جلا دے۔

خداوندا! ہم تجھ سے طلب کرتے ہیں کہ تو ہمارے مزاجوں کو اس قدر بلندی دے کہ تیرے سوا کسی کے سامنے سر تسلیم خم نہ کریں، دنیا ہمیں فریب نہ دے سکے، ہمارے ذاتی مفادات ہمیں اندھا نہ کریں، گناہوں، فساد، تہمتوں، دروغ بافیوں اور غیبتوں کی سیاہی ہمارے دلوں کو تاریک نہ کر دے۔ خداوندا! ہمیں اتنا ظرف عطا کر کہ کامیابیاں ہمیں مغرور اور سرمست نہ بنا دیں اور ہم

Presented by Ziaraat.Com

اپنی بے چارگیوں کو فراموش نہ کریں، شکستوں اور مصیبتوں کے سامنے ہتھیار نہ ڈالیں اور زندگی کے امید کش لحظات میں بھی تجھ سے مایوس نہ ہوں۔

خداوندا! ہمیں اتنی طاقت دے کہ ہم اپنے سرکش نفسوں پر غلبہ حاصل کر سکیں۔ اس قدر شعور عطا کر کہ ہم اپنے اندر کے طاغوت کو پہچان سکیں اور اس کے خلاف پوری شدت سے جنگ آزما ہوں۔

پروردگارا! ہمیں اس قدر بے نیازی عطا کر کہ ہم اپنی ذاتی منفعتوں کے پیچھے نہ بھاگیں اور گداگروں کی طرح اس مقدس انقلاب سے اپنے ذاتی فوائد حاصل نہ کریں۔ اے خالق دو جہاں! ہمارے دلوں کو سخاوت سے بھر دے تاکہ ہم اپنی ہر چیز یہاں تک اپنی زندگی اور اپنا وجود بھی اس عظیم پیغام کی راہ میں قربان کر سکیں۔ اے خداوند دو جہاں! تو نے چودہ سو سال کے بعد اسلام اصلی کو کامیاب کیا ہے اور ہمارے کمزور کندھوں پر بہت بڑی ذمہ داری ڈال دی ہے، دنیا کے محروموں اور مستضعفوں کو امید کی کرن دکھائی ہے، ظلم و ستم کے محل سراؤں کو برباد کر دیا ہے اور بڑے بڑے طاغوتوں کو شکست دی ہے۔ اب ہمیں اپنی رحمت سے نواز تاکہ ہم ایمان و فداکاری پر بھروسہ کر کے اس مقدس انقلاب کی حفاظت کریں اور ان شہدائے خونین کفن کے سامنے، جو آسمانوں کے پرے سے ہمیں دیکھ رہے ہیں شرمندہ نہ ہوں، اور ہمیں ان مضطرب دلوں اور ان منتظر آنکھوں کے سامنے، جن کی شکستگی اور پژمردگی کی خزاں نے بہار سے امیدیں وابستہ کر رکھی ہیں، شرمندگی سے سر نہ جھکانا پڑے۔

خداوندا! ہمیں موقع دے کہ ہم زندگی و موت کے اس معرکے میں شہدائے کربلا کی صف میں شمار ہوں، اس رزم حق و باطل میں علیؑ کی مانند جنگ آزما ہوں اور اس انقلاب کی حفاظت کی راہ میں ا ... کی آخری بوند تک بھی قربان کر دیں۔

ہم خدائے بزرگ و بر ... کرتے ہیں کہ وہ ان بڑی طاقتوں کو، صیہونیوں کو، اور ان لوگوں کو جنھوں نے دنیا کو خاک و خون ... کر رکھا ہے۔ ان سب کو نیست و نابود کر۔

ہم خداوند قدیر سے دعا کرتے ... وہ اس قابل بنائے کہ ہم اس انقلاب مقدس کے لیے اپنے خون کا آخری قطرہ تک بہا دیں

میں خداوند ذوالجلال سے طلبگار ہوں کہ وہ "اسلام" کے جانبازوں کو اور تمام مسلمانوں کو کتائب کے مقابلے میں اسرائیل کے مقابلے میں اور عراقی ایجنٹوں کے مقابلے میں کامیاب کرے اور انھیں محفوظ رکھے۔

میری خداوند بزرگ و برتر سے دعا ہے کہ لبنان کے شیعوں کے عظیم رہنما سید موسیٰ الصدر کو سلامتی سے واپس لوٹا دے۔ میری دعا ہے کہ خداوند بزرگ و برتر صدام سفاک اور اس کی فاسد حکومت کا تختہ الٹ دے اور ان منافقوں کو رسوا کرے جو ہمارے ملک کے اندر سازشوں کی آگ لگاتے ہیں۔

میں خداوند عالم سے دست بدعا ہوں کہ وہ ہماری امت کے رہبر، دنیا کے مسلمانوں اور مظلوموں کے عظیم رہنما آیت اللہ العظمیٰ سید روح اللہ الموسوی الخمینی کو تا ظہور حضرت ولی العصر عجل اللہ فرجہ سلامتی عطا فرمائے۔

Presented by Ziaraat.Com

بلیست دکیم

آخر کلام

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

اَلَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَهَاجَرُوۡا وَجَاهَدُوۡا فِىۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ بِاَمۡوَالِهِمۡ وَاَنۡفُسِهِمۡ
اَعۡظَمُ دَرَجَةً عِنۡدَ اللّٰهِ ؕ وَاُولٰٓـئِكَ هُمُ الۡفَآئِزُوۡنَ (سورہ توبہ: آیہ ۲۰)

(وہ لوگ جو ایمان لائے اور انھوں نے ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں اپنے اموال اور اپنی جانوں کے ساتھ جہاد کیا ان کا درجہ اللہ کے نزدیک بہت بلند ہے اور وہی تو وہ لوگ ہیں جو کامیاب ہیں)

خداوندا! ہم نے اس زمین پر آرزوؤں کی ایک دنیا لے کر قدم رکھا، پاک آرزوئیں مقدس آرزوئیں، الوہی آرزوئیں، جن میں خودپسندی اور کوتاہ نظری کا شائبہ تک نہ تھا۔

ہماری آرزو تھی کہ انقلابِ فلسطین کی راہ میں جانفشانی سے کام لیں اور اپنی جانوں کو آزادی فلسطین کی دستاویز بنائیں۔

ہمیں آرزو تھی کہ پیادہ پا قدس کا سفر کریں اور وہاں پہنچ کر خداوند بزرگ و برتر کے حضور سجدہ گذار ہوں اور اس کے لطف و کرم اور اس کی رحمتوں کا شکریہ ادا کریں۔

• ہماری آرزو تھی کہ ہم عدل و انصاف کی راہ میں جہاد کریں اور محروموں، بے نواؤں اور دل شکستہ لوگوں کے مددگار رہیں۔

ہماری آرزو تھی کہ زمین پر پرچم علی مرتضیٰؑ کو سربلند کریں اور جناب امیرؑ کی شخصیت پر ڈالے گئے ان پردوں کو چاک کردیں جو تاریخ کے ستمگروں نے تہمتوں، حسد، بغض، دروغ بافی، کینہ پروری اور تزویر کی تاریکیوں سے تیار کیا، اور جناب امیرؑ کے وجود پاک و درخشاں کو تشنگانِ حقیقت و عدالت کے عشق و افتخار کے جذبے سے نمایاں کریں۔ انسانیت کو راہ کمال کے سفر میں ان

کے وجود کی شمع درخشاں کے گرد جمع کریں، زندگی کی روح فرسا اور ہمت شکن مشکلات کا مقابلہ کرنے کے لیے جو سراسر غم و درد و مصیبت سے مملو ہیں جناب علی علیہ السلام کے ارادۂ بلند سے ہمت اور حوصلے کی بھیک مانگیں اور قیامت کے دن جب کسی چیز تک ہمیں رسائی نہ ہو تو اپنے صدق و عشق و ایمان کو ثابت کرنے کے لیے درگاہ خداوندی میں ذات مرتضوی کی شفاعت پیش کریں۔

ہماری آرزو تھی کہ طوفان خیز حادثات کے معرکے میں اور حق و باطل کے مابین زندگی و موت کی کشمکش میں حسین علیہ السلام کے خون آلود پرچم کو اپنے کاندھے پر اٹھائیں اور اپنے وجود کو قربان کر کے شہدائے حق کی زنجیر کی ایک کڑی بن جائیں اور یوں انسانیت کو منزل کمال سے ایک قدم نزدیک تر لے آئیں۔

ہماری آرزو تھی کہ ایک فلاحی ریاست کو تشکیل دیں جس پر عدالت سایہ فگن ہو اور جس میں عشق و محبت کے چشمے انسانوں کے سینوں کی زمین کی آبیاری کریں، جہاں سے بغض و حسد، تہمت تراشی اور بدکاری، کفر و جہالت رختِ سفر باندھ لیں، جہاں کوئی یتیم آنکھوں میں آنسو لیئے ہوئے نہ سوئے، جہاں دردمندوں کے نالہ ہائے پرسوز راتوں کی تاریکیوں کا دل نہ چیر دیں اور یاس و ناامیدی کے مارے ہوئے لوگوں کی آتشیں آہیں آسمان کی خبر نہ لائیں۔

ہماری آرزو تھی کہ صفات الٰہی کی تجلیاں ہر جگہ اور ہر شخص میں دیکھیں اور زندگی کے مدار میں جلال و جمال، کمال و علم و تخلیق، عشق و محبت اور خلوص و انسانیت کو جلوہ گر دیکھیں۔

ہماری آرزو تھی کہ شمع بن جائیں اور سرتاپا جل جل کر تاریکیوں کو فرار کرنے پر مجبور کر دیں اور کفر و جہالت و ظلم کو اجازت نہ دیں کہ دنیا پر تسلط حاصل کریں۔

ہزاروں آرزوئیں تھیں، خواہشیں تھیں، آرزوہائے دور و دراز، سنہری چمکتی ہوئی آرزوئیں جو اب ہمیں یوں محسوس ہوتا ہے کہ سب خاک ہوگئیں۔ اب ہم ناامید و دل شکستہ ان آرزوں سے ہاتھ دھو چکے ہیں اور اپنے آپ کو قضا و قدر کے حوالے کر چکے ہیں۔

فقیر و بے نوا ابن کریم نے اپنا دل موت سے وابستہ کر رکھا ہے۔ میں یہ سمجھ چکا ہوں کہ درد و غم سے بھری ہوئی اس طویل تاریخ میں موت دوسروں سے بہتر اور بلند پایہ نہیں، مجھے

Presented by Ziaraat.Com

ہرلاف زنی کا سودا نہیں ہونا چاہیئے اور بے جا توقعات پروان نہیں چڑھانا چاہیے۔

اب زندگی میری نگاہ میں اتنی پست ہو چکی ہے کہ میں اپنی جان کی خاطر یا ساری دنیا کی جان کی خاطر اس بات کے لیے تیار نہیں کہ کسی کے حق کو پامال کروں، یا کسی کمزور چیونٹی کے منہ سے ایک دانہ بھی زبردستی چھینوں، یا حق بات کہنے میں موت یا کسی اور چیز سے خوف کھاؤں، بلکہ میں اپنی جان سے ہاتھ دھو چکا ہوں اور اپنے آپ کو حوادث کے سامنے لے آیا ہوں اور اپنے پورے وجود کو نہایت اخلاص کے ساتھ پیش کر رہا ہوں۔

میں نے اس راہ میں قدم رکھا ہے اور یوں کہ انقلاب پر میرا ایمان ہے اور ہر لحہ حیات وموت کے تصادم میں گذار رہا ہوں۔ لیکن آزادیِ فلسطین کے حصول پر مکمل ایمان کی بناء پر میں موت سے ہراساں نہیں اور میں نے ہر قسم کے خطرات کا خوشی سے استقبال کیا ہے۔ لیکن آج میرا ایمان ان نام نہاد انقلابیوں پر سے اٹھ چکا ہے، میرا دل راضی نہیں، مجھے یقین نہیں، میں ان میں کوئی ایسی خصوصیت نہیں دیکھتا جو انقلابیوں میں ہونا چاہیئں اور میں یہ خیال نہیں کرتا کہ ان لوگوں کی نیت فلسطین کو آزاد کرانے کی ہو۔

میں بے حد کوششیں کرتا ہوں کہ اپنے آپ کو اس بات کا یقین دلا دوں کہ فلسطینی مزاحمت ایک ایسا مقدس شعلہ ہے جس کی انسانوں کی آزادی کی خاطر نگرانی کرنا چاہیئے اور دل وجان سے جس کی حفاظت کرنا چاہیئے۔ لیکن افسوس یہ ہے کہ میں اپنے آپ کو یقین دلانے پر قادر نہیں ہوں، یا کم از کم اپنے آپ کو فریب دے کر ان انقلابیوں کی طرح انقلاب کے میٹھے خواب دیکھوں اور شہادت کے شربت شیریں کی آرزو کروں۔

اس کے مقابلے میں میں یہ دیکھتا ہوں کہ یہ لوگ مجھے زبردستی یقین دلانا چاہتے ہیں اور میرے دل کو راضی کرنا چاہتے ہیں، میری پریشاں روح کو تسکین دینا چاہتے ہیں۔ لیکن وہ اس پر قادر نہیں کیونکہ دلی یقین اور ایمان زبردستی پیدا نہیں ہوتے۔

لیکن اس کے ساتھ ہی میں اپنے آپ کو فریب بھی نہیں دے سکتا اور نہ اپنی دلی بے اطمینانی کو چھپا سکتا ہوں۔ یہ لوگ مجھ پر اعتراض کرتے ہیں کہ میں مزاحمت کے مقابلے میں کھڑے ہو کر اس سے سو فیصد اتفاق کا اظہار نہیں کرتا، میں یہ جرأت کیسے کرتا ہوں کہ مزاحمت کی

سرزمین میں زندہ رہ کر ان کے طور طریقوں پر ایمان نہ لاؤں اور ابھی تک زندہ رہوں۔ یہ اعتراض کرنے والے مصلحت بین لوگ ہیں جو صرف سامنے کی باتوں کو دیکھتے اور سنتے ہیں۔ لیکن میں، میں نے تو اپنی زندگی سے اس انقلاب کو خریدا ہے اور اپنی جان کو ہتھیلی پر لیے پھر رہا ہوں۔ اس لیے میں نہیں ڈرتا کہ کذب و دروغ بافی میری زندگی کے درپے ہوں۔ کوئی شخص مجھے موت کے خوف سے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور نہیں کر سکتا اور غلط راہ چلنے پر آمادہ نہیں کر سکتا۔ انقلاب نے مجھے آزاد کر دیا ہے اور میں اس آزادی کو کسی چیز کے عوض، حتیٰ کہ اپنی زندگی کے عوض بھی اپنے ہاتھ سے نہیں دے سکتا۔ یہ سطور ڈاکٹر چمران شہید نے لبنان کی خانہ جنگی کے دو سال بعد لکھی تھیں اور یہ بتایا تھا کہ وہ لبنان کیوں آئے اور کن آرزوں کو لے کر آئے۔

لبنان کی خانہ جنگی کی سازش اتنا زور پکڑ گئی تھی کہ نہ صرف لبنان اس کے جال میں پھنسا بلکہ انقلاب فلسطین اور سوریا بھی اور دائیں اور بائیں بازو کی دشمن اسلام قوتیں لبنان کے حالات سے فائدہ اٹھا کر تسلط حاصل کر گئیں کہ دونوں طرف سے لبنان کے شیعوں اور ان کے رہنما سید موسیٰ الصدر کو اپنی زد میں لے آئیں۔ اس زمانے میں لبنان کے شیعوں اور ان کے رہنما کی حمایت کرنا بڑا مشکل کام تھا اسی لیے سیاست پیشہ لوگ اور مصلحت بین لیڈر خاموش رہنے کو اور حقیقت کو چھپانے کو ترجیح دیتے تھے لیکن ڈاکٹر چمران شہید اسی خوف وہراس کے عروج کے زمانے میں حق اور حقیقت کے دفاع کے لیے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور کسی چیز سے ہراس نہیں کھاتے اسی طرح کی ایک اور یادداشت میں جو انھوں نے ایران میں قلمبند کی وہ یوں لکھتے ہیں۔

خداوندا! فتنے کی آگ بھڑک رہی تھی۔ سب دشمن اکٹھے ہو کر لبنان کے شیعوں اور ان کے عظیم رہنما سید موسیٰ الصدر کے خلاف دروغ بافی اور افتراء کا بازار گرم کر رہے تھے اور ان پر بے شمار تہمتیں لگا رہے تھے۔ لوگوں پر مصیبتوں اور ابتلاء کی بارش ہو رہی تھی۔ تمام مصلحت بین لوگ ان الزامات اور دھمکیوں سے ڈر کر خاموشی اختیار کر چکے تھے اور ان سازشیوں کے کرتوتوں پر "جی ہاں! جی ہاں!" کر رہے تھے۔

Presented by Ziaraat.Com

لیکن میں حق و باطل کی اس جنگ میں خاموش نہیں رہ سکتا تھا۔ میں اپنے پورے وجود کو لے کر میدان میں اتر آیا۔ میں نے صرف اپنی زندگی حق کے سامنے تحفتہً پیش نہیں کی بلکہ اپنی روح کو، اپنے شعور کو بھی اس جہاد کی نذر کر دیا۔ بہت سے مصلحت بین دوست نما لوگ مجھے یہ مشورہ دیتے تھے کہ میں اس جنگ سے کنارہ کش ہو جاؤں اور سید موسیٰ الصدر کی حمایت نہ کروں کیونکہ اس طرح سے میری نیک نامی، میری سابقہ جدوجہد، حتیٰ کہ میری جان بھی نیست و نابود ہونے کے خطرے میں ہے۔

اے خدائے بزرگ و برتر! میں تیرا شکرگذار ہوں کہ تو نے مجھے بندۂ حق بنایا، میرے دل کو مصلحتوں کے وسوسوں سے پاک کیا، مشکلات کے گردابِ بلا میں مجھے راہ ہدایت دکھائی اور مجھے اس شدید آزمائش میں سربلند و سرخرو کیا۔ تو نے مجھے مصلحت طلبی کی بھول بھلیوں سے نجات دلائی، میرے دل کو نورِ عشق و ایمان سے روشن کیا۔ تو نے میری زندگی کو اور میری موت کو حق کے ساتھ شیر و شکر کر دیا۔ اسی بناء پر میری قدر و قیمت اسی بات میں مخفی ہے کہ میں شدید ترین حالات میں بھی سچائی کی حمایت کروں اور اپنے پورے وجود کو اس راہ میں قربان کر دوں کیونکہ اگر میں بھی تجارتی بنیادوں اور مصلحت بینی کی اساس پر کام کرتا تو مجھ میں اور دوسروں میں کچھ فرق نہ رہتا۔

خداوندا! تو نے لبنانیوں کو آزمائش میں ڈالا ہے۔ یہ آزمائش بڑی سخت اور بے حد خطرناک ہے اور اس میں حق و باطل کی کشمکش دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کر دیتی ہے اور جس کسی کے ہاں بھی کسی قسم کی آویزش تھی وہ اس کشمکش میں کھل کر سامنے آ گیا ہے۔

اس بڑے امتحان میں بائیں بازو کی پارٹیاں اور ان کی ساری طاقتیں گھٹنے ٹیک گئیں اور ان کے ڈھول کا پول کھل گیا، جھوٹ موٹ کے انقلابی رسوا ہو گئے، بے غیرت اور بے شرم تہمتیں باندھنے والے اپنے دام میں خود گرفتار ہو گئے۔ عوام کے دشمنوں کو جو بظاہر عوام کا دم بھرتے تھے عوام نے رد کر دیا۔

اے خداوند بزرگ و برتر! میں تیرا شکر ادا کرتا ہوں کہ تو نے ہمارے مومن دوستوں تنظیم "امل" کے فدائیوں کو کامیابی سے ہمکنار کیا۔ انہیں یہ موقع دیا اور ہمت دی کہ تمام سختیوں

اور مشقتوں کو جھیل لیں، ہر قسم کی تہمتوں اور ہر قسم کے دباؤ کو برداشت کر لیں، قتل، تشدد، اسیری اور خیانت کے الزامات کا صبر سے تحمل کریں اور ایک لمحے کے لئے بھی راہِ حق سے منحرف نہ ہوں۔

پروردگارا! تو نے محال کو ممکن کر دیا۔ تو نے مجھے اس قابل بنایا کہ میں تاریخ کی جبریت کے مقابلے میں کھڑا رہ سکوں، سیلاب کے خلاف تیر سکوں اور طوفانِ بلا کے درمیان کلمۂ حق کا اعلان کروں۔

خداوندا! تو دیکھتا ہے کہ ظلمت و جہالت کا دنیا پر تسلط ہے۔ تو دیکھتا ہے کہ ہر جگہ دھوکا، فریب، جھوٹ، تہمت تراشی اور سیاست بازی کی حکومت ہے۔ تو یہ دیکھتا ہے کہ سارے فریق اپنی مصلحتوں کے پیشِ نظر شیعوں کی تقدیر سے کھیل رہے ہیں۔ یہ سب تاجر ہیں، سب سیاست پیشہ ہیں اور چونکہ ہم الوہی اقدار کے پابند ہیں، یہ لوگ ہمیں دیوانہ اور بیوقوف کہتے ہیں اور اس بات کی کوشش کرتے ہیں کہ ہمارا استحصال کریں۔

خداوندا! میں اس دریائے فریب سے اور اس دنیائے سیاست و فریب کاری سے تنگ آ چکا ہوں، تھک گیا ہوں۔ میری کوشش یہی ہے کہ میں حق کے پیچھے پیچھے جاؤں اور اپنے آپ کو تیرے سوا کسی اور معبود کے ہاتھ نہ بیچوں اور چونکہ میں اپنے آپ کو ظلم و کفر کے مقابل مضبوط کرنا چاہتا ہوں اور اپنے شرفِ ایمانی کو تعرض کے خطرات سے محفوظ بنانا چاہتا ہوں، میں کوشش کرتا ہوں کہ ہر اس چیز کو قلم زد کروں جس میں خلل آ سکے یا وہ سیاست بازوں کے ہاتھوں میں کھلونا بن سکے۔ میں اپنے مال و منال سے، اپنی زندگی سے، اپنے وجود سے حتیٰ کہ اپنے نام و نشان سے بے نیاز ہو جاؤں اور اس طریقے سے ان سیاسی بازیگروں اور شعبدہ بازوں کے ہاتھوں سے ہتھیار چھین لوں تاکہ وہ جو کچھ بھی کریں، جس قسم کی چالیں چلیں، جس قسم کی دھمکیاں دیں، سب بیکار ہو جائیں۔

میرے پروردگار! میں نے فیصلہ کیا ہے کہ مرنا قبول لیکن ظلم و کفر کے سامنے ہتھیار نہیں پھینکوں گا۔ جب تک زندہ رہوں گا آزاد رہوں گا، حق کے سوا کسی کی پرستش نہ کروں گا، سوائے سچائی کے اور کسی چیز کی طلب نہ کروں گا۔

Presented by Ziaraat.Com

خدایا! میں دیکھتا ہوں کہ میرے ارد گرد سب لوگ سیاست بازی کرتے ہیں، دغا بازی اور فریب سے کام لیتے ہیں، جھوٹ بولتے ہیں، مکر سے کام لیتے ہیں، وعدہ خلافی کرتے ہیں۔ جہاں کہیں ان کا بس چلتا ہے، شیعوں کی تقدیر سے کھیلتے ہیں۔

یہ سچ ہے کہ سیاست بازی بڑا پیچیدہ اور الجھا ہوا کھیل ہے اور یہ بھی سچ ہے کہ اس کھیل میں بے شرمی اور ڈھٹائی کی بڑی ضرورت ہے، ہزار قسم کی پیچیدہ چالیں درکار ہیں، ہزاروں فریب اس کا تقاضا ہیں، مکر بازی اس کا مطالبہ ہے لیکن اے میرے پروردگار میں تیرا شکر کرتا ہوں کہ تو نے سیاست میں مجھے یہ سبق دیا ہے کہ صرف حق طلب کروں حق کہوں لوگوں کی خوشی یا ناخوشی سے مجھے کوئی تعلق نہیں ہے۔

فلسطینی مزاحمت کے رہنماؤں کی اکثریت یہ جانتی تھی کہ وہ راہ جو شیعیان لبنان نے اختیار کی ہے یعنی مشرقی اور مغربی طاقتوں پر بھروسہ نہ کیا جائے اور خدائے بزرگ و برتر پر تکیہ کر کے "لاشرقیہ و لاغربیہ" کا اصول اپنایا جائے یہی صحیح راہ ہے۔ لیکن ان میں اس راہ کو اختیار کرنے کے لیے جرائت نہ تھی اور نہ یہ جرائت تھی کہ اس انتخاب کی پاکیزگی کے بارے میں کچھ کہہ سکیں۔ اس حالت میں جب دائیں اور بائیں بازو کے لبنانی گروہ یہاں تک کہ فلسطینی بھی ان کی مخالفت کرتے تھے، وہ یہ جانتے تھے کہ سید موسیٰ الصدر لبنان کے شیعہ اور ان کی عسکری تنظیم "امل" ان کے حامی ہیں اور ان کی بلائیں اپنے سر لیتے ہیں۔ یہاں سے ڈاکٹر مصطفیٰ چمران کی زندگی کی حفاظت نے جنھوں نے لبنان کے شیعوں کی تنظیم کی اور ان میں حرکت پیدا کی، فلسطینی مزاحمت کے لیے اہمیت اختیار کی کیونکہ وہ (فلسطینی) یہ جانتے تھے کہ ڈاکٹر مصطفیٰ چمران درحقیقت اس امر کے لیے کوشاں ہیں کہ القدس کو صیہونیت کے چنگل سے رہا کیا جائے اور اس سلسلے میں امریکی۔ اسرائیلی سازشوں کو ناکارہ بنایا جائے لبنان کے محروم و مقہور شیعہ بھی اسی کی تقلید میں جنگ آزما تھے ڈاکٹر مصطفیٰ چمران نے مزاحمت کے ایک ذمہ دار شخص سے باتیں کرتے ہوئے خداوند عالم کی

قدرت و طاقت پر اپنے بھروسے کا اظہار اپنی ایک یادداشت میں یوں کیا ہے۔

ایک دن ۲۵ جون ۱۹۷۸ کو فلسطینی مزاحمت کی تنظیم کا ایک ذمہ دار شخص جو انقلاب فلسطین کی حفاظت کا انچارج تھا جنوبی لبنان میں ہمارے دفتر میں آیا اور مجھے ایک طرف لے جا کر کہنے لگا کہ مجھے فلسطینی مزاحمت کی قیادت نے اس بات پر مامور کیا ہے کہ میں تمہاری حفاظت کروں اس لیے میں یہ چاہتا ہوں کہ تین فلسطینی جنگ آزماؤں کو تمہارے پاس بھیجوں جو ہمیشہ تمہارے ساتھ گاڑی میں بیٹھیں اور تمہاری حفاظت کریں۔ میں نے دریافت کیا کہ آخر تمہیں کیا اطلاعات ملی ہیں۔ کہنے لگا ہماری خفیہ رپورٹوں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ دشمن تمہارے قتل کے درپے ہے، تمہاری جان خطرے میں ہے۔ اس قسم کا حادثہ فلسطینی مزاحمت کے لیے بے حد شدید اور ناقابل برداشت ہے، میں فلسطینی مزاحمت کی قیادت کے سامنے تمہاری حفاظت کے لیے جواب دہ ہوں۔

میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ خدائے بزرگ و برتر میرا نگہبان ہے۔ لیکن اس نے یہ بات قبول نہ کی اور اپنی ذمہ داری کے مسئلے کو از سر نو دہرایا۔ آخر میں نے کہا کہ تنظیم "امل" کے جوان کافی ہیں اور اگر ضرورت پڑی تو وہ میری حفاظت کر لیں گے۔ اس کے باوجود میں نے اس کا شکریہ ادا کیا۔

کیا عجیب بات ہے، یہ مجھے موت کی دھمکی دیتے ہیں، اس شخص کو جو موت کی آغوش میں غوطہ لگائے اور اس کے امن و سکون سے خوش ہو۔ میں درد و غم کی پیداوار ہوں۔ میں دریائے درد میں غوطہ لگاتا ہوں اور غم کے پہاڑ تلے کچلا جاتا ہوں۔ ہمیشہ محرومیت اور نارسی کی آگ میں جلتا ہوں اور دنیا سے اور جو کچھ اس میں ہے۔ بے رخی اور بیگانگی محسوس کرتا ہوں۔

اس کے بعد ڈاکٹر چمران شہید اپنے پالنے والے سے راز و نیاز کی باتیں کرتے ہیں۔ اپنے باطنی غم و اندوہ کو بیان کرتے ہیں اور اپنی اور شیعوں کی اس نیت کو دہراتے ہیں کہ وہ علیؑ و حسینؑ کی پیروی کر کے مظلوموں اور محروموں کی مدافعت کر کے سرزمین قدس کو دوبارہ حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

Presented by Ziaraat.Com

خدایا! تو جانتا ہے۔ کہ ہمیں پیغمبروں کی جنم بھومی اور نزولِ وحی کی سرزمین فلسطین سے عشق ہے اور ہم فلسطین قدس کو صیہونیت کے منحوس تسلط سے نجات دلانے کو اپنی زندگی کے مقاصد میں سے مقدس ترین مقصد سمجھتے ہیں۔ تجھے خوب معلوم ہے کہ ہم نے اس راہ میں تنظیم آزادی فلسطین کی مدد کرنے میں کسی بات سے دریغ نہیں کیا اور ہمیشہ پورے خلوص سے اور صاف نیتی سے اس کی حمایت کی ہے۔

تو جانتا ہے کہ آج لوگوں کے بہت سے گروہ بعض غلطیوں اور شبہات کی بناء پر فلسطینی مزاحمت اور اس کے مستقبل سے بے اعتنائی برت رہے ہیں۔ عیسائی عام طور پر کھلم کھلا دشمنی کا اظہار کر رہے ہیں اور وہ فلسطینیوں کی ضد میں اسرائیل کے ساتھ اعلانیہ تعاون کر رہے ہیں۔ اہل سنت اور دُرزیوں میں سے بھی بعض لوگ گاہے گاہے فلسطینیوں کے بارے میں اپنی نارضامندی کا اظہار کرتے ہیں۔ اور انتہاپسند عیسائیوں کے رہبروں کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھاتے ہیں تاکہ مفادات کی تقسیم کے وقت انہیں زیادہ مراعات حاصل ہوسکیں۔ لیکن علیؑ و حسینؑ کے شیعہ جو مظلوم و محروم ہیں، دل شکستہ ہیں، پسے ہوئے ہیں جنھوں نے سب سے زیادہ جنگ کے شدائد کو برداشت کیا ہے، سب سے زیادہ شہید پیش کیے ہیں، اور اپنی جان سے کھیل گئے ہیں، یہ سب کے سب اسی طرح فلسطینیوں کے شانہ بشانہ لڑ رہے ہیں اور فلسطینی مزاحمت کی حمایت میں کوشاں ہیں۔ ہر روز وہ اس راہ میں شہیدوں کی قربانیاں پیش کرتے ہیں۔ اس بناء پر عیسائیوں نے شیعوں کو اپنے بغض و کینے کا نشانہ بنایا ہے اور اسی بناء پر صیہونیت اور ان کے داخلی ایجنٹ شیعوں کے خلاف اپنی کاروائیاں تیز سے تیز تر کر رہے ہیں اور ان کی کوشش ہے کہ وہ شیعوں کی مرکزیت اور ان کی قیادت کو برباد کر دیں۔ اس وقت سارے فریق شیعوں کے حقوق پر چھاپہ مارنے کے لیے آپس میں بات چیت کر رہے ہیں۔ اور شیعوں کی تقدیر کو بگاڑنے کے لیے سازشوں میں مصروف ہیں۔ اور ان سب سے زیادہ دردناک بات یہ ہے۔ کہ شیعوں کو غدار اور جاسوس قرار دیا جاتا ہے۔

خداوندا! ہم اس سارے ظلم کو، ان ساری حق تلفیوں کو، ان سب تہمت تراشیوں کو، ان سب حملوں کو تیری خاطر اور آزادی فلسطین کے مقدس ہدف کی خاطر بڑی خندہ پیشانی اور وسعت قلبی سے برداشت کر رہے ہیں۔ ان تمام دل شکن باتوں کے باوجود ہم فلسطینیوں کے شانہ بشانہ موجود ہیں اور آزادی فلسطین کی خاطر کسی قسم کی قربانی سے دریغ نہیں کر رہے۔

Presented by Ziaraat.Com

ضمیمہ الف

ڈاکٹر مصطفےٰ چمران شہید

ایک ایسے شہید کے بارے میں گفتگو کرنا بے حد مشکل بلکہ محال ہے جس کی شخصیت بے حد پہلودار ہو جس کے کردار میں مجموعۂ اضداد کا نقشہ نظر آتا ہو، جس کی شخصیت میں آہنی خصوصیات بھی ہوں اور آنسوؤں کی نرمی و نازکی بھی، جو میدانِ جنگ میں سرخیلِ بہادراں ہو اور تاریک راتوں میں عابد شب زندہ دار، جو یتیموں کے لیے مجسم شفقت ہو اور کافروں کا بے رحم دشمن۔

ڈاکٹر مصطفےٰ چمران کے بارے میں لب کشائی بے حد مشکل ہے، بے حد دشوار ہے۔ وہ مردِ عمل تھے، مردِ سخن نہ تھے وہ کام کے دھنی تھے، زبانی جمع خرچ کے قائل نہ تھے وہ اسلام کے تصورِ ہجرت کا نمونۂ کامل تھے، جذبۂ جہاد و شہادت کی چلتی پھرتی تصویر۔ جنوبی لبنان کے اس مالک اشتر اور کربلائے خوزستان کے اس عباس کے بارے میں کچھ کہنا بڑا کٹھن کام ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ان کی شخصیت کے کسی ایک پہلو کی توصیف کرنا بھی ممکن نہیں، ہے اس لیے یہ توقع نہیں رکھنا چاہیے کہ ان کی زندگی کے اس مختصر سے خاکے میں ان کی شخصیت کی بھرپور تصویر پیش کی جائے۔ علیؑ اور حسینؑ کی راہ پر چلنے والوں کی شخصیت کی نقشہ کشی مادی کلمات اور دنیاوی معیاروں کے مطابق ہو ہی نہیں سکتی۔

لیکن ان کی پُرافتخار شہادت اور انسان ساز قربانی کی سالگرہ کے موقع پر یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ جہاں تک ممکن ہو ان کی شخصیت، ان کے افکار، ان کی راہ عمل اور ان کی مساعی کا تعارف کرایا جائے۔ یہ مختصر سا خاکہ ان کی مختصر سی زندگی کا ایک سرسری سا جائزہ ہے، جس مختصر زندگی میں قدم قدم پر جدوجہد سے پُر حوادث اور ایثار و عشق و فداکاری کے نمونوں کی نشاندہی ہوتی ہے۔ اس سلسلے میں ہماری بیشتر توجہ تاریخی واقعات پر ہے، خصوصاً ان کی شہادت جس کی تفصیلات کی تلاش اکثر لوگوں کو رہتی ہے ورنہ ان کی مکمل سوانح حیات اور بالخصوص ان کی

شخصیت کے تربیتی اور معنوی پہلوؤں کا بیان اس خاکے میں ممکن نہیں۔

ولادت

ڈاکٹر مصطفےٰ چمران ۱۳۱۱ھ ہجری شمسی (۱۹۳۲ء عیسوی) میں تہران کے خیابان پانزدہ خرداد (بوزرجمہری) میں "بازار آہنگرہا" میں متولد ہوئے۔

تعلیم

انھوں نے اپنی تعلیم کا آغاز "مدرسہ انتصاریہ" سے کیا اور ثانوی تعلیم "دارالفنون البرز" میں حاصل کی اور پھر ٹیکنیکل کالج میں داخل ہوئے جہاں سے انھوں نے ۱۳۳۴ھ ہجری شمسی (۱۹۵۵ء) میں الیکٹرو مکینکس کے شعبے میں ڈگری حاصل کی اور پھر ایک سال کے لیے وہیں پر پڑھاتے رہے وہ اپنی تعلیمی زندگی میں ہمیشہ اول آتے رہے۔ ۱۳۳۷ ہجری شمسی (۱۹۵۸ء) میں انہیں وظیفہ ملا اور وہ امریکہ چلے گئے جہاں انہوں نے کیلیفورنیا کی مشہور امریکی یونیورسٹی سے الیکٹرونکس اور پلازما فزکس میں ڈاکٹریٹ حاصل کیا۔

اجتماعی سرگرمیاں

۱۵ سال کی عمر میں مسجد ہدایت میں آیت اللہ طالقانی مرحوم کے تفسیر قرآن کے درس میں شرکت کرنا شروع کی اور اس کے بعد انہوں نے مرتضیٰ مطہری شہید اور دیگر اساتذہ کے فلسفے اور منطق کے دروس میں شرکت کی۔ وہ "انجمن اسلامی دانشجویان دانشگاہ تہران" (تہران یونیورسٹی کے طلباء کی انجمن اسلامی) کے اولین ارکان میں سے تھے۔ انہوں نے ڈاکٹر مصدق کی وزارت کے زمانے میں اس سیاسی جدوجہد میں شرکت کی جس کے نتیجہ میں ایران میں پٹرولیم کی صنعت کو قومیایا گیا۔ وہ اس جدوجہد میں بڑی سرگرمی سے شریک رہے۔ ۲۸ سر دار (۱۹ اگست ۱۹۵۳ء) کو جب امریکی مدد کی شہ پر ایرانی فوج نے ڈاکٹر مصدق کی حکومت کا تختہ الٹ دیا تو ڈاکٹر مصطفےٰ چمران ایران کی قومی مزاحمت کی تحریک میں شامل ہو گئے اور انہوں نے استعماری اور استبدادی طاقتوں کے خلاف

Presented by Ziaraat.Com

شدید ترین جدوجہد کا آغاز کیا اور سابق شاہ ایران کے طاغوتی نظام کے خلاف مسلسل نبردآزما رہے۔ امریکہ میں انہوں نے اپنے بعض دوستوں کی مدد سے پہلی بار "انجمن اسلامی دانشجویان" کی بنیاد رکھی۔ اسی طرح وہ کیلیفورنیا میں ایرانی طالب علموں کی انجمن کے مؤسسین میں سے تھے ان کی ان سرگرمیوں کی بناء پر سابق شاہ کی حکومت نے ان کا وظیفہ بند کر دیا۔ ۱۵ خرداد ۱۳۴۲ ہجری شمسی (۵ جون ۱۹۶۳ء) کے خونی حادثے کے بعد انہوں نے نہایت جرأت مندانہ قدم اٹھایا اور اپنے چند دوستوں کے ساتھ مصر چلے گئے اور دو سال تک صدر جمال عبدالناصر کے زمانے میں مصر میں چھاپہ مار جنگ کی تربیت حاصل کی۔ اس تربیت کے دوران میں انہوں نے اپنی امتیازی خصوصیات کا لوہا منوایا۔ تربیت کے ختم ہونے پر مصر میں موجود ایرانیوں کی تربیت کی ذمہ داری انہی کے سپرد کر دی گئی۔

ان کے ہاں بڑی گہری مذہبی حس کارفرما تھی اس بناء پر جب انہوں نے مصر میں یہ دیکھا کہ عرب نیشنلزم کی تحریک مسلمانوں کو ایک دوسرے سے جدا کر رہی ہے تو انہوں نے جمال عبدالناصر سے اس کے بارے میں گفتگو کی اور اپنے اعتراضات پیش کیے جمال عبدالناصر نے ان اعتراضات کو قبول کیا لیکن کہا کہ عرب نیشنلزم کی تحریک اتنی قوی ہو چکی ہے کہ آسانی سے اس کا مقابلہ کرنا ممکن نہیں۔ جمال عبدالناصر نے مزید کہا کہ انہیں اندازہ نہ تھا کہ عرب نیشنلزم کی تحریک سے دشمنوں کو فائدہ پہنچے گا اور مسلمانوں میں تفرقہ پھیلے گا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی جمال عبدالناصر نے ڈاکٹر چمران اور ان کے ساتھیوں کو اس بات کی اجازت دی کہ وہ مصر میں اپنے خیالات کا اظہار کریں۔

لبنان میں

جمال عبدالناصر کی وفات کے بعد اس امر کی ضرورت محسوس ہوئی کہ ایرانی فداکاروں کے لیے ٹریننگ کا ایک مستقل مرکز قائم ہو جہاں پر انہیں گوریلا جنگ کی تربیت دی جا سکے کیونکہ عبدالناصر کی وفات کے بعد کی پالیسی میں واضح فرق آ گیا تھا جس نے چند برس کے بعد یہ صورت اختیار کی کہ عبدالناصر کے جانشین انور السادات نے ان تمام اصولوں کو پس پشت ڈال دیا جن کے لیے جمال عبدالناصر نے تگ و دو کی تھی اور آہستہ آہستہ ان لوگوں سے دوستیاں استوار کیں جن کے

خلاف جمال عبدالناصر عمر بھر جنگ آزما رہے اور بالآخر اس نے کیمپ ڈیوڈ معاہدے کی شکل اختیار کی۔ بہرحال ایرانی جانبازوں کے لیے چھاپہ مار جنگ کی تربیت دینے کے لیے ایک مرکز کے قیام کے لیے ڈاکٹر مصطفیٰ چمران شہید لبنان سدھارے۔ یہاں پہنچ کر انہوں نے ایک طرف تو ایرانی رضاکاروں کی تربیت کا بندوبست کیا لیکن اس سے زیادہ اہم کام یہ سرانجام دیا کہ انہوں نے سید موسیٰ الصدر کے ساتھ مل کر لبنان کے مظلوم طبقوں بالخصوص جنوبی لبنان کے شیعوں کی مدد کے لیے تنظیمی امور بھی سرانجام دیئے اور تعلیمی اور عسکری بھی۔ سید موسیٰ الصدر نے صور کے قریب برج شمالی میں ایک مدرسہ تعمیر کروایا تھا جس کا مقصد اساسی طور پر ان بچوں کی تعلیم و تربیت تھا جو تعلیم سے محروم تھے۔ اس مدرسے نے ۱۹۷۰ء میں کام شروع کر دیا تھا جہاں ان بچوں کی تعلیم کے علاوہ "معہد الدراسات الاسلامیہ" کو بھی منتقل کر دیا گیا۔ اس ادارے میں ایشیا اور افریقہ کے مختلف ممالک کے طالب علموں کو عربی کے علاوہ فقہ، تفسیر، حدیث اور دیگر قرآنی علوم کی تعلیم دی جاتی تھی۔ لیکن سید موسیٰ الصدر کی اصل خواہش یہ تھی کہ یہاں پر طلبہ کے لیے فنی تربیت کا انتظام بھی ہو لیکن انہیں کوئی ایسا مخلص شخص نہیں مل رہا تھا جو اس کام کو اپنے ذمہ لے سکتا۔ ڈاکٹر مصطفیٰ چمران نے ان کی یہ مشکل حل کر دی اور انہوں نے اسی فنی سکول کی پرنسپلی کا عہدہ سنبھال لیا۔ اس مدرسے کا ذکر بار بار اس کتاب میں آیا ہے لیکن اس سے بھی اہم کام ڈاکٹر مصطفیٰ چمران نے یہ سرانجام دیا کہ انہوں نے سید موسیٰ الصدر کی تحریک "حرکۃ المحرومین" میں دل و جان سے شرکت کی اور اس تحریک کے عسکری شعبے کو اسلامی آئیڈیالوجی کی اساس پر منظم کیا۔ اس شعبے نے "تنظیم امل" کا نام اختیار کیا۔ ڈاکٹر مصطفیٰ چمران نے "امل" کے رضاکاروں کی جنگی اور فکری تربیت کی اور انہیں یوں تیار کیا کہ وہ علی علیہ السلام کے مانند موت و حیات کے معرکوں میں اور خطرات کے گردابوں میں بے خوف کود پڑیں اور امام حسین علیہ السلام کے مانند شہادت کا استقبال کریں اور یوں تشیع کے خون آلود پرچم کو اس دور کے جابر ترین ستمگاروں یعنی صیہونی غنڈوں اور ان کے ہمنواؤں جن میں لبنان کے فاشسٹ کتائب پیش پیش تھے، ان سب کے سامنے اس پرچم کو سربلند کریں۔ ڈاکٹر مصطفیٰ چمران نے جنگ کے شعلوں میں جھلستے ہوئے بیروت سے لے کر جبل عامل کے برباد شدہ پہاڑوں تک اپنے جذبے کی شمعیں اور "امل"

Presented by Ziaraat.Com

کے چراغ روشن کیے جن کی روشنی سے جنوبی لبنان کے مظلوم طبقوں کو مستقبل کی راہیں نظر آئیں اور امید کی منزل دکھائی دی لبنان میں ڈاکٹر مصطفیٰ چمران کے کارنامے نہ صرف بیروت کی سڑکوں اور جبل عامل کے داغ داغ قریوں کے دل میں جاگزیں ہیں بلکہ لبنان مظلوم عوام کے دلوں کو ان کارناموں نے اس قابل بنایا ہے کہ پورے عزم سے اور احساسِ فخر سے ظالموں کے سامنے ان کی دوں صفتی کو للکاریں اور مغربی استعمارگردں کے کریہہ چہروں سے تہذیب و تمدن کے نقابوں کو اتار کر ان کی اصل حقیقت دنیا پر روشن کریں۔"

ایران کے اسلامی انقلاب کی کامیابی کے بعد

ایران میں امریکہ کے کاسہ لیس شاہ کے زوال کے بعد جب اسلامی انقلاب نے فتح یابی حاصل کی تو ڈاکٹر مصطفیٰ چمران ۲۳ سال کی خود اختیار کردہ جلاوطنی کے بعد وطن کو لوٹے۔ انہوں نے اپنے تمام انقلابی اور علمی تجربات کو انقلاب ایران کی خدمت کے لیے وقف کر دیا اور بڑی خاموشی کے ساتھ اپنے آپ کو اس انقلاب کے استحکام میں منہمک کر لیا انہوں نے اپنی پوری قوتیں سعد آباد میں پاسداران انقلاب کے اولین دستوں کو تربیت دینے میں صرف کر دیں اور اس عظیم تنظیم کی داغ بیل ڈالی جس نے مغربی طاقتوں اور ان کے پٹھوؤں کے خوابوں کو پریشان کر دیا۔ اس کے بعد وہ ایران کے وزیر اعظم کے معاون کی حیثیت سے کام کرنے لگے ان کے سپرد انقلابی امور کی نگرانی کا کام تھا تاکہ وہ ان گو ناگوں مشاکل کو حل کر سکیں جو انقلاب ایران کو درپیش تھیں۔ اس سلسلے میں انہوں نے اسی قسم کے جذبے اور قوتِ عمل کا ثبوت دیا جس کا اظہار انہوں نے لبنان میں کیا تھا۔ "پاوہ" کے ناقابلِ فراموش قضیے کو جس طرح سے انہوں نے حل کیا وہ ان کی قوتِ فیصلہ، قوتِ ایمانی، آہنی ارادے، شجاعت اور جانبازی کی دلیل ہے۔"

کردستان میں

ڈاکٹر چمران کا کردستان میں جانا اور "پاوہ" کو محاصرے سے چھڑانا ایک ولولہ انگیز داستان

ہے، "پاوہ" کے جانباز تقریباً مایوس ہو چکے تھے اور خوفناک تاریکی نے ان کا محاصرہ کیا تھا۔ وہاں گنتی کے چند "پاسدار" کچھ زخمی، کچھ دل شکستہ، کچھ تھکے ہوئے، ہزاروں دشمنوں میں میں گھرے ہوئے تھے۔ ان کے ساتھیوں کی اکثریت قتل ہو چکی تھی۔ تمام شہر اور اس کے گرد و نواح کے علاقے باغیوں کے قبضے میں آ چکے تھے اور ان کی فوج کے دستے ہر آن نزدیک تر ہو رہے تھے۔ گولوں کی بارش ہو رہی تھی اور قریب تھا کہ انقلاب کے حامیوں کا آخری مرکزِ مزاحمت بھی ان کے خون کے سیلاب میں غرق ہو جائے۔ ان حالات میں ڈاکٹر چمران اس بات پر قادر ہوئے کہ اس ہولناک تاریکی کو صبح امید کی روشنی میں بدل دیں، باقی ماندہ پاسداروں کی جانیں بچائیں اور اس آفت زدہ شہر کو دشمن کے قبضے میں جانے سے نجات دلائیں۔"

اس وقت امام خمینی نے ایک فرمان جاری کیا۔ اس فرمان کے ذریعے انہوں نے ساری فوجوں کی کمان خود سنبھال لی اور فوج کو حکم دیا کہ ۲۴ گھنٹے کے اندر اندر "پاوہ" پہنچیں۔ اسی فرمان کے ذریعے انہوں نے ڈاکٹر چمران کو "پاوہ" کا کمانڈر بھی مقرر کیا۔ اب فوجی اور "پاسدار" دونوں ہتھیلیوں پر سر رکھ کر نکل آئے اور ڈاکٹر چمران کے تمام انقلابی تجربات، ان کا ایمان، ان کی فداکاری، ان کی شجاعت، ان کے رہبرانہ خصوصیات اور منصوبہ بندی انقلاب کی طاقتوں کے کام آئیں اور دنیا نے ایک عظیم الشان انقلابی منظر دیکھا۔ پندرہ دن کی قلیل مدت میں کردستان کے تمام شہر، تمام راستے اور فوجی اہمیت کے تمام مقامات اسلامی انقلاب کی فوجوں کے تصرف میں آ گئے۔ کردستان کو ایک حتمی خطرے سے نجات مل گئی اور وہاں کے مسلمان عوام نے دل و جان سے اس کامیابی کا استقبال کیا۔"

ڈاکٹر چمران وزارت دفاع میں

اس عظیم الشان کامیابی کے بعد ڈاکٹر چمران تشریف لائے اور رہبرِ انقلابِ اسلامیِ ایران آیت اللہ العظمیٰ خمینی نے انہیں وزارتِ دفاع میں مقرر کیا۔

ڈاکٹر چمران نے وزارت میں اپنا عہدہ سنبھالنے کے بعد ایرانی فوج کو طاغوتی نظام سے آزاد کرانے کے لیے اس کی تطہیر کی اور اسے خالص اسلامی خطوط پر چلانے کے لیے اصلاحی

Presented by Ziaraat.Com

منصوبے تیار کیے جن کا مقصد یہ تھا کہ "پاسدارانِ انقلاب" خداوندِ عالم کی مدد سے اور قوم کی پشت پناہی سے ملک کی خود مختاری اور امن و امان کے ضامن بن جائیں اور ہمارے اسلامی مشن کو کامیاب بنا سکیں۔ ایران میں پاسدارانِ انقلاب کی تنظیم اور تربیت ڈاکٹر چمران شہید کی انتھک محنت، ان کی منصوبہ بندی اور ان کی بے پناہ کدو کاوش کا نتیجہ ہے۔ جس وقت عراق نے ایران پر حملہ کیا اس وقت سب لوگ اسی خیال میں تھے کہ ایرانی فوج تو نہ ہونے کے برابر ہے۔ اس لیے ایران کا شکست کھا جانا چند دنوں کی بات ہے۔ لیکن ان "پاسداروں" نے ثابت کر دیا کہ قوتِ ایمان سے مسلح ہو کر لڑنے والے باضابطہ اور پیشہ ور فوجیوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ تندہی اور جانفشانی سے لڑ سکتے ہیں۔

ایرانی مجلس کے رکن کی حیثیت سے:

ایران کی مجلس شوریٰ اسلامی کے پہلے انتخابات میں ڈاکٹر چمران تہران کے حلقے سے منتخب ہوئے۔ انہوں نے طے کر لیا تھا کہ جدید انقلابی نظام اور جدید قوانین کی تدوین کیلئے خصوصاً وہ قوانین جن کا تعلق فوج سے ہو، اپنی پوری کوششیں صرف کر دیں گے تاکہ سابق ایرانی فوج ایک ایسی انقلابی فوج کی شکل اختیار کرے جو انقلابِ اسلامی کے شایانِ شان ہو۔ مجلس میں نمائندہ منتخب ہونے کے بعد انہوں نے ایک تقریر کے دوران میں ان الفاظ میں خدا کا شکر ادا کیا: "خداوندا! لوگوں نے مجھ سے اس قدر محبت کی ہے اور اپنے لطف و محبت کی بارش سے مجھے یوں سرشار کیا ہے کہ واقعی میں شرمسار ہوں، میں اپنے آپ کو اس قدر چھوٹا محسوس کر رہا ہوں کہ مجھے یہ محسوس ہوتا ہے کہ میں اس ذمہ داری سے عہدہ برآ نہ ہو سکوں گا۔ خداوندا! مجھے موقع دے، مجھے طاقت عطا فرما کہ میں اس ذمہ داری کو نبھا سکوں اور لوگوں کی اس مہر و محبت کا مستحق بن سکوں۔" اس کے بعد انہیں شوریٰ عالی دفاع (سپریم ڈیفنس کونسل) کا رکن مقرر کیا گیا اور ان کے ذمہ یہ کام لگایا گیا کہ فوج کی کارکردگی کے بارے میں اپنی مفصل رپورٹ پیش کریں۔

خوزستان کے محاذ پر:

جب عراق نے ایران پر حملہ کیا تو ڈاکٹر چمران نے ایک اور ولولہ انگیز مظاہرے کا آغاز کیا۔ انہوں نے بغیر کسی شور و شغب کے، بغیر کسی پروپگنڈے کے، صرف خدا کے لیے اپنے آپ کو ایثار، شجاعت اور فروتنی کے نمونے کے طور پر پیش کیا۔

صدامی فوجوں کے ایران کی سرزمین پر حملے کے بعد اور اس کے شہروں اور قریوں کو تباہی کے منہ میں ڈالنے کے بعد ڈاکٹر چمران آرام سے نہ بیٹھ سکے۔ وہ سیدھے آیت اللہ خمینی کی خدمت میں پہنچے اور ان کی اجازت سے سپریم ڈیفنس کونسل میں امام خمینی کے ایک اور نمائندے اور تہران کے حلقے سے منتخب ہونے والے مجلس کے رکن حجۃ الاسلام علی خامنہ ای (جو اس وقت ایران کے صدر ہیں) کے ہمراہ اہواز گئے۔ ڈاکٹر چمران اپنی عادت کے مطابق یہاں بھی خطرات کے طوفان سے بے نیاز اور موت کے خوف سے بالکل دور اہواز پہنچنے کے بعد انہوں نے رات کے وقت دشمن کے ٹینکوں پر چھاپہ مار حملے شروع کیے جو اہواز کے شہر پر قبضہ کرنے کے لیے قریب پہنچ رہے تھے۔

یاد رہے کہ عراقی ہراول دستے اہواز سے تقریباً ۱۲ کلومیٹر دور رہ گئے تھے اور گمان بھی تھی کہ وہ اہواز پر قبضہ کر لیں گے لیکن ڈاکٹر چمران کی چھاپہ مار جنگ اور ان کی منصوبہ بندی نے بعثیوں کے تمام خواب پریشان کر دیئے اور انہیں منہ کی کھانا پڑی اور یہیں سے ان کی شکست کا آغاز ہوا۔

چھاپہ مار دستوں کی تنظیم:

شوقِ شہادت میں سرشار کچھ رضاکار ڈاکٹر چمران کے ساتھ ہو لیے تھے۔ انہوں نے ان رضاکاروں کو چھاپہ مار جنگ کی تربیت دی اور یوں اہواز کے شہر میں چھاپہ مار جنگوں کی تنظیم کا آغاز ہوا۔ ان چھاپہ مار گروہوں کی طاقت میں روز بروز اضافہ ہوتا گیا اور ان دستوں نے بے شمار خدمات سرانجام دیں۔ ان خدمات سے، جن کے بارے میں ڈاکٹر چمران خود بروئے

Presented by Ziaraat.Com

کرنے سے گریز کرتے تھے۔ وہی لوگ آشنا ہو سکتے ہیں جنھوں نے ان چھاپہ مار دستوں کی زندگی کی تلخیوں اور شیرینیوں، ان کی کامیابیوں اور شکستوں، ان کے شجاعانہ اقدامات، ان کے ایثار اور ان کے جذبۂ شہادت کو قریب سے دیکھا ہو۔

چھاپہ مار جنگوں کی تنظیم کے لیے انجینئرنگ کا ایک یونٹ قائم کرنا ان کے پروگرام کا ایک اہم جزو تھا۔ اس یونٹ کی مدد سے مختلف مقامات پر جنگی مقاصد کے لیے سڑکیں بنیں۔ اسی یونٹ نے دریائے "کارون" کے کنارے پمپ لگا کر ایک نہر بنائی جو بیس کلومیٹر لمبی اور ایک سو میٹر چوڑی تھی اور یوں ایک ماہ کی مدت میں انہوں نے اس نہر کی مدد سے "دریائے کارون" کے پانی کا رخ دشمن کے ٹینکوں کی طرف پھیر دیا اور اس کی فوجیں مجبور ہو گئیں کہ وہ چند کلومیٹر پسپا ہو کر اپنے مقابل میں ایک بند باندھیں تاکہ اس پانی سے بچ سکیں۔ اس طریقے سے اہواز کی تسخیر کا خیال ان کے دل سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نکل گیا۔"

ایک اور اہم اور بنیادی کام جو ڈاکٹر چمران شہید نے سر انجام دیا وہ یہ تھا کہ اس علاقے میں موجود فوج، پاسداروں اور رضا کار دستوں کے درمیان ہم آہنگی پیدا کی جائے۔ اس نے اس علاقے میں موجود مختلف قسم کے جنگجو گروہوں کے درمیان ہم آہنگی پیدا کر کے کم و بیش ایک نئے جنگی طریق کار کو جنم دیا۔ اس بات کا بڑی طاقتوں کو وہم و گمان تک بھی نہ تھا۔ افسوس یہ ہے کہ اس قسم کا باہمی ارتباط خرم شہر میں پیدا نہ ہو سکا اور وہاں عوامی قوتیں تنہا رہ گئیں۔ ڈاکٹر چمران شہید کا ارادہ تھا کہ وہ خرم شہر بھی جائیں لیکن ایسا نہ ہو سکا کیونکہ وہ اہواز کو بچانے میں مصروف تھے۔ پھر بھی انہوں نے کئی مرتبہ دو سو سے ایک ہزار رضا کاروں پر مشتمل دستے منظم کیے اور انہیں خرم شہر بھیجا تاکہ وہ وہاں پر موجود اپنے ان بھائیوں کی مدد کر سکیں جو وہاں پر دشمن کے خلاف مزاحمت کر رہے تھے۔

سوسنگرد کی فتح:

اہواز کو فتح کرنے سے مایوس ہونے کے بعد صدام نے سوسنگرد کی تسخیر کا ارادہ کیا اور دوسری بار اس شہر پر حملہ کیا۔ تین روز تک ایرانی ٹینکوں نے شہر کا محاصرہ کیے رکھا۔

تیسرے روز ان میں سے کچھ اس قابل ہوئے کہ شہر میں داخل ہو جائیں۔ شوقِ شہادت سے سرشار جوانوں کا ایک گروہ شہر میں باقی رہا اور دشمن کا مقابلہ جاری رہا۔

ڈاکٹر چمران سوسنگرد کے محاصرے کی بناء پر سخت تشویش میں تھے۔ انہوں نے آقای خامنہ ای کے ساتھ مل کر فوج کو اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ ایک جرأت مندانہ اقدام کر کے حملہ کریں۔ خود انہوں نے رضا کاروں اور پاسداروں کو منظم کر کے فوج کے ساتھ کر دیا اور ایک نئے جوش اور ولولے کے ساتھ اہواز سے سوسنگرد جانے والی سڑک پر سے سوسنگرد پر حملہ شروع کیا۔ ڈاکٹر چمران شہید ان حملہ آوروں کی صف اول میں تھے اور انہیں یہ شوق کشاں کشاں سوسنگرد میں محاصرہ شدہ بھائیوں کی جانب لیے جا رہا تھا جو دشمن کے ٹینکوں میں گھرے ہوئے تھے۔ انہوں نے باقی رضا کاروں اور پاسداروں کو تو دوسری جانب بھیج دیا اور خود اس جگہ حملہ کیا جہاں محاصرے کا حلقہ بہت تنگ تھا۔ یہاں شدید لڑائی ہوئی۔ دشمن کی فوجوں نے ٹینکوں کے سائے میں ڈاکٹر چمران اور ان کے ساتھیوں پر حملہ کیا لیکن انہوں نے بے مثال جرأت و شجاعت کا ثبوت دیا۔ وہ شوقِ شہادت میں لڑے جا رہے تھے۔ یہ لڑائی ۷ محرم کو ہوئی۔ اس کے دوران میں ان کے ایک باوفا ساتھی شہید ہو گئے لیکن وہ اکیلے ہی دشمن کو پریشان کرتے رہے۔ حسین علیہ السلام کا یہ جانباز شوقِ شہادت میں اپنے آپ کو بھول چکا تھا۔ اس اثناء میں ان کا بایاں پاؤں زخمی ہو گیا اور ان کے خون نے خوزستان کی کربلا میں عجیب نقش ابھارے۔ اس زخمی حالت میں انہوں نے ایک عراقی ٹرک پر حملہ کیا جس کے سوار میدانِ جنگ سے فرار کر چکے تھے۔ اس ٹرک میں بیٹھ کر وہ مسکراتے ہوئے دوسروں کو فتح و کامرانی کی خوشخبریاں دیتے رہے۔ جب ان کے زخمی ہونے کی خبر دوسرے مجاہدوں تک پہنچی تو اس خبر نے ان کی آتشِ شوق کو مزید بھڑکایا۔ انہوں نے چاروں طرف سے حملہ کر کے محاصرے میں گھرے ہوئے جانبازوں کو آزاد کروا لیا۔ ڈاکٹر چمران اسی ٹرک میں اہواز کے ہسپتال میں پہنچے جہاں ان کا علاج شروع ہوا۔ لیکن وہ وہاں ایک رات سے زیادہ نہ رہے اور فوراً اپنے ہیڈ کوارٹر پہنچے اور اس زخمی حالت میں انہوں نے اپنے ساتھیوں کو ہدایات دینا شروع کر دیں۔ یہاں یہ چیز قابلِ ذکر ہے کہ جو رات ڈاکٹر چمران نے ہسپتال میں گزاری اس میں فوجی کمانڈروں کی ایک

Presented by Ziaraat.Com

میٹنگ ان کے بستر کے اردگرد ہوئی جس میں جنرل فلاحی شہید، کلاهدوز شہید، کرنل محمد سلیمی، خوزستان کے گورنر اور سپاہ پاسداران میں امام خمینی کے نمائندے آقای محلاتی شریک تھے۔ اسی میٹنگ میں مزید جنگی کارروائیوں کا نقشہ کھینچا گیا۔"

دوستوں کے اصرار اور ذمہ دار افسروں کی تجاویز کے برخلاف کہ وہ اہواز سے تہران چلے جائیں، انہوں نے اہواز سے جانا مناسب نہ سمجھا اور زخمی حالت ہی میں اپنے ہیڈکوارٹر میں رہے۔ ان کے بستر کے اردگرد جنگی نقشے رکھے ہوئے تھے جن کو وہ باقاعدگی سے دیکھتے رہتے اور اسی حالت میں اپنی تجویزیں ذمہ دار افسروں تک پہنچاتے رہے۔ جب ان کے زخم کچھ کچھ درست ہوئے تو اب ان کے لیے چین سے بیٹھنا ممکن نہ تھا۔ بیساکھیوں کی مدد سے وہ اٹھ کھڑے ہوئے اور محاذ جنگ پر جانے کی تیاری کی۔ ۲۸ صفر (۵ جنوری ۱۹۸۰ء) کو جو جنگ ہوئی اس میں ایرانی فوجوں کو زک اٹھانا پڑی اور ہویزہ کا شہر ان کے ہاتھ سے نکل گیا۔ اس وقت ڈاکٹر چمران کے لیے خاموش بیٹھنا ممکن نہ تھا۔ انہوں نے کچھ جانباز رضاکاروں کو چنا، چند ہیلی کاپٹر لیے اور بیساکھیوں کے ساتھ خود اس مہم کی کمان کی اور دشمن کی صفوں پر حملہ کیا لیکن دشمن کی شدید گولہ باری کی بناء پر ہیلی کاپٹر اس قابل نہ ہوئے کہ وہ ہویزہ کے علاقے سے گذر سکیں۔ عراقی ہوائی جہازوں کے حملے نے ہیلی کاپٹروں کو واپس ہو جانے پر مجبور کیا۔ اس بات نے ڈاکٹر چمران کو سخت آشفتہ خاطر کر دیا۔

امام خمینی سے ملاقات

فروری ۱۹۸۰ء میں انھوں نے بیساکھیوں سے مدد لینا چھوڑ دی اور تکالیف کے باوجود وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ اہواز کے محاذ کے معائنے پر گئے اور وہاں سے تہران کی طرف روانہ ہوئے تاکہ امام خمینی سے ملاقات کریں۔ اس ملاقات میں انہوں نے جنگ کی پوری تفاصیل بیان کیں۔ امام خمینی نے انکی باتیں سننے کے بعد انکے اور اُن کے ساتھیوں کے حق میں دعائے خیر کی۔ ڈاکٹر چمران کے لیے یہ بات بہت تکلیف دہ تھی کہ محاذ جنگ پر خاموشی ہو۔ اس لیے انہوں نے ایسی تجاویز پیش کیں جن کے ذریعے سے جنگ کی حرکت

تیز ہو۔ وہ مُصر تھے کہ جلد از جلد بوستان پر حملہ کیا جائے اور سرحد کے نزدیک پہنچ کر عراق کی شمالی اور جنوبی فوجوں کو یکجا ہونے سے روکا جائے۔ آخرکار ۲۱ مئی ۱۹۸۱ء کو ایک شدید لڑائی کے بعد "اللہ اکبر" نامی سطح مرتفع فتح ہوئی۔ سوسنگرد کی فتح کے بعد یہ سب سے بڑی کامیابی تھی جو ایرانیوں کو نصیب ہوئی۔ یہاں بھی ڈاکٹر چمران ہراول دستوں میں موجود اس وقت ان ٹیلوں پر پہنچے جب ابھی دشمن کے سپاہی مزاحمت کر رہے تھے۔ ڈاکٹر چمران اور ان کے بہادر ساتھی ایرج رستمی نے چند جانبازوں کی مدد سے "شحطیہ" کے ٹیلوں پر قبضہ کر لیا۔ یہ کارروائی اس قدر دلیرانہ تھی کہ خود ان کے ساتھیوں کو اس پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

اس فتح کے بعد ڈاکٹر چمران کو یہ اصرار تھا۔ کہ جس قدر جلد ممکن ہو ایرانی مجاہدین بوستان کی طرف بڑھیں تاکہ دشمنوں کو اپنے پاؤں جمانے کا موقع نہ ملے۔ افسوس ہے کہ یہ کام سرانجام نہ پا سکا۔ ڈاکٹر چمران نے اپنے شیر دل ساتھی ایرج رستمی کی ہمراہی میں اپنے آپ کو "دہلاویہ" کی تسخیر میں تن من دھن سے لگا دیا اور اس محاذ پر چھاپہ مار لڑائیوں کا وہ نمونہ پیش کیا جو ایثار و قربانی و فداکاری کی اپنی ایک مثال ہے۔

دہلاویہ کی فتح بذات خود ایسا دلیر اقدام تھا کہ جس پر جس قدر ناز کیا جائے کم ہے۔ ڈاکٹر چمران اور ان کے دلیر ساتھیوں نے دریائے کرخہ پر ایک پل بنایا اور دریا عبور کر کے دشمن پر دھاوا بول دیا۔ خداوند عالم نے ان مجاہدوں کو فتحیاب کیا۔ یہ فتح ابوالحسن بنی صدر کے فوجی کمان سے الگ ہونے کے بعد پہلی بڑی کامیابی تھی۔ "اللہ اکبر" کی کامیاب مہم کے ایک ماہ بعد (۳۰ خرداد ۱۳۶۰ ہجری شمسی مطابق ۲۰ جون ۱۹۸۱ء) ڈاکٹر چمران آیت اللہ اشراقی کے ساتھ شوریٰ عالی دفاع (SUPREME DEFENCE COUNCIL) کے جلسے میں شریک ہوئے جو اہواز میں منعقد ہوا۔ اس جلسے میں بھی انھوں نے فوجوں کی سست روی پر سخت تنقید کی اور اس سلسلے میں اپنی تجاویز پیش کیں۔ یہ آخری جلسہ تھا جس میں ڈاکٹر چمران نے شرکت فرمائی۔ ۲۱ جون ۱۹۸۱ء کی صبح ایک غم انگیز داستان اپنی ہمراہی میں لے کر آئی۔

Presented by Ziaraat.Com

قربان گاہ کی جانب

۳۱ خرداد ۱۳۶۰ھ شمسی (۲۱ جون ۱۹۸۱ء) کو ایرج رستمی نے دہلاویہ میں جام شہادت پیا۔ اس واقعے نے ڈاکٹر چمران کو بے حد متاثر کیا۔ ان کا غم تمام مجاہدین کی غمازی کرتا تھا۔ انہوں نے اپنے ایک افسر کو ساتھ لیا اور دہلاویہ کو چلے کہ ایرج رستمی کی جائے شہادت کو دیکھیں۔ یہ موقع بے حد اثر انگیز تھا۔ انہیں خدا حافظ کہتے سبھی اشکبار تھے۔ نصف شب کے قریب ڈاکٹر چمران نے میٹنگ بلائی اور اپنے دوستوں اور ساتھیوں کو بے بہا نصیحتیں کیں اور تجویزیں پیش کیں۔ اس وقت ڈاکٹر چمران کا چہرہ جذبات سے دمک رہا تھا اور ان کی آنکھوں سے ایک ملکوتی کیفیت نور کا سیلاب بہا رہی تھی۔ اس میٹنگ کے بعد جو ان کی زندگی کی آخری میٹنگ تھی، وہ سوسن گرد کے محاذ کی جانب روانہ ہوئے۔ وہاں پہنچ کر مجاہدین کو ایرج رستمی کی شہادت پر پرسہ دیا اور ان کی حوصلہ افزائی کی۔ ایرج رستمی کی جدائی نے ان کے سینے میں غم کا طوفان برپا کیا ہوا تھا لیکن ان کے چہرے سے اس فقدان کے اثرات ظاہر نہ ہوتے تھے۔ ان کا دل شوق شہادت سے مملو تھا۔ انھوں نے اپنے سپاہیوں سے خطاب کرتے ہوئے کہا "ایرج رستمی خداوند عالم کو پیارا تھا اس لیے اس نے انہیں اپنے پاس بلا لیا۔ اگر ہمیں بھی خدا پسند کرتا تو ہمیں بھی اپنے پاس بلا لیتا" اس خطاب کے بعد انہوں نے تمام افراد کو الوداع کہی اور پھر محاذ جنگ میں اولین مورچوں کی جانب چل دیئے یہ مورچے دشمن کی زد میں تھے یہاں پر ایک قیامت کی گولہ باری کا منظر تھا اور بہت سے افراد شہید ہو چکے تھے ڈاکٹر چمران آگے بڑھتے چلے گئے اور اپنے ساتھیوں سے کہا کہ وہ ان کے نزدیک نہ آئیں یہیں پر ایک مارٹر کے گولے نے انہیں اپنی منزل شہادت کے قریب کر دیا اور اسلام کا یہ سپاہی حسین علیہ السلام کے نقش قدم پر چلتا ہوا اپنے خدا کے حضور روانہ ہوا

ڈاکٹر چمران کی شہادت نے ایران اور ایران سے باہر ہر شخص کو متاثر کیا اور انہوں نے اس کا اظہار ان پیاموں، تقریروں اور مضمونوں کے ذریعے سے کیا جو ان کی مجالس ترحیم میں اور اخبارات میں پیش ہوئے ان کی زندگی کے آثار چڑھاؤ اور ان کا جذبہ شہادت دور اولین کے مسلمانوں کی یاد دلاتا ہے۔ اور ہمیں یہ سبق دیتا ہے کہ کربلا کے شہیدوں کو ماننے والے موت سے ڈرا نہیں کرتے بلکہ اس کا استقبال کرتے ہیں اور یوں ہر دور اور ہر خطہ یزیدیت کو شکست فاش دیا کرتے ہیں۔

السیّد موسیٰ الصّدر

اس کتاب میں ڈاکٹر چمران شہید نے بار بار السید موسیٰ الصدر کا ذکر کیا ہے ہر چند کہ اب پاکستانی قارئین سید موصوف کے نام سے کم از کم آگاہ ہیں لیکن بہت کم لوگ ہوں گے جنہیں سید موسیٰ الصدر کی شخصیت کی عظمت اور نہایت مختصر مدت میں حاصل ہونے والے ان نتائج سے آگاہی ہو جو سید الصدر کی کوششوں کا ثمرہ تھے۔ انہوں نے لبنان میں چند برس کی مدت میں جو کچھ کر دکھایا وہ گویا مردے میں جان ڈالنے کے مترادف ہے اس بات کے پیش نظر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پاکستانی قارئین کی خدمت میں موصوف کے بارے چند مختصر باتیں پیش کی جائیں۔

سید موسیٰ الصدر کے آباء و اجداد لبنان سے ہجرت کر کے ایران اور عراق میں آباد ہو گئے تھے ان کا تعلق اس خاندان سے ہے جس نے سید عبدالحسین شرف الدین اعلی اللہ مقامہ کو جنم دیا۔ سید صدر کے خاندان کی وہ شاخ جو ایران و عراق میں آباد ہو گئی، اپنے مورث اعلیٰ سید صدر الدین صدر کے نام پر خاندان صدر کے نام سے مشہور ہو گئی انکے خاندان نے ان علماء مجاہدین کی ایک کثیر تعداد کو جنم دیا جن کی علمی ادبی، سیاسی، دینی اور اجتماعی خدمات تاریخ میں اپنا مقام پیدا کر چکی ہیں۔ اس خاندان میں آیت اللہ السید باقر الصدر شہید اور ان کی ہمشیر گرامی سیدہ بنت الہدیٰ پیدا ہوئے جن کی سرگرمیوں نے عراق کی بعثی حکومت کو لرزہ براندام کر دیا اور جن کی بنا پر صدامی حکومت نے ان بہن بھائی دونوں کو شہداء کی فہرست میں شامل کر دیا۔

سید موسیٰ الصدر ۱۳۴۶ ہجری (۱۹۲۷ء) میں شہر قم میں متولد ہوئے۔ ان کے والد سید حسن الصدر شہر قم کے علماء میں سے تھے اور اپنے خاندان کی روایات تقویٰ و زہد و علم

Presented by Ziaraat.Com

کے وارث تھے۔ سید موسیٰ نے اپنی ابتدائی تعلیم قم میں اپنے پدر بزرگوار سے حاصل کی اور اس کے بعد تہران میں دانشکدہ حقوق میں داخل ہوئے یہاں انہوں نے سیاسی اور اقتصادی علوم میں لائسنس (بی اے اور ایم اے کے مابین ایک ڈگری) حاصل کیا یہاں ان کے ہم سبق حضرات میں شہید آیت اللہ مطہری بھی تھے۔ تہران سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد فقہ و اصول کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے سید موصوف نجف اشرف تشریف لے گئے اور حصول علم میں اپنے آپ کو مصروف کر دیا۔ یہیں سے ان کی شہرت لبنان پہنچی اور وہاں کے بزرگ رہنما اور مجتہد سید عبدالحسین شرف الدین قدس سرہ نے مرجع بزرگ آیت اللہ العظمیٰ السید محسن الحکیم اعلی اللہ مقامہ سے درخواست کی کہ وہ سید موسیٰ کو لبنان بھیج دیں۔ سید عبدالحسین شرف الدین کے انتقال پر انہیں ان کا جانشین تسلیم کیا گیا اور انھوں نے اپنی تمام تر کاوشوں کو اس راہ میں وقف کر دیا جو سید عبدالحسین شرف الدین نے اختیار کی تھی۔

دَور جدید میں لبنان سے دو سربرآوردہ مجتہدین نے دنیائے اسلام میں اپنا نام پیدا کیا ایک سید محسن الامین رحمہ اللہ تھے اور دوسرے سید عبدالحسین شرف الدین۔ ان دونو بزرگوں نے لبنان کے شیعوں کی حالت کو بہتر بنانے اور مسلمانوں کے مابین اتحاد کی فضا قائم کرنے کے لیے بڑا کام کیا۔ سید عبدالحسین شرف الدین نے شیعہ طلبہ کی سہولت کے لیے صدر (TYRE) میں الکلیۃ الجعفریۃ قائم کیا جس میں اپنی تعلیم کے علاوہ انٹرمیڈیٹ تک لبنان کے سرکاری نصاب کے مطابق سائنس اور آرٹس کی تعلیم دی جاتی تھی۔ راقم الحروف کو اس کالج میں پڑھانے کا شرف حاصل ہے۔ سید عبدالحسین شرف الدین نے فرانسیسی انتداب کے زمانے میں فرانسیسی اور عیسائی تشدد و استبداد کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ ان کی نگاہ دوررس نے السید موسیٰ الصدر کی ذات میں جوہر قابل کو تلاش کر لیا اور یوں سید الصدر عراق سے اپنے آباؤ اجداد کے وطن میں واپس آ گئے۔ یہ واقعہ ۱۹۶۰ کا ہے جب سید عبدالحسین شرف الدین کو انتقال کئے تین برس ہو چکے تھے۔

سید الصدر نے لبنان پہنچ کر وہاں کے شیعوں کی حالت کو سدھارنے کے لیے شب و روز محنت کی اور اپنے کارہائے نمایاں کی بدولت لبنان کے لوگوں میں بالعموم اور شیعوں

میں بالخصوص اعتماد حاصل کیا۔ لبنان کے شیعوں کی حالت کا تذکرہ آپ ڈاکٹر چمران شہید کی زبانی سن چکے ہیں۔ اس لیے اس کو دہرانا مقصود نہیں لیکن یہ بات کہنا شاید نامناسب نہ ہو کہ اس منطقے کے شیعوں نے علماء مجاہدین کی ایک کثیر تعداد کو جنم دیا ہے۔ شہید اول محمد بن مکی (۷۳۴ - ۷۸۶ھ) شہید ثانی زین الدین (۹۱۱ - ۹۶۶ھ) محقق ثانی علی بن حسین کرکی (جو ۹۴۰ھ میں قتل کر دیئے گئے)، شیخ حسن صاحب معالم (۹۶۰ - ۱۰۱۱ھ) سید محمد صاحب مدارک شیخ محمد بہائی (۹۰۲ - ۱۰۳۰ھ)، علامہ حر عاملی (متوفی ۱۱۰۴ھ) ان علماء میں سے چند ایک ہیں ان بدنصیب شیعوں پر عثمانی ترکوں کے دور میں بے انتہا ظلم روا رکھے گئے یہاں تک کہ ایک ترک گورنر احمد پاشا کا نام ہی "الجزار" (قصاب) پڑ گیا۔ ان مظلوم عوام کی حمایت میں سید عبدالحسین شرف الدین نے اقدام کیا اور اپنے کاموں کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لیے وصیت کی کہ سید موسیٰ الصدر ان کے جانشین ہوں سید موصوف نے لبنان میں مستقل سکونت اختیار کرنے کے بعد سید عبدالحسین شرف الدین کے قائم کردہ جعفریہ کالج کا نظم و نسق سنبھالا۔ لیکن یہ کالج صرف لڑکوں کے لیے تھا جبل عامل کے منطقے میں جہاں یہ کالج قائم تھا لڑکیوں کے لیے کوئی تعلیمی سہولت موجود نہ تھی۔ سید الصدر نے اس ضرورت کو محسوس کیا اور لڑکیوں کی تعلیم و تربیت کے لیے ایک ادارہ قائم کیا۔ اس میں بعد دوپہر خواتین کے لیے دینی تعلیمات کے بارے میں درس و تدریس کا سلسلہ شروع ہوا۔ اسی ادارے نے بعد ازاں لڑکیوں کے لیے نرسنگ سکول اور قالین بافی کی تربیت کا سکول قائم کیا۔ اسی طرح طلبہ کے لیے فنی تعلیم کا ایک مدرسہ قائم کیا۔ ان مدرسوں کے بارے میں آپ اس کتاب میں بار بار اشارے پائیں گے علوم شرعیہ کی تدریس کے لیے معہد الدراسات الاسلامیۃ قائم ہوا جو ابتداء میں کرایے کی ایک عمارت میں تھا۔ لیکن کچھ مدت گزرنے پر لبنان کے شہر صدر کے قریب برج شمالی میں نہایت عالی شان نومنزلہ عمارت میں اسے منتقل کر دیا گیا اس میں لبنان، افریقا کے مختلف ممالک کے علاوہ چین ایسے ایشیائی ممالک کے طالب علم تعلیم حاصل کرتے تھے ان کی خوراک اور رہائش کا انتظام بھی مدرسے ہی کی طرف سے ہوتا تھا۔ اس مدرسے کے طلبہ دیگر مدارس کے بچوں کو دینیات کی تعلیم بھی دیا کرتے تھے۔ ان مدرسوں کا ذکر اور ان کی کارکردگی کا حال آپ ڈاکٹر چمران شہید سے سن چکے

Presented by Ziaraat.Com

ہیں۔ اس لیے ان کا تفصیلی ذکر مقصود نہیں بلکہ ان کی جانب اشارہ کا مقصد اس طریقہ کار کی وضاحت کرنا ہے۔ جو سید موسیٰ الصدر نے لبنان کے عوام کے ایک پسے ہوئے طبقہ کو بیدار کرنے اور انہیں شعور حیات اور اپنے حقوق سے آگاہ کرنے کے لیے اختیار کیا۔ یہ ادارے اور مدرسے قائم کرنا اس طریقہ کار کا ایک حصہ تھا۔

سید الصدر نے لبنان میں سکونت اختیار کرنے کے بعد پہلا اقدام یہ کیا کہ لبنان کے عوام بالعموم اور شیعہ عوام بالخصوص کے نزدیک ہوئے اور ان کا اعتماد حاصل کیا۔ یہ بڑا کٹھن کام تھا۔ جن حضرات کو عرب ذہنیت سے سابقہ پڑا ہے وہ یہ بات ضرور جانتے ہوں گے کہ عربوں کی عصبیت آج بھی کم وبیش اسی طرح ہے۔ جیسے زمانہ جاہلیت میں تھی ان میں ایک غیر عرب کا جا کر رہنا اور ان کا اعتماد حاصل کرنا خاصہ مشکل کام ہے۔ سیّد موسیٰ الصدر ہر چند اصلاً لبنانی اور عرب تھے، تاہم وہ ایران میں پیدا ہوئے تھے، فارسی ان کی زبان تھی۔ اور عربی بولتے وقت وہ اپنی ایرانی حیثیت کو چھپا نہ سکتے تھے۔ اس لیے لبنان کے زمینداروں اور جاگیرداروں بالخصوص کامل الاسعد جیسے شیعہ جاگیرداروں اور ان کے کاسہ لیس نام نہاد علماء دین نے سید موسیٰ الصدر کے عربی کے لہجے پر بڑے اعتراضات کئے اور ان کے ایرانی ہونے کو بہت اچھالا (بالکل اسی طرح، جیسے سابق شاہ ایران نے آقائے خمینی کے بارے میں اس بات کو ہوا دی کہ ان کے آباء واجداد کشمیر سے ایران میں آئے تھے) لیکن سید الصدرؒ نے ان تمام حاسدوں اور مخالفوں کی سازشوں کی پروا کئے بغیر اپنی کوششیں جاری رکھیں اور عوام کو اپنا گردیدہ کر لیا۔

معاشری فلاح کے سلسلے میں سیّد موصوف نے جو کام کئے ان میں سرفہرست جمعیت البرّ والاحسان کا نام لیا جا سکتا ہے۔ اس انجمن نے جنوبی لبنان کے اپاہجوں، یتیموں بیواؤں، بیماروں اور اس قسم کے دیگر ضرورت مند لوگوں کی مدد کا بیڑا اٹھایا۔ شہر صدر کے ارد گرد کے تمام علاقے کا جائزہ لیا، ایسے لوگوں کی فہرستیں تیار کیں جو مستحق تھے اور پھر انہیں باعزت طور پر ماہانہ مدد پہنچانا شروع کی۔ ان اخراجات کو پورا کرنے کے لیے عوام سے کہا گیا کہ وہ صدقہ، خیرات وغیرہ کی تمام رقوم براہ راست انجمن کو دیں اور بھک منگوں کو منہ نہ لگائیں

عوام نے اس تجویز کو قبول کر لیا اور انجمن کئی ہزار افراد کو ماہانہ امداد دینے کے قابل ہوئی۔ اس کا ایک نتیجہ یہ نکلا کہ اس علاقے میں بھیک مانگنے والا کوئی دکھائی نہ دیتا۔ کیا آپ تصور کر سکتے ہیں کہ مسلمانوں کا علاقہ ہو اور وہاں گداگری کا وجود نہ ہو۔ لیکن ایسا ہوا ہے اور وہ صرف سید الصدر کے ذاتی نفوذ اور شخصی جاذبیت کی بنا پر۔ السید الصدر نے لبنان میں جو کچھ کیا اس کا بیان اب اس کتاب میں پڑھ چکے ہیں لیکن اس کی تفصیل کے لیے مستقل کتاب درکار ہے جو موجودہ تحریر کے دائرے سے باہر ہے۔ ان کے کارناموں کی اہمیت کا اندازہ صرف اس بات سے ہو سکتا ہے کہ اس سال کی مدت میں انھوں نے ایک پسماندہ، مظلوم اور احساس کمتری کا شکار قوم کو اپنے پاؤں پر کھڑا کیا، انہیں اپنے حقوق کے شعور سے آگاہ کیا انہیں اس قابل بنایا کہ وہ ظالم کے مقابلے میں کھڑی ہو سکے اور اسرائیل و امریکا ایسی استبدادی طاقتوں کے دانت کھٹے کر سکے۔

سید الصدر کیوں کر اس قابل ہوئے کہ وہ ایک تن مردہ میں جان پیدا کر سکیں۔ یہ مسئلہ علم اجتماع کے ماہرین کی تحقیقات کا ہدف بن سکتا ہے۔ کہ وہ اس سے سید موسیٰ الصدر کے طریقہ کار کا سراغ لگائیں تاکہ اس مثال کو سامنے رکھ کر دوسری ستم رسیدہ قوموں کے رہنما بھی اپنا لائحہ عمل طے کر پائیں اور اپنے عوام کو بیداری اور شعور زندگی سے آگاہ کر سکیں یہاں اشارتاً صرف یہی کہا جا سکتا ہے کہ سید موصوف نے صرف وعظ نہیں کیے بلکہ عملی اقدام کے ذریعے سے اپنے عوام کا اعتماد حاصل کیا، ان کے نزدیک ہوئے، انہیں اپنے قریب کیا اور یوں انہیں گم گشتگی سے نجات دلا کر ہوش کی راہ پر ڈالا۔ عام دینی رہنماؤں کے برخلاف سید الصدر نے تقدس کا لباس اوڑھ کر اپنے آپ کو عوام سے الگ اور بالا مخلوق تصور نہیں کیا تھا بلکہ اپنے آپ کو ان جیسا بنا کر پیش کیا۔ ان کے اس طریقہ کار کا نتیجہ لبنان میں شیعوں کی وہ بیداری ہے جس نے امریکا اور اسرائیل کے ساتھ رجعت پسند عرب اور مسلمان حکومتوں کو پریشان کر رکھا ہے۔

اپنی تمام تر مشغولیتوں کے باوجود سید موسیٰ الصدر نے قلمی جہاد کو فراموش نہیں کیا اور جب بھی حالات نے انہیں اجازت دی انہوں نے اپنے افکار کو قالب تحریر میں ضرور ڈھالا

Presented by Ziaraat.Com

قم میں اپنی طالب علمی کے زمانے میں انہوں نے وہاں کے مشہور مجلے مکتب اسلام کی ابتدا کی اور اس میں متعدد مضامین چھپائے۔ ان کی دیگر تحریروں میں زیادہ اہم حسب ذیل ہیں:-

۱ ۔ ادزی کوربان کی کتاب تاریخ فلسفہ اسلامیہ، کے عربی ترجمے پر ایک مبسوط مقدمہ (عربی)

۲ ۔ یوسف مروہ کی کتاب "القرآن الکریم والعلوم الاسلامیۃ" پر ایک مقدمہ (عربی)

۳ ۔ لبنان کے مشہور عیسائی مصنف سلیمان کتانی کی کتاب "وتر فی غمد" پر جو جناب سیدہ سلام اللہ علیہا کی سیرت کے بارے میں ہے، ایک مقدمہ

۴ ۔ اسلام اور عصر حاضر کا تمدن (عربی)

۵ ۔ اسلام اور عورت (عربی + فارسی)

۶ ۔ اسلام اور شہری تربیت (عربی فارسی)

۷ ۔ اسلام اور ارتقاء (عربی)

۸ ۔ اسلام اور عبادات

۹ ۔ المعاملات الجدیدۃ فی ضوء الفقہ الاسلامی

۱۰ ۔ اسلامی اقتصادیات۔

سید موسیٰ الصدر کی گمشدگی

سید موسیٰ الصدر اتحاد اسلامی کے بہت بڑے علمبردار تھے (ہیں؟)۔ انہی نے ۱۹۷۰ء میں لبنان کے سنی اور درزی لیڈروں کے ساتھ مل کر یہ تجویز پیش کی تھی، اور مطالبہ کیا تھا کہ لبنان سنی، شیعہ اور دروز کے ووٹ الگ الگ نہ گنے جائیں بلکہ تمام مسلمانوں کے ووٹ یکجا شمار ہوں۔ اس مطالبہ نے لبنان کی حکومت، جس کی باگ ڈور مارونی عیسائیوں کے ہاتھ میں تھی (اور رہے) اور عیسائی حضوصًا مارونی حلقوں کو بہت سیخ پا کیا کیونکہ اس طرح نام نہاد مارونی اکثریت کے ڈھول کا پول کھلتا تھا۔ سید الصدر اتحاد

اسلامی کی ہر کوشش کی حمایت کیا کرتے تھے۔ انھوں نے جنوبی لبنان کے شیعوں کو اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ ہر قیمت پر فلسطین کی تحریک آزادی کا ساتھ دیں چاہے اس کی بنا پر انہیں اسرائیلی دہشت گردیوں کا نشانہ ہی کیوں نہ بننا پڑے۔ اسی جذبے کے تحت وہ لیبیا کی حکومت کی دعوت پر لیبیا کے انقلاب کی سالگرہ کی تقریبات میں شرکت کرنے کے لیے ۲۳ اگست ۱۹۷۸ء کو بیروت کے ہوائی اڈے سے طرابلس روانہ ہوئے۔ پروگرام کے مطابق انھیں ۳۱۔ اگست ۱۹۷۸ء کو طرابلس سے بذریعہ ہوائی جہاز پیرس روانہ ہونا تھا۔ جہاں ان کی زوجہ محترمہ زیر علاج تھیں لیکن نہ وہ پیرس پہنچے اور نہ بیروت۔ انکے ساتھ المجلس الشیعی الاسلامی الاعلیٰ کے ایک رکن الشیخ محمد شحاظہ یعقوب اور لبنان کے ایک صحافی عباس بدرالدین بھی تھے یہ دونوں بھی بیروت واپس نہ آئے چند دن کے انتظار کے بعد ان کے بارے میں تشویش بڑھنا شروع ہوئی اور سرکاری نیز غیر سرکاری طور پر ان کی تلاش شروع ہوئی۔ حکومت لیبیا نے بتایا کہ سید موصوف اپنے دونوں ساتھیوں کے ہمراہ ۳۱ اگست ۱۹۷۸ء کو الایطالیا (اٹلی کی ہوائی کمپنی) کی پرواز ۸۸۱ میں طرابلس سے روم روانہ ہوگئے تھے اور انھیں سرکاری طور پر الوداع کہی گئی تھی۔ لیکن اٹلی کے حکام سے پوچھ گچھ پر ان کا کوئی سراغ نہ ملا۔ لیبیا کی حکومت کے بیان سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ اٹلی گئے ہیں اور اٹلی کے حکام ان کا سراغ بتانے سے قاصر تھے۔ صرف اتنی خبر ملی کہ تین لبنانی مسافر جن میں سے دو نے علماء کا لباس پہن رکھا تھا ہولی ڈے ان ہوٹل میں تین دن رہ کر غائب ہوگئے حالانکہ انھوں نے ایک ہفتے کے لیے کمرے کرایہ پر لیے تھے۔ وہ دن اور اور آج، سید موسیٰ الصدر اور ان کے ساتھیوں کا کوئی پتا نہیں۔ کیا وہ کہیں چھپ گئے؟ کیا انہیں قتل کر دیا گیا؟ لیبیا، اٹلی اور لبنان کی حکومتیں اس معمے کو حل نہیں کر سکیں۔

سید موسیٰ الصدر لاپتا ہوگئے لیکن لبنان کے لوگ اب بھی اسی خیال میں ہیں کہ وہ کسی کی قید میں ہیں ہر لبنانی شیعہ (زمینداروں کو چھوڑ کر) اسی امید پر جی رہا ہے کہ سید موصوف کسی دن یک دم ظاہر ہو جائیں گے۔ ان کی گمشدگی کے بعد لبنان میں شدید ردعمل کا اظہار ہوا اور لیبیا کو مطعون کیا گیا کہ وہاں کی حکومت نے انھیں قید کر رکھا ہے

Presented by Ziaraat.Com

اس بنا پر ایران اور عراق میں بھی لیبیا کے خلاف جذبات کا اظہار ہوا۔ لیکن اتنی دیر تک ان کا سراغ نہ ملنے سے گمان بھی ہوتا ہے کہ ان کو کسی گروہ کے ایما پر قتل کر دیا گیا ہے اس سلسلے میں مختلف گروہوں پر شک کا اظہار کیا جا رہا ہے۔ بعض لوگ اسے اسرائیلی سازش کا نتیجہ قرار دیتے ہیں۔ بعض کے نزدیک لبنان کے الکتائب (Phalangist) نے انھیں قتل کروایا ہے۔ اس بارے میں فلسطینیوں کی بائیں بازو کی جماعتوں اور لبنان کے رجعت پسند شیعہ زمینداروں پر بھی شک کا اظہار کیا جا رہا ہے۔ لیکن اصل صورت حالات کے بارے میں یقین کے ساتھ کچھ کہنا ممکن نہیں۔

لبنان کی سٹیج سے سید موسیٰ غائب ہو چکے ہیں لیکن ان کے کردار کی چھاپ لبنان کی صورت حالات پر مثبت انداز میں پڑی نظر آتی ہے کہ ان کے زیر اثر لبنان کے پسے ہوئے شیعہ عوام نے امریکہ اور اسرائیل دونوں کے دانت کھٹے کر رکھے ہیں اور ان کی بنا پر تمام دنیا کے شیعوں کی دہشت امریکہ اور ان کے حواریوں کے دلوں پر بیٹھ چکی ہے۔

Presented by Ziaraat.Com